مردِ آخر بیں مبارک بندہ ایست

انہیں کل کی فکر آج کرنی سکھا دے

ذرا انکی آنکھوں سے پردا ہٹا دے

کمیں گاہ بازی دوراں دکھا دے

جو ہونا ہے کل آج انکو سمجھا دے

چھتیں پاٹ لیں تاکہ باراں سے پہلے

سفینہ بنا ڈالیں طوفاں سے پہلے

(حالی)

تمہید

شادی تمدنی زندگی کی ناگزیر ضرورت ہے !

اُس کے کثیر اخراجات

سمندر کی گہرائی، آسمان کی دوری یا ستاروں کی تعداد کا اندازہ کیا جا سکتا ہے مگر شادی کی مختلف منزلوں کے لاانتہا اور غیر محتاط اخراجات کا قیاس کرنا دشوار ترین امر ہے۔ اس کے اخراجات عموماً میزانیہ کے شرمندۂ احسان نہیں ہوتے۔ نوجوانوں کی عمریں اتنی نہیں ہوتیں کہ ماضی، حال و مستقبل پر نظر رکھ سکیں یا اپنی امنگوں کو بنظر کفایت شعاری کم کر سکیں۔ عورتیں جو عموماً جز رس ہوتی ہیں اس معاملے میں انکا دماغ بھی عاجز اور عاری ہو جاتا ہے۔ ہر قسم کا وہ تماشہ جو کسی طرح آئندہ زندگی کے لئے مفید نہ ہو اور تمام فضولیات جن پر وہ خود سنجیدہ اوقات میں ہنسیں گی، نہ صرف جائز بلکہ ضروری سمجھ کر انجام دیتی ہیں۔ ان کے حوصلوں کی انتہا نہیں، بیاہ کا گھر عورتوں کے اسراف و فضول خرچیوں کی تنہا جولاں گاہ ہے۔ مردوں سے توقع ہوتی ہے کہ وہ بُرے وقت میں آڑے آئیں گے مگر انکی فہم و عقل بھی اس موقع پر عورتوں کی بیجا تمناؤں اور حوصلوں، سوسائٹی کی رسم و رواج اور سب سے زیادہ نکو بننے کے وہم سے متاثر و مغلوب ہو جاتی ہیں۔ اگر تعمق کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ شادی کے اخراجات میں اعتدال و کفایت بھی اسراف کی حد میں آ جاتا ہے۔ یا کم از کم ہر شخص کے ذریعہ آمدنی سے تو قطعی بڑھ جاتا ہے۔ اس لئے اس کو اگر برسات کی بارش یا طوفان سے تشبیہ دی جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ جس طرح برسات کی بارش دیوار کی مٹیوں کو دھو دیتی ہے یا چھتوں میں روزن بنا دیتی ہے اور کبھی بارش کا پانی ایک جگہ جمع ہو کر سیلاب

کی شکل میں مضبوط سے مضبوط مکان کی بنیاد کو ہلا دیتا ہے اور پھر پانی زمین میں جذب ہوکر نت نئے امراض پیدا کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے، اسی طرح شادی کے کثیر ولا طائل اخراجات آپ کی صحت، دولت وعافیت غرض کہ ہر چیز کے دشمن ہیں۔ آپ اپنے بچوں کی شادی کے لئے عین وقت پر قرضہ اور ادھار کی فکر میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح بصد خرابی نہایت اونچی شرح سود پر روپیہ حاصل کرنے کے بعد اپنی ہوسناکیوں کو انجام تک پہونچاتے ہیں۔ اور انجام کے بعد ہزاروں مہاجن آپ کی ڈیوڑھی پر مردہ خوار حیوانوں کی طرح منڈلاتے پھرتے ہیں اور آپ کی رہی سہی عافیت، بچی کھچی پونجی اور بنی بنائی عزت بھی ان مہاجنوں کے ہاتھوں ملیامیٹ ہوجاتی ہے۔

مرض کی تشخیص

ایسا کیوں ہوا؟ صرف اس لئے کہ آپ مستقبل سے غافل رہے، پیش بندی کو راہ نہ دیا اور ابتدا ہی سے تھوڑی تھوڑی رقم جو اگرچہ بظاہر حقیر معلوم ہوتی ہو اور جس کے پسماندہ کرنے سے آپکی عافیت وآرام میں بھی چنداں خلل نہ پڑتا، جمع کرنے کی عادت نہیں ڈالی۔ اگر آپ اس طوفان اور سیلاب سے بچنے کے لئے اول ہی روز سے کوشش کرتے اور تنکا تنکا جمع کرتے تو یقیناً شادی کے وقت آپ کے چہرے پر حزن و ملال کی جگہ بشاشت وبے فکری رہتی اور شادی کے بعد آپ کی زندگی مسرت واطمینان سے کٹتی۔

علاج

اگر آپ ان خطرات سے بچنا چاہتے ہیں تو اس کی بہت ہی سہل اور آسان ترین صورت یہ ہے کہ اپنے بچوں کی شادی کا بیمہ کرا دیجئے اور پھر بالکل مطمئن ہوجائیے۔

دی پریمیر جنرل انشیورنس کمپنی لمیٹیڈ ''پٹنہ'' نے شادی کے بیمہ کا خاص انتظام کیا ہے۔

شادی کے بیمہ کے شرائط وفوائد ندیم کے آخر صفحات میں صفحہ ۵ پر لاحظہ فرمایئے۔

۱۔ رسالہ ندیم ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں پابندی وقت کے ساتھ شائع ہوا کرے گا۔
۲۔ رسالہ نہ پہونچنے کی اطلاع ہر ماہ کی ۱۵ر تاریخ تک آنے پر رسالہ دوبارہ ارسال کیا جائے گا۔
۳۔ ندیم ہر ماہ ۷۲ صفحات کے مضامین اور متعدد رنگین و سادہ تصویریں پیش کرے گا۔
۴۔ ندیم کی قیمت سالانہ مبلغ چار روپیہ (للعہ) اور ششماہی دو روپیہ چار آنہ (عہ۴ر) ہوگی۔
۵۔ نمونہ کا پرچہ ۶ر آنہ کے ٹکٹ آنے پر ارسال کیا جائے گا۔
۶۔ جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ بھیجئے ورنہ جواب نہ دیا جاسکے گا۔
۷۔ ندیم میں ہر وہ نظم و نثر شائع ہو سکے گی جو معیار پر پوری اترے۔
۸۔ ندیم میں اخلاق سوز افسانے اور مضامین ہرگز درج نہ ہوں گے۔

باہتمام سید منظر علی ندوی برقی پریس سبزی باغ بانکی پور میں چھپا اور محمد یعقوب پرنٹر و پبلشر نے دفتر ندیم [illegible] گیا سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قیمت بہار نمبر
بذریعہ دفتر عہ علاوہ محصول
بذریعہ ایجنٹ
عہ

رسالہ ندیم گیا
بہار نمبر ۱۹۳۵ء

مشرقی ہندوستان کا واحد کثیر الاشاعت اردو مصور ماہنامہ

چندہ سالانہ
چار روپیہ
للعہ

جلد ۵ | اگست و ستمبر ۱۹۳۵ء | نمبر ۲-۳

(۱۷) سید ابن الحسن فکر ام۔اے اڈیٹر رسالہ پردہ تصویر
(۱۸) ڈاکٹر مبارک حسین مبارک عظیم آبادی
(۱۹) حضرت عرش گیادی
(۲۰) سید رضا قاسم مظفرپوری (سیاح ممالک اسلامیہ)
(۲۱) مشہور بہاری آرٹسٹ اچ۔ ال بن جی
(۲۲) شاہ محمد حسن صاحب بسمل

فہرست مضامین

رحمن حکیم آبادی رکن ۱۹۰۹ — نجمہ — سید شاہ عبدالعزیز آزاد رکن ۱۹۱۰ — اُم نفیسہ عالم (منیجر مدیرہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش نظر بہار نمبر کے متعلق ہم اپنے بعض معاصرین کی طرح یہ دعویٰ کرنے کی تو جرأت نہیں کرتے کہ ہمارا یہ سالنامہ دنیائے ادب کا واحد شاہکار ہے۔ اور کل رسالوں کے سالناموں پر ہر حیثیت سے فوقیت رکھتا ہے۔ کیونکہ تجارتی پروپگنڈا کے لئے اس طرح کی خود ستائی ممکن ہو کہ جائز سمجھی جائے لیکن ادبی خدمت کرنیوالوں کے لئے "ثنائے خویشتن" کا اصول کچھ زیادہ زیب نہیں دیتا۔ عطار گویہ کی بجائے خود مشک ہی اپنی روح پرور خوشبو سے لوگوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کرائے تو زیادہ مناسب ہے۔ اس لئے بڑے بڑے شاندار الفاظ میں بہار نمبر کی تعریف کرنے کے عوض ہم اس کے صرف ان چند خصوصیات کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو بہار نمبر کو اور دوسرے سالناموں سے ممتاز کرتی ہیں۔

(۱)　بہار نمبر میں ہندوستان کے اُن مشاہیر ادبا و فضلا کے مضامین ہیں جو دنیائے علم و ادب میں خاص امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۲)　بہار نمبر کے صفحات ایسے علمی ادبی جواہر ریزوں سے مزین ہیں جنہیں آسمانِ علم و ادب کے روشن ستارے نہیں بلکہ ہر ایک کو بجائے خود آفتاب کہنا موزوں ہو سکتا ہے۔

(۳)　مضامین کی اہمیت کے علاوہ تنوّع کے لحاظ سے بھی علمی' ادبی' تاریخی' تحقیقی مقالوں کے ساتھ ساتھ بلندپایہ افسانوں اور مزاحیہ مضامین' قابل قدر نظموں اور پرکیف غزلوں کے باعث ایک ایسا مجموعۂ علم و ادب ہے جو ہر مذاق کے شائقین ادب کے لئے کافی سامان دلچسپی اپنے اندر رکھتا ہے۔

(۴)　جن مشاہیر ادب کے رشحات قلم سے بہار نمبر کے صفحات مزین ہیں ان کے مضامین کے ساتھ انکی تصاویر بھی قدردانِ علم و ادب کے لئے شائع کی گئی ہیں۔ اتنے اہل قلم اور ادیبوں کی تصاویر شاذ ہی کسی ایک سالنامہ میں شائع ہوئی ہوں۔

(۵)　جس طرح بہار نمبر میں صرف بہاری ادیبوں کے مضامین کی تخصیص رکھی گئی ہے اسی طرح رنگین تصاویر بھی جو اعلیٰ آرٹ کے بہترین نمونے ہیں' بہار نمبر کے لئے صرف بہاری آرٹسٹوں سے تیار کرائی گئی ہیں۔ اتنی تعداد میں یکرنگی و بہ رنگی تصاویر کے بلاکس

• چھپوانے اور چھپوانے کے کثیر اخراجات شاید ہی کسی سالنامہ کے لئے برداشت کئے گئے ہوں۔

(۶) ساڑھے تین سو صفحات سے زائد ضخامت کے سالنامہ کی مثال بہت کم ملے گی۔

(۷) اس قدر ضخیم سالنامہ کی قیمت اتنے قیمتی مضامین اور اعلیٰ آرٹ کی رنگین تصویروں کے ساتھ غیر خریداروں کے لئے صرف ایک روپیہ رکھنی اور سال بھر کے مستقل خریداروں کو مفت نذر کرنا غیر معمولی ایثار ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ کہاں تک اس میں تجارتی منفعت کا پہلو ہے۔ اور خاص کر بہار جیسے بے حس صوبہ میں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کارکنانِ ندیم کی یہ جگر کاویاں اور مالی قربانیاں بہار میں کہاں تک خدمتِ اردو کا احساس پیدا کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔

بہار نمبر میں صرف بہاری ادبا کے مضامین کی تخصیص کا مقصد محض اس جمود و سکوت کو توڑنا ہے جو ایک عرصہ سے اس صوبہ کے اہل قلم حضرات کی طبیعت ثانیہ بن گئے ہیں ورنہ اردو ادب کی خدمت کے لئے بہاری اور غیر بہاری کی تخصیص ایک مہمل سی بات ہے۔ یہ قید صرف اسی غرض سے لگائی گئی کہ اپنے صوبہ کے اہل قلم حضرات کو کسی طرح عملی میدان میں کھینچ کر لایا جائے اور اردو ادب کی خدمت پر آمادہ کیا جائے۔ صوبجاتی تعصب اور "پراونشل ازم" کو اس میں کچھ بھی دخل نہیں۔ بہاری ادبا کی کافی تعداد اب تک صحافتی دنیا میں اپنے ادبی اور علمی معلومات کو پیش کرنے سے محض اس لئے اغماض کرتی رہی کہ ان کی فطری انکساری اور گمنامی پسندی نے اخبارات و رسائل کو اپنی شہرت کا ذریعہ بنانا مناسب نہیں سمجھا۔ ان کی اس استغنا اور انکسار نے بہار میں اردو کی طرف سے ایک عام بے توجہی پیدا کر دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حامیانِ اردو میں سے جب کسی با ہمت شخص نے رسائل و اخبار کے ذریعہ اردو کی خدمت کرنی چاہی تو اس صوبہ کے اہل قلم حضرات نے قلمی اعانت سے اس کی ہمت افزائی کرنے کی بجائے اپنی بے اعتنائیوں سے اس کا حوصلہ اور بھی پست کر دیا۔ شروع شروع ندیم کو بھی انہیں دقتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کی تقریباً پانچ سال کی مسلسل جد و جہد اور استقلال نے ان ادبا کو اپنے صوبہ کی ادبی خدمت پر آمادہ کرا ہی چھوڑا جس کا نمونہ آپ کے سامنے ندیم کا یہ سالانہ "بہار نمبر" ہے۔

بہار نمبر کا اعلان ہوتے ہی نہ صرف مقامی بہاری ادیبوں نے جوش و خروش سے اس کا خیر مقدم کیا بلکہ اپنے وطن سے دور افتادہ ادبا نے بھی لبیک کہہ کر اس کے کامیاب بنانے میں عملی حصہ لیا۔ یوپی سے حضرت علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا سید ابو ظفر صاحب مصنف "تاریخ گجرات" و سابق اڈیٹر "مہتاب" مولانا سید ریاست علی ندوی مصنف "تاریخ صقلیہ"۔ بمبئی سے پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب۔ حیدرآباد سے مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی ریڈر دینیات عثمانیہ کالج۔ دہلی سے سید ابن الحسن صاحب فکر ایم۔ اے مدراس سے مولانا عبید الرحمٰن صاحب۔ کلکتہ سے پروفیسر طاہر صاحب رضوی جیسے مشاہیر ادبا و فضلا کا اپنے صوبہ سے باہر رہ کر بھی بزم ندیم میں شریک ہونا ہماری کوششوں کی کامیابی کا امید افزا ثبوت ہے۔ ان دور افتادہ قلمی سرپرستوں کے علاوہ خود صوبہ کے

ہر ضلع سے جن معاونین نے بہار نمبر کی قلمی اعانت فرمائی ہے ان سب کا تعارف
اور ان کے مضامین پر ایک سرسری تبصرہ کرنا اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ شائقین ادب کو ان بزرگوں کی شخصیت اور ان کے مضامین کی اہمیت کا صحیح اندازہ کرنے کا موقع ملے۔

(۱) نوجوانانِ بہار اور خدمتِ ادب۔

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کی شخصیت ہماری تعریف اور تعارف سے مستغنی ہے۔ مذکورہ بالا عنوان سے علامہ موصوف نے بہار میں اردو کے گذشتہ اور موجودہ ارتقائی مدارج پر جن پُر از معلومات اور جامع الفاظ میں تبصرہ فرمایا ہے اور بہار میں آئندہ اردو کی ترقی و بقا کے لئے جو زریں اصول بتلائے ہیں اگر نوجوانانِ بہار علامہ ممدوح کے ان ذرخشندہ خیالات کو مشعل ہدایت بنائیں تو منزلِ مقصود خود آگے بڑھ کر قدمبوس ہو گی۔ ہم اپنے محترم علامہ کے اس احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے جو آپ نے اپنے ادبی جواہر ریزوں سے ندیم کے صفحات کو مزین فرما کر ہماری ہمت افزائی فرمائی ہے۔

(۲) ایک مغل شاہزادہ بہار میں:۔

ہم اپنے مخلص دوست جناب سید نجیب اشرف صاحب ندوی پروفیسر اسمٰعیل کالج بمبئی کی ان عنایتوں کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے جو ہمارے سے دور رہنے اور پروفیسری کی مشغولیتوں کے باوجود آپ نے بہار نمبر کے لئے مذکورہ بالا عنوان سے ایک ایسا قیمتی ہدیہ عنایت فرمایا ہے جو شائقینِ ادب اور تاریخی ذوق رکھنے والوں کے لئے ایک نئی چیز ہے۔ شاہی گود کا پلا ہوا شاہزادہ آخری تاجدارِ ہند حضرت بہادر شاہ خلد آشیاں کے پوتے کا بہار کے ایک رئیس یعنی مہاراجہ دربھنگہ کی خدمت میں آکر ملازمت کیلئے قصیدہ پڑھنا انقلاب زمانہ کا کس قدر عبرت انگیز منظر ہے۔ دلی کے لال قلعہ کے شہزادہ کا بہار کے ایک استادِ فن حضرتِ شوق نیموی مرحوم سے برسوں اصلاح لیتے رہنا بہار کی ادبی حیثیت کو نمایاں کرتا ہے۔

(۳) سیر المتاخرین:۔

مولانا سید ریاست علی ندوی رفیق دار المصنفین نے جس تحقیق و تفتیش سے اس تاریخی مضمون کو سپرد قلم فرمایا ہے وہ ممدوح کی وسعتِ نظری اور ذوقِ تحقیق کا بیّن ثبوت ہے۔ اس کی خوبیوں کے متعلق صرف یہی کہنا غالباً کافی ہوگا کہ یہ قیمتی مضمون "تاریخ صقلیہ" جیسی یادگار کتاب کے مصنف کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ تاریخی مضامین عموماً خشک و غیر دلچسپ ہوتے ہیں لیکن مسلمان بادشاہوں کے آخری دور کے سیکڑوں تاریخی واقعات اور خود صاحب سیر المتاخرین کی سیاسی زندگی کے حالات ایسے ہیں جو کافی دلچسپی کے سامان اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ہم مولانا ممدوح کی اس قلمی اعانت کے شکرگذار ہیں۔

(۴) ہماری قدیم قومی و وطنی تہذیب۔

مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی پروفیسر عثمانیہ کالج حیدرآباد نے مذکورہ بالا عنوان کے ماتحت ہندوستان کی قدیم مذہبی تصانیف و تواریخ کے حوالہ سے اس غلط فہمی کو دور کیا ہے جو ہندوستان کی قدیم تہذیب کے نام لیوا حضرات عورتوں کی موجودہ پردہ کے متعلق طنزیہ انداز میں کہتے ہیں کہ جنس لطیف کا یہ حبس بیجا مسلمانوں کی معاشرتی تہذیب کی یادگار ہے۔ مولانا ممدوح نے انہیں کی مذہبی اور تاریخی کتابوں کے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ عورتوں کا پردہ ہندوستان کے قدیم تمدن کا لازمی جزو تھا۔ اس تحقیقی مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا موصوف کو ہندوستان کی قدیم تاریخ و تہذیب کے مطالعہ سے کس قدر گہری دلچسپی ہے۔ ہم آپ کی اس مخلصانہ کرمفرمائی کے مشکور ہیں کہ بہار نمبر کو ایسے بلند پایہ مضمون کے شائع کرنے کا موقع عنایت فرمایا۔

(۵) ظہور اسلام سے قبل ایرانی اور عربی تعلقات۔

جناب پروفیسر طاہر صاحب رضوی کا یہ تحقیقی مضمون تاریخی معلومات میں قابل قدر اضافہ ہے۔ پروفیسر موصوف کی علمی دلچسپیوں کا مرکز زیادہ تر قدیم ایرانی تاریخ رہا ہے۔ زردشت پر آپ کی مشہور تصنیف علمی حلقے میں کافی شہرت پا چکی ہے۔ گذشتہ سال فردوسی کی ہزار سالہ برسی کی تقریب کے موقعہ پر جو طہران میں فردوسی کانگرس کا شاندار جلسہ ہوا جس میں مختلف ممالک کے علماء و فضلا مدعو تھے پروفیسر موصوف نے ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوکر "دقیقی کے اشعار شاہنامہ کے متعلق" جو نظریہ پیش کیا اس نے علمی دنیا میں ایک ہلچل مچادی۔ آپ کی اس علمی تحقیقات پر ایران کے کل اخبارات نے بے حد مدح سرائی کی۔ پروفیسر ممدوح نے قدیم ایرانی و عربی تعلقات پر جو قیمتی مضمون بہار نمبر کے لئے عنایت فرمایا ہے اسے ہم نہایت شکریہ کے ساتھ شائع کرتے ہیں

(۶) خدابخش خاں مرحوم بانی اورنٹیل پبلک لائبریری پٹنہ

عظیم آباد کی مشہور اورنٹیل پبلک لائبریری اور اس کے بانی خدابخش خاں مرحوم کے نام سے کون واقف نہیں، لیکن اس نادر المثال کتب خانہ کی اہمیت اور اس کے بانی کی بلند شخصیت اور ان کی علمی خدمت سے بہت کم لوگوں کو واقفیت ہے۔ ہم مولانا حاجی معین الدین صاحب پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ کے مشکور ہیں کہ ممدوح نے نہایت ہی محنت و کاوش سے متذکرہ بالا عنوان پر مضمون لکھ کر علمی ذوق رکھنے والوں کے معلومات میں ایک قیمتی اضافہ فرمایا ہے۔

(۷) س۔ ش۔ ص

گذشتہ بہار نمبر میں جناب وصی احمد صاحب بلگرامی[1] کا دلچسپ مضمون "جلال جنگ کے تین بیٹے" پڑھکر ادبی ذوق رکھنے والے

---

[1] جناب وصی صاحب کے نام کے ساتھ بلگرامی کے لفظ سے ناظرین کو یہ شبہہ نہ ہو کہ یہ صوبہ اودھ کے رہنے والے ہیں۔ وصی صاحب کا مولد و مسکن آرہ ہے چونکہ آپکے اسلاف نے بلگرام سے آکر بہار میں سکونت اختیار کی تھی اسی نسبت کے لحاظ سے اب تک آپ اپنے کو بلگرامی لکھتے ہیں۔

حضرات کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ جناب وصی صاحب اردو ادب کی ایک خاص طرز نگارش کے مالک ہیں۔ اس نمبر میں "س۔ش۔ص" کے دلچسپ عنوان سے جو بسیط مضمون جناب ممدوح نے سپرد قلم فرمایا ہے وہ اگرچہ بہار کے تین مشہور شعرا کے حالات کے باعث ایک خشک تاریخی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے لیکن تحریر کا انداز، عبارت کی شوخی، ادب کی لطافت، زبان کی چاشنی نے اس میں ایسی دلچسپیوں کا سامان پیدا کر دیا ہے کہ باوجود کافی طویل ہونے کے شروع کرنے کے بعد اسے ختم کئے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ کہنے کو تو صرف حضرت صفیر، حضرت شاد اور جناب سلطان کے حالات ہیں لیکن اسی سلسلہ میں صوبہ بہار اور خاص عظیم آباد کے ان سیکڑوں شعرا کا ذکر ہے جن کے نام اور حالات سے اور تو اور، خود صوبہ کے لوگ بھی واقف نہیں ہیں —— اسی تضمن میں عظیم آباد کی ان معرکۃ الآرا علمی مجلسوں اور ادبی صحبتوں کا دلچسپ تذکرہ بھی ہے جو آج سے سو سال پہلے تک مختلف زمانوں میں بہار کی علمی و ادبی زندگی کا نمونہ پیش کرتی رہیں۔ گویا یہ قیمتی مضمون بہار کی سو سالہ ادبی جنتری ہے۔ اس مضمون میں حضرت صفیر و حضرت شاد کی استادی و شاگردی کی پرانی بحث بھی چھیڑی گئی ہے جو ممکن ہے کہ بعض حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح کی اختلافی بحث اور گڑے مردے اکھیڑنے کے ساتھ ہم بھی نہیں لیکن جہاں بہت سے واقعات ناواقفیت کے تودے کے نیچے دب گئے ہوں وہاں صحیح معلومات کے مدفون خزانہ کو برآمد کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرنا ہمارے خیال میں نامناسب نہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ بھی ممدوح ندیم کے صفحات کو اپنے ادبی جواہر ریزے سے اسی طرح خزینہ ہونے کا موقع عنایت فرماتے رہیں گے۔

(۶) شتاب رائے۔

مولانا ابو ظفر صاحب ندوی سابق ایڈیٹر شہاب و مصنف تاریخ گجرات نے راجہ شتاب رائے گورنر بہار کا تذکرہ جس وضاحت سے فرمایا ہے اس سے جناب ممدوح کی وسعت نظری اور محققانہ طرز نگارش کا پتہ چلتا ہے۔ راجہ شتاب رائے کی شخصیت صرف تاریخ سیاسیات بہار ہی میں نہیں بلکہ تاریخ ادبیات بہار میں بھی ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ راجہ صاحب کو اردو سے جو خاص لگاؤ رہا ہے اور اس کی ترقی میں جو انہوں نے نمایاں حصہ لیا ہے وہ ناظرین مضمون متذکرہ بالا میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

ہم مولانا ابو ظفر صاحب کی ندیم نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے "راجہ شتاب رائے" کے تذکرے سے بہار نمبر کے صفحات کو زینت دیتے ہیں۔

(۷) زنانہ رسائل کی تجارت

ہم اپنے صوبہ کے مشہور ادیب جناب پروفیسر مسلم صاحب کی اس قلمی اعانت کے تہ دل سے ممنون ہیں کہ ممدوح نے ایک قابل قدر مضمون بہار نمبر کے لئے بھیجکر ہماری حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ پروفیسر موصوف نے اس اصلاحی مضمون میں ان تجارتی زنانہ پرچوں کی افسوسناک حرکتوں پر روشنی ڈالی ہے جو طرح طرح کے اشتہاری مضامین کے ذریعہ بھولی بھالی پردہ نشین خواتین کے

رہے ہیں لوٹتے ہیں۔

چونکہ نفرات کے محدود صفحات میں بہار نمبر کے کل قابل قدر مضامین نظم و نثر پر تفصیلی تبصرہ کی گنجائش نہیں اس لئے ناظرین ندیم کی محض توجہ منعطف کرنے کے لئے نہایت ہی مختصر لفظوں میں صرف ان سب کا تذکرہ کافی ہوگا۔ تاکہ شائقین ادب پڑھ کر خود اندازہ کریں کہ بہار نمبر کا دامن کیسے کیسے علمی و ادبی جواہر ریزوں سے مالا مال ہے۔ انہیں علمی تحقیقی اور تاریخی مضامین میں جناب رخشاں ابدالی کا "اردو نثر میں بہار کا حصہ" جناب بہاء الدین صاحب بی۔اے۔بی۔ال سابق اڈیٹر موج نسیم کا "شاعرات بہار" خضر بانو صاحبہ کا "صحافت بہار" یہ تینوں تحقیقی مضامین بہار نمبر کے مخصوص اغراض کا لحاظ کرتے ہوئے جس محنت و کاوش کے ساتھ لکھے گئے ہیں ہم اپنے ان علمی معاونوں کی تلاش و جستجو کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

جناب مولانا مسعود عالم صاحب ندوی اڈیٹر "الضیا" (عربی) نے "جھوٹی آزادی" کے عنوان سے زمانۂ جنگ میں عربوں کی حب وطن کا ایک سبق آموز تاریخی واقعہ نہایت ہی دلچسپ پیرایہ میں لکھ کر بہار نمبر کے لئے عنایت فرمایا ہے ہمیں امید ہے کہ ناظرین ندیم اسے دلچسپی سے پڑھیں گے۔

اس کے بعد فسانوں میں حضرت جمیل مظہری ام۔اے کا افسانہ "فرض کی قربانگاہ پر" ایک ادبی شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے پلاٹ کی بنیاد فلسفۂ اخلاق کے ایک بلند نظریہ پر رکھی گئی ہے اور پھر جذبات کی مصوری میں ان کے زور قلم نے گویا جادو کا کام کیا ہے، فلسفیانہ خیالات کو ادبی سانچہ میں اس خوبی کے ساتھ ڈھالا گیا ہے کہ بلا قصد مضامین ذہن نشین اور چلے زبان زد ہو جائیں۔ حضرت جمیل کی اس کامیاب فسانہ نویسی پر ہم مبارکباد دیتے ہیں اور ان کی ندیم نوازی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

جناب ابن الحسن صاحب فکر ام۔اے اڈیٹر "پردۂ تصویر" دہلی کا "چینی آئینہ" جناب عرشی عظیمی صاحب کا "انتقام" و جناب اختر اوریوی صاحب کا "کام" یہ تینوں مختصر افسانے پلاٹ اور ادبی خوبیوں کے اعتبار سے ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ جناب مولوی سید رضا قاسم صاحب مظفر پوری کا "بہار کے معدنی وسائل" بھی نہایت ہی کارآمد اور مفید مضمون ہے۔

حضرت ماہنپوری کے مزاحیہ و طنزیہ مضمون "اپ ٹو ڈیٹ شاعری" اور "میری لیڈری" پر تبصرہ ہم اس ڈر سے نہیں کرنا چاہتے کہ انکا سب سے جداگانہ نظریہ ہمارے تعریفی الفاظ کو غیریت پر نہ محمول کرے کیونکہ ندیم کے ساتھ انہیں خلوص و محبت ہے اس خصوصیت کی بنا پر اس رسالہ کو وہ اپنا پرچہ سمجھتے ہیں اور بقول انکے جب تعلقات "من تو شدم تو من شدی" کی حد تک پہنچ جائیں تو "من دیگرم تو دیگری" کا بتاؤ کے کیا معنی بہر حال ہمیں امید ہے کہ ہنسی مذاق میں کام کی باتیں کہہ جانیوالے اس ظریف واعظ کی معنی خیز باتوں میں ناظرین ندیم اپنی دلچسپی کا کافی سامان پائیں گے۔

مضامین نثر کے بعد بہار نمبر کی نظموں اور غزلوں کے متعلق یہ عرض کرنا کافی ہوگا کہ یہ ادبی جواہر ریزے ان قادر الکلام شعرا کے نتیجۂ افکار ہیں جو نظم اور تغزل کی دنیا میں ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

علامہ فضل حق آزاد ان مغتنم ہستیوں میں ہیں جن کی ساری عمر اردو ادب کی خدمت میں گذری ہے۔ ہندوستان کے مشہور جرائد و رسائل حضرت آزاد کے رشحات قلم سے مدتوں مستفیض ہوتے رہے اس طرف کئی سال سے کبر سنی کے باعث ممدوح نے دنیائے شاعری سے علیحدگی اختیار کر لی۔ لیکن اس ادبی زندگی سے کنارہ کشی کے باوجود تصویر اور مضمون کی طلبی پر جو نظم ممدوح نے بہار نمبر کیلئے بھیجی ہے وہ حضرت آزاد کی تخیل آفرینی کی زندہ تصویر ہے۔

ڈاکٹر سید عظیم الدین صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر پٹنہ کالج کی ذات گرامی دنیائے علم و ادب کے لئے مایۂ ناز ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی نے جو اردو کی اہمیت تسلیم کر لی وہ زیادہ تر آپ ہی کی خدمتِ اردو کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ازراہِ عنایت بہار نمبر کے لئے ایک قابل قدر نظم بھیجکر ہماری ہمت افزائی فرمائی ہے۔ اسے ہم شکریہ کے ساتھ شایع کرتے ہیں۔

خان بہادر سید احمد علی خاں صاحب عظیم آبادی ریٹائرڈ ڈپٹی مجسٹریٹ کا غیر منقوط نعتیہ قصیدہ ایک ایسا درخشندہ ادبی جواہر پارہ ہے جس کی قدر و قیمت نقطہ کے دھبے سے پاک ہونے کے باعث اہل نظر کی نگاہوں میں اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں جبکہ ہندوستان سے فارسی زبان و ادب کا ذوق تقریباً مٹ چکا ہے اس مشکل ترین صنعت غیر منقوط میں فارسی زبان کا ایسا پندور قصیدہ ممدوح کی قابلیت اور قادر الکلامی کا زبردست ثبوت ہے۔

حضرت یاس بہاری نے اپنی نظم "درس حریت" میں حب وطن کے ایک سبق آموز واقعہ کی تصویر نہایت ہی دلکش الفاظ میں کھینچی ہے۔ حضرت رسا ہمدانی نے "جھولا" کے عنوان سے ایک معصوم بچے کے متعلق ماں کے جذبات کا اظہار دلچسپ پیرایہ میں کیا ہے۔ جناب اصغر مجیبی کا "پیمانہ" میکشان ادب کے لئے روح افزا ہدیہ ہے۔ جناب شمس کا "پیام" اس قابل ہے کہ اسے غور سے سنا جائے۔ جناب منصور نے "جنون آرزو" میں آرزو کی کامیاب تصویر کشی کی ہے، جناب اختر قادری بلیاروی کی نظم "میں تمکو بھول جاؤں تم مجھکو بھول جاؤ" اور جناب محمد یعقوب پریمی (اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر) کا ہندی گیت "پریم کتھا" بھی قابل ذکر ہیں۔

ان نظموں کے بعد غزلوں میں حضرت شفق کی کیف پرور فطرت نگاری، حضرت عرش یادگار مومن کا وجد آفریں رنگِ تغزل، حضرت جمیل مظہری کے لطیف جذبات، ڈاکٹر مبارک کی شستہ زبان، حضرت ولی کا حسنِ تخیل، حضرت ہاتف کی مضمون آفرینی، جناب کشتہ کی سلاستِ بیان، پروفیسر اختر کی ترجمانی جذبات، پروفیسر بیدل کے کلام کی رنگینی، جناب سخن کی سخن سنجی، جناب نجم کی شیریں کلامی، جناب حافظ کے پاکیزہ خیالات، جناب بسمل کا انداز بیان، ان گلہائے مضامین کی رنگارنگی نے بہار نمبر کو گویا بہار نمبر بنا دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ "ندیم" کا یہ ادبی گلدستہ اہل ذوق کی میز کا زینت ہوگا۔

مصور جذبات شعراء کے ذکر کے ساتھ ہی ناانصافی ہوگی اگر ہم بہار کے اُن تین آرٹسٹوں کا شکریہ نہ ادا کریں جن کے موئے قلم نے "بہار نمبر" میں چار چاند لگا دیئے۔

اس نمبر کا ٹائیٹل صوبہ کے مشہور نوجوان آرٹسٹ "بہزادِ ہند محمد ہادی کے موئے قلم کا کامیاب نتیجہ ہے۔ ہادی صاحب کا تعلق آرٹ کے ساتھ ذاتی نہیں بلکہ خاندانی ہے۔ آپ کے نانا اودھ میں شاہ امجد علی خاں کے یہاں شاہی مصور تھے۔ آپ کے والد نثار مہدی صاحب صوبہ بہار کے مایہ ناز آرٹسٹ تھے۔ ہادی صاحب کا سلسلۂ شاگردی براہ راست 'بہزاد' سے ملتا ہے۔ آپنے قدیم مصوری کی تعلیم گھر پر حاصل کی اور جدید آرٹ کلکتہ آرٹ اسکول میں سیکھا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر عرصے تک کلکتہ کے مشہور فرموں میں بحیثیت انچارج آرٹسٹ کے رہے۔ متفرق نمائشوں میں اول انعامات حاصل کئے۔ کلکتہ میں آپ کے شاگرد کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اب آپ مستقل طور پر اپنے وطن عظیم آباد آگئے ہیں اور صوبہ بہار کو اپنے اعلیٰ آرٹ سے مستفید ہونے کا موقع عنایت فرما رہے ہیں۔

آرٹسٹ ممدوح کی ایک دوسری تصویر اسی نمبر میں "کشمکش" کے عنوان سے شائع کی جا رہی ہے جو آرٹ اور تخیل کا بے نظیر نمونہ ہے۔

ایچ۔ ایل جین بی۔ اے کے موئے قلم نے ایک نازنین کی حالت رکوع کی تصویر میں عبودیت کے جن لطیف اور پاکیزہ جذبات کو نمایاں کیا ہے وہ ان کے اعلیٰ آرٹ کی زندہ تصویر ہے[۱]۔ بہار نمبر میں اُنکا ایک اور ایرانی آرٹ کا شاہکار حضرت حافظ کے مشہور شعر "مطرب چہ نغمہ ساخت۔۔۔" کی وجد آفریں تخیل کی تصویر ہے۔ جو ایک شاعر کی مصوری اور ایک مصور کی شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ جین جی کو ایرانی آرٹ میں کمال حاصل ہے۔ آپ دیوان حافظ کو مصور کر رہے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ مرقع آپ اپنی نظیر ہوگا۔

جناب سید نصرت حسین صاحب نصرت آروی ان نوجوانوں میں ہیں جنہیں شاعری کیساتھ ساتھ مصوری سے بھی خاص مناسبت ہے۔ اس نمبر میں آپ کی ایک تصویر "ہمدردی" کے عنوان سے شائع کی جا رہی ہے جسے دیکھ کر ناظرین یقینی لطف اندوز ہوں گے۔

ان تینوں بہار کے مایہ ناز آرٹسٹوں نے آئندہ بھی ندیم کے صفحات کو زینت بخشنے کا وعدہ کیا ہے۔

آخر میں ہم بہار نمبر کی اس تنگی داماں پر نادم ہیں کہ موزونہ صفحات کی کافی تعداد بڑھانے پر بھی "دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار" کی مجبوری کی وجہ سے بہتیرے ادبی جواہر ریزوں کو اپنے دامن میں نہ لے سکا۔ ان سب قابل قدر اور بلند پایہ مضامین میں سے بعض تو ان کاتبوں کی مہربانیوں کی بدولت بہار نمبر میں ہم شائع نہ کر سکے جنھوں نے وقت پر کتابت کر کے ہمیں واپس نہیں کئے ناظرین ندیم کو ان قیمتی مضامین کے لئے آئندہ نمبروں کی انتظار کی زحمت اٹھانی پڑیگی ہمیں امید ہو کہ ہماری مجبوریوں کا لحاظ کر کے ہمیں معاف فرمائینگے

سب سے آخر میں حضرت اسحاق امرتسری اڈیٹر "مسلم گزٹ" کلکتہ اور جناب مسٹر سمیع سیدآبادی کی مخلصانہ عنایتوں کا شکریہ ادا کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں جنھوں نے بہار نمبر کے بلاکس بنوانے اور چھپوانے میں اپنا قیمتی وقت صرف کر کے ہمیں ممنون احسان فرمایا۔ ان دونوں ہمدردوں کے اس خلوص و محبت کے ہم بے حد شکر گزار ہیں۔

---

[۱] یہ تصویر کلکتہ اگزیبیشن میں اول انعام حاصل کر چکی ہے

کشمکش

(تصویر کی تصویر)

شفق کی سرخیوں میں شام کی دلکش فضا روشن
نہاں تاریکیوں میں آسمانِ شرق کا دامن

حسیں انگڑائیاں تاروں کی کچھ کچھ آسمانوں میں
فضا ڈوبی ہوئی ہر سمت مغرب کی اذانوں میں

ادائے "فرض" کی خاطر کھڑی اِک "ماں" مصلے پر
گر چلا ہوا ننھا سا "بچہ" پاؤں سے آکر

عبادت کے لئے گرچہ بروئے قبلہ استادہ
مگر بچے کو آنکھیں جذب کر لینے پہ آمادہ

اُدھر اِک ہاتھ اُس دل پر جو شیدائی خدا کا ہے
اِدھر اِک ہاتھ اِس سر پر جو پیارا ماتا کا ہے

اُدھر پیشِ خدائے پاک سرتا پا عبودیت
اِدھر روتے ہوئے بچے کے آگے صرف اِک عورت

اُدھر وہ جس نے اِس اولاد سی نعمت عطا کی ہے
اِدھر یہ جس کی اُلفت خود ہی اِک طاعت خدا کی ہے

اُدھر اللہ کا ڈر، اِس طرف اولاد کی اُلفت
اُدھر احساسِ فرضِ بندگی ماں کی اِدھر فطرت

قضائے فرض میں مانع جہنم کا اُدھر دھڑکا
ادائے فرض میں حائل اِدھر روتا ہوا لڑکا

تخیل میں اُدھر دھندلی سی اِک تصویر جنت کی
اِدھر پیشِ نظر تابندہ تر دنیا محبت کی

شریعت اُس طرف آمادۂ تکفیر ہوتی ہے
اِدھر انسانیت بڑھ کر گریباں گیر ہوتی ہے

تقاضا اُس طرف ایمان کا "یادِ خدا کر لے!
علائق سے چھڑا دامن، نماز اپنی ادا کر لے!"

اِدھر تلقینِ فطرت "ہے خدا مستغنی طاعت
مگر ننھا ہے محتاجِ محبت، تشنۂ شفقت"

غرض ہے مبتلا بیچاری دوگونہ مصیبت میں
بلا کی "کشمکش" ہے، ماہتا میں اور عبادت میں

نوجوانان بہار اور خدمت ادب

(علامہ سید سلیمان صاحب ندوی)

اگر کوئی پوچھے کہ صوبہ بہار کی مادری زبان کیا ہے؟ تو جواب ہر طرف سے یہی ملے گا کہ "ہندوستانی" جس کو عام طور سے اردو کہا جاتا ہے، اس زبان کے عروج کا جو زمانہ دلی اور لکھنؤ میں تھا بعینہ وہی صوبہ بہار میں تھا، اور یہ بات اہل ادب میں بے تامل مانی جاتی ہے کہ دلی اور لکھنؤ کے بعد اس زبان کا تیسرا مرکز عظیم آباد پٹنہ تھا، جو صاحب کمال بھی اپنے گھر سے بے گھر ہوا اور اجڑی دلی کو چھوڑ کر نکلا، اس نے پہلے لکھنؤ میں قسمت آزمائی کی، اگر بخت نے یہاں یاوری نہ کی تو پورب کی سمت اور بڑھا، اور عظیم آباد پہنچ کر دم لیا، اگر یہاں کی آب و ہوا بھی اس کو راست نہ آئی، تو بنگال میں مرشد آباد کی طرف نکل گیا،

اس رسالہ کے کسی پہلے سالانہ نمبر میں میں نے حضرت مخدوم شرف الدین رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات سے وہ چند فقرے لکھے تھے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح دوسرے صوبوں کے قدیم بزرگوں کے دہن مبارک سے اس بولی کے متعدد فقرے نکلے ہیں اس صوبہ کے بزرگ بھی اس کو بولتے اور سمجھتے تھے، اس کے بعد جیوں جیوں یہ بولی ترقی کر کے زبان بنی گئی۔ اس کی اس ترقی میں یہ قطعہ ہند بھی اپنی بساط بھر حصہ لیتا رہا، اور یہ حالت اس وقت تک قائم رہی جب تک نئی حکومت نے اس صوبہ کو صوبہ بنگال میں محو کر کے اس کی مستقل حیثیت فنا نہ کر دی اور بہار کے تمام دفتروں اور صیغوں میں بنگالیوں کا تقرر عمل میں نہ آیا، جو ہندوستانی سے ایک حرف آشنا نہ تھے، صوبہ میں ہندوستانی کے ساتھ بنگالی اور اوڑیا اور دو اور زبانیں شریک تھیں، اس کے بعد اس درخت پر دوسری کلہاڑی اس صوبہ کے ایک مشہور گورنر نے ماری جب ملک کی متحدہ زبان کے رسم خط کو اردو اور ہندی کے دو حصوں میں بانٹ کر ملکی اتحاد کی رگ کے آخری قطرہ کو بھی بہا دیا ۱۸۶۰ء میں بہار و بنگال کی گورنمنٹ نے ہندی کو دفتروں کا خط قرار دیا ہوا اسی اثنا میں یہاں بنگال کی ہمسائگی کے اثر سے انگریزی تعلیم کو روزافزوں ترقی ہوتی گئی، تو اس زبان پر اس صوبہ میں مردنی چھا گئی، عدالتوں اور دفتروں کی ضرورت سے کون آزاد ہے، ہندی رسم خط نے عوام میں ہندوستانی رسم خط کی جگہ لینی شروع کی، اور خواص میں جو دن پر دن انگریزی تعلیم پڑھتے جاتے تھے، دیسی زبان کی وقعت گھٹتی چلی گئی، یہاں تک کہ دوستوں میں خط و کتابت، گھروں میں بات چیت، مجلسوں میں تقریر و تحریر سب انگریزی میں کیجانے لگی، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ دیسی زبان میں بولنا ان دنوں ذلت اور بے توقیری کا مرادف تھا۔

یہ کیفیت قریب قریب پچاس ساٹھ برس رہی اس طویل عرصہ میں بزرگوں کی ادبی دولت برباد ہوگئی، اپنی زبان کی خدمت کا ولولہ جاتا رہا، صحیح زبان بولنے اور لکھنے کی دھن نہ رہی، انگریزی اسکولوں میں جو مدرس اور ماسٹر پڑھاتے تھے ان میں بڑا حصہ بنگالیوں کا تھا، وہ جیسی ہندوستانی بولتے تھے، اس کے قریب قریب ان کے شاگرد بھی بولنے لگے، اگر اس عہد میں قاضی رضا حسین صاحب رئیس عظیم آباد اور ان کے ہم نشین اہل علم و ادب کا مختصر سا گروہ پٹنہ میں نہ ہوتا تو یہ رہی سہی یادگار بھی ملیامیٹ ہو جاتی۔

قاضی صاحب کی ادب آفرینی، اور علم آموز صحبتوں میں جو نوجوان آ آکر شریک ہوئے اس پورے پچاس برس کے زمانہ میں بھی اسلاف کی اس یادگار کو اپنے سینے سے لگائے رہے، اس گروہ میں شہر عظیم آباد کے علاوہ اس کے قصبات کے نوجوان شرفا بھی برابر کے شریک تھے، ظہیر احسن نیموی، عبدالغفور شہباز، عبدالغنی وارثی، سید رحیم الدین، حافظ فضل حق آزاد، حافظ محب الحق وغیرہ دیہات اور قصبوں کی پیداوار تھے، اور شہر کے باشندوں میں سے دو نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، قاآنی ہند حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم اور حضرت شاد، ایک نام اور ہے جو مجھے یاد نہیں لیکن سر راہے زیارت ایک دفعہ اپنے چھوٹے چچا مرحوم مولوی ابو یوسف صاحب کے ساتھ پٹنہ میں ہوئی، اور جن کی نسبت انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ صورۃ الخیال معروف بہ ولایتی بیگم کے مشہور فسانہ کے اصلی مصنف یہی ہیں، چچا مرحوم بھی اسی آغوش صحبت کے پروردہ اور اسی گروہ کے ہمنشیں تھے، اس لئے اس بارہ میں ان کا بیان وثوق کے قابل ہو۔

دوسرا نام محب حسین ہے، یہ بھی دیہات کے باشندہ اور اسی خوشہ پروین کے ایک دانہ تھے، اپنے زمانہ میں خوب پھلے پھولے اور کلکتہ جا کر وہاں کے مشہور اخبار اردو گائڈ وغیرہ کے مدتوں ایڈیٹر رہے، چچا مرحوم میں اور ان میں برادرانہ محبت تھی، انہیں کے ساتھ ایک دو دفعہ ان سے ملاقاتیں ہوئیں، دبلے پتلے سے تھے، لمبا قد تھا، سیاہ ایرانی ٹوپی پہنتے تھے۔

یہ چند نام بر سبیل تذکرہ آ گئے، کہ شاید آجکل کے ہمارے نوجوان ادیبوں کے کانوں میں اپنے بزرگوں کے نام پڑ جائیں اور صوبہ کی ادبی ترقیوں کے سلسلہ میں ان کے کارناموں کو فراموش نہ کریں۔

یہ تغافل کا زمانہ رفتہ رفتہ رخصت ہوا، اور اب چند سال سے نظر آ رہا ہے کہ خود آذر کے گھر میں ابراہیم پیدا ہو رہے ہیں، یعنی انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں جن کے ہاتھوں سے ہندوستانی ادب کا قتل عام ہوا تھا اب ایسے مسیحادم پیدا ہو رہے ہیں، جن کی کوششوں سے اس کے تن مردہ میں نئی جان پڑنے کی امید بندھ رہی ہے۔ نئی تعلیم کے تیز و تند جھونکوں نے ہماری محفل ادب کی جن شمعوں کو گل کیا تھا، اب ان کی جگہ برقی قندیلوں نے لے لی ہے، جن کو اب زمانہ کا طوفان حوادث گل کرنے کے بجائے اور زیادہ تیز کرتا جائے گا۔

یہ پورا انقلاب میری آنکھوں کے سامنے گذرا ہے، حالات کی تبدیلی میں سب سے بڑا ہاتھ ملک کے پچھلے سیاسی انقلاب کا ہے۔ بنگال کی شورش کے اثر سے ۱۹۱۱ء میں بہار کو بنگال سے علحدہ کیا گیا اس علحدگی سے بنگال کا اثر اس صوبے سے آہستہ

آہستہ کم ہونے لگا، اور خود صوبہ کو اپنی ادبی خود مختاری کا فرمان ملا سر علی امام مرحوم کا یہ احسان وطن کی گردن پر ہمیشہ رہے گا یہ خود مختاری انہیں کی کوششوں کا نتیجہ تھی، اس کے بعد ہی دنیا کے سیاسی انقلابات اور اسلامی دنیا کے تیز تیز تغیرات نے یورپ کی طرف سے نفرت اور قومیت، اور وطن کی محبت پیدا کی، اس نے ہندوستانیوں کے دلوں سے انگریز آقا کا رعب اٹھا دیا، اور بتا دیا کہ لومڑی شیر کی کھال اوڑھ کر شیر نہیں بن سکتی، نہ انگریزوں کی نقالی ہندوستانیوں کو انگریز بنا سکتی ہے، اس تحریک کی آندھی نے بدیسی چیزوں کے ساتھ بدیسی زبان و ادب کے بڑاپن کا بھی خاتمہ کر دیا، اور دیسی زبان کی ترقی کا خیال روز بروز بڑھنے لگا، ملک کی بڑی بڑی سیاسی مجلسوں میں جہاں انگریزی کے سوا ہر زبان ناقابل فہم تھی، انگریزی اس طرح شہر بدر کی گئی کہ انگریزی تو رہے بڑے بڑے پرستاروں کو بھی ہندی اور ہندوستانی میں بولنے سے چارہ نہ رہا،

کانگرس، خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں میں ہر صوبہ کے نمایندوں کو ہفتہ ہفتہ اور مہینہ مہینہ سمٹ کر ہندوستان کے مختلف گوشوں میں جمع ہونا پڑتا اور دوسروں کی تقریریں سننی اور اپنی سنانی پڑیں، ہر صوبہ میں کانگرس و خلافت کی شاخوں میں کارکنوں کے اجتماع اور جلسوں میں، مجبوری یا شوق سے ایک ایک کو تقریریں کرنی پڑیں، جن میں غلطیوں پر ہنسی اڑائی جاتی تھی اسلئے مقرروں کو اپنی بول چال اور تقریروں میں احتیاط کی پوری کوشش کرنی پڑتی تھی، اسی تحریک کے اثر سے یہاں اخبارات نے جنم لیا، اور انہیں کے زیر سایہ رسالوں کی ولادت بھی عمل میں آئی،

اس طوفان کا دائرہ آہستہ آہستہ بڑھتا گیا، اور ان تک بھی پہنچ گیا جو اس باد سموم سے پوری حفاظت کے ساتھ بچا کر رکھے گئے تھے یعنی انگریزی اسکول، کالج، اب انگریزی خط و کتابت، اور تقریر و تحریر امتیاز کا نشان اور غرور کا سامان نہیں رہی اور لوگ اپنی دیسی زبان سے محبت کرنا سیکھنے لگے، مادری زبان کی تعلیم کا مطالبہ روز افزوں ہوا، اور یونیورسٹیوں کو بھی اس سخت مطالبہ کے آگے جھکنا پڑا، بلکہ خود صوبہ کی گورنمنٹ کو بھی بعض کشنریوں میں ہندوستانی رسم خط کو اس کی جگہ دینی پڑی، یہ معمولی سی مثال اس اصول فطرت کی ہے کہ ڈھونڈو تو پاؤگے اور کھٹکھٹاؤ تو کھولا جائیگا، ضرورت ہے کہ ہم اس اصول کو بار بار آزمائیں اور اس وقت تک دم نہ لیں جب تک ہندوستانی زبان اس ملک کی عام زبان اصولاً اور عملاً تسلیم نہ کر لی جائے،

اب یہ صوبہ اور بھی خالص ہو رہا ہے اور اونٹ کی گردن سے بلی کھولی جا رہی ہے، یعنی اڑیسہ بہار سے الگ ہو رہا ہے اور اب اس صوبہ میں صرف ایک زبان جس کا نام ہندوستانی ہے باقی رہ گئی ہے،

اب تو حق ہے کہ اس صوبہ کے باشندے یہ مطالبہ کریں کہ چونکہ اب اس صوبہ کی زبان خالص ہندوستانی ہے۔ اسلئے ضرورت ہے کہ حکومت اب اس کی تعلیم و اشاعت پر خاطر خواہ توجہ مبذول کرے۔

اس سلسلہ میں ہم کو غور کرنا ہے کہ اس کو صوبہ کی عام اور مقبول زبان بنانے کے لئے کیا کیا تدبیریں عمل میں لائی جائیں، سب
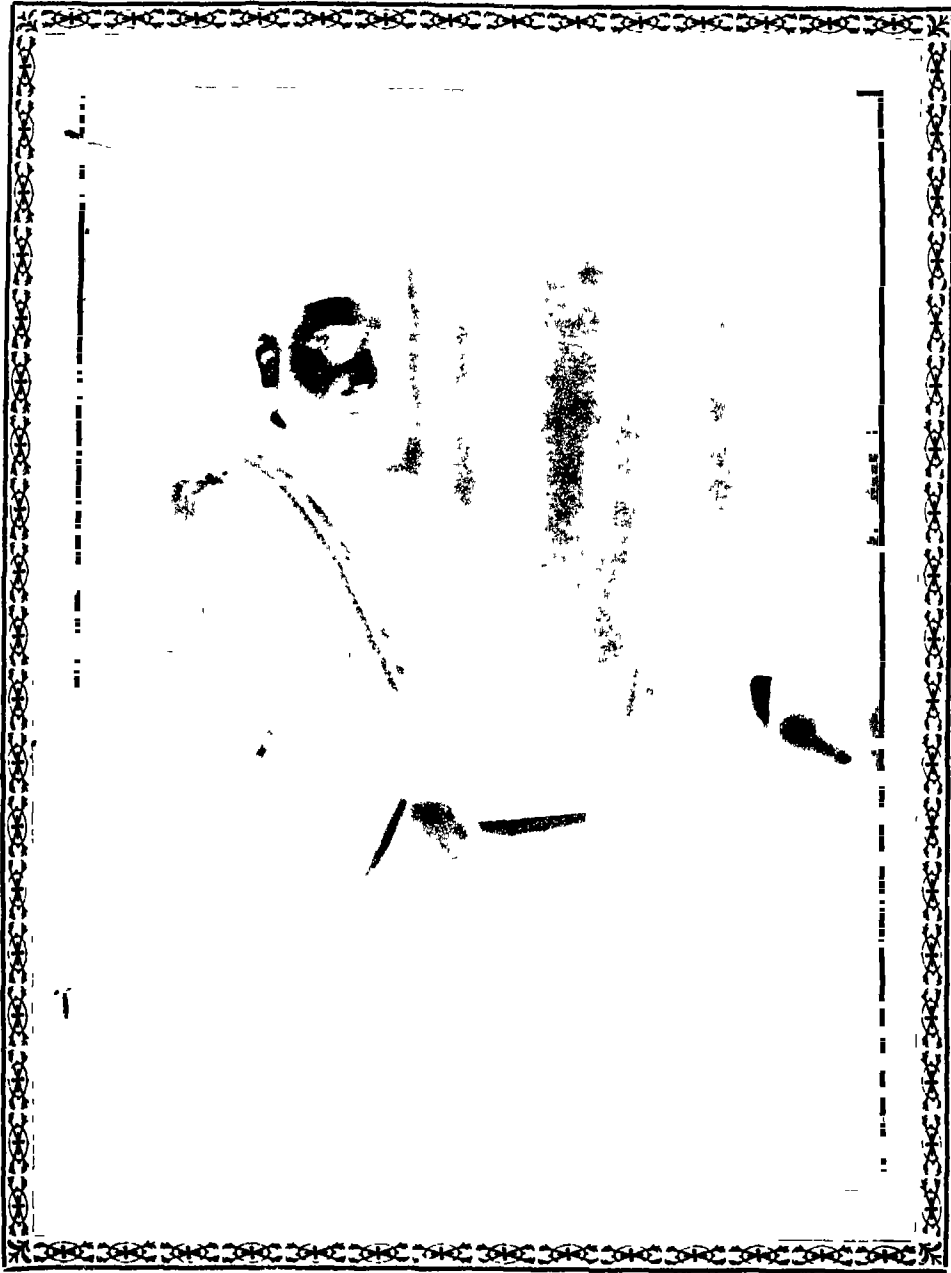
علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ۔

حسب ذیل صورتیں ذہن میں آتی ہیں'

۱۔ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے مکتبوں اور پاٹ شالوں میں اس کو مناسب جگہ دی جائے' اور اسلامی مکاتب گاؤں گاؤں کھولے جائیں' اور اس کے لئے دیہاتی رقبوں کے مسلمان خاص کوشش کریں'

۲۔ اسکولوں میں اس کی تعلیم باقاعدہ ہو' اور اس کے لئے اچھے معلم بہم پہنچائے جائیں'

کیا یہ سن کر آپ کو افسوس نہ ہوگا کہ پورے صوبہ میں انٹرنس میں اس کی .. ۵ جوابی کاپیاں بھی مشکل سے ہوں گی

۳۔ یونیورسٹی نے اردو کا اعلیٰ امتحان کھولا ہے' مگر اب تک اس کا معیار اور تعلیم بلند نہیں' یونیورسٹی کو مجبور کرنا چاہیے کہ اس کے لئے لایق پروفیسر مقرر کئے جائیں'

۴۔ یونیورسٹی اور گورنمنٹ کو مجبور کرنا چاہیے کہ اس زبان کی بہترین کتابوں پر سالانہ انعام دے۔

۵۔ وکیلوں اور مقدمہ بازوں کو چاہیے کہ ہندوستانی کے فارموں کو استعمال کریں اور اسی زبان و خط میں تحریریں داخل کریں

۶۔ صوبہ کے مشہور شہروں اور قصبوں میں اس زبان کے کتبخانے اور قرأت خانے (ریڈنگ روم) بکثرت قائم کئے جائیں۔

۷۔ ہر جگہ اخباروں اور رسالوں کے پڑھنے کے لئے چندہ سے دارالمطالعہ کھولے جائیں'

۸۔ مدرسوں' اسکولوں' اور کالجوں میں ہندوستانی زبان کی علمی و ادبی مجلسیں بنائی جائیں جن میں طالب علم ہندوستانی میں تحریریں لکھ کر سنائیں یا تقریریں کریں۔

۹۔ ہر سال صوبہ کے طالب علموں کا ایک مقابلہ کا جلسہ ہو' جس میں اس زبان کے سب سے اچھے بولنے والے کو انعام دیا جائے'

۱۰۔ صوبہ کی عام زبان میں جن غلطیوں کا علانیہ ارتکاب کیا جاتا ہے ان کی تصحیح کی جائے' اور اس پر رسالے لکھے جائیں' جو عام طالب علموں میں تقسیم کئے جائیں۔

۱۱۔ صوبہ میں اعلیٰ تصنیف و تالیف کے لئے خواہ دارالمصنفین کے طور پر یا ہندوستانی اکاڈیمی کے اصول پر ایک ادبی ادارہ قائم کیا جائے'

۱۲۔ ڈاکخانہ کے ہندوستانی فارم خصوصیت سے استعمال کئے جائیں' اسی طرح کچہریوں کے وہی فارم لئے جائیں جو ہندوستانی میں ہوں'

اسی کے اظہار میں ہم کو خوشی ہے کہ پچھلے پندرہ بیس برس کے عرصہ میں ہندوستانی نے اس صوبہ میں گو کمیت کے لحاظ سے

نہیں مگر کیفیت کے لحاظ سے خوش آیند ترقی کی ہے. غلطیاں کم ہو رہی ہیں' لہجہ بدل رہا ہے' نوجوانوں میں مضمون نگاری' شعر و سخن اور تقریر و خطابت کا چرچا ہے' قافلہ جب رخت سفر باندھ کر صبح کو روانہ ہو تو یہی وقت ہے کہ وہ اچھی طرح دیکھ لے کہ جس راہ پر وہ قدم رکھ رہا ہے وہ منزل مقصود تک سیدھی جاتی ہے یا نہیں' ہمارا موجودہ زمانہ ہمارے کاروان ادب کے لئے وہی وقت ہے۔

زبان کی صحت

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ہر قدم پر زبان کی صحت پر نظر رہے' اس کے لئے خاص کاوش کی جائے' اور تذکیر و تانیث' طریقہ جمع و تصحیح اسمار اور صحیح روزمرہ کا دھیان رہے اور بعض دوسرے صوبوں کی طرح اپنی غلطیوں پر ہٹ دھرمی نہ کی جائے' اس میں شک نہیں کہ بہار میں قدمار کے بہت سے پرانے لفظ بولے جاتے ہیں جو اب متروک ہیں اور ان میں لکھنؤ اور دہلی کی تقلید چنداں ضروری نہیں' لیکن ہمارے ہاں اصلی غلطی یہ ہے جو زیادہ تر دیہاتوں میں ہے کہ کسی ایک لفظ کی تذکیر و تانیث یکساں نہیں رہنے پاتی' ایک ہی فقرہ میں ایک لفظ ابھی مذکر استعمال ہوا' تو ابھی مونث ہو گیا' اگر پابندی کے ساتھ ایک لفظ کو مذکر یا مؤنث ہمیشہ یکساں بولا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس دیار کی زبان میں یہ لفظ مذکر یا مونث ہے جیسا کہ دلی اور لکھنؤ میں بہت سے لفظوں کی تذکیر و تانیث میں اختلافات ہیں' مگر یہ زبان کا عیب نہیں۔

شعر و سخن

کا عصر جدید ہمارے صوبہ میں بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اور بعض اچھے اچھے شاعر اس میدان میں کمال کا جوہر دکھا رہے ہیں' ہمارا بوڑھا لیکن ہمہ داں شاعر فضل حق آزاد ہمارے صوبہ میں اس عہد جدید کا بانی ہے' معاصرین میں تمنائے لوازی فنون سخنوری میں کامل ہیں' ڈاکٹر عظیم الدین کا تخیل بڑی وقعت رکھتا ہے' نجم گیلانی اگر توجہ کرتے تو شاعری کے آسمان میں ستارہ ہو کر چمکتے' رسا ہمدانی نے بھی طبع رسا پائی ہے' خود ہمارے دوست و رفیق درس انجم صاحب کسی سے کم نہیں' مگر کاروباری طبیعت نے ان کی شاعری کو بھی کاروباری بنا دیا ہے' یعنی مجبور ہوں گے تو کہیں گے ورنہ نہیں' نوجوانوں میں رضی عظیم آبادی' صبا' رشیدی' نجم ندوی وغیرہ ابھر رہے ہیں' مقصود ناموں کا گنانا نہیں' بلکہ یہ دکھانا ہے کہ طبیعتیں آمادہ ترقی ہیں' رضی صاحب کو اگر خدا نے موقع دیا تو وہ شاعر فطرت ہوں گے'

ضرورت یہ ہے کہ ہمارے نوجوان شعرا ان بے راہیوں سے بچیں جن میں اس عہد کے دوسرے صوبوں کے نوجوان شعرا مبتلا ہیں' ایک یہ کہ کلام کی اشاعت میں جلد بازی اور عجلت سے پرہیز کریں اور بار بار کی نظر سے جب تک صحت لفظی و معنوی کا یقین نہ ہو جائے' اس کو منظر عام میں پیش نہ کریں' ہو سکے تو اپنے عہد کے ممتاز شعرا سے اصول فن کے نکتے سیکھیں' فن سے جہالت نوجوانوں کی عادت بن رہی ہے' سطحی اور عریاں جذبات کے اظہار میں شرافت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے'

فارسی ترکیبوں کا استعمال اعتدال کی حد سے زیادہ نہ ہو' پھر یہ لحاظ رہے کہ جو نئی ترکیبیں پیدا کی جائیں وہ فارسی کے محاورہ کے مطابق صحیح بھی ہوں' آجکل کے نوجوان شعرا جو لفظی شان و شکوہ کے طالب ہیں' فارسی کا صحیح علم نہ رکھنے کے سبب سے ایسی

ترکیبیں ایجاد کرتے ہیں جن کو سن کر علم و دانش کے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے،

خوشی ہے کہ صوبہ میں مضمون نگاروں کی تعداد کم نہیں مگر یہ دیکھ کر رنج ہوتا ہے کہ ان کی تعداد اسی وبائے عام میں مبتلا ہے جس میں دوسرے صوبوں کے نوجوان اہل قلم مبتلا ہیں، سطحی باتیں، پست خیالات، تفریحی مشاغل، بیہودہ مباحث، نصب العین سے دور، "ادب لطیف" سے مبرا اور ادب عالی سے معرا، سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہمارے کچھ بنیادی اور اصولی خیالات ہوں، جن کو عمدہ اور دلچسپ پیرایوں میں معلومات سے مدلل اور واقعات سے مبرہن کر کے پیش کیا کریں، ہر تحریر سبق آموز اور ہر بیان دماغ افروز ہو، جس کے پڑھنے سے ناظرین کے علم میں اضافہ، دانش میں ترقی اور خیال میں وسعت پیدا ہو، صوبہ میں اس حیثیت سے پروفیسر محفوظ الحق، پروفیسر نجیب اشرف، ڈپٹی ولی الرحمن وغیرہ ہر حیثیت سے مغتنم ہستیاں ہیں اور ان سے مستقبل کو بڑے بڑے توقعات ہیں، عبدالملک صاحب آروی بھی اس فہرست میں ہیں، بشرطیکہ ان کو ان کے حوصلے کے مطابق مناسب فضا مل سکے، نوجوان علما میں سید محمد طٰہٰ اشرف (امتفوا گیا) مسعود عالم ندوی اور محمد ناظم ندوی اور دوسرے ندوی وغیرہ مستقبل میں چمکیں گے،

لیکن نظر آتا ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں دوسرے صوبوں کے ان شاعروں اور نثاروں کی تقلید کا عیب پیدا ہو رہا ہے جن کو عوام کے طبقہ سے واہ واہ کی داد مل جاتی ہے، ہمارے شاعر ان گویّے شاعروں کی تقلید میں ہیں جو جگہ جگہ گا گا کر اپنے نام و نمود کی بھیک مانگتے پھرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ موسیقی کے جادو سے اپنے کلام کا عیب دوسروں پر ظاہر نہ ہونے دیں، ہمارے نثار ان بےمقصد نثر نویسوں کی نقالی میں لگے ہیں جن کی تحریریں نوجوانوں کی محفل میں شور تحسین برپا کرتی ہیں، زندگی اور زندگی کے مشکلات واقعہ ہیں، ان واقعات کی تلخی کو نہ لفظی شراب اور نہ معنوی شراب کے نشہ سے فراموش کیا جا سکتا ہے بہادر وہ ہیں جو واقعہ کو واقعہ سمجھ کر اوس کا مقابلہ کرتے ہیں، اور کامیاب ہوتے ہیں، وہ نہیں جو ان کو بھلا کر غم غلط کرنا چاہتے ہیں،

اوپر کی سطروں میں جو کچھ کہا گیا ہے ممکن ہے کہ ہمارے نوجوان ادیب و صاحب قلم و شاعر اس کو سن کر برا مانیں لیکن چونکہ جو کچھ لکھا گیا ہے خلوص سے لکھا گیا ہے اس لئے امید ہے کہ "جوانان سعادتمند" حافظ کی طرح راقم کو بھی معاف فرما کر "پند پیرا" پر توجہ فرمائیں گے۔

خیالاتِ آزاد

از حضرت علامہ سید فضل حق آزاد عظیم آبادی مدظلہ

شاعر کی تصویر

جس نام سے ہے شہرتِ عام شاعر — اس نام سے ہے بقائے نامِ شاعر
بیکار ہے تصویرِ سخنور کی تلاش — شاعر کی شبیہ ہے کلامِ شاعر

~~~

جب نطق سے محروم رہی کیا ہوتی — بے ناطقہ بیزبان رسوا ہوتی
آزاد ہم اس کی تو پرستش کرتے — تصویر بھی شاعر کی جو گویا ہوتی

بہت کہتے ہیں لکھئے ان کو پوچھے کوئی کیا لکھئے — گزشتہ ماجرا شرحِ جفا شکرِ وفا لکھئے
اگر شاباش لکھئے قیس کو بیدادِ لیلےٰ پر — تو مرگِ سرشکن پرکوہکن کو مرحبا لکھئے
قصائد سے اگر ہو طبعِ اقدس کو نہ دلچسپی — جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کو مرثیہ لکھئے
روانی طبع کی بادِ صبا سے کم نہیں ہرگز — صبا لکھئے اگر اسکو قلم کو بادِ پا لکھئے
مریضِ جاں بلب لکھئے اگر دردِ آشنا دل کو — مسیحا موت کو اور درد کو دل کی دوا لکھئے
بزرگوں سے اگر ملیے تو چشمِ آرزو بن کر — اور اس تقریب سے خاکِ قدم کو طوطیا لکھئے
بری ہو احتمالِ کذب سے ہرگز نہ پر بیتی — جو لکھئے آپ بیتی کیونکر اسکو برملا لکھئے
کس و ناکس کو اپنے حال سے کیوں کیجیے واقف — جو اس کے اہل ہیں خود مبتلا ہیں انکو کیا لکھئے
خموش آزاد نطقِ بے اثر سے خامشی اچھی
نہ اپنا مدعا کہئے نہ اپنا مدعا لکھئے
~~~

ادیب الملک نواب محمد نصیر حسین خاں خیال عظیم آبادی مرحوم

(۸)

رانچی – ۷ مئی ۱۹۳۴ء

عزیز المکرم – سخت انتظار کے بعد کل آپکا پوسٹ کارڈ، مورخہ ۲ مئی، ملا جس سے معلوم ہوا کہ آپ دو اپیلیں اور خط بھیج چکے ہیں مگر اب تک نہ وہ اپیلیں ملیں اور نہ خط! اور وہ خط بھی مجھ تک نہ پہونچا جو ڈاک پر روانہ کیا گیا۔ کشمیر کے مندیے متعلق غالباً اسی خط میں آپ نے کچھ تحریر کیا تھا۔ وہ خط ملتا تو اُسے پڑھ کر آپکو جواب لکھتا۔ اس کارڈ سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ ما نیا آپکو کچھ مجبوریاں ہیں۔ میں صرف اتنا عرض کرونگا کہ آدمی کو چانس ہمیشہ نہیں ملتا۔ اسوقت اتفاق سے کشمیر میں آپ کے لئے وہ موقعے نکل سکتے ہیں جو آئندہ سخت کد وکاوش کے بعد بھی پیدا نہیں ہو سکتے۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ میں اسوقت خالی ہوں اور آپ کی خدمت پر آمادہ۔ اس لئے میں گزارش کرونگا کہ اپنے فیصلہ پر آپ پھر غور کریں اور اس موقعہ (چانس) سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ کشمیر میں نہ .... زیادہ رہیں گے اور نہ دنیا مجھے آئندہ اتنی مہلت دے گی کہ آپ کے ستہ بے ریا مہربان کی خدمت کر سکوں۔ مجھے واقعی ولولہ ہے کہ خدا کا نام لے کر یہ سفر کیا جائے۔ اللہ ضرور برکت دے گا۔ غور کیجئے اور بسم اللہ کیجئے اور فوراً مجھے خبر دیجئے۔

ہمارے منسٹر صاحب اس کام کی طرف زیادہ راغب و مخاطب نظر نہیں آتے۔ اس لئے اب میں جلد یہاں سے رخصت ہونا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنے وطن 'بہار' کو ۳۴ برس قبل سلام کیا تھا۔ کلکتہ کے قیام نے اُسوقت اتنا سمجھا دیا تھا کہ بہار انسان پرور نہیں ہے اور وہ اپنوں سے زیادہ غیروں کا ساتھی ہے۔ ۱۹۱۲ء میں صوبہ الگ ہوا۔ اس کے بعد بعض شناسی کیلئے میں عظیم آباد گیا اور وہاں ایک سال رہا۔ اُس دفعہ زیادہ تلخ تجربہ ہوا اور اچھی طرح سمجھ میں آگیا کہ بہار کیا ہے؟ کلکتہ واپس آیا اور پھر وطن جانے کی جرأت نہ کر سکا۔ اب آپ کی ملاقات اور ہمت افزائی نے وطن کی یاد تازہ کر دی تھی اور اس لئے رانچی آیا۔ مگر دیکھتا ہوں، کہ یہ صوبہ ۵۰ سال پہلے جہاں تھا الحمد للہ اب تک وہیں ہے۔ اپنی جگہ سے ایک انچ نہ سرکا! اور نہ اُسکے ہٹنے کی آگے امید ہے

میں اب دنیا میں ایک 'خالی' آدمی ہوں۔ مجھ سے کام لیا جا سکتا ہے۔ مگر جبکہ بازار مندہ ہو تو کیا کیا جائے؟ ہاں اگر آپ کشمیر جا سکتے اور جلدی اسکیم کے مطابق وہاں کچھ ہو جاتا تو آپ کی معیت میں، میں دکھا دیتا کہ ایک 'آدمی' کیا کر سکتا ہے۔ اس لئے یہ دلی آرزو ہے کہ کسی طرح آپ وہاں جلد سے جلد جاتے اور ہم لوگ کچھ کام کر آتے۔

میں ایمانداری سے کہتا ہوں کہ رسالوں میں مضامین شائع کرانے کا مجھے شوق نہیں ہے۔ بلکہ ایک مدت سے مجھے اس سے نفرت ہے۔ میں اسے مشاعروں کی بے نتیجہ واہ واہ اور مجلسوں کی وقتی آہ آہ سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ ہمارا ملک؛ خصوصاً ہمارا صوبہ اس قابل نہیں ہے کہ یہاں کوئی حقیقی کام کیا جائے اور اسکا پھل بھی مل سکے۔ 'مغل اور اردو' نے ہمارے اس عقیدہ کو اور مضبوط کر دیا۔ بہار نے اس سے جو سرد مہری برتی وہ تو تعجب خیز نہیں۔ مگر اور جگہ کے حضرات نے جس طرح اسکا خیر مقدم کیا وہ افسوسناک ہے۔ کتاب خریدی، شاید اسے پڑھا بھی۔ اس لئے کہ اسپر ریویو بھی نکلے۔ لیکن میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا مفہوم و مطلب سو میں دو نے بھی نہ سمجھا۔ ایسی حالت میں کوئی باحواس 'فضول کیوں اپنا دماغ و وقت اُن لوگوں کے لئے برباد کریگا جو نہ دماغ لائے ہیں اور نہ دل؟ ندیم آپنے شائع کیا۔ کیا پھل پایا؟۔ ایسا پرچہ کسی اور جگہ اگر نکلتا تو آپ دیکھتے کہ کیا ہوتا۔ کل ہی لاہور سے ایک خط آیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ وہاں کے رسالہ 'ادبی دنیا' کی پانسو جلدیں ماہانہ پنجاب گورنمنٹ نے خریدنا منظور کی ہیں جو وہاں کے اسکولوں کو دی جائیں گی۔ حالانکہ اُس رسالہ نے کبھی نہ کسی منسٹر صاحب کی مدح سرائی کی اور نہ کسی وائس چینسلر کی اور نہ انکی تصویریں شائع کیں! 'ندیم' کے لئے بہار نے اب تک کیا کیا؟ اسکا جواب ملنا چاہیے۔ میں نے جس مضمون کا 'ندیم' کے لئے وعدہ کیا ہے۔ کلکتہ سے بھیجدونگا۔ لیکن پھر عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ بادلِ ناخواستہ ہوگا۔ محض آپکی محبت سے مجبور ہو کر؛ ورنہ میں اپنی کسی تحریر کو رسالہ کے ذریعہ سے شائع کرنا فضول سمجھتا ہوں۔

امید ہے کہ 'تبصرہ بر شاہنامہ' آپ نے کلکتہ سے منگوا لیا ہوگا۔ اُسے بہ غور پڑھئے اور اُس کے 'ماحصل' کو دوسروں تک پہونچا دیجئے۔ یہ ایک انقلاب پیدا کرنے والا بیان ہے۔ اسے اگر آپ کتابی صورت میں شائع کرنا چاہیں تو میں اسپر نظر ثانی کر جاؤں۔ پروفیسر طاہر کی کتاب 'دشت' پر ہمارا ریویو اس قابل ہے کہ آپکی نظر سے بھی گذر جائے۔ طاہر صاحب سے طلب کر لیجئے۔

کپتان (وحید) صاحب، خواجہ منوپسل صاحب اور حبیب صاحب کو سلام و نیاز۔ امیدوار ہوں کہ یہ حضرات کچھ ایسا عمل پڑھیں کہ پھلگو ندی کے پشتہ پر پھر گنگھٹا ہو اور چند دن مزے میں گذر جائیں۔ آپنے اپنی مختصر ملاقات میں بہت کچھ مجھے عنایت کیا۔ ان میں 'نجم' کا سا تحفہ بھی ہے۔ آپکا یہ احسان نہ بھولونگا کہ آپکی توجہ سے ایک 'انسان' مجھے ملا۔ خدا اس 'آدمی' کو تا دیر سلامت

وباکرامت رکھے۔ آمین! جواب بہت جلد عنائت کیجئے۔

والسلام مع الاکرام

خیال

(۱)

کلکتہ۔ ۱۱ اگست ۳۴ء

عزیز الکرم۔ میں منتظر ہی تھا۔ یہ خط کل ملا۔ مضمون کے لیے شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ مجھے آپکا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ ہماری زبان کا دکھڑا اوزرنگ کی زبان سے سنایا گیا۔ اُسپر نوٹ تو قابل تعریف ہے' مگر ایسے الفاظ ہیں کہ ہماری طرف شبہ ہو سکتا ہے۔ اور نوٹ بھی مزے کے ہیں۔ اس دفعہ کا پرچہ اچھا ہے۔ رضی کی اُلٹی آنتوں نے پیٹ میں بل ڈال دیے 'جلوۂ سوز' کی زبان میں ایک کُن ہے۔ سوز اگر واقعی خالص بہاری ہیں تو میری طرف سے انھیں مبارکباد دیدیجئے۔ 'برسات' بھی مزے کی ہے۔ یہ کاکو والے غضب کے ہیں۔ 'رشیق و شرق' پر لکھنے والے صاحب اگر کچھ زیادہ کہتے تو لطف بڑھتا۔ 'سامرہ' کے متعلق نئی تحقیقات نے اُس مقام کی متعلق بدل دی ہے اور ۱۹۲۷ء کی وہاں کی کھدائی نے تاریخ کا ایک نیا باب کھول دیا ہے۔ مگر ان بیچارے مولویں کو ان باتوں کی کیا خبر۔ اور پھر تاریخ سے انہیں کیا واسطہ۔ یہ حضرات اپنے دائرے کے اندر رہیں تو بہتر ورنہ پکڑے جائیں گے۔

آپ کے مقدمہ نے مجھے بھی پریشان کر دیا ہے۔ خدا ہماری آپکی اس پریشانی کو جلد دور کرے . . . . معلوم ہمارے بہاریوں نے اپنی زبان کا ذکر کن تیوروں سے سنا۔ خط لکھا کیجئے اور کیا لکھوں

والسلام۔

خیال

اظہارِ حقیقت

از علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب عظیم آبادی - پی - ایچ - ڈی

خوشی سے مجھکو کیا حاصل کہ لذت یابِ حسرت ہوں
طرب کی مجکو کیا پروا کہ میں محرومِ عشرت ہوں

میں اک تصویر ہوں گویا زبانِ بیزبانی کی
نہ میں منت کشِ نالہ نہ مرہونِ سماعت ہوں

میں نے ہوں اور نیستاں ہوں اسکا کاٹنے والا
میں اپنے درد کی تاثیر ہوں اپنی شکایت ہوں

نہ میں گنجینۂ قاروں نہ میں جم کا دفینہ ہوں
نہ ہو جس کو فنا ایسا خزانہ ایسی دولت ہوں

میں ہوں وہ مست جس کا ایک جرعہ زمزم و کوثر
میں اس تکوین کے خمخانے میں صہبائے وحدت ہوں

مجھے ظاہر کی کیا پروا میں ہوں مستِ مئے باطن
صنم خانے میں اور میخانے میں محوِ عبادت ہوں

علو کے راز اسرارِ تنزل مجھ میں پنہاں ہیں
میں اپنی آپ عزت ہوں میں اپنی آپ ذلت ہوں

میں ہوں وہ آئینہ ہے عکسِ عرش و لامکاں جسمیں
میں ہوں بینائی چشمِ حقیقت محوِ حیرت ہوں

میں گو اک فرد ہوں پر نوع ہوں اور سارا عالم ہوں
میں خود دیر و حرم ہوں میں ہی دوزخ اور جنت ہوں

میں وہ ہوں جو ہو سب کے ساتھ پھر سب سے الگ ٹھہرے
مجازِ عالمِ ہستی ہوں اور اس کی حقیقت ہوں

حقیقت کے کرشموں سے جو دل مجبور ہوتا ہے
تو پھر کہہ کر "انا الحق" دار پر منصور ہوتا ہے

علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد پی - ایچ - ڈی - پروفیسر پٹنہ کالج -

SPECIAL PRESS CAL

رازِ حیات

(از جناب سیّد نجم الہدیٰ صاحب بی، اے، بی، ال نجمؔ گیلانی)

مولوی سیّد نجم الہدیٰ صاحب نجمؔ گیلانی وکیل پٹنہ کا نام محتاج تعارف نہیں ان کی یہ نظم بہت دیر کے بعد پہنچی اسلئے "نظرات" میں اس نظم پر تبصرہ نہ ہو سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ایسی بلند پایہ نظم ہے جو محتاج ستایش نہیں اس کا ہر شعر فلسفۂ حیات کی مکمل تفسیر ہے یہ نظم اس قابل ہے کہ اس کو بار بار پڑھا جائے اور اس کے درس کو ہمیشہ کے لئے دماغ میں محفوظ رکھا جائے۔ نجمؔ گیلانی صاحب نے یہ نظم بستر علالت پر لکھی ہے۔ افسوس ہے کہ مہینوں کی علالت کی وجہ سے وہ ندیم کے "بہار نمبر" کیلئے کوئی علمی اور ادبی مضمون نہ لکھ سکے۔ زیادہ افسوس اس امر کا ہے کہ بار بار کے تقاضہ کے باوجود انہوں نے اپنی تصویر سے ندیم کو محروم رکھا ہم ان کی اس "گوشۂ گمنامی" میں پڑے رہنے کی پالیسی کو کسی طرح پسند نہیں کرتے

(ادارہ)

رو رو کر جاں سے گذر جانا، سکھلایا اُلفت والوں نے
میداں میں لڑ کر مر جانا، بتلایا ہمت والوں نے

انساں زندہ مر جاتا ہے، اور مر کے بھی زندہ رہتا ہے
جاں دیکر درسِ حیات دیا، عشق اور محبت والوں نے

زندہ رہنا مرنا ہے، اور مر جانا زندہ رہنا ہے
یہ رازِ ہستی دنیا کو، سمجھایا حکمت والوں نے

جینے کا خیال خام کیا، انکارِ بقائے دوام کیا،

اُلفت کو بھی بدنام کیا، اِن جھوٹی اُلفت والوں نے
ہنگامی لذّت کی دھن میں، سرمایۂ عشرت کو کھویا
اِن نیچی فطرت والوں نے، اِن پست طبیعت والوں نے
دل وہ آئینۂ ہستی ہے، جس پر ہوتی ہے جِلا غم سے
حُسنِ فطرت کا لطف اٹھایا، رنج و مصیبت والوں نے
پیکارِ حیات کی شدّت میں، کمزور فنا ہو جاتا ہے
دُنیا میں زندہ رہنے کا حق پایا طاقت والوں نے
حُسنِ فطرت پنہاں تھا مگر، چمکایا اُس کو مشقت نے
قدرت کی جلوہ نمائی کی، دُنیا میں محنت والوں نے
محکوم کو کیا معلوم کہ جامِ ہستی میں کیا لذت ہے
اِس مئے کا لطف اُٹھایا دولت اور حکومت والوں نے
دولت کا اکٹھا ہو جانا، افلاسِ عام کا باعث ہے
گھر گھر غربت پھیلائی ہے، دُنیا میں دولت والوں نے
کب ہوش و خرد والوں سے ہوا وہ کام جو مدہوشوں نے کیا
دیوانوں نے مستانوں نے اور اُلفت کے متوالوں نے

سیّد غلام حسین خاں مُصنفِ سیر المتاخرین

(صُوبہ بہار کا ایک نامور مؤرخ)

از مولانا سید ریاست علی صاحب ندوی رفیق دار المصنفین

سیّد غلام حسین ہندوستان کی مشہور تاریخ "سیر المتاخرین" کا مصنف ہے۔ یہ کتاب ہندوستان کے عہد اسلامی کے اخیر دور کی ایک اہم دستاویز ہے۔ تاریخ ہند الیٹ میں ہے :-

"مصنف ایسی آزادی، صفائی اور زورِ کلام کے ساتھ سادہ طرزِ تحریر میں اظہارِ خیال کرتا ہے جو ایشیائی مورخین میں مفقود ہے اور اسلئے مسلمان مورخین میں اس کا ایک ممتاز درجہ ہو سکتا ہے۔ جنرل برگس کے بقول یہ کتاب بھی یادداشتوں کے طور پر لکھی گئی ہے۔ اور یہی انداز تاریخ نویسی کے لئے مفید اور بہتر ہے۔ اگر وہ چند خصوصیات نظر انداز کر دئے جائیں جو مسلمان مورخین کے ساتھ وابستہ رہے ہیں تو پھر یہ کتاب یورپ کی تاریخی یادداشتوں سے کسی لحاظ سے کم نہیں۔ اگر یہ کتاب لارڈ کلیرنڈن اور بشپ برنٹ کے ناموں سے منسوب کر دی جائے تو ایسی تصنیف ان کے ناموں کے لئے ناموزوں نہ ہوگی ... . . . ـــــــ اس تصنیف سے انگریز اچھی طرح واقف ہیں۔ کیونکہ مل نے اپنی تاریخ ہندوستان میں جا بجا اس سے اقتباسات نقل کئے ہیں۔ اور یہ غلام حسین ہی ایک ایسا مسلمان مورخ ہے جس سے میکالے نے اقتباسات لیکر اس کی بڑی تعریف و توصیف کی ہے۔" (ج ۸ ص ۱۹۵)

سید غلام حسین کا خاندان سادات کے بہت سے خانوادوں کی طرح مغرب سے ہجرت کر کے مشرق آیا اور اس نے مرشدآباد میں عارضی قیام کے بعد عظیم آباد میں مستقل توطن اختیار کیا۔ پھر جس طرح صوبہ بہار میں جس خانوادہ کو جہاں جاگیر ملی وہیں اس نے طرح اقامت ڈالدی۔ اُسی طرح غلام حسین کا خاندان بھی چپلا میں ایک قصبہ حسین آباد کی بنا ڈال کر توطن پذیر ہو گیا۔

غلام حسین کی کتاب سیر المتاخرین کے متعلق جنرل برگس کا مقولہ اوپر گذرا کہ یہ کتاب در اصل بھی یادداشتوں کے طور پر لکھی گئی ہے۔ اور حسن اتفاق کہ اس کتاب کا یہی پہلو ہمارے لئے اس کے مصنف سے روشناس ہونیکا ذریعہ بنا۔ اگرچہ اس عہد کی حکومت سے مصنف اور اس کے

خاندان کے جو گوناگوں تعلقات تھے ان کا بھی اقتضا یہ تھا کہ وہ حالات اس تاریخ میں جگہ پاتے۔ تاہم اگر مصنف نجی یادداشتوں کے طور پر کہیں کہیں غم کے سفر، آمد و رفت، اور بعض دوسرے کوائف کے اشارات نہ کرتا جاتا تو ہم بڑی حد تک مصنف کے ذاتی و خاندانی حالات سے لاعلم رہتے۔ یہ حالات تقریباً ساری کتاب میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ذیل کی سطروں میں انہی بکھرے ہوئے معلومات میں سلسلہ و ربط قائم کرکے انہیں یکجا پیش کرنا ہے۔ اور آخر میں اس کی کتاب پر ایک مختصر گفتگو کرنی ہے:-

خاندان غلام حسین کا دادہالی خاندان حسنی سادات میں۔ اور ننہالی موسوی سادات میں تھا۔ اس کے اجداد میں سید ابراہیم معروف بہ طباطبا، شہرت رکھتے ہیں۔ اس نسبت سے غلام حسین طباطبائی مشہور ہوا۔ اور ننہالی خاندان میں سید احمد بن موسیٰ بن جعفر معروف بہ شاہ چراغ شیراز میں قیام فرماتے۔ اس کے بعض اجداد مدینہ منورہ سے مشہد اقدس آئے اور وہاں سے وارد ہند ہوئے۔ اور دہلی میں سکونت اختیار کی۔ اس کے دادہالی و ننہالی خاندانوں میں پہلے سے باہمی قرابتیں تھیں۔ دادا کا نام سید علیم اللہ طباطبائی اور نانا کا نام سید زین العابدین تھا۔ (سیر المتاخرین ص ۵۲۲، ۹۴۸ مطبوعہ ۱۸۹۶ء مطبع نولکشور)

سید علیم اللہ طباطبائی غلام حسین نے اپنے دادا سید علیم اللہ طباطبائی کو برگزیدہ بزرگوں میں لکھا ہے اور ان کے احوال و کرامات کا ذکر کیا ہے۔ یہ ابتداً اعظم شاہ کی فوج میں کسی اعلیٰ عہدہ پر تھے۔ پھر ترک دنیا کرکے روپوش ہوئے پھر بیس سال کے بعد اہل و عیال سے آ کر ملے اور عظیم آباد میں اپنے صاحبزادے سید ہدایت علی خاں کے گھر میں گوشہ نشین ہو گئے۔ اور یہیں ۱۱۵۵ھ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

غلام حسین نے ان کی منقبت میں ایک مثنوی بشارۃ الامامہ لکھی تھی۔ اور سیر المتاخرین میں ان کے حالات کے لئے اسی کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت کی ہے۔ شاد مرحوم عظیم آبادی کی نظر سے وہ مثنوی گذری تھی۔ انہوں نے ایک سلسلہ میں اپنی کتاب حیات فریاد میں اس سے اخذ کرکے ان کے حالات لکھے ہیں اور اس کا خلاصہ درج کیا ہے۔ (سیر المتاخرین ص ۵۲۲، ۶۱۳، و حیات فریاد ص ۲۹ تا ۳۷)

سید زین العابدین غلام حسین کے نانا سید زین العابدین بھی اعظم شاہ کی فوج میں تھے۔ یہ صوبہ بنگال و بہار کے مشہور حکمراں محمد علی وردی خاں مہابت جنگ کے چچازاد بھائی تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی چھوٹی لڑکی کی شادی سید ہدایت علی پسر سید علیم اللہ طباطبائی سے ہوئی۔

ہجرت سید زین العابدین کے انتقال کے بعد اس خاندان کا سرپرست مرزا محمد علی تھا جو بعد میں محمد علی وردی خاں مہابت جنگ بنا اور شجاع الدولہ کے ساتھ بنگال آیا۔ اور اسے یہاں عروج حاصل ہوا تو یہ خاندان بھی ہجرت کرکے مرشد آباد چلا آیا۔ چنانچہ غلام حسین کی نانی نے بھی اپنے سکونتی مکان واقع دہلی کو فروخت کیا اور اپنے بال بچوں کو لیکر مع اپنے دونوں دامادوں کے مرشد آباد چلی آئیں۔ بعض بیانات کے مطابق ان کے مرشد آباد آنے کا زمانہ تقریباً ۱۱۴۵ھ قرار پاتا ہے۔

ورود عظیم آباد

پھر تھوڑے ہی دنوں کے بعد علی وردی خاں صوبۂ عظیم آباد (یعنی صوبۂ بہار) کی نظامت (گورنری) پر سرفراز کیا گیا۔ اور سید ہدایت علی اہل و عیال بچوں کے ساتھ اس کی رفاقت میں عظیم آباد چلے آئے۔ اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ چنانچہ غلام حسین لکھتا ہے :۔

"والد مرحوم برفاقت او در بلدۂ مذکور (عظیم آباد) رسیدہ توطن گذید از آں زمانے الی الآن کہ سال ۱۱۹۵ء است درین مکان ایزد تعالیٰ بکام و آرام و بعزت و احتشام نگہداشتہ بیوت مملوکہ و محالات و التمغا بقدر قسمت کہ در ظاہر بسبب غفران پناہ مہابت جنگ میسر آمدہ در قبضۂ تصرف و اوقات در گذرست" (ص ۴۸۹)

سید ہدایت علی خاں

غلام حسین کے والد سید ہدایت علی خاں نے اس خاندان میں نمایاں امتیاز حاصل کیا۔ ان کا نام ہندوستان کی تاریخ میں اس وقت سے آتا ہے جب محمد علی وردی خاں مہابت جنگ نے شجاع الدولہ کے مرنے کے بعد محمد شاہ بادشاہ کے حضور سے بنگالہ و بہار کی صوبہ داری کا پروانہ حاصل کیا۔ اور بہار پر قبضہ جما کر مرشد آباد کا رخ کیا۔ مہابت جنگ نے اسی وقت اپنے نوجوان داماد نواب زین الدین احمد خاں (ہیبت جنگ) کو صوبۂ بہار کی نیابت دی اور اپنے بھانجے داماد سید ہدایت علی خاں (اسد جنگ) کو اس کا مشیر بنایا۔ وہ اس وقت پرگنہ سرس و کٹنبہ وغیرہ کے فوجدار تھے۔ ہیبت جنگ نے انہیں بخشی گری کا عہدہ عطا کر کے اپنی فوج ان کے سپرد کر دی اور تمام امور مملکت میں ان کے مشیر و معاون رہے۔

سید ہدایت علی خاں کا گیا سے خاص تعلق رہا ہے۔ یہاں کے مختلف پرگنے سنوت، ٹکاری، سرس، کٹنبہ، چرکانواں، رام گڈھ اور چترا وغیرہ ان کے انتظام اور فوجداری میں تھے۔ اور یہاں کے ہندو راجاؤں راجہ سندر سنگھ اور راجہ بیکش رائے وغیرہ پر ان کے گہرے اثرات تھے۔ نیز بھوجپوری زمینداران کے بجد مطیع تھے۔ ان میں زمینداروں کو مطیع کرنے کا خاص سلیقہ تھا۔ اس لئے عہدۂ بخشی گری اپنے چھوٹے بھائی سید مہدی نثار خاں کے سپرد کر کے وہ پھر ان علاقوں کے زیر کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ زمانہ حال کے ضلع وار تفصیل کے لحاظ سے یوں سمجھئے کہ اضلاع شاہ آباد، آرہ، گیا، ہزاری باغ اور پلاموں کا بیشتر علاقہ انہی کی فوجداری میں تھا۔ ان علاقوں کو انہوں نے اس طرح سر کیا کہ یہاں کے ہندو زمینداران کا کلمہ پڑھنے لگے۔ اور ہیبت جنگ ان علاقوں کے ہر چھوٹے بڑے مرحلہ میں ان کا دست نگر بن گیا۔

اس کے بعد سید ہدایت علی کے مختصر سوانح حیات یہ ہیں کہ وہ اضلاع گیا و ہزاری باغ کی فوجداری پر معین تھے کہ انہیں قلعہ چترا میں مرہٹوں کی آمد کی اطلاع ملی۔ انہوں نے اس کی اطلاع حکومت کو بھیجی۔ اور وہ وہاں کی ہدایت کے مطابق عظیم آباد چلے آئے۔ پھر مہابت جنگ نے بھاسکر پنڈت کی سرکردگی میں مرہٹوں کی آمد کے بعد ہیبت جنگ کو اپنی مدد کے لئے بلایا۔ اور سید ہدایت علی کو قائم مقام والی بہار بنایا۔ اس طرح وہ صوبہ بہار کی نظامت و صوبہ داری پر فائز ہوئے۔

لیکن ان کی یہی ترقی صوبہ بہار سے ان کی بے تعلقی کا ذریعہ بن گئی۔ مہابت جنگ نے مرکزی حکومت دہلی سے مرہٹوں کے

مقابلہ کے لئے مدد طلب کی وہاں کے ایما اور مہابت کے مشورہ سے صفدر جنگ صوبہ دار اودھ فوج لیکر آیا۔ ہدایت علی نے اس کی پذیرائی کی۔ لیکن صفدر جنگ سے بعض ایسی نازیبا خفیف حرکتیں سرزد ہوئیں کہ مہابت جنگ وہیبت جنگ نے اسے عظیم آباد ہی سے واپس کرا دیا۔ اور اس سلسلہ میں مخبروں نے ہدایت علی کے متعلق بھی بعض افواہیں پہنچائیں۔ اس لئے اسے بھی صوبہ داری سے معزول کرا دیا گیا۔ لیکن عجیب اتفاق کہ انہی دنوں بالاجی راؤ کی یورش صوبہ بہار پر ہوئی اور اس نے داؤ دنگر (گیا) پہونچکر اسے تباہ وبرباد کر دیا۔ اور قریب تھا کہ عظیم آباد پہونچے جو ان دنوں فوج سے خالی تھا۔ مگر ہدایت علی نے اپنے معزول ہونے کا کوئی خیال نہیں کیا۔ اور محض ان کی خوش تدبیری سے وہ گیا، ٹاہنور، بہار مونگیر اور بھاگلپور کو تباہ کرتا ہوا بالا بالا نکل گیا۔ لیکن اس کارکردگی کے باوجود ہیبت جنگ کا دل ان کی طرف سے صاف نہیں ہوا۔ وہ مرشد آباد سے سیدھے ان کے زیر اثر علاقہ میں آیا اور سنوت، ٹکاری، کٹنہ، چرگانواں، شہر گھاٹی اور کوٹھی گندہ گیا اور یہاں کے زمینداروں کو ان سے منحرف کرنا چاہا۔ مگر پھر مرہٹوں کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ اور وہ بعجلت عظیم آباد واپس آیا۔ یہاں ہدایت علی سے اس کی طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ ہیبت جنگ کی ساری غلط فہمی دور ہو گئی۔ مگر ہدایت علی نے اس تلخی کے پیدا ہو جانے کے بعد یہاں کی حکومت سے وابستہ رہنا مناسب نہ جانا اور وہ ہیبت جنگ کے بار بار روکنے کے باوجود رجب ۱۱۵۶ھ میں عظیم آباد سے روانہ ہو گئے۔

اثنائے راہ میں فیض آباد پہونچے۔ چونکہ یہ صورت حال صفدر جنگ کی وجہ سے پیش آئی تھی۔ اس نے انہیں روکنا چاہا مگر انکی غیرت نے تقاضا نہیں کیا۔ اور وہاں سے تیسرے دن روانہ ہو کر دلی پہونچے۔ یہ زمانہ محمد شاہ بادشاہ کا تھا۔ یہاں پہونچکر اس کے دامن دولت سے وابستہ ہو گئے۔ اور دولت وحشمت نے ان کے قدم چومے۔

وہ پہلے سکندرہ کے والی بنائے گئے۔ پھر خاں کا خاندانی خطاب عطا ہوا۔ پھر روہیلوں کے علاقہ میں مختلف محال کے فوجدار رہے۔ مثلاً ۱۱۶۱ھ میں روہیلکھنڈ کے ایک وسیع علاقہ کے ناظم تھے۔ ان کا دار الحکومت بریلی تھا۔ اور اہم شہر بدایوں وشاہجہانپور وغیرہ اس میں داخل تھے۔ روہیلہ سرداروں سے ان کے مقابلے ہوئے پھر دوستانہ مراسم قائم ہوئے۔ اسی طرح پھر پانی پت سونی پت کے ۱۴ محال کی فوجداری پر فائز کئے گئے۔ اور محمد شاہ کی طرف سے منصب پنجہزاری وخطاب سد جنگ واعزاز دیگر عطا ہوئے۔ پھر عالمگیر ثانی (۱۱۶۷ھ تا ۱۱۷۳ھ) کے عہد میں محالات سرہند، تھانیسر و پانی پت وغیرہ کی فوجداری عطا ہوئی۔ اس کے بعد عالمگیر ثانی اور اس کی ملکہ زینت محل نے وزیر عماد الملک کے خوف سے اپنے ولی عہد شاہزادہ عالی گہر (شاہ عالم بادشاہ) کا ہاتھ ہدایت علی کے ہاتھ میں دیکر اسے ان کے سپرد کیا۔ اور یہ اسے لیکر جھجر وہانسی وغیرہ کی جاگیر پر روانہ ہو گئے۔ اور پھر عماد الملک کے قبضہ میں جانے کے بعد جب وہ دلی سے دوبارہ فرار ہوا تو ہدایت علی اسے نجیب الدولہ کے یہاں لائے۔

اب ہدایت علی شاہزادہ عالی گہر کے مربی واتالیق تھے۔ اس وقت سے اس کے تخت دلی پر آجانے کے وقت تک جتنے

واقعات گذرے وہ ہدایت علی کی نگرانی اور مشوروں سے انجام پائے۔ خصوصاً صوبہ بہار پر حملہ آوری، عالمگیر ثانی کی رحلت کے بعد بہار میں تاجپوشی، انگریزوں سے جنگ، پھر صلح سب ہدایت علی ہی کے ذریعہ انجام پائے۔ اب وہ بخشی الملک[1] احترام الدولہ سید ہدایت علی خاں بہادر اسد جنگ کے لقب سے مشہور تھے۔ آخر عمر میں وہ سیاسیات سے کنارہ کش ہو کر اپنی جاگیر واقع حسین آباد (جو ضلع چپرا میں انہی کا آباد کردہ مشہور قصبہ ہے) میں مقیم ہو گئے اور یہیں انہوں نے ۱۱۷۹ھ میں وفات پائی اور مدفون ہوئے۔

دیگر اعزہ

غلام حسین کے والد ہدایت علی اگرچہ مرکزی حکومت دلّی سے وابستہ ہو گئے تھے لیکن اس کا پورا خاندان اپنے وطن مالوف عظیم آباد میں مقیم رہا۔ اور یہاں مہابت جنگ و ہیبت جنگ کے خاندان سے اس کی ددھیالی و ننھیالی دونوں خاندانوں کے گہرے تعلقات قائم رہے۔ اور اس کی ماں بھی مدت العمر یہیں مقیم رہیں اور اس عہد میں اس کے خاندان کے مختلف اکابر سید عبد العلی خاں بہادر (ماموں اور خسر)، نواب سید مہدی نثار خاں (عم) نواب سید نصرت علی خاں بہادر (ماموں)، سید عبد الوہاب خاں (عم)، نواب فخر الدولہ سید نقی علی خاں بہادر (برادر خرد) نواب سید علی خاں بہادر (برادر خرد) اور سید غالب علی خاں بہادر (برادر خرد) وغیرہ مہابت جنگ، ہیبت جنگ، صولت جنگ، اور میر قاسم عالیجاہ وغیرہ کے زمانوں میں ممتاز عہدوں اور منصبوں پر فائز تھے اور بڑی حد تک یہی لوگ مشیر سلطنت تھے۔ مثلاً ہیبت جنگ کے عہد حکومت کے متعلق لکھا ہے:۔

"علی ای حال ہیبت جنگ بکمال جاہ و جلال باتفاق والد و عم و خال این شکستہ بال و دیگر ملازمان بانتظام مہام این بلاد و رفاہ رعایا و کل عباد در نہایت عدل و داد بسری برد۔"[۹۴] (ص ۵۰۰)

---

[1] بخشی الملک نصیر الدولہ سید ہدایت علی خاں بہادر اسد جنگ کے مفصل حالات کے لئے دیکھئے سیر المتاخرین کے حسب ذیل صفحات:۔ ۴۹۰، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۶، ۵۵۹، ۵۷۳، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۹۸، ۶۶۰، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۷۰، ۶۷۴، ۶۷۶، ۶۸۴، ۶۹۲، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۹، ۷۱۱، ۷۴۳، ۷۵۸، ۷۵۲، ۷۷۶، ۸۶۵، ۸۶۸، ۸۷۲، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۸، ۹۰۴، ۹۰۶، و تاریخ ہند الیٹ ج ۸ ص ۱۹۶، و فہرست مخطوطات فارسی کتبخانہ برٹش میوزیم ج ۱ ص ۲۸۰۔

[2] نواب سید عبد العلی خاں بہادر کے مفصل حالات کیلئے دیکھئے مثلاً صفحات ۴۴۵، ۴۹۵، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۳۶، ۴۹۶، ۴۹۴، ۵۰۸، ۵۴۸، ۵۴۲، ۵۱۶، ۵۴۲، ۵۷۳، ۶۰۴، ۶۶۲، ۷۰۷، ۷۰۵، ۷۴۵۔ نواب فخر الدولہ سید نقی علی خاں بہادر کے لئے ۵۳۶، ۵۸۵، ۶۰۸، ۶۱۳، ۶۲۸، ۷۰۳، ۷۴۵، ۸۷۴، ۹۴۶۔ نواب سید علی خاں کے لئے ۵۵۸، ۵۶۱، ۵۷۳، ۶۰۶، ۶۱۳، ۷۱۱، ۷۴۳، ۷۱۹، ۷۴۵، ۷۷۔ نواب سید مہدی نثار خاں کے لئے ۵۳۶، ۵۰۶، ۵۵۹، (باقی حاشیہ دوسرے صفحہ پر دیکھیے)

ولادت و تعلیم و تربیت

غلام حسین ۱۱۴۰ھ میں دہلی میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے والدین کا اکبر اولاد تھا۔ اپنی عمر کے پانچویں سال میں تھا کہ اپنی ماں کی معیت میں دہلی سے مرشد آباد اور پھر وہاں سے عظیم آباد چلا آیا۔ ساری تعلیم و تربیت عظیم آباد میں ہوئی (ص ۹۴۵)

محلسرا

عظیم آباد میں ہدایت علی کی محلسرا حاجی گنج کے محاذات میں اس شارع عام پر واقع تھی جو دروازہ بیگم پورہ کو جاتی ہے۔ غلام حسین کا آبائی مکان یہیں تھا۔ (ص ۵۸۶)

سفر دہلی

پھر سید ہدایت علی کے دہلی پہونچنے کے بعد یہ بھی اپنے بھائی سید نقی علی کے ساتھ تقریباً ۱۶، ۱۷ برس کی عمر میں ۱۱۵۷ھ میں دہلی گیا (ص ۵۲۸) اور اپنے والد کی معیت میں محمد شاہ بادشاہ (۱۱۳۱ھ۔ ۱۱۶۱ھ) کے دربار میں باریاب ہوا۔ جہاں اس کے والد کو دو خلعت اور ان دونوں بھائیوں کو خاں کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ وہاں سے رخصت ہو کر وزیر الممالک صفدر جنگ کی خدمت میں آیا۔ وہ بڑی شفقت اور محبت سے پیش آیا۔ اور دونوں بھائیوں کو سرپیچ مرصع عطا کیا۔ اور بنگالہ کے بعض تحائف بھیجنے کی فرمائش کی اور اس کے ذریعہ ناظم بنگالہ کی خدمت میں محبت و اخلاص کا پیغام بھیجا۔ (ص ۸۵۲، ۸۵۳)

شادی

غلام حسین دلی میں تھا کہ اس کی شادی کی تقریب کے انجام پانے کا فیصلہ ہوا۔ اور سید نقی علی خاں اس کے بعض انتظامات کے لئے ماہ ذی قعدہ ۱۱۵۷ھ میں عظیم آباد بھیجا گیا۔ اور تین مہینے کے بعد یہ بھی دلی سے عظیم آباد آیا۔ اور ماہ محرم ۱۱۵۸ھ میں اس کی شادی اس کے ماموں سید عبد العلی خاں بہادر (جنہیں بہادری کا خطاب اور سہ ہزاری منصب حاصل تھا اور ان دنوں صوبۂ بہار میں سپہ سالار اعظم تھے) کی صاحبزادی سے انجام پائی۔ (ص ۵۳۶)

عملی زندگی

اب سید غلام حسین کی عملی زندگی شروع ہوتی ہے۔ اس نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے سامنے زمانہ کی پر آشوب سیاست کی بساط بچھی دیکھی اور چونکہ برسر حکومت خانواہ سے وابستہ تھا اس لئے اسے بھی عنفوان شباب ہی میں بساط سیاست کا ایک مہرہ بن جانا پڑا۔

جنگ میں پہلی شرکت

چنانچہ اسی سال ۱۱۵۸ھ میں مصطفیٰ خاں بہادر میر جنگ، مہابت جنگ سے بگڑ کر مرشد آباد سے بہار آیا۔ اور اس صوبہ پر قبضہ جمانا چاہا۔ ادھر سے سید عبد العلی خاں بہادر کی سپہ سالاری میں اس کا راستہ روکا گیا۔ اور خونریز جنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس موقع پر اگرچہ اس کا چھوٹا بھائی سید نقی علی سرکاری ملازمت میں داخل ہو کر سو پیادوں کا افسر اپنے چچا سید مہدی نثار خاں بہادر کی ماتحتی میں مقرر ہو گیا تھا۔ مگر غلام حسین نے ملازمت قبول نہ کی محض اخلاص و رفاقت کے لئے فوج

(بقیہ صفحہ گذشتہ حاشیہ نمبر ۲) ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۱۶، ۵۲۶ — نواب سید غالب علی خاں کے لئے ۷۱، ۷۵، ۷۴ — سید عبد الوہاب خاں کے لئے ص ۶۶۶ — نواب سید نصرت علی خاں بہادر ص ۵۴۴، ۶۴۴، ۶۹۴ —

میں شریک ہوا۔ اس وقت یہ تقریباً انیس سال کا نوجوان تھا اور ابتدا ً ہیبت جنگ کی معیت میں عظیم آباد کی شہر پناہ کے دروازہ کی حفاظت پر متعین کیا گیا۔ (ص ۵۳۶) پھر ایک رات کو میدان جنگ میں ہیبت جنگ کے خیمہ کی پاسبانی کی (ص ۵۴۰) پھر ایک خاص جنگی مقام پر قبضہ کرنے کے لئے دونوں حریفوں نے کوششیں کیں۔ یہ وقت بڑے آن کا تھا مصطفےٰ خاں کا پلہ بھاری تھا۔ ادھر کے لوگ مقتول و مجروح ہو رہے تھے۔ غلام حسین بھی اس وقت ایک ہاتھی پر سوار ہو کر جنگ میں مصروف تھا کہ عبدالعلی خاں کے دستہ کے ایک سپاہی نے اس سے مدد طلب کی۔ یہ ہاتھی بٹھانے لگا کہ قریب ہی ایک گولا آ کر گرا اور اس کا بایاں بازو سخت زخمی ہو گیا۔ گوشت پوست جل کر بھسم ہو گیا۔ تاہم اس کے جوش و خروش میں کمی نہیں آئی۔ اس اثنا میں مصطفےٰ خاں کا علمبردار گولہ کی زد سے ہاتھی سے گرا۔ غلام حسین للکار کر چلایا "زدہ ایم انشاء اللہ"۔ اسی وقت جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ مصطفےٰ خاں نے فرار اختیار کیا۔ تعاقب میں غلام حسین بھی دور تک گیا۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد ہیبت جنگ نے اسے داد تحسین کے لئے اپنی آغوش میں لے لیا۔ (ص ۵۴۱) ۔

اس کے بعد اس نے مصطفےٰ خاں کی تیسری جنگ میں شرکت کی جس میں مصطفےٰ خاں مارا گیا۔ پھر مرہٹوں کی لڑائی میں شریک ہوا۔ جو رگھوجی بھوسلہ کی سرکردگی میں ہوئی تھی۔ اور جس میں ہیبت جنگ فتحیاب ہوا تھا۔ (ص ۵۴۴، ۵۴۹)

غلام حسین کا سفر اور عظیم آباد میں انقلاب

اس کے بعد غلام حسین اپنے والد سے ملنے کے لئے عازم دہلی ہوا۔ قصبہ سیٹھی ضلع غازی پور تک پہونچا تھا کہ اسے ہیبت جنگ کے مارے جانے اور عظیم آباد میں انقلاب برپا ہو جانے کی اطلاع ملی۔ (ص ۵۵۹) لیکن خوش قسمتی سے اس غارت گری میں سید غلام حسین کی حرم سرا محفوظ و مامون رہی کہ اولاً اسکے پہرہ داروں نے حفاظت کی۔ علاوہ ازیں بختاور خاں نے جو بانی انقلاب شمشیر خاں کا خاص دوست تھا۔ اس کی حرم سرا کی حفاظت کیلئے دو ہزار سپاہی تعینات کر دئے۔ البتہ اس کا چھوٹا بھائی سید علی خاں مصائب میں پھنس گیا اور اسے لباس زرتار اتار کر پھٹی چادر اوڑھ کر روپوش ہونا پڑا۔ اسی طرح سید عبدالعلی خاں بھی گرفتار کر لئے گئے۔ لیکن سعی و سفارش سے ان کی جان بچی۔ (ص ۵۶۳، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳)۔ اس وقت غلام حسین کے لئے لوٹنا بھی ممکن نہ تھا۔ راہ میں بھوجپوری زمیندار پڑتے تھے اور وہ خود سر ہو کر شمشیر بکف میدان میں اتر پڑے تھے۔ بادل ناخواستہ وہ بریلی پہونچا وہاں سے شاہجہان آباد دلی گیا۔ وزیر الممالک صفدر جنگ کی خدمت میں پھر باریاب ہوا۔ پھر والد کی معیت میں پانی پت گیا۔ (۵۷۲) پھر دلی آیا اور بالآخر جب عظیم آباد میں امن و امان قائم ہونے اور مہابت جنگ کے ہاتھوں شمشیر خاں وغیرہ کے قلع قمع ہو جانے کی اطلاع ملی تو وہاں سے عظیم آباد کیلئے بیتابی سے روانہ ہوا۔

مرشد آباد کا قصد

لیکن عظیم آباد پہونچکر وہ نئے حالات سے دوچار ہوا۔ ہیبت جنگ کے مارے جانے کے بعد عظیم آباد، اہل کمال اور ان کے قدر داں دونوں سے کچھ دنوں کے لئے خالی ہو رہا تھا چنانچہ معلوم ہوا کہ ہیبت جنگ کے لشکر کے مشہور قائدین اور دربار کے افاضل اہل علم مثلاً مہدی نثار خاں، نقی علی خاں، غلام رضا خاں، خادم حسن خاں، ابلک محمد خاں، عرب علی خاں،

میر اسد علی، میر فضل علی، ملا غلام یحییٰ، میر وحید، مفتی ضیاء اللہ اور میر عبد الہادی وغیرہ جو غلام حسین کے اعزہ و احباب خاص تھے ہیبت جنگ کے حقیقی بھائی نصیر الملک صمصام الدولہ سعید احمد خاں بہادر صولت جنگ کی معیت میں مرشد آباد کا قصد رکھتے ہیں اس لئے غلام حسین نے بھی ان لوگوں کی رفاقت کا ارادہ کیا اور مرشد آباد روانہ ہو گیا کہ سلسلۂ ملازمت سے وابستہ ہو جائے۔

صولت جنگ کے دربار سے وابستگی اور پورنیہ میں قیام

یہ قافلہ ابھی اثنائے راہ میں تھا کہ غلام حسین نے اپنے بھائی نقی علی خاں کو ساتھ لیکر نواح مونگیر میں صولت جنگ کی خدمت میں باریاب ہو کر نذر پیش کی۔ اس نے ان کا خیر مقدم کیا۔ اور ان دونوں بھائیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ معقول ماہانہ وظیفہ مقرر کرنیکا فرمان جاری کیا۔ اور انہیں سفر و حضر میں ساتھ رہنے کا حکم دیا۔ چنانچہ جب مرشد آباد پہونچکر صولت جنگ پورنیہ کی صوبہ داری پر مامور ہوا تو یہ بھی اس کے ساتھ ماہ ربیع الاول ۱۱۶۲ھ میں پورنیہ روانہ ہوا (ص ۵۷۳ تا ۵۷۵)۔

اس کے بعد اس کی زندگی ایک معزز رکن حکومت کی حیثیت سے گذرتی ہے۔ صولت جنگ کی صحبت میں شریک رہتا ہے۔ اس کی نیابت کے فرائض انجام دیتا ہے اور اہم ملکی و سیاسی مسائل کے مشوروں میں شریک رہتا ہے (ص ۵۷۵، ۵۸۹، ۵۹۶)

غلام حسین کامل سات برس تک صولت جنگ کے دربار سے وابستہ رہا۔ اس وقت اس کی عمر اگرچہ صرف ۲۷ سال کی تھی لیکن صولت جنگ اس کے علم و فضل اور زیرکی و دانائی سے اس کا بیحد مداح اور اس پر کامل اعتماد رکھتا تھا اور اس سے ایسے دوستانہ مراسم رکھتا کہ بڑے بوڑھوں کو رشک آتا۔ صولت جنگ صاحب علم و فضل اور علماء و فضلاء کا قدرداں تھا۔ اس کے دربار میں علمی مذاکرہ کا ہونا بھی اس کے روزانہ کے معمولات میں تھا۔ اس مجلس میں غلام حسین کی شرکت لازمی تھی اور علمی گفتگوؤں میں اس کا بڑا حصہ رہتا تھا چنانچہ لکھتا ہے:۔

"بعد از اں نماز عصر خوانده بیروں می آید و در آں مجلس اول علماء مثل ملا غلام یحییٰ، مفتی ضیاء الدولہ و میر وحید و مولوی لال محمد و شیخ ہدایت اللہ و سید عبد الہادی حاضر شده تا دو ساعت نجومی مذاکرۂ علمی می شد و کتابے بخصوص مثل درس می خواند و ملا غلام یحییٰ حل معضلاتش می نمود و دیگراں نیز دراں باب گفتگو می کردند ..... (صولت جنگ) بر فقیر نہایت نوازش داشت تاکید کرده بود کہ دراں وقت ہم حاضر شوم و از استماع سخنان من بسیار خوش بود و در سفر و حضر بفرورت با دیگراں سخن می گفت واں ہمہ وقت مکالمہ با فقیر و روئے سخن و گوش سماعت بسوئے من داشت بنحویکہ دیرینہ رفقائے کہن سال او حیرت داشتند کہ ایں جواں چہ سحر بکار برده است کہ با غیر او التفاتے ندارد۔ (ص ۶۰۰)

اسی لحاظ سے صولت جنگ کے الطاف و عنایات بھی غلام حسین پر بیحد مبذول تھے۔ اس کے ذاتی رسالہ میں ۷۰، ۸۰ سوار اور ڈیڑھ دو سو پیادے تھے اور دروازہ پر ہاتھی جھومتا تھا۔ اسی طرح کسی موقع پر دو ہزار دیدیے اور کبھی باتوں باتوں میں ماہانہ تنخواہ کے علاوہ ۷ ہزار سالانہ کی مستقل آمدنی کا بندوبست کر دیا۔

اس کی یہ عنایات صرف غلام حسین پر نہ تھی بلکہ اس کے تعلقات سے وہ اس کے عزیزوں کی بھی خدمت کرتا رہا سید عبد العلی خان بہادر عظیم آباد سے شہر بدر کر دیئے گئے تھے۔ غلام حسین نے صولت جنگ کے ذریعہ مہابت جنگ سے معافی دلانی چاہی۔ مگر مہابت جنگ صولت جنگ کے خط کے جواب میں اس مسئلہ کی طرف سے اغماض کر گیا۔ یہ دیکھ کر صولت جنگ نے محض غلام حسین کے پاس خاطر سے پانسو روپیہ ماہانہ ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور دو ہزار روپے پیشگی ارسال کر دئے۔ اور جب تک زندہ رہا یہ رقم انہیں بنارس میں جہاں وہ مقیم تھے ملتی رہی۔

غلام حسین صولت جنگ کے آخر دم تک اس سے وابستہ رہا۔ اس نے ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۹ھ کو وفات پائی۔ اور اس کے ساتھ بظاہر قیام پورنیہ کا رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ (ص ۶۰۰ - ۶۰۴)

پورنیہ سے روانگی اور واپسی صولت جنگ کے انتقال کے بعد شوکت جنگ اس کا جانشین ہوا۔ غلام حسین اس سے خوش نہ تھا۔ اس لئے اس نے ترک ملازمت کا ارادہ کیا۔ اسے اس ارادہ سے باز رکھنے کی بہتیری کوششیں کی گئیں مگر کامیابی نہیں ہوئی اور وہ پانچ ہزار روپے رخصتانہ انعام لیکر وہاں سے عظیم آباد کے قصد سے روانہ ہو گیا۔ اثنائے راہ میں اسے مہابت جنگ کی وفات کی خبر ملی۔ اسے اس کے جانشیں سراج الدولہ کی طرف سے بھی بعض وجوہ سے اطمینان نہ تھا اس لئے آئندہ کے حالات کا اندازہ کرنے کے لئے چند دنوں اسی مقام پر ٹھہر گیا چنانچہ واقعی سراج الدولہ نے برسر اقتدار آتے ہی اس کے چند اعزہ کو عظیم آباد سے جلا وطن کر دیا۔ یہ سن کر وہ پھر پورنیہ واپس آیا اور اپنی قدیم حویلی میں فروکش ہو گیا

شوکت جنگ کے دربار سے وابستگی اس کے بعد اس کے دوستوں نے پھر ملازمت قبول کرنے پر اصرار کیا۔ یہاں تک کہ ایک دن خود شوکت جنگ غیر متوقع طور پر اس کے مکان پر آیا اور بالآخر اس نے ملازمت قبول کر لی۔

اس کے بعد اس کا بیان ہے کہ صورت حال یہ ہو گئی کہ شوکت جنگ نے تمام داخلی وخارجی معاملات حکومت اس کے سپرد کر دئے اور خود معاملات حکومت سے قطعی بے تعلق ہو گیا۔ صرف کاغذوں پر دستخط کر دیا کرتا۔ لیکن وہ شوکت جنگ کے اس طرز عمل سے خوش نہ تھا اسے اس کی تلون مزاجی سے خوف تھا کہ معلوم نہیں کس وقت کس بات پر بگڑ بیٹھے۔ آخر واقعی ایک ناگوار صورت پیش آئی اور وہ دربار سے اٹھ کر چلا آیا۔ شوکت جنگ اپنی غلطی پر متنبہ ہوا اور اسے منا کر راضی کر لیا۔ (ص ۶۲۳، ۶۲۴) اگرچہ حکومت کے معاملات غلام حسین ہی کے مشورہ سے طے پاتے تھے مگر شوکت جنگ کبھی کبھی اپنی افتاد طبیعت سے اس کی بات نہ مانتا اور من مانی حرکتیں کر جاتا۔ اس قسم کے ایک سے زیادہ واقعات پیش آئے۔ (ص ۶۲۵)۔

جب میر جعفر نے سراج الدولہ کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کیں تو شوکت جنگ کے پاس بھی اس کا ایلچی پہونچا اور وہ سراج الدولہ

کے خلاف خروج کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس کی اطلاع سراج الدولہ تک پہونچ گئی۔ اس نے آزمائش کے لئے ولایت پورنیہ کے چند پرگنوں کی سند ایک ہندو کے نام لکھ بھیجی۔ شوکت جنگ نے مشورہ کے لئے غلام حسین کو بلا بھیجا۔ اس نے سراج الدولہ کے نام ایک معقول جواب لکھا تا کہ بات بنی رہے۔ چنانچہ وہ خط اس کے آدمی کے حوالہ کر دیا گیا۔ مگر پھر شوکت جنگ نے اپنی ضد سے وہ خط اس سے واپس لے لیا۔ اور اعلان جنگ کر دیا۔ سراج الدولہ نے فوراً پیشقدمی کر کے ۱۱۷۰ھ میں شوکت جنگ کو میدان جنگ میں قتل کر کے اس کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ (ص ۶۲۴، ۶۲۶)

اس جنگ میں غلام حسین اور اس کے بھائی نقی علی دونوں شریک تھے۔ مگر اس کی شرکت با دل ناخواستہ تھی۔ وہ سراج الدولہ کو برسر حق سمجھتا تھا۔ لیکن اس نے شوکت جنگ سے غداری نہ کی۔ حالانکہ اثنائے جنگ میں سراج الدولہ کا پیام بھی آیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دونوں طرف سے ہدف ملامت بنا۔ شوکت جنگ کا خیال ہوا کہ یہ دونوں بھائی سراج الدولہ سے مل گئے ہیں۔ اور سراج الدولہ کے نزدیک فتنہ و فساد کے سارے بانی مبانی یہی دونوں بھائی قرار پائے۔ اور جنگ کے بعد اس نے انتقام لینے کا فیصلہ کیا۔ (ص ۶۳۱) لیکن خوش قسمتی سے سراج الدولہ کے لشکر میں غلام حسین کے سگے ماموں زاد بہنوئی میر محمد کاظم خاں موجود تھے۔ اس کی سعی و سفارش سے جان بخشی ہوئی اور عزت و آبرو کے ساتھ مع اہل و عیال پورنیہ سے چلے جانے کی اجازت ملی اور وہاں سے عظیم آباد چلا آیا۔

عظیم آباد سے جلاوطنی

عظیم آباد پہونچکر وہ سخت بیمار ہو گیا۔ لیکن چونکہ ان دنوں وہ حکومت کا معتوب تھا اس لئے بجز دو تین شخصوں کے کوئی اس کی عیادت تک کے لئے اس کے پاس نہیں آیا۔ یہاں تک کہ صوبہ بہار سے اس کی جلاوطنی کا پروانہ آپہونچا۔ اور وہ بنارس روانہ ہو گیا۔

قیام بنارس اور شیخ علی حزیں سے روابط

اس وقت بنارس اس کے لئے گویا وطن ثانی تھا مختلف اعزہ عبدالعلی خاں، سید علی خاں، سید غالب علی خاں اور سید عبدالوہاب خاں پہلے سے جلاوطن ہو کر یہاں آئے ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں غلام حسین کے خاندان اور خصوصاً اس کے تعلقات، اس عہد کے مشہور شاعر شیخ علی حزیں سے بہت گہرے تھے۔ بنارس کے قیام کے زمانہ میں اس کا بیشتر وقت انہی کی علمی و ادبی صحبت میں بسر ہوتا تھا۔ پھر چند دنوں کے بعد اس کے اہل و عیال بھی بنارس چلے آئے اور وطن کی واپسی کے لئے کسی مناسب موقع کے منتظر رہے۔ (ص ۶۳۲، ۶۴۴)

میر جعفر کے عہد حکومت میں

یہاں تک کہ صوبہ بنگال و بہار کی نظامت پر میر جعفر مستولی ہوا۔ اتفاق سے میر جعفر اور غلام حسین کے خاندان کے درمیان گہرے روابط تھے۔ خصوصاً نقی علی خاں سے اس کا یارانہ تھا اسلئے مستولی ہونے کی خبر سنتے ہی نقی علی خاں نے غلام حسین کی مخالفت کے باوجود میر جعفر کو ایک خط لکھا اور جواب کا انتظار کئے بغیر عظیم آباد روانہ ہو گئے۔ یہاں پہنچے تو صوبہ دار بہار کے نام میر جعفر کا پروانہ آیا کہ انہیں مع اہل و عیال بنارس لوٹا دیا جائے۔ ادھر بنارس میں غلام حسین

بھی پہونچا۔ اور بالآخر میر جعفر کے بھائی میر محمد کاظم خاں کے بیچ بچاؤ اور سعی و سفارش سے جلاوطنی کا حکم منسوخ ہوا۔ اور پھر راجہ رام نرائن صوبہ دار بہار کی کوششوں سے ان کی جیلا، بی نگر اور مونگیر کی قدیم جاگیریں واگذار ہوئیں۔ (ص ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۷، ۶۵۰)

شاہزادہ عالی گہر (شاہ عالم) کا حملہ بہار اور غلام حسین

اس کے بعد غلام حسین کے سوانح حیات میں پہلے سے بھی زیادہ نازک دور کا آغاز ہوتا ہے یعنی ۱۱۷۳ھ میں شاہزادہ عالی گہر (شاہ عالم بادشاہ) نے صوبۂ بنگال و بہار چھیننے کے لئے میر جعفر پر چڑھائی کی۔ اس لشکرکشی میں غلام حسین کے والد بخشی الملک نصیر الدولہ نواب سید ہدایت علی خاں بہادر اسد جنگ کا جو ان دنوں شاہزادہ کے آتالیق اور مشیر خاص تھے، گہرا ہاتھ تھا۔ میر جعفر نے یہ سنتے ہی راجہ رام نرائن صوبہ دار بہار کو لکھ بھیجا کہ :-

"شاہزادہ کو اس حملہ آوری پر آمادہ کرنے والے اور فساد برپا کرنے والے صرف سید ہدایت علی اور ان کے لڑکے ہیں۔ جو یہاں موجود ہیں۔ اور جنہوں نے اپنے باپ کو اسکی ترغیب دی ہے۔ ان پر خاص نگرانی رکھو۔" (ص ۶۶۰)

راجہ رام نرائن نے غلام حسین کو بلا کر سارا ماجرا سنایا۔ اس نے ایک لمبی گفتگو میں اپنی اور اپنے خاندان کی اپنے والد سے بے تعلقی دکھائی راجہ رام نرائن گفتگو سے متاثر ہوا اور اس کے شکوک جاتے رہے۔ بلکہ جب بنگال سے مدد آنے میں تاخیر ہوئی اور رام نرائن نے شاہزادے سے صلح کرنی چاہی تو اسی کو سفیر بنا کر شاہی لشکر میں بھیجا جو ان دنوں داؤد نگر (گیا) میں پڑاؤ ڈالے تھا۔ غلام حسین وہاں جاکر وہاں کے مشوروں میں شریک ہو گیا۔ اور جب شاہی لشکر عظیم آباد آیا تو یہ بلطائف الحیل اپنے تمام اہل و عیال اور والدہ وغیرہ کو شہر سے شاہی کیمپ میں لے آیا اور جب شاہی لشکر کی شکست کے قرائن دیکھے تو وہاں سے کوچ کر کے سہسرام میں آکر ٹھہرا۔ اور پھر شاہی لشکر بھی یہیں آگیا۔

یہاں پہونچکر غلام حسین نے ایک اہم کارنامہ انجام دیا۔ یعنی اس کی تحریک سے شاہزادہ کی طرف سے کرنل کلایو کے نام ایک تاریخی مکتوب لکھا گیا جس کا مسودہ غلام حسین ہی نے تیار کیا۔ اور یہی مکتوب شاہزادہ اور انگریزوں کے تعلقات کے قیام کی بنیاد قرار پایا۔ پھر دوسری طرف اسی مکتوب کی بناء پر ہدایت علی کا علاقہ جسے میر جعفر نے دوبارہ ضبط کرلیا تھا، واگذار ہوا۔ اور اس مکتوب کے محرک اور کاتب ہونے کی وجہ سے غلام حسین کی عزت و وجاہت بھی ممتاز انگریز عہدہ داروں کی نگاہ میں قائم ہوگئی۔ (ص ۶۶۳، ۶۶۴)

یورپی اہل علم کی ایک غلطی کی تصحیح

یہ عجیب بات ہے کہ غلام حسین کے اس مکتوب نے انگریزوں کے درمیان اس قدر شہرت حاصل کی کہ یورپ کے مستند مورخین نے غلام حسین کو شاہ عالم کا میر منشی قرار دیدیا چنانچہ تاریخ ہند الیٹ میں ہدایت علی کے ضمن میں ہے :-

"جب شاہ عالم دہلی سے فرار ہوا تو اس کے ساتھ میر بخشی ہو گیا۔ اور اپنے لڑکے کے لئے میر منشی کا عہدہ حاصل کیا۔ (ج ۸ ص ۱۹۶)

اسی طرح برٹش میوزیم کا فہرست نگار لکھتا ہے :-

"کچھ دنوں تک شاہ عالم کی حکومت میں میر منشی کی خدمت انجام دیتا رہا۔" (فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم ج ا ص ۲۸۰)
حالانکہ اس نے بجز اس مکتوب کے جو محض ذاتی حیثیت سے اس نے لکھا تھا وہ کبھی شاہزادہ کی ملازمت سے وابستہ نہیں ہوا۔ اور وہ واقعہ اس کی بادشاہی یعنی "شاہ عالم" بننے سے پہلے شاہزادگی کے زمانہ کا ہے۔ چنانچہ سیر المتاخرین میں اسی مکتوب کے سلسلہ میں ہے:۔

".. . شاہزادہ نوبت خاں را مع مہر منشیان خود فرستاد تا مسودہ نمودہ بمضمونیکہ مناسب دانند برنگارند چوں کسے خاطر خواہ ننوشت فقیر را والد اشارہ کرد کہ اگر چیزے بخاطر تو آید بنویس۔ انچہ طبیعت باں دلالت نمودہ بر زبان قلم دادہ آمد معقول طبائع افتادہ موافق ضابطہ منشیان نقلش برداشتہ و بدستخط پادشاہزادہ رسانیدہ بکرنل کلیف فرستادند۔" (ص ۶۷۱)

اس مکتوب کے لکھے جانے کے بعد غلام حسین پھر مع اہل و عیال بنارس چلا گیا۔ اور ہدایت علی انگریزوں سے تعلقات صاف ہونے کے بعد سیاست سے کنارہ کش ہو کر اپنے علاقہ حسین آباد میں آکر قیام پذیر ہو گئے۔

غلام حسین کا ایک سفر

اس کے بعد غلام حسین کسی خاص مہم پر جس کا وہ تذکرہ نہیں کرتا، بنارس سے روانہ ہو کر اپنے والد کے پاس حسین آباد آتا ہے۔ پھر ٹکاری جاتا ہے۔ یہاں اپنے قدیم دوستوں دلیر خاں اور امالت خاں سے ملتا ہے۔ پھر بہار شریف جاتا ہے۔ اس کے بعد عظیم آباد میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ مگر راجہ رام نرائن اس سے بدگمان نکلتا ہے اور اس پر عظیم آباد میں داخلہ کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔ مگر پھر سعی و سفارش کے بعد اسے اجازت ملتی ہے۔ اور وہ یہاں کے معزز انگریز افسروں مسٹر امیٹ اور ڈاکٹر فلرٹن سے ملتا ہے اور ان لوگوں سے اس کے گہرے روابط قائم ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دلیر خاں وغیرہ میرن پسر میر جعفر سے بگڑ کر ٹکاری (گیا) چلے آئے تھے۔ اور شاہزادہ عالی گہر کو دوبارہ بلا کر عظیم آباد پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں چنانچہ شاہزادہ اسی نیت سے سرحد بہار میں داخل ہوا۔ اور پھر فوراً ہی ۱۱۷۳ھ میں اسی عالمگیر ثانی کے مرنے کی اطلاع ملی۔ اور ہدایت علی کے مشورہ سے اس نے شاہ عالم کے لقب سے اپنی بادشاہی کا اعلان کیا۔ اس کے بعد انہی راستوں سے عظیم آباد آتا ہے، جن سے پہلے غلام حسین گذر چکا تھا۔ اور یہ قیاس قائم کرنے کے معقول دلائل موجود ہیں کہ غلام حسین کا یہ سفر اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔ اور راجہ رام نرائن انہی وجوہ سے اس سے بدگماں ہوا۔ اور یہ بدگمانی آخر وقت تک رفع نہیں ہوئی۔ چنانچہ جب ہدایت علی نے گیا پہونچکر شاہ عالم کے لشکر کی مدار المہامی ہاتھ میں لی تو راجہ رام نرائن نے غلام حسین کے انگریز دوستوں کو اس کی دورخی حکمت عملی پر توجہ دلائی لیکن جیسا کہ بعض قیاسی دلائل سے آشکارا ہوتا ہے، اولاً انگریزوں نے اس موقع پر اپنے بعض مصالح کے لحاظ سے چشم پوشی کی، اور غلام حسین نے پھر ایک مرتبہ اپنے والد سے اپنی بے تعلقی دکھا دی

میر قاسم کے زمانہ میں

پھر جب شاہ عالم عظیم آباد کے معرکوں میں نتیجۂ شکست کے بعد محاصرہ اٹھا کر داؤد نگر آیا، اور گیا مانپور اور اس کے نواح پر قبضہ کر کے ڈیرے ڈال دیئے۔ تو ہدایت علی بعض وجوہ سے اس سے رخصت ہو کر اپنے علاقہ پر

چلے گئے اور ادھر نظامت بنگال و بہار پر میر جعفر کے بجائے میر قاسم (عالیجاہ) بٹھا دیا گیا۔ ان حالات کے بدلنے سے غلام حسین کی پوزیشن ہر طرف سے محفوظ ہوگئی۔ بادشاہ کے کیمپ سے اس کے والد جا چکے تھے، حکمرانی کی مسند پر اس کا قدیم دوست میر قاسم سرفراز تھا۔ اور حکمراں طاقت یعنی انگریزوں سے علیحدہ اس کے گہرے تعلقات تھے۔ اس کا فوری اثر یہ مترتب ہوا کہ غلام حسین کی ذاتی جائداد قیمتی ۲ لاکھ روپیہ جو مونگیر میں واقع تھی، اور جسے میر جعفر نے ضبط کر لیا تھا، وہ انگریزوں کی تحریک اور میر قاسم کی منظوری سے واگزار ہوگئی۔ اور وہاں اس نے اپنے عامل مقرر کر دیئے۔ (ص ۶۷۴ - ۶۹۰)۔

غلام حسین اور انگریزوں کی دوستی

اس کے بعد غلام حسین کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے، وہ اس کی اور انگریزوں کی پائدار دوستی ہے، اب اس نے انگریزوں سے اپنی دوستی کا اعلان کر دیا۔ یہاں تک کہ بڑی جماعت کے ساتھ شاہ عالم سے لڑنے کے لئے انگریزی لشکر میں داخل ہوگیا۔ لیکن انگریزوں کو ایک دوسرے موقع پر اس کی ضرورت پڑی، اور اس سے ایک خاص ضرورت سے اپنا سفیر بنا کر میر قاسم کی خدمت میں روانہ کر دیا تاکہ وہ اس پر اپنے قدیم مراسم و تعلقات کا اثر ڈال کر اسے انگریزوں کے حسب منشار عظیم آباد لائے۔ چنانچہ میر قاسم نے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اور عزت و احترام سے اسے مہمان بنایا۔ لیکن پھر عظیم آباد سے اسے مستند ذرائع سے بعض حالات کی خبر ملی۔ اور وہ غلام حسین سے بدگمان ہو کر برگشتہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ اس کے قتل کئے جانے تک کی افواہ عظیم آباد پہنچی۔ اور انگریزوں نے میر قاسم سے مطالبہ کیا، کہ غلام حسین کے ہاتھ کی تحریر سے اس کے وہاں رُک جانے کے اسباب لکھے جائیں، اس کے بعد وہ بہزار دشواری عظیم آباد واپس آیا۔

تاریخ ہندا لیٹ اور فہرست کتبخانہ برٹش میوزیم میں اس موقع پر بھی یہ تسامح ہوگیا ہے۔ کہ انہوں نے غلام حسین کو میر قاسم کے دربار میں انگریزوں کا مستقل سفیر لکھ دیا ہے، حالانکہ وہ محض عارضی طور پر ایک کار خاص بجالانے کے لئے وہاں بھیجا گیا۔ نہ کہ وہ وہاں مستقلاً عہدۂ سفارت پر فائز تھا۔ (ص ۷۰۰، و ۷۰۴)

ادھر انگریزوں نے گیا مانپور پر چڑھائی کر کے شاہ عالم کو شکست دی، اور سید ہدایت علی پھر شاہی کیمپ میں ممتاز رکن کی حیثیت سے دکھائی دیئے۔ اور طرف انہی کی انتھک کوششوں سے انگریزوں اور شاہ عالم کے درمیان گیا کے باغ میں مجلس صلح منعقد ہوئی۔ اور شاہ عالم انگریزوں کے ساتھ عظیم آباد آگیا۔ ہدایت علی کے ان خدمات سے غلام حسین اور انگریزوں کے تعلقات پہلے سے زیادہ استوار ہو گئے۔

ارکان کونسل سے ملنے کیلئے کلکتہ کا سفر

یہاں تک کہ جب میر قاسم عظیم آباد آیا، تو باوجودیکہ غلام حسین اور میر قاسم کے تعلقات خوشگوار نہیں رہ گئے تھے۔ لیکن میر قاسم نے خود پہل کر کے صفائی کی۔ اور اسے اپنی ضرورت سے کلکتہ روانہ کیا تاکہ وہ اپنے اثر سے کام لے کر کونسل کے ارکان سے گفتگو کرے۔ اور صوبہ بہار میں اس کے ہندو نائبوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو رکوائے چنانچہ غلام حسین کلکتہ گیا۔ اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر عظیم آباد واپس آیا۔ اور میر قاسم کے حسب لخواہ احکام نافذ کرائے۔ (ص ۷۰۵)

میر قاسم کی ملازمت

اس کے بعد بعض انگریزوں کی جانب سے (غالباً اپنی غرض کے لئے) غلام حسین کے میر قاسم کی ملازمت میں داخل ہونے کی تحریک شروع ہوئی۔ میر قاسم اس پر آمادہ ہو گیا، لیکن اس وقت تک ان دونوں کے دلوں کی صفائی نہیں ہوئی تھی۔ غلام حسین نے کھلی گفتگو میں اپنے دلی خطرات کا اظہار کیا۔ اور بالآخر اس کے دامن دولت سے وابستہ ہو گیا۔ اس کے بعد ان دونوں کے تعلقات آقا و ملازم کی حیثیت سے شروع ہوئے۔ لیکن ایسے ملازم کی حیثیت سے جس سے آقا ہمہ وقت چوکنا رہتا ہو، اور ملازم بھی اپنے ہاتھ پاؤں بچائے رہتا ہو۔ پھر اسی طرح بعض انگریزوں کی سفارش سے اس کے دو بھائی سید علی خاں اور سید غالب علی خاں میر قاسم کے دربار میں ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد میر قاسم نے مونگیر کو دارالحکومت قرار دیا۔ اسی سلسلہ میں اسے غلام حسین کے علاقہ کی زمین درکار ہوئی، چنانچہ اس نے جے پور، شہسرام میں اراضی دیکر اس سے اس کا علاقہ حاصل کر لیا۔ اور کچھ دنوں کے بعد غلام حسین اور اس کے بھائی بھی مونگیر چلے آئے۔

میر قاسم نے مونگیر میں کچھ دنوں اس کے ساتھ بے رخی برتی، یہ زمانہ غلام حسین کی بدحالی پریشانیوں میں گزرا۔ پھر میر قاسم نے اس پر نظر عنایت کی اور محرم ۱۱۷۶ھ میں ۶ ہزار انعام دئے اور شروع سے اس وقت تک کی تنخواہ بھی ادا کر دی۔ (ص ۷۰۹، ۷۱۱)

لیکن میر قاسم کا یہی زمانہ تھا، جب وہ انگریزوں سے بددل ہو رہا تھا اور آزاد ہونے کی فکر میں تھا، غلام حسین اور اس کے بھائی انگریزوں کے ملازم رکھائے ہوئے تھے، اس لئے اس نے ان لوگوں پر مشتبہ نگاہ ڈالی۔ اور اس کے بھائیوں کو تو صریح طور پر جاسوس سمجھا، بلکہ سید علی خاں کے متعلق تو صاف یہ حکم دیدیا کہ انہیں دربار میں حاضری کا کم سے کم موقع دیا جائے۔ (ص ۷۱۲) اور جب انگریزوں سے اس کی مخالفت کھلم کھلا ہو گئی تو اس نے اس کے دونوں بھائیوں کو ان کے والد کے پاس حسین آباد بھیج دیا۔ اور ان کی تنخواہ جاری رکھی۔ (ص ۷۱۹) اور پھر یہ مستند طور پر معلوم ہوا کہ غلام حسین کو وہ بطور یرغمال یہاں رکھے ہے تاکہ اس کے والد اور بھائی سر نہ اٹھا سکیں (۷۱۹)

غلام حسین کا یہ زمانہ سخت کشمکش میں گزرا۔ انگریزوں سے اس کی دوستی مشہور تھی، میر قاسم کا اعتماد اس پر سے اٹھ چکا تھا۔ تاہم اسے اس کی ضرورت نہ صرف یرغمال کے طور پر بلکہ اس لئے بھی باقی رہ گئی تھی، کہ انگریزوں سے افہام و تفہیم اور صلح صفائی کی گفتگوؤں میں اس سے کام لیا جائے۔ چنانچہ اس نے بڑے نازک موقعوں پر یہ فرائض انجام دیئے۔ پھر جب جنگ چھڑ گئی، اور میر قاسم عظیم آباد آیا، تو یہ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ اس زمانہ میں اس نے انگریزوں اور میر قاسم میں صلح کی سلسلہ جنبانی بھی کی، مگر وہ گفتگو آگے نہ بڑھ سکی۔ پھر جب میر قاسم نے انگریزوں کے قتل عام کا حکم دیا تو بڑی جرأت کے ساتھ اپنے مخلص انگریز دوست ڈاکٹر ولیم فلرٹن کی جان بخشی کرائی۔

بہرحال اس سارے دور میں اس نے میانہ روی کے ساتھ اپنا ایسا طرز عمل رکھا کہ نہ میر قاسم کو اس پر کسی گرفت کا موقع مل سکا۔ اور نہ اسے انگریزوں کی دوستی سے انکار کرنے کی ضرورت پڑی، اور تمام کام بڑی دانائی و ہوشمندی سے انجام دیئے۔ کبھی انگریزی وفد کا استقبال کیا، کبھی سفارت کی خدمت انجام دی، اور کسی موقع پر انگریز حکام سے میر قاسم کی ہدایت کے مطابق خفیہ ملاقاتیں کیں، لیکن ان تمام مراحل میں اپنا دامن ہر قسم کی گرفت سے محفوظ رکھا۔ (ص ۷۴۲ تا ۷۴۵)

پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ میر قاسم غلام حسین سے بے التفات ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ شکست کھا کر مغرب کی سمت روانہ ہوا۔

NADEEM. GAYA.
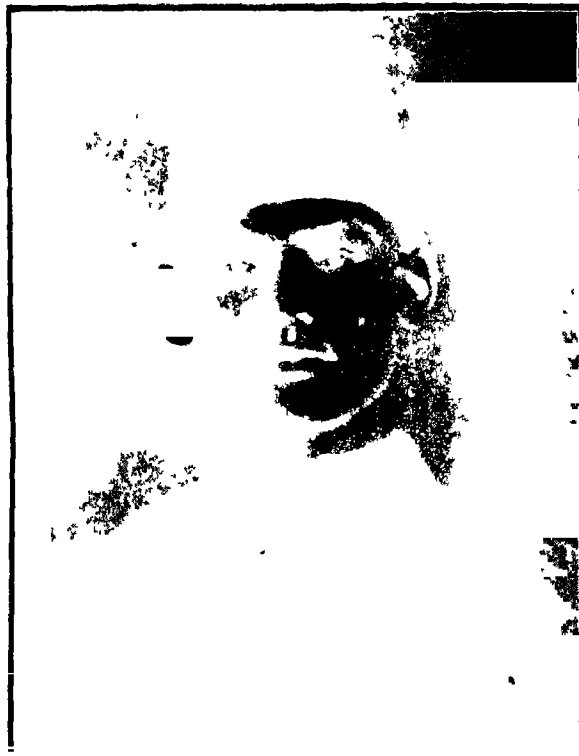
MAULANA SYED REYASAT ALI NADVI.

اور شہسرام میں ٹھہرا۔ غلام حسین بھی شکست خوردہ لشکر کے ہمراہ رہا۔ پھر میر قاسم یہاں سے مایوس ہو کر ماہ ربیع الآخر سنہ ۱۱۷۷ھ میں بنارس پہنچا۔ غلام حسین نے یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ اور وہاں پہنچ کر اپنے خسر کے یہاں ٹھہر گیا۔ میر قاسم نے غلام حسین کی اس رفاقت پر بھی شبہہ کی نظر ڈالی اور ایک معاندانہ گفتگو کے بعد اس نے لشکر میں آمد و رفت کم کر دی۔ اس کے بعد میر قاسم بندیلکھنڈ روانہ ہو گیا۔ لیکن غلام حسین پھر بھی بہار نہ لوٹا، حالانکہ اس کے خسر سید عبد العلی خاں کو میر جعفر نے دوبارہ برسر حکومت آ کر ایک ہزار روپیہ بھیج کر عظیم آباد طلب کر لیا تھا۔ (ص ۷۴۳ – ۷۴۵)

میر قاسم اور انگریزوں کی دوسری جنگ اور غلام حسین

اس کے بعد میر قاسم پانچ مہینے کے بعد ماہ رمضان سنہ ۱۱۷۷ھ میں شاہ عالم بادشاہ اور شجاع الدولہ کا لشکر لے کر بہار پر چڑھائی کرنے کے لئے دوبارہ بنارس آیا۔ اب باوجودیکہ میر قاسم سے غلام حسین کا تعلق منقطع ہو چکا تھا۔ لیکن پھر بھی جب اس کا لشکر بہار کی سمت روانہ ہوا، تو وہ بھی بنارس سے کوچ کر کے حسین آباد آیا۔ اور وہاں سے فوراً لشکر میں آموجود ہوا۔ (ص ۷۴۶، ۷۴۷)

اس جنگ کے اثنا میں وہ کسی کا ملازم نہ تھا۔ وہ کہتا ہے کہ محض لشکر کے سرداروں کے دوستانہ تعلقات سے مجبور ہو کر چلا آیا تھا۔ اسے پوری آزادی حاصل تھی۔ کہ "جہاں چاہتا وہاں جاتا"۔ اور دور سے کھڑے ہو کر جنگ کا نظارہ کرتا۔ اس اثنا میں ہدایت علی بھی شاہ عالم کی خدمت میں اداب بجالانے کے لئے لشکر میں آگئے تھے۔ (ص ۷۴۹، ۷۵۰) پھر جب شاہی لشکر شکست کھا کر واپس جانے لگا تو ہدایت علی اور غلام حسین دونوں نے بادشاہ کی شایعت کی۔ (۷۵۱)

جس طرح میر قاسم کی معیت میں غلام حسین کا بنارس تک جانا مشتبہہ تھا۔ اسی طرح اس کا بنارس میں قیام پھر لشکر کے ساتھ آنا مشتبہہ ہے وہ بلا ضرورت میدان جنگ میں کیوں آیا؟ پھر انگریزوں سے اس کی خفیہ مراسلت بھی جاری رہی، چنانچہ اس کا بیان ہے کہ اثنائے جنگ میں بعض انگریزوں سے اس کی مراسلت کا سلسلہ مستقلاً قائم رہا۔ اور ان لوگوں نے اُسے آمادہ کیا کہ بادشاہ اور انگریزوں میں صلح کرا دی جائے۔ چنانچہ واپسی کے وقت غلام حسین نے اپنے والد کے سامنے یہ راز ظاہر کیا اور کہا کہ اگر "مصالحت کرانے میں کامیابی ہو گی تو انگریزوں کا اعتماد اس خاندان پر زیادہ ہو جائے گا۔" ہدایت علی کو بھی یہ رائے پسند آئی، اور اس نے شاہ عالم کو اس کے لئے آمادہ کر لیا اور اس نے وزیر شجاع الدولہ سے چھپا کر ایک مفصل مکتوب لکھا۔ اور غلام حسین کے حوالہ کر دیا۔

لیکن غلام حسین نے عظیم آباد واپس آ کر ڈاکٹر ولیم فلرٹن اور میجر کرنک سپہ سالار افواج میں سخت باہمی اختلاف پایا۔ صلح کی یہ تحریک ڈاکٹر فلرٹن اور اس کے دوستوں کے ذریعہ سے ہوئی تھی، اس لئے میجر کرنک اُسے آگے بڑھانے پر آمادہ نہیں ہوا۔ اور صاف جواب دیدیا کہ وہ ذریعے علاوہ ہو کر صلح کرنے کے لئے تیار نہیں، بلکہ اس نے شاہ عالم کے منع کرنے کے باوجود اس کی اطلاع ایسے لوگوں کو دیدی جو شجاع الدولہ تک اس خبر کو پہنچا دیں۔ یہ غلام حسین کی قسمت کا کھیل تھا کہ ڈاکٹر فلرٹن کے اقتدار کو اچانک زوال آگیا۔ چنانچہ اس نے خاموشی سے حسین آباد کی راہ لی۔

(ص ۷۵۱، ۷۵۲)

غلام حسین کے ذریعہ انگریزوں کا قلعہ رہتاس پر قبضہ

لیکن اس کے بعد ہی عظیم آباد کے انگریزی کیمپ کی سپہ سالاری پر میجر منرو کا تقرر ہوگیا۔ اور ڈاکٹر فلرٹن معاملات حکومت میں پھر دخیل ہوگیا۔ اتفاق سے ادھر وزیر شجاع الدولہ نے میر قاسم کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کرکے اُسے گرفتار کرلیا۔ اس وقت تک مشہور قلعہ رہتاس پر میر قاسم کا عامل متعین تھا۔ میر سلیمان نے میر قاسم کی انگشتری پر قبضہ کرکے اس کی طرف سے قلعہ دار کے نام مکتوب لکھا۔ اور اس قلعہ کو شجاع الدولہ کے قبضہ میں لانے کے لئے روانہ ہوگیا۔ ادھر ڈاکٹر فلرٹن کے مشورہ سے میجر منرو نے غلام حسین کے نام مراسلہ بھجوایا کہ وہ اپنے اثر و رسوخ سے کام لیکر قلعہ رہتاس پر قبضہ دلادے کہ "انگریزوں سے اس کی دوستی زیادہ استوار ہوجائے۔" غلام حسین نے اس موقع پر پھر اپنی خیر خواہی کا ثبوت دیا۔ رہتاس کے قلعہ دار پر اس کا اخلاقی دباؤ تھا چنانچہ انگریزوں سے اس قلعہ دار کے حق میں مواعید کے چند مراسلے منگاکر اُسے اس قلعہ کو انگریزوں کے سپرد کردینے پر آمادہ کرلیا۔ اور پھر غلام حسین ہی کے مشورہ سے کرنل گاڈرڈ جو ان دنوں ٹکاری (گیا) کے نواح میں تھا، بلوایا گیا۔ اور انگریزی فوج قلعہ میں داخل ہوگئی۔

عظیم آباد میں آمد

اب غلام حسین انگریزوں کی طرف سے پھر پر اُمید ہوگیا۔ اور عظیم آباد کی روانگی کا قصد کیا۔ اگرچہ اس وقت تک شاہ عالم و شجاع الدولہ اور انگریزوں کے تنازع کا آخری فیصلہ نہ ہوسکا تھا، تاہم اس نے اپنے والد کے مشورہ سے انگریزوں سے پھر کھل کر ملجانے کا فیصلہ کیا۔ ہدایت علی کو خاموشی اختیار کرنے کا مشورہ دیا کہ اگر آئندہ جنگ میں انگریز کامیاب ہوئے تو اس کے ذریعہ سے ہدایت علی کی پوزیشن بہرحال محفوظ رہے گی۔ اور اگر شجاع الدولہ نے کامیابی حاصل کی تو وہ غلام حسین سے اپنی بے تعلقی ظاہر کرکے بری الذمہ ہوجائے گا۔ چنانچہ جب قلعہ رہتاس کے متعلق برہمی کے خطوط ہدایت علی کے نام آئے، تو انہوں نے اسی قسم کے جوابوں سے جان بچائی۔ (ص ۷۵۸)

الغرض وہ یہی فیصلہ کرکے عظیم آباد چلا آیا۔ پھر ڈاکٹر فلرٹن کی سفارش سے ریزیڈنٹ بنارس کی معیت میں اس کی تعیناتی ہوئی، اور یہاں علی حزیں سے بھی اس کی سرگرم صحبتیں رہیں۔

والد کی جانشینی

اس کے بعد ۲ رجمادی الاولی ۱۱۹۰ھ کو ہدایت علی نے وفات پائی۔ چونکہ یہ اکبر اولاد تھا، اس لئے کونسل کلکتہ کی طرف سے جاگیرداری پر اسی کا نام چڑھایا گیا۔ اور اس نے اپنے علاقہ میں مستقل توطن اختیار کرلیا۔ (۷۶۔ ۷۷)۔

اس کے بعد بھی بہار کے اعلیٰ حکام سے اس کے روابط قائم رہے۔ چنانچہ مہاراجہ شتاب رائے کے عروج کے زمانہ میں اس کی مزدوری سے اس کی معیت میں ۱۱۹۱ھ میں کلکتہ گیا۔

اس کے بعد وہ حج و زیارت کربلا کا ارادہ کرتا ہے۔ اور جاگیر کے کچھ انتظامات کے لئے کلکتہ آتا ہے۔ (ص ۷۹۰) لیکن غالباً وہ اس سفر پر روانہ نہ ہوسکا، کیونکہ تقریباً اسی زمانہ میں ۱۱۹۴ھ میں وہ اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر کرتا ہے ۶۵ ہزار روپیہ کا مقروض ہوجاتا ہے، اور مشکلوں سے سرکاری مالگذاری ادا کرتا ہے اور پھر جائیداد پر کچھ ادبار آتا ہے۔

ملازمت اور عظیم آباد

اس کے بعد وہ جنرل گاڈرڈ کی ملازمت میں داخل ہوجاتا ہے، جو ان دنوں چناڈہ کا قلعہ دار تھا، اور وہ بہت

اخلاق وعنایات کے ساتھ پیش آیا۔ لیکن یہاں کی آمدنی معقول نہ تھی، خبر ملی کہ آصف الدولہ صوبہ دار اودھ کو لشکر کی تربیت کے لئے کسی انگریز افسر کی ضرورت ہے، چنانچہ غلام حسین اپنے طور پر لکھنؤ گیا، اور اس کی کوششوں سے حکومت اودھ نے جنرل گاڈرڈ کو کونسل کلکتہ کی معرفت لکھنؤ طلب کرلیا۔ غلام حسین ۱۲ مہینے لکھنؤ میں ٹھہرا، مختار الدولہ نائب آصف الدولہ سے اس کی ملاقاتیں رہیں، حافظ رحمت خاں کے مصیبت زدہ لڑکوں سے بھی ملا۔ لیکن یہاں پورے طور پر مطمئن نہ تھا۔ آخر جنرل گاڈرڈ کے وہاں سے چلے آنے کی وجہ سے وہ بھی وہاں سے وطن چلا آیا۔ اور عظیم آباد میں قیام اختیار کیا۔ (ص ۹۳۸، ۹۴۹ - ۹۵۵) زندگی کے ان تمام مراحل کے بعد وہ قلم ہاتھ میں اٹھاتا ہے۔ اور سیر المتاخرین لکھنے بیٹھ جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ ۱۱۹۴ھ میں ایک مرتبہ کلکتہ بھی گیا۔ پھر وہاں سے عظیم آباد آیا۔ (ص ۸۱۳)

مذہب، خوش عقیدگی و اوہام پرستی غلام حسین مذہباً اثنا عشری شیعی تھا۔ اس کا اندازہ کتاب کے پہلے ہی دعائیہ کلمہ میں "والہ المعصومین" سے ہوجاتا ہے۔ نیز کتاب میں اور بہ کثرت شواہد ہیں، پھر خاندان مہابت جنگ اور اس کے لواحقین کا شیعہ ہونا معلوم و مشہور ہے، اسی طرح اس میں خوش عقیدگی و اوہام پرستی بھی پائی جاتی تھی، وہ سخت مواقع پر دیوان حافظ سے فال لیتا، (ص ۵۳۰) شدائد کے وقت شیخ علی حزیں کی کتاب سے اوراد و اذکار پڑھتا اور خاص خواہ اثر دیکھتا تھا۔ (ص ۷۱۳) یہاں تک کہ ایک مرتبہ اُسے غیب کی ندا بھی سنائی دی تھی (ص ۵۵۹)

تصنیفات سیر المتاخرین کے علاوہ اسکی دو اور کتابوں کا اور تذکرہ ملتا ہے، ایک تو اس کی مثنوی بشارۃ الامامہ ہے، جس کا تذکرہ اوپر گزرا اس کے علاوہ اس نے مثنوی مولانا روم کی شرح بھی لکھی تھی

سیر المتاخرین

سیر المتاخرین، تین جلدوں میں تقسیم ہے، جنہیں مصنف نے تین دفتروں سے تعبیر کیا ہے۔ جلد اول میں ابتداءً ایک دیباچہ ہے، جس میں یہ کتاب اس عہد کے گورنر جنرل ہسٹنگس کے نام معنون کی گئی ہے۔ پھر جلد اول کے ماخذوں کا ذکر ہے۔ پھر تصنیف کی ضرورت دکھائی ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کے عمومی حالات کا ایک تفصیلی بیان ہے۔ جسے ہندوستان کے طبعی تمدن و سیاسی جغرافیہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اس میں پہلے ہندوستان کا تعارف کرایا ہے، پھر اس کی آبادی، سرسبزی، شادابی، مساجد، معابد کا روانسرائے اور ذرائع حمل و نقل وغیرہ کا اجمالی ذکر ہے۔ پھر پھل پھول، حیوانات، علوم و فنون، مذاہب و عقائد اور رشیوں منیوں کا تذکرہ آیا ہے، اس کے بعد ہندوستان کی صوبہ وار تقسیم درج ہے۔ اور ہر صوبہ کے شہروں، وہاں کی پیداوار، صنعت، حرفت اور تجارت کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ وہاں کے فرمانرواؤں کا آغاز تا بہ عہد اسلام نقشہ مرتب کیا ہے۔ اور ہر فرمانروا کی مدت حکومت لکھی ہے۔ اس ضمن میں کابل و غزنی وغیرہ کے حالات بھی ہیں۔ یہ حصہ ۶۸ صفحوں میں تمام ہوا ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کی سیاسی تاریخ گردپانڈو کے عہد سے اورنگ زیب کے زمانہ تک درج کی ہے۔ یہ حصہ

۴۷۲ صفحہ پر تمام ہو گیا ہے۔ یعنی کل گویا تین سو صفحے ہیں۔ دوسری جلد ۴۷۲ سے ۸۴۴ صفحوں تک یعنی کل ۳۷۰ صفحوں میں ہے۔ یہ جلد سال سلطنت اورنگ زیب یعنی ۱۱۱۸ھ سے ۱۱۵۲ھ تک کے ہندوستان کی عمومی تاریخ اور پھر اس وقت سے ۱۱۹۵ھ تک کے صرف صوبہ بنگال و بہار و اڑیسہ کے مفصل حالات پر مشتمل ہے۔ اور آخر میں اس نے انگریزی نظام حکومت پر ایک مفصل بیان لکھا ہے اور انگریزی طرز حکومت پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ پھر تیسری جلد محمد شاہ کے عہد حکومت کے اس زمانے سے شروع ہوتی ہے، جہاں سے وہ بنگال و بہار کے مفصل حالات لکھنے کے لئے علیحدہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ یہ جلد ۱۱۵۲ھ سے ۱۱۹۵ھ تک ۴۳ برس کی ہندوستان کی عمومی تاریخ ہے، جو ۸۴۶ سے ۹۶۱ صفحہ پر ۱۱۵ صفحوں میں تمام ہوئی ہے۔

کتاب کا نام اور زمانۂ تصنیف

لیکن پھر ہندوستان کی پوری تاریخ لکھنے کے باوجود اس کتاب کا نام "سیر المتاخرین" کیوں رکھا گیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف نے اصل تصنیف صرف جلد دوم کو قرار دیا ہے۔ اسے ابتداءً صرف اسی حصہ کے لکھنے کا خیال پیدا ہوا تھا، کیونکہ اس وقت تک اس کی نظر سے اس زمانہ کی تاریخ میں کوئی کتاب نہیں گزری تھی۔ اس نے اس موضوع پر سب سے پہلے قدم اٹھایا اور اسی لئے اس نے اس کتاب کا یہ نام تجویز کیا۔ چنانچہ جلد دوم کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

... ... رہ نگارد کہ بعونہ تعالیٰ انجام پذیرد "سیر المتاخرین من زمان اعظم الی خمس وتسعین من المائة الثانیة عشر من الہجرة المقدسہ" مسمیٰ خواہد بود" (ص ۳۰۵)

یعنی اس کا نام "۱۱۱۸ھ سے ۱۱۹۵ھ تک کے پچھلے لوگوں کا تذکرہ" ہے۔ اس جلد کی تصنیف کا آغاز روز سہ شنبہ یکم صفر ۱۱۹۴ھ کو ہوا اور تقریباً ایک سال میں بروز یکشنبہ ۱۲ ماہ محرم ۱۱۹۵ھ اتمام کو پہنچی۔ (ص ۴۷۸، ۸۴۴)

اس کے بعد مصنف نے اس جلد کے تتمہ کے طور پر جلد سوم لکھی، جو چند مہینوں میں یوم سہ شنبہ ۸ رمضان ۱۱۹۵ھ میں تمام ہوئی (ص ۹۶۱)۔

اس تتمہ سے فارغ ہونے کے بعد اسے اصل کتاب کا مقدمہ لکھنے کا خیال ہوا، اور اس نے وہ حصہ لکھا، جو عرف عام میں جلد اول کہلاتا ہے۔ اگرچہ مصنف نے اس حصہ کے زمانہ تصنیف کے آغاز و اختتام کا ذکر نہیں کیا ہے، مگر اس نے ہندوستان کے جغرافی حالات میں صوبہ بہار کے ضمن میں ایک پل کا تذکرہ کیا ہے، جو نوتہ و پٹنہ کے درمیان پختہ سڑک پر واقع ہے، اس کے متعلق لکھا ہے۔

"ہمانجا پلے است از عہد اکبر اساس یافتہ الی یومنا ہذا کہ ہزار و صد و نود و ہفت ہجری است۔ بکمال استحکام برپاست۔ و فتورے دراں راہ نیافتہ" (ص ۱۹)

اس سے معلوم ہوا کہ ۱۱۹۷ھ میں اس نے اس مقدمہ کو لکھنا شروع کیا، اور یہ تقریباً ایک سال میں تمام ہوا ہو تو یہ کتاب ۱۱۹۸ھ کے لگ بھگ اختتام کو پہنچی۔

ماخذ سیر المتاخرین کی جلد اول کی بنا پر مشہور انگریز مصنف کیپٹن لی نے مصنف پر سرقہ کا الزام لگایا ہے، کہ یہ کتاب سبحان رائے بٹالوی کی خلاصۃ التواریخ سے مسروقہ ہے۔ مصنف پر یہ الزام عجیب ہے۔ جب کہ خود اس نے بہ تصریح یہ لکھ دیا ہے، کہ یہ حصّہ ایک فارسی تاریخ کا خلاصہ ہے (ص ۳) نیز بعض جگہ ہاشم علی کی منتخب التواریخ سے مواد اخذ کرنے کا تذکرہ کیا ہے (ص ۲۴۰) پھر پہلی جلد میں ہندوستان کے جغرافی حالات کا جو مفصل بیان ہے، اُسے ذیل کی کتابوں سے ماخوذ بتایا ہے۔

(۱) رزم نامہ ترجمہ مہابھارت مترجمہ شیخ عبد القادر و شیخ محمد سلطان تھانیسری، در عہد اکبری،

(۲) آئین اکبری نوشتہ شیخ ابو الفضل،

(۳) گل افشاں، ترجمہ سنگھاسن بتیسی متضمن احوال بکرماجیت،

(۴) پدماوت احوال رائے رتن سین مرزبان چیتور

(۵) راجاولی مصنفہ بدیا دھر مترجمہ بنا ہو رام متضمن اسمائے راجہائے ہند۔

(۶) راج ترنگی (تاریخ نہ ہزار سالہ) مترجمہ بعہد اکبری

(۷) کتب تواریخ فارسی متضمن بر احوال سلاطین اسلام ہند۔ (ص ۳)

پھر دوسری جلد کا وہ حصّہ جو بنگال و بہار و اڑیسہ کی تاریخ میں ہے۔ اور جس کے ۳۵۸ صفحات ہیں۔ اس کے اکثر اہم موقعوں پر وہ خود موجود رہا ہے۔ اور سیر المتاخرین کا یہی حصّہ اس کی اصل جان ہے، وہ دفتر حکومت سے وابستہ تھا۔ اندرونی معاملات اس کے علم میں آتے اور جس تربیت سے وہ سرزد ہوتے، ان سے آگاہ رہتا۔ دربار حکومت میں موجود رہتا۔ میدان جنگ میں جاتا۔ خفیہ گفتگوؤں میں وہ حصّہ لیتا۔ خفیہ دستاویزیں اس کے ذریعہ سے بھیجی جاتیں۔ سفارتوں پر مامور کیا جاتا۔ اور یہانتک کہ اندرون محل کی گفتگوئیں سنتا۔ (ص ۴۹۵) اسلئے جب وہ تاریخ لکھنے بیٹھا تو وہ ان تمام معلومات کا حامل تھا۔ اور اب ان کے آشکارا کر دینے میں کوئی امر مانع نہ تھا۔ چنانچہ اس نے بڑی دیانتداری سے سب کچھ صفحۂ قرطاس پر لاکر رکھ دیا۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر سیر المتاخرین نہ لکھی جاتی تو ان حالات کا بیشتر حصّہ ہمیشہ کے لئے مستور رہتا۔ اور مؤرخین کو ایک ایک گتھی سلجھانے اور کڑی ملانے میں قیاسیات کی ہزاروں عمارتیں تیار کرنی پڑتیں۔

اس طرح جن مواقع پر وہ موجود نہیں رہا، ان کے حالات اُن مستند و معزز راویوں سے سُنتا، جو مواقع پر موجود رہے تھے۔ چنانچہ اکثر مقامات پر وہ حوالہ دیتا گیا ہے۔ اور بعض جگہ تو راویوں سے اس نے حلفیہ بیان لیا ہے۔ (ص ۵۵۵،) اسی طرح اس جلد دوم اور سوم میں مرکزی حکومت دلی اور ہندوستان کی جو عمومی تاریخ ہے۔ وہ بھی مستند ذرائع سے فراہم ہوئی ہے، اس کے اہل خاندان اعظم شاہ کی فوج میں تھے۔ اور اسی زمانہ سے سیاسیات سے تعلق رکھتے۔ اور ہر قسم کی خبروں سے باخبر رہتے۔ پھر اس کے والد کے مرکزی حکومت دلی سے وابستہ ہو جانے کی وجہ سے اسے سیاسیات کے صحیح علم حاصل ہونے کا ایک قوی ذریعہ حاصل تھا۔ پھر اسے اس کے انگریز

دوستوں سے جو علی صاحب پر تھے، بہتیری خبریں ملیں، چنانچہ اکثر جگہ ان کے حوالے سے بھی واقعات درج کئے ہیں، اور خصوصاً انگریزی کیمپ کے حالات کا تو اُسے مستند علم حاصل تھا۔ پھر دلی و کلکتہ وغیرہ کے سفروں میں بھی شمالی و جنوبی ہند کے واقعات لوگوں سے سنے، اور بعض موقعوں پر خود شریک رہا۔

پایۂ استناد

اس لئے جہاں تک ذرائع و ماخذ کا تعلق ہے۔ سیر المتاخرین کا مصنف نہایت خوش قسمت مورخین میں تھا، لیکن اس کا پایۂ استناد صرف اس کی دو جلدوں دوم و سوم میں پایا جاتا ہے کہ وہ ذرائع و مواقع انہی دونوں جلدوں سے تعلق رکھتے ہیں، جو اس کی اصل تصنیف ہے، ورنہ افسوس ہے کہ اس کی پہلی جلد ہرگز لائق اعتبار نہیں۔ اس میں صرف اس کا جغرافی حصہ پڑھے جانے کے لائق ہے، باقی دوسرے حالات میں تاوقتیکہ اس کے بیان کی دوسرے مورخین کے بیانات سے تصدیق نہ ہو۔ اعتبار کے لائق نہیں، کاش یہ حصہ اس کے قلم سے اس قدر سرسری اور غیر تحقیقی نہ نکلا ہوتا کہ آج عام طور پر اس حصہ پر قیاس کرکے اس کی دوسری تیسری جلدوں پر شک و شبہ کی گنجائش نکل آتی ہے۔ اگرچہ وہ خود اس حصہ کو اپنی کتاب سے خارج قرار دے چکا ہے۔

سیر المتاخرین حق و دیانت کے ساتھ لکھی گئی، یا کتمان حق اور تلبیس و تدلیس کے ساتھ؟ اس سوال کے حل کرنے کے لئے مصنف کی زندگی کے چند پہلو سامنے آتے ہیں، ایک یہ کہ اس عہد کی سیاسیات سے اس کے خاندان والوں کا تعلق تھا۔ دوسرے اس کی شیعیت اور تیسرے انگریزوں سے اس کی دوستی ہے۔

اعزّہ کی پاسداری اور سیر المتاخرین

سیر المتاخرین کے سرسری مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے اعزّہ کی پاسداری سے بچنے کی کوشش کی، اور نہ کسی کو اس کے مرتبہ سے زیادہ بڑھایا۔ شاہ عالم کے اس لشکر میں جو بہار آیا تھا، اس کے والد اس سے زیادہ نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ ایک موقع پر اس نے لشکر کے نمایاں اشخاص کا ذکر کیا ہے۔ اس میں اپنے والد کا نام سب سے پہلے لکھا ہے لیکن اسی جگہ اس شبہہ کا ازالہ کر دیا ہے۔ کہ لکھنے میں یہ تقدم رشتۂ پدری و پسری کے باعث نہیں ہے، چنانچہ لکھتا ہے:۔

"اول والد فقیر کہ مخاطب بہ بخشی الملک نصیر الدولہ سید ہدایت علی خاں بہادر اسد جنگ بود، دوم .... ناظران این اوراق گمان نکنند کہ راقم والد خود را در صدر جمیع اسامی بنا بر پاس پدری و پسری جائے دادہ، فی الحقیقت آنست ....." (ص ۶۵۷)

شیعیت اور سیر المتاخرین

افسوس ہے کہ اس حیثیت سے مصنف کا دامن کچھ نہ کچھ داغدار ضرور ہو جاتا ہے۔ مثلاً اس نے اورنگ زیب عالمگیر کے حالات لکھنے میں سخت عصبیت برتی ہے، یہ صرف اس لئے کہ وہ جماعت شیعی میں محبوب نہ تھا، یوں تو سیر المتاخرین کی جلد اول عمومی حیثیت سے پایۂ استناد نہیں رکھتی، اور خصوصاً عالمگیر کے حالات قطعی ناقابل اعتبار ہیں۔

عالمگیر کے برخلاف جب وہ بہادر شاہ اول کے حالات لکھتا ہے، تو محض اس لئے کہ وہ مذہب شیعی کی طرف مائل تھا۔ اس کی تعریف و توصیف میں حد سے گزر جاتا ہے یہاں تک کہ اسے تمام تیموری سلاطین میں سب سے زیادہ صاحب علم و فضل قرار دیتا ہے۔ اور ذہبی زبان سے اس پر

یہ خرفگیری کرتا ہے کہ مذہب شیعی اس نے بزور شمشیر کیوں نہ پھیلایا۔ (ص ۳۸۱)

اسی طرح جب مصطفےٰ خاں اور ہیبت جنگ کی لڑائی میں مصطفےٰ خاں کی ایک آنکھ گھائل ہوجاتی ہے، تو لکھتا ہے :۔

"چوں مصطفےٰ خاں امیر المومنین علیہ السلام و جان آنجناب را بنظر کج می دید بچشم راست او چنیں آنچہ رسید و دیدا نچہ دید (ص ۵۴۱)

تاہم میرا خیال ہے کہ وہ غالی شیعہ نہ تھا۔ اور اس قسم کی عصبیت اس کی نگاہ میں پسندیدہ نہ تھی۔ چنانچہ اس نے خود اپنے چچا شاہ حیدری کے غلو رکھنے کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے۔ (ص ۶۱۲) اور غالباً شاہ حیدری اور ان کے لڑکے کے سوا اس پورے خاندان میں مذہبا غلو نہ تھا۔ چنانچہ شیعی جماعت کے متعلق یہ عرفاً معلوم ہے کہ وہ لوگ یکم محرم سے ۔ا صفر تک شادی کی تقریبیں انجام نہیں دیتے، مگر غلام حسین کی شادی ماہ محرم ہی میں انجام پائی، چنانچہ لکھتا ہے :۔

"در ماہ محرم سال پنجاہ و ہشتم از مایۃ دوازدہم با دختر خال سرا پر انفعال خود عبد العلی خاں بہادر فقیر کتخدا شد۔" (ص ۵۳۶)

انگریزوں کی دوستی کا اثر سیر المتاخرین پر

بلا شبہ مصنف اور انگریزوں کے درمیان جو گہرے تعلقات تھے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب بڑی حد تک مشتبہ کہی جاسکتی ہے، لیکن اس کے مطالعہ کے بعد یہ شبہ قائم نہیں رہ سکتا، اس نے شاید ہی کسی جگہ انگریزوں یا انگریزی حکومت کی بیجا طرفداری کی ہو، بلکہ انگریزی حکومت کے قائم ہوجانے کے بعد اس کے جو اثرات ہندوستان پر پڑے اُسے دیانتداری سے لکھا ہے۔ مثلاً اس نے دکھایا ہے، کہ "عمال کے مظالم ہوتے ہیں۔ اس ملک کی دولت یہاں خرچ نہیں کی جاتی۔ لاکھوں روپے غیر ملک ولایت انگلینڈ کو چلے جاتے ہیں۔ اور ملک میں قحط اور خشک سالی کا دار دورہ ہے، ہزاروں پیادے سوار جو فوج میں ملازم تھے اب بے روزگار ہوگئے ہیں۔ ملک میں اوّلاً افتادہ زمینیں رہ گئیں، اور جن میں کاشت کی جاتی ہے ان کا بھی کوئی خریدار نہیں ملتا۔ کہ ملک میں اشرفی کیا، روپیہ تک عنقا ہو رہا ہے۔" (ص ۷۸۳) یہ الفاظ شاید انگریزوں کی بیجا طرفداری کرنے والے کی زبان قلم سے نہیں نکل سکتے تھے۔

پھر جہاں اس نے انگریزی نظام حکومت کا مکمل خاکہ کھینچا ہے۔ حکومت کے شعبہ ہائے لشکری و کشوری کے تفصیلات بیان کئے ہیں۔ وہیں اس نے "وہ اسباب بھی دکھائے ہیں، جن سے ملک میں تباہی و ویرانی پھیلی" اور انگریزی حکومت اور قدیم ہندوستانی حکومت کا موازنہ کیا ہے۔ سیر المتاخرین کا یہ باب بہت اہم ہے، اس میں اس نے دکھایا ہے، کہ حکمراں طبقہ، ہندوستانیوں سے میل جول نہیں رکھتا، ان سے بیگانہ رہتا ہے۔ اعلیٰ ملازمتیں ہندوستانیوں کے پاس باقی نہیں رہ گئیں۔ مقدمات دائر کرنے میں سخت مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ اور کثیر مصارف ہوتے ہیں۔ ملکی پیداوار اور مالیات کے محاصل و منافع ہندوستانیوں کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جرائم پر سنگین سزائیں دیجاتی ہیں، اور بعض سنگین جرائم ان کے قانون میں سرے سے جرائم ہی نہیں ہیں۔ اور زبان کی حیثیت کی وجہ سے دشواریاں ہوتی ہیں۔

انگریزی حکومت کے متعلق مصنف کے یہ بیانات بیحد اہم ہیں۔ یہ خیال صحیح نہیں کہ مصنف کے خیال میں یہ کتاب انگریزوں کی نظر سے نہیں گذری، کہ ہندوستان میں پریس میں چھپنے کا اس وقت رواج نہ تھا۔ جیسا کہ برٹش میوزیم کی فہرست اور تاریخ ہند ایلیٹ میں لکھا گیا ہے، بلکہ

میرے خیال میں مصنف نے محض دیانتداری سے جو بات اس کی سمجھ میں آئی ۔ وہ لکھ دی ہے۔ اور اس کا امکان موجود تھا کہ کتاب کے مباحث و معلومات اس عہد کے گورنر جنرل کے کانوں تک پہنچتے ۔ اور اسی لئے اس نے یہ کتاب اس کے نام سے معنون کی ، اور اس کے متعلق لکھا کہ وہ تاریخ ہند کا قدر داں ہے ۔ اور اس موقع پر تنا میں بڑھا کر تا ہے لیکن چونکہ اس نے جو کچھ لکھا وہ دیانتداری اور نیک نیتی سے لکھا ۔ اس لئے کسی مصنف مزاج انگریز کے لئے بھی یہ ممکن نہ تھا کہ وہ مصنف کی نیت پر حرف گیری کرتا ۔

چند دیگر خصوصیات سیر المتاخرین کے مذکورۂ بالا امور کے علاوہ اس کے چند دیگر خصوصیات اور بھی ہیں ۔ مثلاً وہ روایات پر نقد و نظر رکھتا ہے ۔ مثلاً فرخ سیر کی موت پر تفصیلی بحث ص ۴۱۹) مہموں کے اسباب و وجوہ بیان کرتا ہے ۔ اور ان پر رائے زنی کرتا ہے (مثلاً ص ۵۰۶،۴۰۳) معاصر تاریخی شخصیتوں میں موازنہ کرتا ہے اور ان کے اخلاق و عادات و کردار کا ایک دوسرے سے فرق دکھاتا ہے ۔ (مثلاً ص ۵۹۹) ہر دور کے باکمال علما ، اہل علم اور مشاہیر صوفیہ وغیرہ کا بھی تذکرہ کرتا ہے (مثلاً ۲۲ - ۲۲۷) کتاب میں کہیں کہیں ادبی لطافت ، نکتہ آفرینی اور عبرت و موعظت کے لئے اپنا کوئی شعر درج کر دیتا ہے ۔ اور یوں تو پوری کتاب کی زبان صاف اور سلیس اور عام فہم فارسی ہے ۔

انگریزی ترجمے اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ہو چکا ہے ۔ اس کا پہلا ترجمہ ایک فرانسیسی نومسلم مصطفےٰ نے کیا ہے ، جو ہندوستان میں ملازم تھا ۔ اور فرانسیسی علاوہ ، انگریزی ، فارسی اور ہندوستانی زبانیں جانتا تھا ۔ لیکن اس کا ترجمہ زبان کے نقائص سے خالی نہ تھا ۔ یہ ترجمہ ۱۷۸۹ء میں شائع ہوا ۔ پھر جنرل برگس نے اُسے ۱۸۳۲ء میں لندن سے شائع کیا ۔

پھر جنرل برگس نے خود اس کی پہلی جلد کا ترجمہ کیا ۔ لیکن جا بجا اصل میں ترمیم و تنسیخ کی ۔ یہ جلد بھی شائع ہوئی ۔ پھر صوبہ بنگال کے متعلق جو کچھ اس میں مواد ہے ، اسے اسکاٹ نے ترجمہ کر کے اپنی تاریخ دکن میں شائع کیا ۔

اُردو ترجمے سیر المتاخرین ، اُردو زبان میں بھی منتقل ہو چکی ہے ۔ اس کا پہلا ترجمہ مولوی بخشش علی نے " اقبال نامہ " کے نام سے کیا ۔ جس کا تذکرہ تاسی نے اپنے خطبہ میں کیا ہے ۔ پھر مرآۃ السلاطین کے نام سے بھی اس کا دوسرا اُردو ترجمہ شمس المطابع دہلی سے معور شائع ہوا ۔

سیر المتاخرین کے اڈیشن سیر المتاخرین ابتداءً کلکتہ سے کئی بار شائع ہوئی ۔ پھر ۱۸۳۶ء میں اس کا ایک عمدہ نسخہ چھپا ، اس کے بعد نولکشور نے اسے کئی بار چھاپا ۔ ۱۸۹۷ء میں بھی اس کا ایک اڈیشن اس مطبع سے شائع ہوا ۔

وفات و آلِ اولاد ؟ غلام حسین کے یہ حالات اس کی سیر المتاخرین سے اسی کی زبانی لکھے گئے ، اس تصنیف کے بعد وہ کتنے دنوں زندہ رہا ؟ کتنے بال بچے تھے ؟ کس سنہ میں اس نے وفات پائی ؟ کہاں سپرد خاک کیا گیا ؟ افسوس کہ ہمیں یہ حالات وان چند کتابوں کے سرسری مراجعہ کے باوجود معلوم نہ ہو سکے ۔ جو متاخرین نے لکھی ہیں اور ہمارے پیش نظر ہیں ۔

البتہ شاد مرحوم عظیم آبادی نے اپنی تاریخ صوبہ بہار میں اس کے والد سید ہدایت علی اور اس کے بھائی سید نقی علی خاں بہادر کا تذکرہ کیا ہے ، اور اسی ضمن میں انہوں نے نقی علی خاں کے نواسہ سید ولایت علی خاں بہادر کا ذکر کیا ہے جنہیں ۱۸۶۶ء میں سی آئی ای کا خطاب اس وقت ملا جب بہت کم ہندوستانیوں کو ملتا تھا ۔ اس خاندان کے

غزل

از حضرت جمیل مظہری

جب خاک ہی ہونا تھا مجھکو تو خاکِ رہِ صحرا ہوتا
اک کوششِ پیہم تو ہوتی اٹھتا ہوتا گرتا ہوتا

موتی بننے سے کیا حاصل جب اپنی حقیقت ہی کھو دی
قطرے کے لئے بہتر تھا یہی قلزم بنتا دریا ہوتا

محویّت تھی کیفیت تھی خودداری عشق کی فطرت تھی
چھپنے کی جب اُسنے کوشش کی تو ہم نے کیوں دیکھا ہوتا

سینے میں تمناؤں کی خلش مضراب ہے سازِ ہستی کا
ہوتی نہ اگر گرمیٔ طلب بازارِ جہاں سونا ہوتا

ہستی ہے جدائی سے قائم جب وصل ہوا تو کچھ بھی نہیں
دریا سے اگر ہوتا نہ جدا قطرہ کیونکر قطرا ہوتا

قطعہ

اے وہ کہ بہت توڑیں تو نے فطرت کی پہنائی زنجیریں
جو زنجیریں خود پہنی ہیں اے کاش انہیں توڑا ہوتا

تخیل غلط آزادی کی جب فطرت خود آزاد نہیں
آزاد اگر ہوتی فطرت تو آسکا نتیجہ کیا ہوتا

پابند نہ ہوتی گر یہ زمیں سورج سے جا کر مل جاتی
پابند نہ ہوں گر موجیں ساحل کی جگہ دریا ہوتا

پابند نہ ہوتے گر تارے تو آپس میں ٹکرا جاتے
سارا یہ "طلسم ارض و سما" اک پل میں ٹوٹ گیا ہوتا

پابند نہ ہوتی گر یہ ہوا چلتی اک ایسی تیز آندھی
ذرات میں اک ہلچل ہوتی "شیرازہ کل" بکھرا ہوتا

"گرمیٔ عمل" محدود رہے ہے "فلسفۂ اخلاق" یہی
اے کاش حقیقت کو تو نے زنجیروں کی سمجھا ہوتا

آزادیٔ مطلق لعنت ہے۔ ہوتا جو سکوں آزادی میں
زنجیروں کا خلعت انساں نے خود شوق سے کیوں پہنا ہوتا

ہر بات جمیلِ زار کی ہے تدبیر بقا تعلیم عمل
خاموش سہی خوددار سہی تم نے تو کبھی چھیڑا ہوتا

چینی آئینہ

(از جناب سید ابن الحسن صاحب فکر ایم۔ اے آر وی)

> کبھی کبھی چینی آئینہ میں دھندلی تصویریں حرکت کرتی ہوئی نظر آتی تھیں ...... لیکن ایک روز یہی تصویریں اصلی انسانوں کے پیکر میں مبدل ہو گئیں اور قدیم عجائبات کی دوکان کا عجیب و غریب راز افشا ہو گیا۔

ڈینیشیا کے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ ملازمت تلاش کرے۔ دنیا میں اس حسین دوشیزہ کا کوئی سرپرست نہ تھا۔ رشتہ داروں میں صرف ایک بڑی بہن تھی جو شادی کرنے کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ چلی گئی تھی۔ ڈینیشیا کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا اور اس کے تمام متعلقات زندگی اور اس کی تمام راحتوں کا دروازہ اس پر بند ہو گیا ہے۔ وہ ملازمت کی تلاش میں نکلی تھی مگر اس اقتصادی بدحالی کے دور میں ملازمت کہاں ملتی ہے! وہ پریشانی اور سراسیمگی کے عالم میں بمبئی کی سڑکوں اور گلیوں میں پھر رہی تھی۔ سیکڑوں آدمی اس کے قریب سے گذر جاتے تھے مگر اس کاروباری بھیڑ بھاڑ میں بھی وہ ایسی تنہا اور بے پناہ تھی کہ اسے اپنے وجود کا احساس تک باقی نہ رہا تھا۔ وہ کہیں کہیں ٹھہر کر ایک نہ دیکھنے والی نگاہ سے راہگیروں کو دیکھ لیتی تھی اور اپنی دھن میں آگے بڑھ جاتی تھی۔ دوپہرے چلتے چلتے سہ پہر آ گئی۔ وہ بہت تھک گئی۔ اس کے پیر دکھنے لگے۔ بھوک کا حملہ بھی شروع ہوا مگر اس کی جیب میں ایک پیسہ نہ تھا۔ وہ اپنے مختصر اندوختہ کی آخری کوڑی تک خرچ کر چکی تھی۔ وہ چل رہی تھی مگر بلا ارادہ اور آگے بڑھتی تھی مگر کوئی مقصد اسے نظر نہیں آتا تھا۔ اسی حالت میں وہ ایک گلی کے اندر داخل ہوئی جو تنگ تھی اور شام قریب ہونے کے باعث اونچے مکانات کے سایہ سے تاریک بھی ہو رہی تھی۔ اس لمبی اور پتلی گلی میں بدنما عمارتیں، چند گودام اور پرانی چیزوں کی متعدد دوکانیں تھیں ڈینیشیا نے اس گلی کا تقریباً نصف حصہ طے کیا تھا کہ یکایک اس کی نگاہ ایک تختی پر پڑی جو ایک پرانی گرد آلود دوکان کے دروازے پر آویزاں تھی اور اس پر یہ لکھا ہوا تھا۔

"اس دفتر میں ایک نوجوان لیڈی ملازمہ کی ضرورت ہے"

دوکان کے بدرنگ سائن بورڈ پر "مسز ہنٹر ــــ قدیم اشیا اور عجائبات" بڑے بڑے حروف میں تحریر تھا اور حروف بھی

امتداد زمانہ کے باعث مٹنے کے قریب تھے۔

وینیشیا کے دل میں اس دوکان کے متعلق کچھ شبہات پیدا ہوئے۔ اس کا دل امید اور ڈر کے مخلوط جذبہ سے دھڑک رہا تھا۔ مگر ملازمت کی اسے فوری ضرورت تھی۔ اس نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ اندر سے ایک بوڑھی عورت نمودار ہوئی جسے دیکھتے ہی وینیشیا کو ایسا معلوم ہوا جیسے مکڑی اپنے جال میں پھنسی ہوئی مکھی کی طرف قدم بڑھا رہی ہو۔ اس ضعیفہ کی بھویں بہت گھنی تھیں اور چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ وینیشیا کو اس کی طرف کوئی کشش نہ ہوئی مگر ضرورت بہر حال ضرورت ہے اور کاروباری معاملات میں خیالی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کو دخل نہیں ہوتا۔ وینیشیا اندر داخل ہوئی اور تھوڑی سی گفت وشنید کے بعد اس دوکان میں ایک معمولی تنخواہ پر اس شرط کے ساتھ ملازم رکھ لی گئی کہ چیزوں کی فروخت پر اسے کچھ کمیشن بھی دیا جائے گا۔

ملازمت کے چند دنوں بعد ہی وینیشیا کو معلوم ہو گیا کہ سامان کی فروخت پر کمیشن کی رقم بہت قلیل نکلی ہے۔ بلکہ اسے تو اس بات پر حیرت تھی کہ اس دوکان میں چیزوں کی فروخت ہی بہت کم ہوتی ہے۔ گاہک اکثر آیا کرتے تھے مگر کوئی کچھ خریدتا نہ تھا جو لوگ دوکان میں داخل ہوتے تھے پہلے ذرا ٹھہر کر ادھر اُدھر دیکھ لیتے تھے اور اندر آتے ہی مسز ہنٹر کو پوچھتے ہوئے سیدھے اس بڑھیا کے کمرہ میں جو دوکان کے عقب میں واقع تھا چلے جاتے تھے۔ ان گاہکوں کے بھی چہرے زرد اور آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے۔ وینیشیا کو کبھی کبھی یہ خیال گذرتا تھا کہ شاید مسز ہنٹر غریب شرفا کو قرض دینے اور چیزیں گرو رکھنے کا کچھ کام بھی کرتی تھی۔

دوکان کی حالت سے ظاہر تھا کہ اس کی طرف کبھی کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ تمام چیزیں گرد آلود تھیں اِدھر اُدھر بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ اور ان کے بیچنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی جاتی تھی۔ اور ان میں بعض ایسے قدیم عجائبات بھی تھے جو بیش قیمت معلوم ہوتے تھے۔

انہیں چیزوں میں ایک بڑا چینی آئینہ تھا جو ایک خوبصورت طلائی رنگ کے چوکھٹے میں جڑا ہوا تھا اور جس کے حاشیہ پر انگور کی خوبصورت بیلیں منقش تھیں۔ وینیشیا نے کباڑ خانہ سے اس آئینہ کو باہر نکال کر اچھی طرح صاف کیا اور دوکان کی کھڑکی کے پیچھے ایک نمایاں جگہ پر آویزاں کر دیا۔ اس آئینہ سے دوکان میں کسی قدر رونق تو ہو گئی لیکن وینیشیا نے بعد محسوس کیا کہ کسی اندرونی وہم کے باعث اس کی موجودگی اُسے ناپسند ہے۔ خواہ وہ کسی کام میں مشغول ہوتی مگر اسے ایسا معلوم ہوتا کہ آئینہ ایک مقناطیسی کشش سے اس کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ وہ کوششوں کے باوجود اپنی نظر اس آئینہ سے ہٹا نہ سکتی اور کبھی کبھی چند دھندلی تصویریں اس کے اندر حرکت کرتی ہوئی دکھائی دیتیں۔ کبھی ایک عورت آرام کرسی پر بیٹھی ہوئی اور کوئی دوسرا

شخص اس کے پاس جھکا ہوا نظر آتا۔ وینیشیا جب اس آئینہ کو اور اس کے اندر ان متحرک تصویروں کو دیکھتی تھی تو ڈر جاتی تھی۔ دل کو سیکڑوں بار سمجھانے اور مضبوط بنانے کے باوجود وہ اس جذبۂ خوف کو اپنے دماغ سے دور نہ کرسکی جب وہ اپنی نگاہ کو آئینہ کی طرف سے ہٹاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ مقناطیس سے لوہا بہ مشکل الگ کیا جارہا ہے۔

"یہ بہت برا معاملہ ہے!" وینیشیا نے ایک روز اپنے دل سے کہا۔ "مجھ میں عصبی کمزوری پیدا ہوتی جارہی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ جلد کوئی گاہک اس چینی آئینہ کو خرید کر یہاں سے لے جاتا!"

دنیا کے بعض واقعات اس درجہ حیرت انگیز ہوتے ہیں کہ یہاں پر اگر یہ کہا جائے کہ انسان کا خیال خالق ہے اور حالات اس کے مخلوق ہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ وینیشیا کے دل میں اس خیال کا آنا تھا کہ دفعتاً اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی اور ایک گاہک اندر داخل ہوا۔ یہ گاہک مسٹر منٹر کے دوسرے گاہکوں کی طرح زرد رو اور پریشان حال نہ تھا' بلکہ جوان' تندرست' خوبصورت اور خوش پوش تھا۔ اس کی رگوں میں حیات کی برقی لہریں دوڑ رہی تھیں' اور عضو عضو سے زندگی اور زندہ دلی نمایاں تھی۔

"کیا میں پیتل کا گلدان دیکھ سکتا ہوں؟" اس نے ایک دلکش آواز میں خوشگوار انداز سے کہا۔ "میں اسے خریدنا چاہتا ہوں"

وینیشیا ایک تشکرانہ ادا سے "ہاں" کہہ کر گلدان کو اٹھا لانے کے لئے بڑھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نو وارد شخص اس گلدان کو دیکھنے کے بہانے خود وینیشیا کے گلزار حسن کو دیکھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس تنگ و تاریک گلی کی اس مشتبہ دوکان میں وینیشیا جیسی شریف معصوم اور حسین لڑکی کا ہونا بجائے خود اس قدیم عجائبات کی دوکان کا سب سے بڑا عجوبہ تھا۔

اس شخص نے گلدان خرید لیا اور اس کے بعد کوئی دن ایسا نہیں گذرتا کہ وہ کوئی نہ کوئی معمولی سی چیز خریدنے کیلئے وہاں نہ آتا ہو۔ اس کا نام رابنسن تھا اور جب وینیشیا اور اس کے درمیان خاصی راہ و رسم پیدا ہوگئی تو اس نے بتلایا کہ وہ ایک مشہور اخبار کے دفتر میں مضمون نگار اور رپوٹر کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔

تقریباً ایک ماہ تک اسی طرح آنے جانے کے بعد رابنسن جب ایک روز دوکان میں آیا تو وہ وینیشیا نے اپنی حماقت اور اپنے اوہام پر ہنس ہنس کر اس سے چینی آئینہ کے تمام حالات کہہ سنائے۔

"ہاں۔ ہاں ممکن ہے" رابنسن نے جواب دیا۔ "بہت ممکن ہے اس میں کوئی راز ہو۔ از منہ وسطیٰ میں چین میں بعض عجیب و غریب واقعات ہوئے تھے اور تاریخ کے صفحات کہتے ہیں کہ اکثر پراسرار چیزیں آج تک پردۂ راز میں ہیں۔ ممکن ہے اس آئینہ نے بھی ان میں سے بعض واقعات دیکھے ہوں۔ میرے عقائد ان چیزوں کے متعلق بہت وسیع ہیں۔ اسکا کوئی سبب نہیں کہ کبھی ہیبت ناک قتل و تشدد' یا خفیہ تعشق و تعلق کے کسی عمل کا منظر اس طرح کی بیجان چیزوں کے حافظہ میں باقی نہ رہ جائیں۔۔۔۔

حافظہ بھی ایک طرح کا عکس ہے جو بعض جاذب اشیاء کی سطح پر رقم کردہ جاتا ہے۔ جب آواز گراموفون رکارڈ پر منعکس ہو کر دوبارہ پیدا ہوسکتی ہے تو یہ کون سی تعجب کی بات ہے کہ ایک آئینہ میں کسی قدیم منظر کا عکس رہ گیا ہو اور اتنے دنوں کے بعد پھر نمایاں ہوتا ہو۔ ------ کیا اچھا ہو اگر میں خود اس قدیم چینی آئینہ کو خرید لوں۔ مجھے یہ پسند ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم کو اسکی ناپسندیدہ اور پریشان کن موجودگی سے نجات مل جائے گی۔"

اس خلوص و خیر خواہی کے جذبہ نے وینیشیا کے دل پر بڑا اثر کیا۔ رابنسن نے اپنے ہاتھوں سے آئینہ کو دیوار سے اُتار لیا اور اچھی طرح دیکھ بھال کر کہا۔ "میں اسے ابھی خرید لیتا ہوں۔ مگر دو تین روز تک اسے یہیں چھوڑ دونگا۔ آج میں شہر سے باہر ایک حادثہ کی رپورٹ لینے جارہا ہوں۔ اخبار کی نامہ نگاری کا کام بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ بہر حال میری واپسی تک اس آئینہ کو یہیں رہنے دو۔"

"لیکن دیکھئے۔ کہیں لاپتہ نہ ہو جائے گا" خوبصورت وینیشیا نے ایک دلنواز تبسم کے ساتھ کہا

"کیا خوب"! رابنسن نے مزاحیہ انداز میں جواب دیا۔ "مجھے تو یہ ڈر ہے کہ میری واپسی تک کہیں خود تم، یہ دوکان اور سب کچھ غائب نہ ہو جائے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک خوشگوار خواب دیکھ رہا ہوں۔"

اس اشارہ سے وینیشیا کسی قدر سہم سی گئی۔ رابنسن کے جانے کے بعد وہ کچھ مغموم رہنے لگی۔ اس سے پہلے وینیشیا نے محسوس نہ کیا تھا کہ روزانہ رابنسن کا دوکان میں آنا اُس کے لئے کیسی روحانی مسرت کا باعث تھا اور اُس کی آمد انتظار کتنا خوشگوار ہوتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے حالات میں دل کے تعلق کا احساس جُدائی کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ ملاقات کی رنگینیاں ابتدائی جذبات کو چھپائے رہتی ہیں اور جدا ہوتے ہی یہ جذبات اُبھر کر ایک نمایاں حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اب اسے تنہائی کا احساس اور دوری کی تکلیف ستانے لگی۔ وہی چینی آئینہ جو کل تک ایک خوفناک اور ناگوار ساتھی تھا اب رابنسن کی ملکیت ہو جانے کے بعد اس کی ایک خوشگوار یادگار بن گیا۔ لیکن اس خیال سے کہ رابنسن جلد آکر اس آئینہ کو لے جائے گا۔ وینیشیا نے اسے پھر دیوار پر نہ لگایا بلکہ جہاں پر رابنسن نے اپنے ہاتھوں سے رکھ دیا تھا وہیں رہنے۔

دوکان کی مالک بوڑھی مسز ہنٹر کبھی کبھی لیچی سے کراچی جایا کرتی تھی اور واپس آنے پر گھنٹے دو گھنٹے تک دوکان کے پیچھے والے کمرے میں تنہا بیٹھ کر کچھ کام کیا کرتی تھی۔ دوکان کے لئے جو دو چار پرانی چیزیں وہ اپنے سوٹ کیس میں رکھ کر لاتی تھی، انکو دیکھ کر وینیشیا کو حیرت ہوتی تھی، کیونکہ یہ چیزیں اتنی قیمت کی بھی نہ ہوتی تھیں کہ ان سے مسز ہنٹر کو منافع تو ایک طرف صرف آمد رفت کا کرایہ بھی نکل سکے۔ اس مرتبہ مسز ہنٹر جب واپس آئی تو وینیشیا کو یاد آیا کہ اس نے چینی آئینہ کے فروخت ہو جانے کی

اطلاع مسز ہنٹر کو نہیں دی ہے۔ اس خیال سے کہ ایسا نہ ہو خود مسز ہنٹر اس آئینہ کو کسی دوسرے گاہک کے ہاتھ بیچ ڈالے وینیشیا نے ضروری سمجھا کہ فوراً اطلاع دیدی جائے۔ اس نے قریب جا کر مسز ہنٹر کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور جواب ملنے سے پہلے ہی کمرے میں داخل ہو گئی۔

"مسز ہنٹر میں نے آپ کے مینی آئینہ کو ...."

ابھی یہ الفاظ وینیشیا کے منہ سے نکلے بھی نہ تھے کہ وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے کی طرف ہٹی۔ مسز ہنٹر دفعتاً لال پیلی ہو کر غصہ میں تھرتھراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور اُس سوٹ کیس کو جسے کھول کر وہ اس کے اندر کی چیزوں کا معائنہ کر رہی تھی۔ فوراً بند کر دیا۔ اس کی طیش آلود، غضب ناک، مشکوک اور پرخوف نگاہوں نے وینیشیا کو ہیبت زدہ کر دیا۔

"تم یہاں کیوں آئیں؟" مسز ہنٹر نے لال لال آنکھیں نکال کر پوچھا۔ کیا ابتک تم کھانا کھانے نہیں گئی ہو؟"

مسز ہنٹر کا چہرہ غصہ سے قوس قزح بنا ہوا تھا۔ متعدد رنگ آتے تھے اور جاتے تھے۔ اتنا کہہ کر وہ آپے سے اسقدر باہر ہو گئی کہ منہ میں زبان حرکت نہ کر سکی۔ وینیشیا حیرت زدہ تھی کہ یہ کیا ہو گیا۔

"معاف کیجئے۔ مجھے بہت افسوس ہے" وینیشیا نے کہا "میں صرف اتنا کہنے آئی تھی کہ مینی آئینہ فروخت ہو گیا ہے اور اسے لے جانے کے لئے گاہک کا آدمی آنے والا ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ اپنا سامان دیکھ رہی ہیں"

اس آخری فقرے اور "سامان" کے لفظ پر مسز ہنٹر نے پر شبہہ نگاہوں سے وینیشیا کو دیکھا۔ وینیشیا کو یقین ہو گیا کہ اس نے یہ دوسری غلطی کی۔ پہلی ہی نظر میں اس نے مسز ہنٹر کے سوٹ کیس کے اندر کی چیزوں کو دیکھ لیا تھا۔ اس میں بہت سی چھوٹی چھوٹی شیشیاں تھیں جن پر سرخ رنگ کے لیبل لگے ہوئے تھے۔

"غالباً یہ بغیر لائسنس کی ناجائز منشیات ہیں" وینیشیا نے اپنے دل سے کہا "میں کیسی بیوقوف تھی کہ اب تک مسز ہنٹر کے اس کاروباری راز کو نہ سمجھی تھی"

اسی ایک واقعہ نے وینیشیا کے تمام خیالی معمے حل کر دئے۔ دوکان کی چیزوں کی طرف سے غفلت، ہر ہفتہ دو ہفتہ پر مسز ہنٹر کا خفیہ سفر اور زرد چہروں، نرالے وحشت زدہ اور مریض صورت گاہک اب یہ تمام اسرار وینیشیا پر ظاہر ہو گئے۔ اسکو افسوس ہوا کہ ایسے وقت میں رابنسن نے کیوں اسکا ساتھ چھوڑ دیا۔ اگر وہ ہوتا تو اس سے مشورہ کر کے اپنے لئے کوئی راہ عمل نکالتی۔

وینیشیا مسز ہنٹر کے کمرے سے نکل کر ایک ہوٹل میں کھانا کھانے چلی گئی۔ وہاں سے واپس آنے پر اس نے دیکھا کہ مسز ہنٹر کی وہ خفگی باقی نہیں ہے۔ اور اس کی گفتگو اور اطوار نے ایک طمانیت بخش صورت اختیار کر لی ہے۔ وینیشیا کو اسکا بھی یقین ہو گیا کہ مسز ہنٹر کو یہ معلوم نہیں ہے کہ میں اس کے مجرمانہ آلودہ راز سے واقف ہو چکی ہوں۔

"مس وینیشیا" مسز ہنٹر نے ایک بااخلاق انداز سے کہا" کیا آج شام کو تھوڑی دیر ٹھہر کر دوکان کی چیزوں کو صاف اور درست کرنے میں تم میری مدد کرسکو گی"؟

"ہاں ہاں۔ بڑی خوشی سے"۔ وینیشیا نے جواب دیا" میں خود بھی چاہتی تھی کہ دوکان کا سارا سامان بہتر انداز یاں طریقہ پر سجادیا جائے۔ میں پانچ بجے صرف چائے پینے جاؤنگی اور واپس آکر آپ جتنی دیر تک کہیں گی ٹھہر کر آپ کی امداد کرونگی۔

وینیشیا جب چائے پینے گئی تو ہوٹل سے براہ راست سی۔ آئی۔ ڈی پولیس کے دفتر میں پہنچی اور جس آفسر سے اس نے عجائبات کی دوکان کے پراسرار حالات بیان کئے اس نے ہمدردی سے اس کی باتیں سنیں۔

"ہاں" اس افسر نے جواب دیا" وہ دوکان ایک مدت سے ہماری نگرانی میں ہے۔ اگر میں آپ کی جگہ پر ہوتا تو وہاں ملازمت نہ کرتا۔ بہتر ہے آپ جلد وہاں سے الگ ہوجائیں۔ بہرحال۔ دیکھا جائے گا۔ اب آپ جاسکتی ہیں"۔

واپسی کے وقت وینیشیا کے دل کو تقویت اور مسرت دونوں حاصل تھی۔ کیونکہ اسکا دماغی بوجھ ہلکا ہوچکا تھا۔ وہ دوکان میں پہنچی تو شام ہوچکی تھی اور مسز ہنٹر اسکا انتظار کر رہی تھی۔

"چلو۔ پچھلے کمرے سے اپنا کام شروع کریں"۔ یہ کہہ کر مسز ہنٹر نے دوکان کا دروازہ اندر سے بند کردیا۔ وینیشیا کے دل میں دفعتاً کچھ شبہہ پیدا ہوا۔ مگر قبل اس کے کہ وہ کوئی فیصلہ کرسکے' مسز ہنٹر نے اسکا ہاتھ پکڑ کر اندر کی طرف کھینچا۔ دفعتاً ایک قوی ہیکل شخص نے دوکان کے ایک تاریک گوشہ سے نکل کر زور سے اس کے دونوں بازو پکڑلئے اور دھکا دیکر اسے دوکان کی پیچھے والی کوٹھری میں لے گیا۔ اس کی سخت گرفت سے نازک وینیشیا کے بازو ٹوٹے جارہے تھے۔ اس نے چیخنا چاہا مگر مسز ہنٹر نے زور سے اسکا منھ بند کردیا۔ اس نے رہائی کے لئے جدوجہد کرنی چاہی مگر اس دیوپیکر مرد نے دھکا دیکر اسے آرام کرسی پر ڈال دیا اور اس کے دونوں بازو کرسی کے بازؤں سے باندھدئے۔ اب بے دست وپا وینیشیا بالکل دہشت زدہ اور خاموش تھی۔ برقی سرعت کے ساتھ طرح طرح کے خیالات اس کے دل میں آنے لگے۔ رابنسن نے ایسا کیوں کہا تھا کہ ایسا نہ ہو میرے آنے سے پہلے تم یہ دوکان اور سب کچھ لاپتہ ہوجائے۔ کیا یہی اسکا پیش خیمہ ہے۔ اب میں کیا ہوجاؤنگی! کیا واپس آکر وہ مجھے تلاش کریگا۔ کیا کوئی شخص اس دنیا میں اب میری خبر لے گا!

وینیشیا کے منھ سے ایک آہ نکلی۔ اس نے محسوس کیا کہ رومال میں رکھ کر کوئی ایسی دوا اُسے سنگھائی جارہی ہے جس سے اس کے ہوش دفعتہً رفتہ چلے جارہے ہیں۔ اسکا دماغ چکرانے اور دل ڈوبنے لگا اور اسکی آنکھوں کے سامنے تاریکی کی ایک ہیبت ناک چادر پھیلتی ہوئی معلوم ہوئی۔

اسی شام کو ایک موٹر کار اس تنگ و تاریک گلی کے سرے پر پہنچکر رُکی۔ رابنسن اس میں سے نکل کر دوکان کی طرف چلا۔ اسے خیال تھا کہ اسوقت دوکان بند ہو چکی ہوگی اور ممکن ہے وینیشیا وہاں نہ ہو۔ پھر بھی دوکان کے دروازے پر پہنچکر جب اسے پیچھے کے کمرے سے روشنی کی جھلک دکھائی دی تو وینیشیا سے ملنے کی ایک موہوم امید میں اس نے شیشے کی کواڑ کو اندر کی طرف دھکا دینا چاہا۔ مگر دروازے کو بند پاکر اس نے واپس ہو جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ مڑ کر وہاں سے چلنا ہی چاہتا تھا کہ یکایک اس کی نگاہ دروازے کے شیشے سے گذر کر چینی آئینہ پر جا پڑی۔ اس کی سطح غیر معمولی طور سے چمک رہی تھی۔ ہوش مند اور تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس آئینہ کے اندر تصویریں حرکت کر رہی ہیں۔ اسوقت یہ تصویریں ایسی دھندلی نہ تھیں جیسا کہ وینیشیا نے اس سے بیان کیا تھا، بلکہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ ایک عورت اور ایک مرد کسی دوسری عورت پر جھکے ہوئے تھے اور اس عورت کے جسم کا نصف حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ دفعتًا رابنسن کو کچھ خیال آیا۔ اس کے دماغ کا طلسم ٹوٹ گیا۔ اس نے کوٹ اتار کر اپنے داہنے ہاتھ پر لپیٹا، ایک ضرب سے شیشہ کا دروازہ توڑ دیا، اور پولیس کو بلانے کے لئے زور سے سیٹی بجاتا ہوا دوکان میں داخل ہو گیا۔ چند سپاہی گلی کے نکڑ سے دوکان کی طرف دوڑ پڑے ـ ـ ـ ـ ـ

"اب تمہاری طبیعت اچھی ہے، پیاری؟" ایک محبت آمیز آواز نے وینیشیا کو گہری بیہوشی کی تاریکی سے ہوش وحواس کی روشنی میں آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "میں تمہارے پاس پہنچ گیا ہوں۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔"

رابنسن کو دیکھ کر وینیشیا کے مغموم اور دلآویز چہرے پر ایک ہلکا سا تبسم نمایاں ہوا۔

"یقینًا میری ذرا سی تاخیر بھی ناقابل معافی ہوتی" رابنسن نے بعد کو وینیشیا سے کہا۔ "میں خود سی۔ آئی۔ ڈی کی ہدایت سے اس دوکان کی نگرانی کر رہا تھا۔ لیکن میں نے تم سے اس لئے نہیں کہا تھا کہ تم ڈر جاؤ گی۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ میں ڈرتا تھا کہ ایسا ہو تم کہیں غائب ہو جاؤ اور پھر میں تمہیں کبھی نہ دیکھوں۔ میں تمہارے بغیر اپنی زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا۔ میں تمہیں جانے کی طرح جانتا تھا۔"

اب تک اُس گلی میں وہ مکان موجود ہے جس میں مسز ہنٹر کی پُراسرار تجارت چلائی جاتی تھی۔ مگر اب اس میں قدیم عجائبات کی دوکان نہیں بلکہ ایک بڑے غیر ملکی تاجر کا مال گودام ہے۔ مسز ہنٹر جیل خانہ میں سزا کی میعاد پوری کر رہی ہے ـ ـ ـ

ـ ـ ـ اور وہ چینی آئینہ؟

اب وہ آئینہ مسٹر رابنسن کی پیاری اور ماہ پارا بیوی "وینیشیا رابنسن" کے سنگار خانہ میں آویزاں ہے۔ حیرت کی بات

یہ ہے کہ اس کے اندر پہلے کی طرح وہ دھندلی تصویریں نظر نہیں آتیں۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ نور اور سایہ، روشنی اور تاریکی عکس متعدد عجائبات کا باعث ہوتے ہیں۔

نوٹ:۔ اس افسانہ کے تمام افراد خیالی ہیں۔

میں تمکو بھول جاؤں تم مجھکو بھول جاؤ!

از جناب اختر قادری بلیاروی — (وزیر گنج۔ گیا)

۱

بے رحم آسماں کے گلہ، ستم سے حاصل — کیا فائدہ الم سے کیا چشم نم سے حاصل
اب ہجر دائمی پر اظہار غم سے حاصل
رو رو کے جان اپنی ایجاں نہ یوں گھلاؤ! — میں تم کو بھول جاؤں تم مجھکو بھول جاؤ

۲

اب دل سے اپنے اگلی باتوں کو تم مٹا دو — حسرت، امید، ارماں ہر ایک کو بھلا دو
تصویر، خط، نشانی، جو کچھ بھی ہو جلا دو
بے فائدہ نہ دلکو آماج غم بناؤ! — میں تم کو بھول جاؤں تم مجھکو بھول جاؤ

۳

آزادیوں کے وہ دن بچپن کا وہ زمانہ — گاتے تھے مل کے ہم تم الفت کا جب ترانہ
آساں نہیں بھلانا، مانا کہ وہ فسانہ
لیکن نہ یاد کر کے یوں اشکِ غم بہاؤ — میں تم کو بھول جاؤں تم مجھکو بھول جاؤ

۴

دنیا کا اک روش پر دو دن نہیں ٹھکانا — پہلو نیا بدلتا ہے ہر گھڑی زمانا!
کرتے تھے التجا ہم پہلے "نہ بھول جانا"
اب آرزو ہے "مجھکو تم یاد میں نہ لاؤ" — میں تم کو بھول جاؤں تم مجھکو بھول جاؤ!

۵

قطرے جو اشکِ غم کے ایجاں ہو تم بہاتے — بن بن کے تیر دل میں میرے وہ ہیں سماتے
ناشاد کر کے خود کو کیوں مجھکو ہو جلاتے
اب خواب میں مرے یوں باچشم نم نہ آؤ! — میں تم کو بھول جاؤں تم مجھکو بھول جاؤ

اردو نثر کی ارتقاء میں اربابِ بہار کا حصہ[1]

رخشاں ابدالی ، اسلام پور (پٹنہ)

(۱)

علم و فن کی ترقی علم دوستی اور علم پروری اور زبان و ادب کی خدمت میں بہار اور اہل بہار نے کس حد تک حصہ لیا ، کیا یہ محتاج بیان ہے ؟ آج بیرونی دنیا بہار کی خدمات علمی تسلیم نہیں کرتی . تو نہ کرے . لیکن اگر حقیقت کے انکار سے حقیقت جھٹلائی نہیں جا سکتی اگر واقعہ کی لایعنی تکذیب سے واقعہ غلط نہیں ہو سکتا ، اگر بداہت محتاج دلیل نہیں ، تو انکار کرنے دو ! بیرونی دنیا کو انکار کرنے دو ! واقعہ اپنی جگہ ، واقعہ اور حقیقت بجائے خود حقیقت ہے ۔

اپنی جگہ یہ حقیقت ہے اور ناقابل انکار حقیقت ، کہ ہندوستان کا خطۂ پُر بہار۔ بہار ۔ علم و فن کی خدمت میں کسی سے پیچھے نہیں رہا ۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ علمی دنیا میں اس صوبہ کی اپنی ایک حیثیت (پوزیشن) مسلم ہے ۔

"سُلّم" اور "مسلم الثبوت" کا مصنف اسی خاک سے اٹھا تھا ۔ اگر "فاضل بہار" ملا محب اللہ[1] کو تم نہیں جانتے تو فرنگی محل سے پوچھو ، قاضی مبارک گوپاموی سے دریافت کرو ، علامہ آزاد بلگرامی سے استفسار کرو کہ اس کی فضیلت علمی کا کیا درجہ ہے ۔ اور اس کی یہ دونوں تصنیفیں کس پایہ کی ہیں !

ملا غلام یحییٰ کے افادات علمیہ آج بھی عربی نصاب تعلیم کا غیر منفک جز ہیں ۔ "فتاوی عالمگیری" کی مجلس مرتبین میں بہاری نمائندگی کا انکار کون کر سکتا ہے ؟ صوفی ادب میں حضرت مخدوم شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری کا علمی کارنامہ "شرح آداب المریدین" ہی (حضرت کی دوسری تصانیف سے قطع نظر کر کے) بہار کے مجد و شرف کیلئے کیا کم ہے ؟ تاریخ میں سیرۃ المتاخرین فراموش نہیں کی جا سکتی اور متاخرین میں عظیم آباد کے محدث مولانا شوق نیموی (متوفی ۱۳۲۲ھ) صاحب "آثار السنن" اور مولانا شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادی ، صاحب "عون المعبود شرح ابی داؤد" و "غایۃ المقصود" کی خدمت حدیث و سنت شاید اہل علم کو ابھی فراموش نہ ہوئی ہو ۔

بہر حال یہ مسلم ہے کہ بہار اور اہل بہار کو علم و ادب سے فطری لگاؤ اور ازلی تعلق ہے ، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے زبان اردو کی ترقی و تدریج میں نمایاں حصہ لیا ، لیکن افسوس ہے کہ ان کی فطری گمنامی پسندی ، منکسر مزاجی اور اس سے زیادہ ان کے اخلاف عقات کوش

---

[1] ملا کے حالات راقم کے قلم سے رسالہ فطرت (راجگیر) بابت ماہ دسمبر ۶۳ء میں شائع ہو چکے ہیں ۔

کی بے پروائی —— مجرمانہ بے پروائی —— اور اسباب طبع ونشر کی کمیابی کی وجہ سے ان کے کارنامے منظر عام پر نہ آسکے۔

آیئے آج کی مغتنم صحبت میں ارباب بہار کی نثری خدمات زبان کی مختصر تفصیل بیان کی جائے۔

تذکرے جہاں تک اُردو نثر کی خدمت کا تعلق ہے، یقیناً بہار نے اس میں بیش از بیش حصہ لیا، اُردو شعرا کا تذکرہ لکھنے کا مبارک قدام عظیم آباد میں ہوا۔ اور یہ فخر اس کے لیے بس کرتا ہے، کہ سب سے پہلا تذکرہ نویس اسی خاک کا نونہال تھا، میرا اشارہ رحمت علی عشق کے "تذکرہ عشق" کی طرف ہے جو ۱۱۵۰ھ میں مرتب ہوا اور جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ نہ صرف عظیم آباد کا اولین تذکرہ ہے، بلکہ اُردو شعرا کا سب سے پہلا تذکرہ یہی ہے، اس میں ۳۹۴ شعرائے اُردو کا تذکرہ ہے۔ بہاری تذکرہ نگاروں نے اسی تذکرہ پر بس نہیں کی، بلکہ میر غلام حسین سوزش (متوفی ۱۱۹۵ھ) اور جوشش عظیم آبادی (معاصر میر) نے بھی تذکرے لکھے، نواب علی ابراہیم خاں کا "تذکرہ گلزار ابراہیم" اس پر مستزاد ہے، جو مرزا علی لطف کے تذکرہ گلشن ہند (مرتبہ ۱۲۱۵ھ) کا ماخذ ہے۔ گلزار ابراہیم کی تکمیل شاید ۱۱۹۶ھ میں ہوئی۔ اول الذکر تینوں تذکرے کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔ البتہ گلزار ابراہیم انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن کی مساعی سے اب طبع ہو چکا ہے، یہ تمام تذکرے فارسی زبان میں ہیں، جو اس وقت کی علمی زبان تھی، فارسی شعرا کے تذکرے بھی بہاریوں نے لکھے ہیں لیکن وہ خارج از بحث ہیں، آخر میں ناظر وزیر علی عبرتی (متوفی ۱۲۸۰ھ) نے معراج الخیال، شعرا کا تذکرہ اور ریاض الافکار، نثر نگاروں کا تذکرہ لکھا۔ صفیر بلگرامی آروی (۱۲۴۹ھ ۔ ۱۳۰۷ھ) نے دو جلدوں میں تذکرہ "جلوۂ خضر" تالیف کیا۔

مغربی علوم کے تراجم کے لیے بہار نے "سائنٹفک سوسائٹی" قائم کی جس کا تذکرہ فرانسیسی محب اُردو گارساں دتاسی نے ۴ دسمبر ۱۸۶۹ء کے خطبہ میں[۱] کیا ہے، یہ سوسائٹی ہندو مسلم اور انگریز ارباب علم کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اس کا مرکز مظفر پور تھا، ہرچند اس انجمن کے علمی کارنامے ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں، لیکن وہ دن زیادہ دور نہیں، جبکہ اس کے کارنامے بھی منظر عام پر آجائیں گے۔ فورٹ ولیم کالج میں اُردو کے لیے جو مساعی عمل میں آئیں، اس میں یقیناً بہار کے گمنام مصنفین کا بھی حصہ ہے۔

اخبار زبان کی ترقی واشاعت میں اخبارات ورسائل کو جتنا دخل ہے، وہ پوشیدہ نہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ بہار نے اس نکتہ کو بہت پہلے سمجھا، اب تک یہی سمجھا جاتا رہا ہے کہ بہار کا سب سے پہلا اخبار "الپنچ"[۲] ہے، جو ۱۸۸۵ء میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا[۳]۔

[۱] "بہار کی "سائنٹفک سوسائٹی" کا صدر مقام مظفر پور ہے، اس انجمن کے معتمد ایک فاضل مسلمان ہیں، اس وقت انجمن میں ۲۱۸ ارکان ہیں، اس تعداد میں ۲۸ مسلمان ہیں، ۱۹۲ ہندو ہیں اور ۲۰ یورپین ہیں، انجمن کی طرف سے "اخبار الاخیار" شائع ہوتا ہے، تجویز ہے کہ انجمن مشرقی زبانوں کی تعلیم کے لئے ایک کالج قائم کرے، اور اس کے ساتھ مغربی علوم کی اشاعت کا کام بھی انجام دے۔" (خطبات گارساں دتاسی، خطبہ ۴ دسمبر ۱۸۶۹ء رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۳۲ء)

[۲] چونکہ "الپنچ" ایک عرصہ تک جاری رہا، اور ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا، اسی لئے اس کا نام زبانوں پر رہ گیا، اس کے پہلے اڈیٹر سید رحیم الدین صاحب استھانوی تھے ۱۸۸۵ء سے ۱۹۱۰ء تک (۲۶ برس) نکلتا رہا، حضرت آزاد عظیم آبادی، حضرت رجو عظیم آبادی مرحوم، پروفیسر شہباز مرحوم، مولانا شوق نیموی مرحوم، ذوق مفتی گنجی مرحوم

لیکن دتاسی کی تصریحات بتاتی ہیں کہ عظیم آباد کا سب سے پہلا اخبار "چشمۂ علم" ہے جو ۱۸۶۹ء سے نکلنا شروع ہوا تھا، اس اخبار کے متعلق دتاسی کا بیان خالی از لطف نہیں، کہتا ہے:۔

"چشمۂ علم' یہ پٹنہ سے اُردو میں مہینہ میں دو دفعہ نکلتا ہے، اس سے پہلے اس شہر میں کوئی اخبار نہ تھا، اس کی پہلی اشاعت یکم جنوری ۱۸۶۹ء کو شائع ہوئی۔ یہ چھوٹی تقطیع پر ہے۔ اور ہر صفحہ پر دو کالم ہوتے ہیں، میرے ایک مہربان نے اسکی ایک اشاعت مجھے بھیجی ہے۔ اس کا ایک مضمون مجھے پسند آیا، جس کا موضوع بنی نوع انسان کے اتحاد سے متعلق تھا۔"

(خطبات گارساں دتاسی، انیسواں خطبہ ۶ دسمبر ۱۸۶۹ء)

مظفر پور سے اسی سال (۱۸۶۹ء میں) ایک اخبار "اخبار الاخبار" نامی نکل رہا تھا، (جس تذکرہ فٹ نوٹ میں دتاسی کے حوالہ سے آچکا ہے) اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ۱۸۶۹ء سے پہلے بہار میں کوئی اخبار نہ تھا، دتاسی کی تصریح کے مطابق پٹنہ سے چشمۂ علم سے پہلے کوئی اخبار نہیں نکلا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ غدر سے سات برس پہلے بہار کا ایک اخبار "نور الانوار" آرہ، ۱۸۵۲ء میں نکل رہا تھا۔ اس کے تین برس بعد ۱۸۵۵ء میں گیا سے "وکیلی رپورٹ" نکلنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے اخبارات بھی مختلف مقامات سے نکلتے رہے، پٹنہ، آرہ، اور قطع نظر کرکے کہ یہ ضلع کا صدر مقام ہے، بہار شریف جیسے قصبہ سے بھی مختلف اوقات میں متعدد اخبار نکلے، شرف الاخبار یہاں کا مشہور اخبار تھا، پھر پیام عشاق گلدستہ اور رسالہ الشرف اور بعض دوسرے اخبارات ورسائل اس قصبہ سے نکلے ہیں۔

بہار اور نالۂ عشاق یہ دو وقیع گلدستے پٹنے سے نکلتے تھے، اور بھی متعدد گلدستے پٹنہ نے نکالے، یہاں مقصود اشارات ہیں، اسلئے ان کی تفصیل کا موقع نہیں، مذکورہ اخبارات کی تحریر کا نمونہ پیش کرنا مشکل ہے، کیونکہ اور تو اور خاص بہار شریف (جہاں بیٹھ کر یہ مضمون لکھا جا رہا ہے) کے اخبار ورسائل کی فائل، کبریت احمر کا حکم رکھتی ہے، البتہ 'اپنچ' کی ظرافت کا نمونہ تفریح طبع کے لئے حاضر ہے۔

کس سوچ میں ہو امیر بولو آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

"ایں یہ کیا۔ چوری اور اس پر سینہ زوری! معاذ اللہ۔ چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد! کیا خوب ارے اس میں دلاوری کی کونسی بات ہے، اور چوری کا ہے کی۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ شعر حضرت امیر مینائی کا ہے، اچھا اگر نہیں ہے تو اس سے ہوا کیا۔ خیالات کا ملجانا کچھ محال نہیں۔ مضامین کا لڑ جانا خلاف قیاس نہیں۔ آورد ہو تو کہا جائے، آمد میں روک

(بقیہ حاشیہ صفحہ) تحیر مرحوم، جناب خیر حاتی، عاقی (یا مشرقی) امیری مرحوم، منشی محمد احسن بہاری صاحب وغیرہ اس کے مستقل مضمون نگار تھے، 'النپخ' نے قومی وملکی، اصلاح وتعلیمی اُمور میں خاصی جد وجہد کی، حکام اور حکومت کے اعمال پر سخت نکتہ چینی کرتا رہا، زبان وادب کو 'النپخ' سے جو فائدے پہنچے، اسکا بیان تحصیل حاصل ہے، اس کے پریس نے اُردو کتابوں کے طبع ونشر کا فریضہ بھی ادا کیا۔

۵۳ "النپخ" کے اجرا سے ایک برس پہلے جولائی ۱۸۸۴ء میں شمس العلما مولوی محمد حسین ذبیح عظیم آبادی نے ایک اخبار پٹنہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نامی جاری کیا۔

ٹوک کیوں، یہ تو تنگ بندی کے کارخانے ہیں، جس سے جیسی بن آئی، اسی کو تو توارد کہتے ہیں، ایسا تو اوپری سے ہوتا آیا ہے پھر مجھ ہی پر الزام کیوں، میں ہی چور کیوں ٹھہرا۔ سنا نہیں ہمارے شہر کے البیلے شاعر نے کہا تھا ؎

کالی گھٹائیں بانکی ادائیں باغ میں جھولے سبز دوپٹے — اُس پہ یہ قدغن آپ نہ آئیں اُف رے جوانی ہائے زمانے

کہئے ہے نا تک بندی سے درست؟ لیجئے اب اُن کے ایک مدظلہ العالی کی ذہانت بھی سُن لیجئے۔ ؎

نام کے سید چال میں کید کہنے کو شاعر رکھنے کو مارن — اس پہ یہ طرہ شعر ہو ایسا اف رے جوانی ہائے زمانے

چلیئے تب تو یہ بھی چوری ہے یا توارد۔ بس جناب بس۔ بھر پایا شعر فہمی عالم بالا معلوم شد۔۔۔۔۔"

(پنچ ۱۶ جون ۱۸۹۰ء)

۲۷ جنوری ۱۸۹۰ء کے ایک دلچسپ آرٹکل "فقیر کی صدا و دعا" کا اقتباس بھی لطف سے خالی نہیں :۔

"مریں تو پانچوں مریں۔ جھٹ پٹ مریں۔ مریں تو پانچوں مریں۔ چٹ پٹ مریں۔ جھٹ پٹ مریں۔ سائیں داتا اباد اللہ۔ عشق اللہ، مریں تو پانچوں مریں۔ چٹ پٹ مریں، جھٹ پٹ مریں۔ داتا! آئیے ذرا ایک دم گانجے کا تو لگا جو بہتر بابا۔ (گانجے کا دم لگا کر) بابا۔ آج تجھے جو کچھ مانگنا ہے مانگ۔ داتا جو مانگوں سو پاؤں، ہاں مانگ کیا مانگتا ہے۔ داتا آپ دعا کیجئے کہ پہلے میری شادی ہو جائے، پھر نویں مہینے لڑکا ہو۔ اور یا اقبال فرخ فال ہو"۔۔۔۔۔ "دعا کیجئے کہ ایسا ہو جائے۔ اچھا بابا جا، تجھ کو ہم نے دیا۔ داتا میری تمنا ایک اور ہے، وہ یہ کہ پٹنہ میونسپلٹی فطرتی اندھی پیدا ہوئی ہے، آپ دعا کیجئے، کہ اس کی آنکھوں میں روشنی آجائے۔ بابا تم نے تو یہ بڑی کٹھن فرمائش کی۔ اچھا دم لو۔ ذرا ہم لوح محفوظ دیکھ لیں۔ (سر جھکا کر تھوڑی دیر بعد) اوں ہوں، نہیں۔ نہیں بابا اس سے معاف کر، اس کی آنکھوں میں روشنی ازل میں پیدا ہی نہیں کی گئی۔۔۔۔۔۔۔"

بہار میں اُردو نثر کی ابتدا اور تیرھویں صدی ہجری کی اُردو تصانیف

اب میں بہار کے تصنیفی کارناموں پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

موجودہ تحقیقات کے مطابق اُردو نثر کی پہلی تالیف مولا فضلی کی "دہ مجلس" قرار دی جاتی ہے، جو ۱۱۴۵ھ میں لکھی گئی۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ آٹھویں صدی ہجری کے بہاری بزرگ حضرت مخدوم شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری علیہ الرحمۃ (۶۶۱ھ ـ ۷۸۲ھ / ۱۲۶۳ء ـ ۱۳۸۱ء) نے (قطع نظر ان دوہوں اور منظوم فقیری چٹکلوں (نسخوں) کے جو حضرت کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، اور جن کی اقیعت اور جن کی واقعیت و عدم واقعیت کا کوئی قطعی اور آخری فیصلہ نہیں کیا جا سکتا) اپنے بعض ملفوظات میں ہندی کے بعض الفاظ استعمال

ؒ ملاحظہ ہو سید سلیمان ندوی کا مقالہ "بہار میں اُردو" بہار نمبر ندیم ۱۹۳۲ء۔

فرمائے ہیں، لیکن تیرہویں[1] صدی سے پہلے کی اُردو نثر کی کسی بہاری تصنیف کا کوئی تحقیقی ثبوت اب تک نہیں ملا ہے، گو بہار کی اولین کتاب نثر کے متعلق آئندہ سطور میں میں جو کچھ کہنے والا ہوں وہ ہر چند موجودہ تحقیقات پر مبنی ہے۔ لیکن راقم کا خیال ہے کہ بہار میں اُردو نثر کی پہلی کتاب کے متعلق موجودہ تحقیق حرفِ مقتتم اور آخری فیصلہ کی حیثیت نہیں رکھتی، کیونکہ ابھی بہتیرے دفینے ایسے ہیں جہاں تک تجسس کا ہاتھ نہیں پہنچا ہے، لہٰذا اس کا بہت زیادہ امکان ہے کہ دو چار برس میں کوئی اس سے بھی زیادہ قدیم کتاب منظرِ عام پر آسکے۔

گذشتہ بہار نمبر میں مولانا گیلانوی کا مقالہ "اُردو نثر کی پہلی کتاب صوبہ بہار میں" بہت مبارک ثابت ہوا کیونکہ اسی مقالہ کا نتیجہ ہے کہ آج چند نایاب کتابیں ہمارے علم میں آگئی ہیں۔

بہر حال اس وقت تک کی تحقیقات کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے، کہ بہار کی سب سے پہلی اُردو نثر کی کتاب "رسالہ نماز" یا "فضائل رمضان" ہے۔ اس کے مصنف پھلواری شریف کے ایک بزرگ حضرت مولانا شاہ ظہور الحق صاحبؒ (سنہ ۱۱۸۲ھ - سنہ ۱۲۳۴ھ) ہیں، جناب شاہ غلام حسنین صاحب ندوی پھلواری کے خیال میں "اتنا تو یقینی ہے کہ یہ دونوں رسالے سنہ ۱۲۰۰ھ سے قبل لکھے گئے، کیونکہ یہ اور بعض رسالے حضرت مصنف نے اپنے ایامِ طالب العلمی میں لکھے تھے، اور آپ پورے سنہ ۱۲۰۲ھ میں فارغ التحصیل ہوئے ہیں" اور "اگر آپ نے فاتحۂ فراغ سے ایک سال پہلے بھی اُردو کے یہ دونوں رسالے حضرت نے لکھے تھے، تو وہ سنہ ۱۱۹۹ھ تھا" یقیناً شاہ صاحب کے قول کو ترجیح دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ آپ ہی نے ان رسالوں کا اکتشاف کیا ہے۔ لیکن اگر بہت زیادہ احتیاط ملحوظ رکھی جائے، تو ہم ان رسالوں کا سنہ تالیف سنہ ۱۲۰۰ ہجری قرار دے سکتے ہیں، پھر اگر سنہ تالیف سنہ ۱۲۰۰ھ ہی قرار دے لیا جائے، تب بھی مولانا شاہ ظہور الحق صاحبؒ کے دوسرے رسالوں سے (جن کا ذکر عنقریب ہی ہو گا) مذکورہ دونوں رسالوں کو کافی قدامت حاصل ہے، لہٰذا صوبہ بہار کی سب سے پہلی اُردو نثر کی کتاب مولانا شاہ ظہور الحق صاحبؒ کا رسالہ "فضائل رمضان" یا "رسالۂ نماز" ہے۔ جو سنہ ۱۲۰۰ھ میں تالیف ہوا۔

رسالہ فضائل رمضان کی ابتدائی عبارت حسبِ ذیل ہے:-

"ہلال رمضان دیکھ پڑھے اللھم سلمنی من رمضان سلمہ منی اللھم ارزقنا صیامہ و قیامہ و تلاوۃ القرآن بالقلب واللسان. ایضاً ہر روز و شب سورۂ اخلاص تین سے (سو) بہتر مرتبہ پڑھا کرے حق تعالیٰ اس کے بدن کو جہنم پر حرام کرواتے"

اور رسالہ نماز کا نمونہ یہ ہے:-

"نماز تہجد کی بارہ رکعت ہے، بعد نیند سے اٹھنے کے، دو گانے دو گانے، پھر دو گانے کے بعد توبہ اور استغفار اور

[1] کہا جاتا ہے کہ تحریرِ موہنی مصنفات قصبہ بہار شریف کے کسی بزرگ کی ایک رسالہ "کتاب اوان نعت" کی تحقیق مولانا محفوظ الحق صاحب ایم اے پروفیسر پریسیڈنسی کالج کلکتہ نے فرمائی ہے جو شاید بارھویں صدی ہجری کی تالیف ہے لیکن اس کتاب کے متعلق اب تک تفصیلات سامنے نہیں آئی ہیں۔

سب کے بعد مناجات اور بعد اس کے خدا کی یاد کرے، بلکہ صبح تک، جو توفیق ملے"

ان ہی شاہ محمد ظہور الحق پھلواروی کی ایک تصنیف "فیض عام" ہے جس کو جناب سید رضی الدین احمد صاحب عظیم آبادی، بہار کی اولین اُردو تصنیف قرار دیتے ہیں، یہ ۱۲۳۸ھ میں لکھی گئی، اس کی طرز تحریر ملاحظہ ہو:۔

"اس سال پہلے ہجرت کے کتنے واقعے درپیش ہوئے، پہلا تو مسلمان ہونا عبد اللہ بن سلام یہودی کا کہ مدینہ میں رہتے تھے اور اپنی قوم میں تھے بمجرد مشاہدہ کرنے شواہد کے خود اور چند یاران کے دولت اسلام سے مشرف ہوئے۔

دوسرے عہد مواخات یاندھا حضرت نبینا صلی اللہ علیہ وسلم کا درمیان ایک ایک مہاجر اور ایک ایک انصاری کے۔ تیسرا عہد صلح کرنا یہودیوں کا قریظہ اور نضیر اور قینقاع کے جناب پیغمبر صلعم سے باین شرط کہ طرفین میں کوئی مددگاری تلک دوسرے کے دشمنوں کی نہ کرے۔ خود جنگ کرنے کا تو کیا دخل ہے۔ چوتھا مقرر ہونا طریقہ اذان کا واسطے خبردار کرنے نمازیوں کے نماز اور جماعت سے مطابق خواب عبد اللہ بن زید انصاری یا عمر فاروق کے، بروائت جبرئیل علیہ السّلام نے بھی آکر طریقہ خاص اذان کا تلقین فرمایا، واللہ اعلم بالصواب"

آپ ہی کی ایک اُردو کتاب "کسب النبی" ہے، اس کا سنہ تالیف ۱۲۳۰ھ ہے۔ اس رسالہ کی غرض صنعت و حرفت کی طرف متوجہ کرنا ہے، جو خود نام سے ظاہر ہے، ذیل میں اس کتاب کا مختصر سا اقتباس حاضر ہے:۔

"بات یہ ہے کہ لوگ ناواقف کاری کے سبب اکثر کسب و حرفت کو کہ جس کو نبیوں نے کیا ہے ذلیل اور حقیر سمجھتے ہیں، اس کا حال مختصر سا یہاں پر بیان کیا جاتا ہے، کہ لوگ واقف ہوجائیں اور عیب نہ کریں، اور سب کوئی حرفت کرکے دکھاویں اور خود سیکھیں اور سکھاویں۔

یہ چاروں کتابیں خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سیٹی کے کتبخانہ میں محفوظ ہیں۔

اب میں ۱۲۵۰ھ کی ایک کتاب کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، یہ میر محمد تقی خیال کی مشہور کتاب "بوستان خیال" کا، جو فارسی زبان میں سولہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، ملخص ترجمہ ہے، بوستان خیال کے اس ملخص ترجمہ کا نام "زبدۃ الخیال" ہے۔ اس کے مصنف کا نام عالم علی، عظیم آبادی ہے، اور ۱۲۵۰ھ اس کتاب کا سنہ تالیف ہے، اس کا ایک نسخہ کتبخانہ قادریہ، خانقاہ اسلام پور (پٹنہ) میں ہے۔ اس نسخہ میں ۲۳۰ صفحات موجود ہیں، اور آخر کے بقیہ صفحے غائب ہیں، ابتدا میں جو فہرست مضامین ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۴۸۰ صفحوں پر تمام ہوئی ہے، افسوس ہے کہ مصنف کے حالات بالکل تاریکی میں ہیں۔ اس کتاب کی زبان بہت صاف سلیس اور رواں، ذیل کا اقتباس نمونتاً ملاحظہ فرمایئے:۔

"جب ملکہ مہر افروز، زوجہ اورنگ خاں بادشاہ ملک ختا، کہ حسن تدبیر سے حکیم اسقلینوس الہی کے حبالہ ہوئی، بعد نو مہینے کے

ے دختر نیک اختر، آفتاب صورت، ماہتاب سیرت پیدا ہوئی، نام اس کا زہرہ جبیں ختائی رکھا۔ ؎

چہ دختر، اختر برج سعادت گرامی گوہر درج سعادت

اکتالیس اسباب حسن کے، جو کتب معتبرہ میں مقرر ہیں، وہ سب اسباب ملکہ میں مجتمع تھے۔ سر سے پاؤں تک سراپا حسن، اور تمام عضو اُس کے نور الٰہی سے مجسم تھے۔ اور جو جو علم و ہنر کہ بادشاہ زادیوں کو چاہیے، بارہ برس کے سن میں سب میں لائق و فائق ہوئی۔ جس رات کو ملکہ کی سالگرہ تیرہویں برس کی ہوئی، ملکہ نے لباس مکلف اور زیورات مرصع پہن کر بستر راحت پر آرام فرمایا۔ عالم خواب میں دیکھا کہ خود ملکہ حمام سے غسل کر، جامہ خانہ میں کپڑے بدل کر، آئینہ خانہ میں گئی، اپنی صورت اس کو آئینہ خانہ میں نظر نہ آئی۔ بدلے اس کے شکل و شمائل ایک جوان ماہرو کی دیکھی، دیکھ دیکھنے کے تیر عشق کا کمان ابرو سے اس کے سینہ پر لگا۔ ملکہ نے شرم سے سر نیچے کر لیا، جب پھر نظر اُٹھائی، تو وہی صورت نظر آئی، چاروں طرف اس مکان کے آئینے تھے۔ جدھر نظر کرتی ہے، وہی صورت زیبا نظر آتی ہے۔ ملکہ بے اختیار نعرہ مار کر خواب سے اُٹھی۔ عشق نے اس جوان کے ملکہ کو بے قرار کیا، عشرت افزانے چہرہ کو ملکہ کے دیکھ کر دریافت کیا، کہ ملکہ بلاشبہ کسی پر عاشق ہوئی، نہیں تو یہ حالت سوائے عاشقوں کے دوسرے کی نہیں ہوتی ... ." (صفحہ ۲۷۵ تا ۲۷۶)

اب تک میں نے قلمی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے، اب میں ایک مطبوعہ رسالہ کی تفصیلات پیش کرنا چاہتا ہوں، جو ۱۲۵۸ھ میں مرتب ہوا ہے، یہ رسالہ مدرسہ اسلامیہ بہار شریف کے کتب خانہ میں ہے، اور اس مضمون کے دوران تحریر میں میری نگاہ سے گزرا۔ رسالہ کا نام نہ ابتدا میں ہے (سر ورق ہے ہی نہیں) نہ سبب تالیف میں اور نہ خاتمہ پر، یہ خستہ کاغذ کے ۹۵ صفحات پر چھپرہ میں طبع ہوا ہے، خاتمہ پر یہ عبارت درج ہے:۔

"تمام ہوا سولہویں ذی الحجہ کو ۱۲۵۸ھ، روز جمعہ مطابق ۲۸ جنوری ۱۸۴۲ء عیسوی میں و بانطباع شیخ دین محمد مطبع چھپرہ کے تکمیل پایا"

اس کتاب کے مصنف، مولوی شجاع الدین علی، ابن مولوی سید یتیم اللہ رضوی بہاری ہیں (مصنف نے مولوی یتیم اللہ کے لیے "عالم با عمل" "محدث یگانہ" "فقیہ زمانہ" وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں)

تمہید کے بعض فقرے مصنف کے حالات کی وضاحت کے لیے پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، کہتے ہیں:۔

"...... و بحسن تربیت و فیضان صحبت والد ماجد علیہ الرحمۃ کہ فی الجملہ علوم ضروریہ صرف و نحو، فقہ و عقائد و علم کلام و اصول دین و تفسیر و حدیث سے بہرہ رکھتا ہے، و بایمان حقیقی و تحقیق مانند بزرگان خود پیراستہ، و عقیدہ تقلیدی سے وارستہ" .... "محبت خدا و رسول و اہلبیت نبوت و تبعیت کتاب اللہ و سنت، دین و ایمان ما را۔

ہے، وتعصب ونفاق وعداوت اہلبیت نبوت کو موجب شقاوت دارین وضلالت نشاتین جانتا ہے، سنی بے تعصب وشیعہ بے تبرا مذہب آبائی ہمارا ہے۔" (ص۷)

اس کتاب میں ملا کرامت علی جون پوری کی کتاب "قوت الایمان" کا رد ہے، جو تعزیہ داری کی مخالفت میں لکھی گئی، اسی لئے کتاب کی حیثیت مذہبی اور مناظرانہ ہے، اسی کتاب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے، کہ مصنف اس سے پہلے تین کتابیں رد نصاری میں لکھ کر شائع کر چکے تھے، لکھتے ہیں:-

"اس لئے ہیچمدان نے ایک کتاب مدلل بابطال مذہب نصرانی کے واثبات مذہب اسلام کے تصنیف کرکے بصرف ایک ہزار پانچسو روپے کے، پانچسو نسخہ چھاپ کر لوگوں کو تقسیم کیا، و نام اس کا تحفہ مسیحیہ (مسیحیہ؟) رکھا، وبیس نسخہ اس کا دار الامارۃ کلکتہ میں بھیجا، لیکن کسی نے جواب اس رسالہ مدلل کا نہ لکھا، مگر بعضوں نے کچھ تاویل وتوجیہہ اپنے اس عقیدہ متناقضہ باطلہ کا لکھا، اور ایک کتاب کئی پادریوں نے ولایت میں متفق ہو کر ابطال جمیع مذاہب وادیان غیر عیسویہ اپنے خیال فاسد میں کیا ہے، ہمارے یہاں بھیجا، لنظر براں اس ہیچمداں نے رد وابطال ان دونوں رسالہ جات کفر وضلالت کا جدا جدا لکھا۔ وبفضل الہی یہ تینوں کتابیں بابطال عقیدہ باطلہ تثلیث در توحید و توحید در تثلیث مذہب عیسائی کے کافی ووافی ہوئے" (ص۱۱)

مندرجہ بالا اقتباسات سے نہ صرف مصنف کے حالات پر روشنی پڑتی ہے، بلکہ کتاب کی زبان کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے، اطناب، طوالت اور حشو وزوائد اور تکرار اس میں بہت زیادہ ہے، اس کے علاوہ چند الفاظ کے تلفظ اس میں بد لکھانہ پائے جاتے ہیں۔ مثلاً جب اور تب کے بجائے 'جد' اور 'تد'۔ اسی طرح سب کو 'سبھ' (بزیادتی ہائے مخلوطہ) لکھا گیا ہے، اور چونکہ ایسا متعدد جگہ ہے، اس لئے کتابت وطباعت کی غلطی نہیں کہی جا سکتی۔ کہیں کہیں علامت فاعلی بھی محذوف ہے، مثلاً:-

"ابن زیاد حکم کیا" صلا، اور "جب موسیٰ نے دعوی نبوت کا کیا تد فرعون بادشاہ وقت وساری قوم اس کی منکر موسیٰ کی رسالت کی ہوئی"۔ ۔۔۔ "یہ خبر فرعون کو معلوم ہوئی تد فرعون ساتھ ساری فوج اپنے واسطے گرفتاری موسیٰ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نکلا" ۔۔۔ "تد موسیٰؑ نے بحکم خدا عصا اوپر دریائے نیل کے مارا" (ص۸) ۔۔۔

"ادیان کتابی سبھ خدا کی طرف سے تھی" ص۹ "عابد ومعبود سبھ فرزند جہنم کے ہیں" ص۲۱ اور "عورات انصار کی روتیاں تھیں" (ص ۴۱)

اس کے بعد ہم جس کتاب کا نام لے سکتے ہیں وہ "دیدۂ مغرب معروف بہ ہدایت المسافرین" ہے، اس کے مصنف حضرت شاہ عطا حسین صاحب منعمی قدس سرہٗ گیاوی (۱۲۳۱ھ – ۱۳۱۱ھ) مصنف "کیفیت العارفین" و "کنز الانساب" (فارسی)

".. کہتا ہے فقیر حقیر سراپا تقصیر محمد تقی تلمی فردوسی، کہ اگرچہ یہ قلیل البضاعۃ اتنی استعداد نہیں رکھتا تھا، لیکن بموجب فرمانے بعض شخصوں کے، کہ اوپر فارسی کے قدرت نہیں رکھتے تھے، مسائل چند کہ جاننا اُن کا ضروریات دین سے تھا، کتابوں معتبر سے چُن کر زبان ہندی میں ترجمہ کیا گیا..... "

سنہ ۱۲۹۱ء کا ایک مطبوعہ رسالہ بھی قابل ذکر ہے اس کا نام "عین الایمان" ہے۔ اس کے مصنف مولوی امین اللہ عظیم آبادی ہیں۔ یہ مطبع نظامی کانپور میں سنہ ۱۲۹۱ھ میں مصنف کی زندگی میں طبع ہوا، اس کے ۸ صفحات ہیں، اور اہل سنت کے عقائد اس کا موضوع۔ رسالہ کی ابتدا میں سبب تالیف یہ لکھا ہے۔

"اما بعد مخفی نہ رہے کہ یہ رسالہ جامع عقائد اہل سنت و جماعت بنظر نفع خاص و عام کے زبان اُردو میں لکھا گیا، اور "عین الایمان" نام رکھا گیا، ہر مرد و عورت کو چاہیئے کہ اس رسالہ کو صفحۂ دل پر لکھیں، کہ درستی ایمان اس پر منحصر ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔"

تیرہویں صدی ہجری کی بہاری اُردو تصانیف کا اجمالی خاکہ آپ کے سامنے ہے، رہ گئی چودھویں صدی تو اس کے لئے کسی دوسری فرصت کی ضرورت ہے۔

"موج نسیم"

(از جانب سید نور الہدیٰ نسیم ندوی مرحوم)

غم وہ غم جس کی انتہا نہ ملے — درد وہ جسکی کچھ دوا نہ ملے
عشق وہ عشق جو کہ کامل ہو — کچھ تصنع کا شائبہ نہ ملے
دل وہ دل جسمیں تو ہو جلوہ فگن — ڈھونڈنے سے بھی دوسرا نہ ملے
سر وہ سر جس میں تیرا سودا ہو — لب پہ جز آہِ نارسا نہ ملے
آنکھ وہ جو کھلے تو تیرے لئے — سامنے کوئی دوسرا نہ ملے

پاؤں اٹھیں تو جستجو میں تیری
اور تیرا کہیں پتہ نہ ملے

از جناب حکیم عبدالحی صاحب ہاتف بہاری

تم جور و جفا کے عادی ہو ہیں صبر و رضا کے خوگر ہم
پہلو میں دبائے پھرتے ہیں اب دل کے عوض اک پتھر ہم

تقدیر کہاں پہونچاتی ہے دیوانہ بنا کر کیا کہئے
مل لیتے ہیں ان سے راتوں کو دشمن کی گلی میں اکثر ہم

نیرنگ محبت یہ ہی ظالم درد دوا خود بنتا ہے
منہ بھرتے ہیں زخمِ تیرِ نظر کا لے کر پارۂ نشتر ہم

بالیں پہ یہ آئے وہ آئے ہنگامہ ہے پھر بھی ہوش نہیں
ساحل سے ہے کشتی دور ابھی اور پھینک چکے ہیں لنگر ہم

بیتاب طلب کو چین کہاں بدنام سکونِ یاس نہ کر
تھک کر جو کبھی گھر بیٹھ گئے دنیا کو لئے ہیں سر پر ہم

مے اور نہیں ہے کچھ نہ سہی تسکین خرابِ ہوش تو ہے
دو گھونٹ میں ایسے کھوئے گئے خود آپ سے ہیں اب باہر ہم

اک بوند لہو کی ڈھل نہ سکی رونا بھی نہ آیا آنکھوں کو
قاتل کی شکایت توبہ کر شرمندہ بہت ہیں مر کر ہم

سنتے ہیں وہاں کی مٹی کو کچھ خاکِ حرم سے نسبت ہے
مشکل سے بچا کر لائے تھے جس بزم سے اپنا ساغر ہم

امید کرم بہلاتی ہے ناکامِ وفا کی ہمت کو
ڈر ہے کہ نہ کہہ دیں جذبۂ دل سب حال کسی کے منہ پر ہم

یہ عالم عالم یاس کا ہے اس عالم کا انداز نہ پوچھ
ہر شخص کے پیچھے جاتے ہیں کچھ دور سمجھ کر رہبر ہم

ہاتف دنیائے شعر میں کچھ سناٹا سا سناٹا ہے
مشتاق تماشا آنکھ نہیں کیا خاک دکھائیں جوہر ہم

منیر و بہار میں مسلمانوں کی آمد

صوبہ بہار میں اسلامی حکومت کا آغاز محمد بن بختیار خلجی کی فتوحات سے ہوا۔ لیکن بعض واقعات سے ثابت ہوتا ہے، کہ محمد بن بختیار سے پہلے مسلمانوں نے یہاں قدم جمانا شروع کر دیا تھا

مقامی روایات کے مطابق منیرؔ (منیر) کو اول اول سلطان محمود غزنوی کے سپاہیوں نے فتح کیا۔ محمود غزنوی کی تاریخوں میں کوئی ایسا واقعہ پایا نہیں جاتا، لیکن ہندوستان پر اس نے جتنے حملے کئے ہر ایک کی مفصل کیفیت بھی کسی تاریخ میں مذکور نہیں اور اس سلطان کی زندگی کے حالات میں جو کتاب عنصری اور فردوسی نے لکھی تھی، ہمارے زمانہ سے دو سو برس قبل نایاب ہو چکی تھی[1]، تاہم تاریخ سالار مسعود غازی سے ظاہر ہوتا ہے، محمود غزنوی کے انتقال سے دو ایک برس پہلے اس کا ایک لشکر اس کے ایک بھانجے سالار مسعود غازی کے تحت میں ہندوستان آیا۔ سالار مسعود نے مقام ستر کھ میں قیام کر کے مشرقی علاقوں پر چڑھائی کی، اکثر راجاؤں نے متحد ہو کر مقابلہ کیا، لیکن ان میں بعض ایسے تھے، جو پہلے سے سلطان محمود سے ربط رکھتے تھے، اور بعض کو گمان تھا کہ ایک لشکر گراں مسعود کی کمک کے لئے غزنیں سے روانہ ہوا چاہتا ہے، بہر حال مسعود نے اکثر راجاؤں کو شکست دے کر ان کی متحدہ طاقت کا استیصال کیا، لیکن بالآخر خود بھی مقتول ہو کر بہرائچ میں مدفون ہوا، اس کے بعد تقریباً ایک سو ساٹھ برس تک سلاطین غزنیں کا کوئی لشکر ادھر نہ آیا۔ سالار مسعود کے لشکر کا اطراف بنارس تک آنا صریح طور پر مذکور ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ تمام اطراف میں کمتر کوئی مقام ہوگا، جہاں ان سپاہیوں نے جنگ نہ کی ہو، سالار مسعود کے بعد اس گروہ کے پس ماندہ افراد مختلف اطراف میں منتشر ہو کر رہ گئے[2]۔

جن جن مقاموں میں مسعود غازی کے سپاہیوں نے جنگ کی، اور مقتول ہو کر مدفون ہوئے، عام طور پر گنج شہیداں کے نام سے مشہور ہیں، اطراف کنڑہ مانکپور، غازی پور، سیوان (ضلع سارن) کے علاوہ خاص قصبہ منیر میں بھی ایسی جگہ موجود ہے، جہاں اس واقعہ کی یادگار میں سالانہ میلا ہوا کرتا ہے، جو غازی میاں کے میلے کے نام مشہور ہے۔

منیر کے مخدوم زادوں کے سفینوں سے پایا جاتا ہے، کہ سنہ ۵۷۶ھ (۱۱۸۰ء) میں حضرت تاج فقیہ اور قطب سالار

---

[1] کپتان ولیم نیولیس (W. NASSAU LESS L.L.D) نے سنہ ۱۸۶۴ء میں طبقات ناصری کی اشاعت کے متعلق دیباچہ میں لکھا ہے کہ اب سے ایک صدی قبل تک عنصری اور فردوسی کی لکھی ہوئی سلطان محمود کی لائف اس ملک میں پائی گئی تھی۔ [2] اس خلاصہ تاریخ سالار مسعود غازی صفحہ ۵ تا ۱۱۲ اور مزید تحقیقات کے لئے مرآت مسعودی اور تاریخ ماثر غزنوی دیکھنا چاہیئے، منیر میں بڑی درگاہ کے احاطہ میں ایک قبر کو لوگ سلطان محمود غزنوی کے کسی عزیز تاج الدین کھانڈگاہ (شاید خواندگاہ ہو) کی قبر بتاتے۔ لیکن اس کی تحقیق محال ہے ۱۲

راجہ منیر کو شکست دیکر منیر پر قبضہ کیا۔ قطب سالار کا مزار منیر سے دو میل پورب موضع جہاداں میں مسجد کے پس پشت میدان میں واقع ہے، اس جنگ میں جو مسلمان شریک تھے، ان میں پچیس آدمیوں کے نام بھی سفینوں میں مذکور ہیں، اور اس فتح کی تاریخ حسب ذیل ہے۔

یافت چوں بر راجہ منیر ظفر — داد امام از دین جہانے را نوی

ہست منقول از بزرگان سلف — سال آں "دین محمد شد قوی"

ان سفینوں کے رو سے حضرت تاج فقیہ اور قطب سالار کے آنے سے پہلے ایک مسلمان مومن عارف نامی منیر میں رہتا تھا، جس کو راجہ منیر سے سخت ایذائیں پہنچی تھیں، مومن عارف نے تنگ آکر مدینہ کی راہ لی، اور وہاں جاکر حضرت تاج فقیہ کو اپنا ماجرا کہہ سنایا۔ حضرت تاج فقیہ جن کا اصل وطن خلیل الرحمٰن (ہبرون Hebron) تھا ایک گروہ کو ساتھ لیکر غزنیں ہوتے ہوئے منیر پہنچے، اور راجہ منیر سے جنگ کرکے منیر پر قابض ہوئے۔"

بہرحال اس زمانہ میں مومن عارف یا کسی مسلمان کا باشندۂ منیر ہونا اس طور پر قرین قیاس ہو سکتا ہے، کہ مسعود غازی کے ساتھیوں میں سے کسی نے منیر آکر سکونت اختیار کرلی تھی۔ اور اسی کی نسل میں مومن عارف تاج فقیہ اور قطب سالار کے زمانہ میں منیر کا باشندہ تھا۔ تاریخ اجینہ اودھ (صفحہ ۱۵۳) میں مذکور ہے، کہ خواجہ عماد خلجی جو سالار مسعود کے ہم جد تھے، اور محاربہ مجاہدانہ سالار مسعود میں شریک تھے، ان کی اولاد بہرایچ میں اب تک موجود ہے۔ اس بیان سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

منیر کے رہنے والے ایک برہمن رجھان گیر نامی نے ایک دعویٰ کے ثبوت میں عدالت میں ایک تانبے کی تختی پیش کی جسکے رو سے قنوج کے راجہ گوبند چندر نے پٹالہ (یعنی پرگنہ) منیر میں پڈلی نامی ایک موضع ایک برہمن کو عطا کیا، اس لوح پر جو سنہ درج ہے، حساب کے رو سے سنہ ۱۱۲۶ء کے موافق ہوتا ہے، اور اس میں یہ فرمان درج ہے، کہ اس حکم کے مطابق تمام مطالبات مع مالگذاری تجارتی محصول اور ترکوں کا محصول (غالباً جزیہ مراد ہوگا) جو تم حال تک ادا کرتے آئے ہو ادا کرنا"[۳]

اس لوح کے رو سے سنہ ۱۱۲۶ء کے قبل سے ترک لوگ علاقہ منیر میں، مالگذاری یا محصول (یا جزیہ) وصول کرتے تھے، اور یہ زمانہ محمد بن بختیار خلجی کی فتح سے چھیاسٹھ برس قبل کا ہے، لہذا اس کتبہ کے اعتبار سے بھی، راقم کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔

سلاطین غزنویہ کے عہد میں ایک مسلمان سیاح کا اس طرف سے گذرنا ایک اور روایت سے بھی دریافت ہوتا ہے

---

[۱] وسیلۂ شرف مولفہ شاہ فرزند علی صوفی صفحہ ۸۴ تذکرۃ الکرام مولفہ شاہ کبیر الدین احمد صفحہ ۶۷۴ و آثار شرف مولفہ قاضی سید نور الحسن صفحہ ۶۶۔ آخر الذکر کتاب میں مومن عارف کے بعد حایک کا اضافہ بھی ہے۔ ممکن ہے مومن عارف بجائے نام کے لقب ہو۔۱۲ [۲] مولف وسیلۂ شرف نے اس کو بیت المقدس کا ایک محلہ تیس کیا ہے لیکن حقیقتاً یہ جگہ بیت المقدس سے تیس میل کے فاصلہ پر ہے اور مشہور زیارت گاہ ہے۔۱۲ [۳] اصل عبارت مع انگریزی ترجمہ سنہ ۱۹۱۶ء میں جرنل بہار و اڑیسہ ریسرچ سوسائٹی جلد ۲ میں شائع ہو چکا ہے۔۱۲

جو اس موقع پر تاریخ آئینہ اودھ صفحہ (۱۵۳) کے حوالہ سے مختصراً نقل کی جاتی ہے -

"تذکرہ محاربہ مجاہدانہ امیر کبیر سید قطب الدین محمد مدنی جو عربی میں ہے، اور وہ کتب خانہ اولاد سید فضل اللہ گوشائیں محلہ بارہ دری متصلات بہارت ملا تھا۔ ملخص اس کا یہ ہے کہ امیر کبیر موصوف حج کر کے جدہ جہاز پر خلیج بنگالہ ہو کر اس ملک میں داخل ہوئے اور براہ خشکی افغانستان ہو کر وطن جانے کے عزم سے کڑہ مانک کی طرف روانہ ہوئے راہ میں ہندوؤں نے کچھ کچھ کہہ کر کہیں ٹھہرنے نہ دیا۔ اور سخت ایذا پہنچائی، بالآخر کسی طرح براہ خشکی مدینہ واپس ہوئے، اور وہاں سے بعض مریدوں کے ساتھ پھر بادشاہ غزنی کے پاس آئے اور شاہی فوج کی معیت میں دوبارہ ہندوستان آ کر نواح دہلی میں مقیم ہوئے"

سنہ ۵۷۶ھ میں حضرت تاج فقیہ کا منیر فتح کرنا جو اوپر مذکور ہوا، تاریخی طور پر بالکل صحیح ثابت ہوتا ہے اسلئے کہ تاج فقیہ مخدوم یحییٰ منیری پدر مخدوم شرف الدین منیری کی ولادت سنہ ۶۶۱ھ میں ہوئی، اس لئے ان سے اوپر تین پشتوں (یعنی مخدوم یحییٰ ابن اسرائیل ابن تاج فقیہ) کے لئے پچاسی برس کی مدت قرین قیاس اور صحیح معلوم ہوتی ہے، بہر حال طبقات ناصری (صفحہ ۱۴۰) کے رو سے سلطان شہاب الدین غوری نے بنارس تک فتح کیا، اور تاریخ فرشتہ (جلد ۱ صفحہ ۹۵) میں مذکور ہے کہ اس سلطان نے "تا بلاد بنگالہ" فتح کر لیا۔

اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی

(سنہ ۵۹۰ھ تا سنہ ۶۰۲ھ / ۱۱۹۲ء-۱۲۰۴ء)

پہلا شخص جس نے بہار و بنگالہ میں اسلامی حکومت قائم کی اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی تھا محمد بن بختیار خلج وغور و ... بلاد گرمسیر کے اکابر میں تھا، تلاش منصب میں اول سلطان معز الدین سام (شہاب الدین غوری) کے پاس غزنی میں حاضر ہوا، پھر وہاں سے دہلی چلا آیا، لیکن یہاں بھی حسب خواہ کام نہ ملنے پر سپہ سالار ہزبر الدین حسن ادب کی خدمت میں بداؤں پہنچا، پھر کچھ عرصہ کے بعد یہاں سے اودھ کی طرف آ کر ملک حسام الدین اغلبک کا ملازم ہوا، اسی اثنا میں محمد بن بختیار نے گھوڑے اور ہتھیار فراہم کر لئے اور سلطان معز الدین سام کے مفتوحہ ممالک سے مقام سہلت و سہلی میں (مرزاپور کے قریب) جاگیر بھی حاصل کر لی، اور یہیں سے منیر و بہار پر ایلغار کر کے مال غنیمت حاصل کرتا رہا۔[1]

اسی زمانہ میں غور و خراسان و غزنی و مرو سے[2] ایک جماعت ہندوستان آ کر پراگندہ ہو رہی تھی، محمد بن بختیار کی شہرت سن کر اس کے پاس فراہم ہوئی، اور محمد بن بختیار کو بھی اُن کے آنے سے بڑی تقویت ہوئی، رفتہ رفتہ سلطان قطب الدین ایبک کو اسکی

---

[1] طبقات ناصری صفحہ ۱۴۷۔ [2] تاریخ فرشتہ۔ صفحہ ۲۹۴

شہرت کا حال معلوم ہوا، سلطان نے اس کو اپنے پاس بلوا کر بڑی عزت کی۔ اس عرصہ میں بہار و بنگالہ میں لوگوں کے دلوں میں محمد بن بختیار کی جلادت کا رعب بیٹھ گیا تھا۔ دو ایک برس اطراف منیر و بہار پر اچانک حملے کرنے کے بعد محمد بن بختیار نے حصار بہار کو فتح کر لینے کا تہیہ کر لیا۔ اور دو سو سواروں کو ساتھ لیکر غایت دلیری و بہادری سے جنگ کر کے قلعہ بہار پر قبضہ کر لیا۔ یہاں کا راجہ اندرمن دیو پال بھاگ کر روپوش ہو گیا۔

طبقات ناصری کے مطابق اس وقت بہار کے اکثر باشندے "سر منڈے برہمن" (یعنی بودھ دھرم کے راہب) تھے جو معرکہ میں قتل ہوئے، مسلمانوں نے دیہاروں میں بہت سی کتابیں پائیں، اور بعض گروہ کو طلب کر کے ان کے مطالب کی تحقیق چاہی لیکن راہب قتل ہو چکے تھے، اس لئے کوئی ان کا مضمون نہ بتا سکا۔

فتح کے بعد محمد بن بختیار مال غنیمت لے کر سلطان قطب الدین ایبک کے پاس حاضر ہوا۔ لیکن درباروں نے حسد کر کے سلطان کو اس کی بہادری کا امتحان لینے پر آمادہ کیا۔ محمد بن بختیار نے ایک فیل مست سے مقابلہ کر کے گرز کی ایک ہی زد میں فیل کو بھگا دیا۔ سلطان نے خوش ہو کر اس کو انعام سے سرفراز کیا، اور درباریوں سے بھی انعام دلوائے۔ محمد بن بختیار نے تمام انعام کو اسی جلسہ میں تقسیم کر دیا، اور پھر بہار واپس آ کر کچھ مدت کے بعد ایک لشکر فراہم کر کے شہر ندیا (بنگالہ) پر چڑھائی کی، اور سین خاندان کے راجہ "لکھمنیہ" (لکھمن سین) کو شکست دے کر بنگالہ پر قبضہ کر لیا، اور شہر لکھنوتی (گوڑ) کو اپنا دارالسلطنت بنا کر سلطان دہلی کا سکہ و خطبہ جاری کر کے تمام علاقوں میں مسجدیں، مدرسے، خانقاہیں، سرائیں اور [illegible] بنوائیں، اور بعض مال غنیمت سلطان کے پاس روانہ کیا۔

منہاج الدین سراج مؤلف طبقات ناصری لکھتا ہے کہ "بہار کی فتح کے وقت جب محمد بن بختیار قوت و دلیری سے دروازۂ حصار تک پہنچا۔ اہل فرغانہ سے دو فہمیدہ شخص جن کے نام نظام الدین و صمصام الدین تھے (اور آپس میں بھائی تھے) اس معرکہ میں محمد بن بختیار کے ساتھ تھے۔ انہیں میں سے صمصام الدین نے فتح بہار کا چشم دید واقعہ ۶۴۱ھ میں لکھنوتی میں خود مجھ سے بیان کیا"

بنگالہ کی فتح کے چند سال بعد محمد بن بختیار نے کوچ بہار کی راہ سے ملک تبت پر چڑھائی کی۔ یہی پہلا شخص معلوم ہوتا ہے، جس نے اس راہ سے تبت پر فوج کشی کی۔ اس مہم میں بعض وجوہات سے اس کو سخت ہزیمت ہوئی، دس ہزار آدمیوں میں سے بمشکل سو سوا سو سوار سلامتی کے ساتھ واپس آئے۔ محمد بن بختیار کی واپسی پر خلجیوں کی عورتیں اور لڑکے جن کے قرابت مند تلف ہوئے تھے، محمد بن بختیار کو سر راہ گالیاں اور بد دعائیں دیتی تھیں اور اسی صدمہ سے بیمار ہو کر اس نے ۶۰۲ھ میں انتقال کیا[1]۔ مرنے سے

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد اصفحہ ۲۰۹ میں لکھا ہے کہ اس کا جنازہ بہار میں لا کر دفن کیا گیا، لیکن طبقات ناصری میں دفن کا کوئی ذکر نہیں۔

پہلے کہا کرتا تھا، کہ شاید ملک حسام الدین؛ نابک پر کوئی حادثہ ہوا جو اقبال نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے، دا قعی انہیں دنوں میں، ملک مذکور قتل ہوا تھا۔

طبقات ناصری میں ایک اور روایت یہ لکھی ہے کہ محمد بن بختیار کا ایک سردار علی مردان خلجی اپنی جاگیر سے دیوکوٹ آیا. اور محمد بن بختیار کے مکان میں جہاں تین دنوں سے کوئی اس کو دیکھنے نہ گیا تھا، داخل ہو کر اس نے اس کے منہ سے چادر اٹھائی، اور خنجر سے اس کا کام تمام کر دیا۔"

محمد بن بختیار کی جسمانی ہیئت بھی غیر معمولی تھی، اس کے ہاتھ اس قدر لانبے تھے کہ کھڑا ہو کر ہاتھ چھوڑ دیتا تھا، تو انگلیاں گھٹنوں کے نیچے تک پہنچ جاتی تھیں۔ رائے لکھمن سن کو برہمنوں نے پیشین گوئی کر کے ڈرا دیا تھا کہ اسی ہیئت کا ترک اس کی حکومت کا خاتمہ کرے گا۔ ؎

راقم
فصیح الدین بلخی
ریونیو افسر و مجسٹریٹ ریاست سرائے کیلا (اڑیسہ)

غزل

(از جناب معظم علی خاں صاحب سیماب عظیم آبادی)

سر ہے اور اسکا آستانہ ہے — اوج پر بخت کا زمانہ ہے
دل لگانا - تڑپنا - مرجانا — تین ٹکڑوں کا اک فسانہ ہے
دل جسے دیں وہ پائمال کرے — کیا روش ہے یہ کیا زمانہ ہے
قصۂ گیسوو دلِ مضطر — الجھا الجھا سا اک فسانہ ہے
موت آئی شباب میں اپنی — دل رہے کارواں روانہ ہے

تم تو یوں بھی تڑپتے ہو سیماب
دل لگانے کا اک بہانہ ہے

؎ پورا بیان طبقات ناصری صفحہ ۱۴۶ تا ۱۵۷ سے ماخوذ ہے۔

قصیدۂ نعتیہ غیر منقوطہ

از

جناب خان بہادر سید احمد علی خاں صاحب عظیم آبادی

طلوع مطلع مدح مراد ہر دو سرا — وہ ہدِ دلِ علما را طلوعِ مہرِ ولا
سوارِ عرصہ لولاک سرورِ والا — اساسِ عالم ارواح ۔ روحِ کل را

رسول داور و دلدار آدم و حوا

محمد احمدِ محمود سرورِ معصوم — رسولِ اکرم و اعلم ہمال او معدوم
سرِ رُؤسا ہم سواد او موہوم — حدودِ علم کلام و کمال لامعلوم

مراد سورہ طٰہٰ و عَلَّمَ الاسما

مطلعِ حور و ملائک سُلالۂ آدم — اساسِ مہر و عطا و عمادِ رحم و کرم
امامِ کل امم مصدر علوم و حکم — مؤسسِ ہمہ عالم مدرسِ اعلم

مکمل کملا و معلم علما

سرورِ دل ۔ دل عالم ہُمام را سرِ ور — مدار ہور و ہلال و سماک را محور
سرِ معمم و رو مہر و لالہ احمر — طرِ معطرِ و مسکی کلالہ ہا اطہر

کہ داد در سرِ حورا سوادِ مو سودا

اصولِ سوءِ عمل را حسام او صارم — حصار کرو حسد را رماح او ہادم
صلاح کار و ورع را صلاح او عاصم — علوم آدم و داؤد و ہود را عالم

محلِ حلِ مسائل عمودِ دارِ ہدا

وداد سرورِ لولاک در دلِ آگاہ　　علحدہ ہمہ اعدا ملاحدہ گمراہ
اساس مسئلہ لا الہ الا اللہ　　مسلمہ کلمہ را گوا رسولِ الٰہ

کہ علم او بعلم اللہ مارا الا احصا

ہمہ عساکر و کل گروہ را سالار　　کہ و مہ و امرا و ملوک را سرکار
کرم و علما و کرام را سردار　　ممدوام و ودود مور و مار را داوار

اکاسرہ ہمہ مرؤس طوعا او کرہا

حصار رحم و مراحم موسع و واسع　　ہمارہ عالم اسرار دور دراساع
درود و ڈالہ او لاد او ہما طالع　　کلام او حکما را دلائل ساطع

امام کل ائمہ رسول ہر دوسرا

معدل ہمہ موسم محولِ احوال　　محل کل مدارا و مصلح اعمال
مرام کل اُسارا و حاصلِ آمال　　دوا و مہلک سم مکارہ و اہوال

گدا و سائل و گم کردہ راہ را ماوا

کلامِ حاسد او لا کلام لاطائل　　رسولِ محرم و سر الہ را حامل
کل مراد مددگار داد رس عادل　　سما ہماد مُلک عائل و ملک سائل

کہ ماہ طاس صدا آلا و مہر کاس گدا

مکمّل و اولی الامر و ملک را آمر　　مُصدّر و سر سدرہ امور او صادر
ممدوہ ہمہ امصار و ملک را عامر　　مطہر و ہمہ آل کرام او طاہر

ملوم حاسد سر و رعدو او رسوا

ہمہ معاصر او لا مکرم و مسرور　　مکائد ہمہ اعدا معطل و مدحور
عساکر ہمہ حساد در عدم محصور　　ورا در اہمہ محکوم ما سوا مامور

مدار دہر و مدار الہام داد روا

رسول ملہم و کل علوم را ماہر　　اصول وسوسہ و طرح عاد را کاسر۔

طول حاسد او مردہ سحر ہر ساحر — ہول مار و مدحور کرہ ہر ماکر
کل و اسم ہمہ کائد ہلاک کل اعدا

طلوع گردہ اعمد تدر دور گردد — وگر مسعود ہر دو مر مطر گردد
رسول امر دہد گر مطر گہر گردد — وہر سطوع مسا را اگر سحر گردد
وگر علو رہ او گاہ گردد آس سرا

گواہ اول اکرام او الہ صمد — دگر کہ عادل و ہم اسم کردگار واحد
محال مدح رسول کرام لے احد — اگر دہد دل مداح را امام مدد
گر مستودہ گردد مکارم والا

محمد او اسد اللہ علی ودرکار — در علوم ملک ولولہ ملک کردار
ہم اسم داور و محمد مدح مرسل ادوار — امام اول و واللہ سرور احرار
مراد سورۂ الدہر دہر را دوا را

امام دوم دل آرام مورد آلام — امام دوم مسموم مصدر اکرام
امام سوم معصوم حاسم اسلام — کہ روح ہر دو ورا داد و صد درود و سلام
ہمارہ و مہ و سال وگہ طلوع و مسا

دہد ملال و الم حال سرور معصوم — صدا آہ ہمہ ہر دو ہمدرد او ہمہ مسموم
ہلال و عامر و عمار و عروہ مرحوم — حر دلاور و مسعود و سعد ہم معدوم
وداع دار عمل کردہ ہا ہمہ دردا

سوار عرصہ اورد مسلم ہمدم — ہمہ عساکر مکار کرد او درہم
اسد ہمال علمدار ماہ اہل حرم — اساس علم و ہم ہم والہ امام امم
گوار راہ عدم کردہ ہر دو واصدوا

امام راسہ سرور دل و ہم اسم الہ — اول کہ حامل آلام لا دوا اسد آہ
کلوم او ستا را داد و طمع گمراہ — ہلاک کرد سوم را کہ حرملہ واللہ
وداع کردہ دل آرام را امام ہدا

نوائے شوق

از جناب سید شاہ ولی الرحمٰن صاحب ولی ایم۔ اے ڈپٹی مجسٹریٹ پورنیہ

ہے شبیہِ حیرتِ آئینہ حیرانی میری
پیکرِ زلفِ پریشاں ہے پریشانی میری

رو پڑے وہ دیکھ کر صحرا میں عریانی میری
ساز و ساماں بن گئی بے ساز و سامانی میری

زمزمہ خواں ہوں نہ مجھکو دیکھ کر کیوں عندلیب
ہے نویدِ موسمِ گل چاک دامانی میری

المدد اے صبر بن جا پردہ دارِ رازِ عشق
پردہ در ہونے لگی خوننابہ افشانی میری

آبلوں کے منتظر ہیں خارہائے تشنہ لب
سوئے صحرا لے چل اے آشفتہ سامانی میری

رحم کھایا رحمتِ حق نے گناہوں پر مرے
عرصۂ محشر میں کام آئی پشیمانی میری

جوہرِ پنہاں سے لے اب کام اے شمشیرِ ناز
مانعِ ذوقِ شہادت ہے گراں جانی میری

پائے ساقی پر گرا میں مست ہو کر بزم میں
کر گئی اک کام دانائی کا نادانی میری

جوشِ وحشت میں رہی مجھکو نہ کچھ فکرِ لباس
خاکِ صحرا ہی نے رکھ لی شرمِ عریانی میری

دل کی الجھن دیکھ کر الجھے وہ گیسوئے سیاہ
یوں پریشاں کر گئی انکو پریشانی میری

تیرے در کی جبہ سائی سے ملا مجھکو یہ اوج
بن گئی خاکِ شفا گھس گھس کے پیشانی میری

چشمِ تر آخر کریگی آبپاشی تا بکے
کم نہ ہوگی سوزشِ غمہائے پنہانی میری

گر ہوا سے بجھ گئی شمعِ لحد کچھ غم نہیں
قبر پر روتی ہے خود بے ساز و سامانی میری

خانۂ دل سے یہ کہہ کر سدھاری آرزو
یاس کے ہوتے یہاں ہوگی نہ مہمانی میری

کس قدر سودا ہے تیری زلفِ پیچاں کا مجھے
دیکھ کر سنبل کو بڑھتی ہے پریشانی میری

کیا جنوں زا ہے یہ عالم حسن پر مفتونِ عشق
میں وہ مجنوں ہوں کہ خود لیلیٰ ہے دیوانی میری

خوشہ چینی خرمنِ غالب کی کرتا ہوں ولی
کیوں نہ مقبولِ جہاں ہوگی غزل خوانی میری

سید ابن الحسن فکر ایم اے ایڈیٹر پردۂ تصویر

سعد ساة ولی الرحمن ولی ایم اے ایڈیٹر مسرت
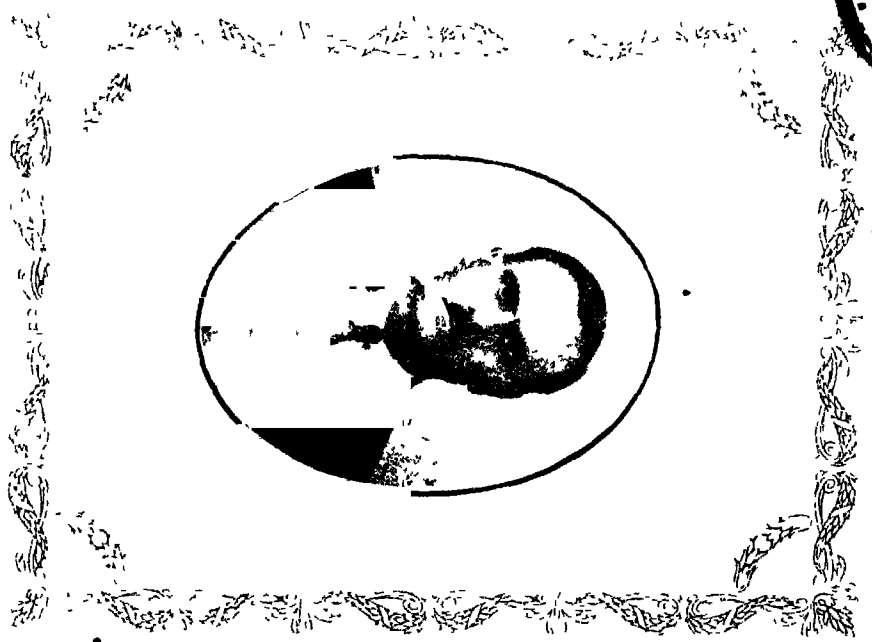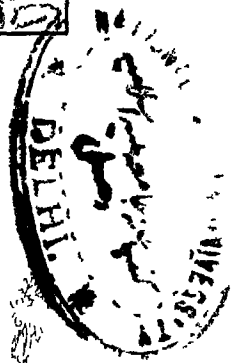
جھوٹی آزادی

از جناب مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، مدیر "الضیاء" (عربی) لکھنؤ

جنگ عظیم میں عربوں کی بغاوت اور اس کے ہولناک نتائج، اخبار بیں طبقہ سے پوشیدہ نہیں، کرنل لارنس اور سرپرسی کاکس، جیسے شاطران بساط سیاست کے کارنامے منظر عام پر آچکے ہیں اور آئے دن اس موضوع پر کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں، ہمارے عرب بھائی اُسے "جہاد آزادی" سے تعبیر کرتے ہیں، ابھی حال ہی میں " الثورۃ العربیۃ الکبریٰ" کے نام ایک کتاب تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے، جس میں تمام وثائق اور معاہدے شائع کردیئے گئے ہیں۔ اور ابھی پچھلے دنوں، ان عرب نوجوانوں کی یادگاریں، جو جمال پاشا کے حکم سے تختۂ دار پر لٹکائے گئے تھے، تمام عربی ممالک میں "یوم الشہداء" منایا گیا۔

اردو خواں طبقہ تصویر کے صرف ایک رخ سے واقف ہے۔ اسے صرف یہ معلوم ہے، کہ عربوں نے جنگ عظیم میں ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرکے، شعائر دین کی خلاف ورزی کی، اور اسی لئے شریف حسین ——— جسے عرب اپنا نجات دہندہ "منقذ الامۃ العربیۃ" مانتے ہیں ——— اردو اخبارات کے حلقہ میں بری طرح بدنام ہے، لیکن ہندوستان کے مسلمان عموماً اندرونی حالات سے ناواقف ہیں، ہم بھی شریف حسین کو بے گناہ نہیں سمجھتے، اور نہ اس کی بغاوت کو "جہاد" خیال کرتے ہیں، لیکن بعض اندرونی حالات سے پوری واقفیت کے بعد، یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہیں، کہ عرب اس قدر ملامت کے مستحق نہیں، جتنا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔

" آویزش ترک و عرب" ایک مستقل مضمون ہے، اور اس کے لئے ایک مخصوص فرصت درکار ہے، آج کی صحبت میں، ہم ایک جدید کتاب (Shifting Sands) کے ایک باب "جھوٹی آزادی" (False Freedom) کا ترجمہ کرنا چاہتے ہیں، جس سے معلوم ہوگا، کہ اثنائے بغاوت میں عرب سپہ سالاروں کے جذبات کیا تھے؟ اور کن خیالات کے ماتحت وہ ترکوں کے خلاف، نبرد آزما ہوئے؟ کتاب کا مصنف میجر ن-ن-ی-برے (Bray) مصر میں انگریزی فوجی افسر تھا۔ اور عربوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ جیسا کہ مضمون سے معلوم ہوگا۔

اتنی تمہید کے بعد ہم قارئین سے اصل مضمون کے پڑھنے کی درخواست کرتے ہیں کہ مفید اور دلچسپ ثابت ہوگا۔ کہیں کہیں ضروری نوٹ دیئے گئے ہیں۔

مسعود عالم ندوی

ایک عرب

۱۹۱۷ء موسم گرما میں سر مارک سائکس اور موسیو پیکو[1] ـــــــ جس نے معاہدہ سائکس ۔ پیکو پر حکومت فرانس کی جانب سے دستخط کئے تھے ـــــــ مصر آئے، میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا، اور سر مارک سے درخواست کی، کہ ایک عرب دستہ (Legion) کی تیاری میں اپنے اثر و نفوذ سے ہماری مدد کریں، تاکہ عربوں کی تحریک بغاوت ایک خالص قومی رنگ اختیار کرلے۔ یہ ممکن تھا کہ گرفتار شدہ عرب فوجیوں اور دوسرے عرب قوم پرستوں کی شرکت سے یہ دستہ جلد از جلد آسانی سے تیار ہو جائے، اور اس کی قیادت انگریز اور فرانسیسی افسروں کے ذمہ کی جائے۔ ہم نے اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی۔ اور سر مارک سے تحریک کی بنیادی کمزوری بیان کی۔ اور ایک مرکزی محور کی حاجت جتائی، جس کے زیر اثر اس تحریک کا بار آور ہونا ممکن ہو۔ اور امید ظاہر کی، کہ یہ عربی دستہ انگریزی لشکر کے لئے قوت بازو ثابت ہوگا۔ سر مارک نے میری رائے سے اتفاق کیا، اور ایک عربی دستہ کی تشکیل کا پختہ ارادہ کر لیا۔

محکمہ حرب نے بھی اس تجویز سے اتفاق کیا اور مال و سلاح سے امداد کا وعدہ کیا گیا۔ حکومت سوڈان نے اپنے ذمہ وردیوں کا انتظام لیا۔ میرے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ عرب فوجی قیدیوں سے مل کر انھیں تیار کروں،

حسب تجویز قیدیوں سے ملا، اور افسروں سے اپنا مقصد وضاحت سے بیان کیا۔ ان کی ایک بڑی تعداد اس اقدام کے لئے تیار ہوگئی، فوراً ان کی رہائی کے احکام صادر ہوئے اور وہ آزاد ہوگئے۔

افسروں کی کمیٹی

افسروں کی ایک جماعت مشورہ کے لئے منتخب کی گئی۔ ہم لوگ روزانہ عرب کی تفصیلات پر غور کرنے کے لئے مجتمع ہونے لگے۔ ہم نے قواعد (Drill) کی عربی کتاب کی ضرورت محسوس کی اب تک عرب فوجیوں کو

[1] ۱۹۱۶ء میں انگلستان اور فرانس نے ایک دوسرے خفیہ معاہدہ پر دستخط کئے۔ جو معاہدہ سائکس ۔ پیکو کے نام سے مشہور ہیں۔ اس معاہدہ کی رو سے ترکی عرب صوبجات کی باقاعدہ تقسیم ان تجاویز کے مطابق ہوگئی۔ جو سال ماقبل کے اصلی عہد نامہ مورخہ ۹ مارچ ۱۹۱۵ء میں قرار پائی تھیں۔ سائکس پیکو عہد نامے کی رو سے عراق کا بہت بڑا حصہ برطانیہ کے قبضہ میں اور ساحل صور سے لے کر اسکندرونہ تک بشمول ارمینیا اور ایشیائے کوچک، فرانس کے قبضہ میں آیا، فلسطین بین الاقوامی رہا، البتہ اس کا بندرگاہ حیفا برطانیہ کو ملا۔ خلاصہ یہ کہ وہ آزادی جس کا وعدہ سر میکموہن نے عربوں سے کیا تھا۔ ہباءً منثورا ہوگئی۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو (جدید دنیائے اسلام از اسٹاڈرڈ)
م ۔ ع

زکی زبان میں قواعد کرائی جاتی تھی۔ ہم نے اس بارے میں، مصر کے علماء اد باسے امداد طلب کی اور انہوں نے وضع اصطلاحات میں ہماری خاطر خواہ مدد کی۔

سائکس پیکو عہدنامہ

ہمیں آگے چل کر، دوسری دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ قیدخانہ کی تاریک کوٹھریوں میں، ان عرب افسروں کو آئے دن کے سیاسی انقلابات کی بالکل خبر نہ تھی۔ آزاد ہونے کے بعد عرب قوم پرستوں سے ملنے کا موقع ملا۔ لازمی طور پر سائکس پیکو معاہدہ کی بھنک ان کے کانوں میں پہنچی۔ اگرچہ وہ اس کی اصلیت و تفصیلات سے بالکل ناواقف تھے۔ پھر بھی اس سے عرب وطن پرستوں کا اضطراب بڑھ گیا۔ ہمارے پاس انکا ایک وفد آیا، کل سوا آدمی تھے۔ مشن بہت اہم تھا۔ ان کے نمائندہ نے اس طرح گفتگو شروع کی:۔

"آپ نے ہم لوگوں کو عربی دستہ میں شریک ہو کر ترکوں سے لڑنے کا مشورہ دیا، جن کی پناہ میں کل تک ہم افسر تھے۔ اس طرح پر ہم اپنے کو موت کے منہ میں ڈال رہے ہیں، ہماری عورتیں اور بچے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں، ہمارے گھربار بھی محفوظ نہیں، ہم یہ سب کچھ خوشی خوشی برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں، اگر ہمیں اس کا یقین دلا دیا جائے کہ ہم اپنے وطن کی حقیقی آزادی کے لئے جنگ کر رہے ہیں، ورنہ ہمیں اجازت دیجئے کہ پھر قیدخانہ کی تنگ و تاریک کوٹھریوں کا رخ کریں۔ کہ یہ قربانیاں، ہم صرف آزادی ہی کے لئے گوارا کر سکتے ہیں۔"

ذاتی طور پر، مجھے ان کے رویہ سے پوری ہمدردی تھی، میں نے محسوس کیا، اور اب تک اسی رائے پر قائم ہوں۔ کہ انکا مطالبہ حق بجانب ہے۔ ان بیچاروں سے یہ کوئی توقع نہیں کر سکتا کہ جھوٹی آزادی کے لئے وہ اپنا تن من دھن قربان کر دیں۔ مجھے غور و فکر کے لئے فرصت و سکون کی ضرورت تھی، ایک دو روز کے بعد ان سے پھر ملنے کا وعدہ ہوا، اور مجلس ختم ہو گئی۔

منصفانہ غور و فکر

یہ غور و تفکر میرے لئے جاں گسل ثابت ہوئی۔ اس لئے کہ اس سے پوری عربی تحریک کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا، حکومت برطانیہ اور شریف حسین کے درمیان، عربی ممالک کے حدود کے متعلق کتنی ہی غلط فہمی کیوں نہ ہو، مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عربوں نے معرکہ کارزار میں صرف اس لئے حصہ لیا، کہ تمام عربی علاقے ترکوں کے پنجۂ اقتدار سے آزاد ہو جائے، عراق ہو یا شام، حجاز ہو یا فلسطین، ہر باشندہ کے دماغ میں ایک آزاد عربی حکومت کا تخیل تھا۔ یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ عرب، اپنے مستحکم عقیدہ کے مطابق، اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے تھے، یقینی وہ کسی غیر ملکی لشکر میں تنخواہ دار سپاہیوں کی حیثیت سے کام نہیں کر رہے تھے۔ پھر وہ اپنے عزیز ملک کو، ایک فر [illegible] اسکے قبضہ سے نکال کر دوسرے

حکمران کے پنجۂ استبداد میں دینے کے لئے' اپنی عزیز جانیں کیوں قربان کریں ؟ یہ توقع ان سے کس طرح کی جاسکتی ہے کہ ترکوں کے بدلہ وہ کسی دوسری طاقت کو اپنی قسمت کا مالک بنانا گوارا کریں گے ؟

مجھے شام' عراق اور فلسطین کا حشر معلوم تھا؟ پھر انہیں کس طرح تسلی دیتا؟ میں نے ایک سخت خطرہ کا احساس کیا اور موجودہ حالات میں میرے لئے دشوار تھا کہ اس دشوار مسئلہ کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھ سکوں'

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے' عربوں کو اس میں مطلق شک نہیں تھا' کہ وہ عربی ممالک کی آزادی کے لئے آگ اور خون سے کھیل رہے ہیں۔ اگرچہ شبہات نے ان کو حقیقت سے قریب ترکردیا تھا' مگر برطانیہ اور حلفاء کے وعدوں پر انہیں اتنا اعتماد تھا کہ شبہات اور افواہوں کے باوجود ان کے اس عقیدہ میں کوئی کمزوری نہیں آئی ۔ مجھے یقین تھا کہ جب حقیقت بے نقاب ہوگی اور واقعات اپنی اصلی صورت میں نمایاں ہوں گے' عربوں کے شریفانہ جذبات کو سخت ٹھیس لگے گی' ممکن ہے اس وقت خطرناک ردعمل ہو۔ اور بہرحال ہم لوگ عہدشکنی اور دغابازی کے مجرم قرار پائیں گے

سر مارک سائکس سر مارک سائکس' کسی مہم سے بحر احمر کی طرف گئے ہوئے تھے' آج ہی ان کی واپسی تھی' میں نے انکے پاس پیغام بھیجا کہ "فوراً ملنا چاہتا ہوں" آدھی رات کو' انکا جواب ملا کہ صبح کو آٹھ بجے وہ ملاقات کے لئے تیار رہیں گے۔ ناشتہ ساتھ ہی ہوگا۔

حسب عادت وہ بشاش تھا' شریف حسین کی ملاقات کی تفصیلات مزے لے کر بیان کرتا رہا۔ اتنے میں یک بہ یک بول اٹھا۔

"ہاں بتاؤ' کیا مصیبت آپڑی ہے"؟

"اس عربی بٹالین نے سے آپ تھی اور آدمی ہٹا انتظام کیجئے" مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا' یہ سن کر وہ اچھل پڑا جیسے ناگن نے ڈس لیا ہو۔

"ناممکن! ناممکن!! مجھے کوئی دوسرا معاون نہیں مل سکتا۔ آخر تم کیوں معذور ہوگئے"؟

لہ ہمیں اپنے عرب دوستوں سے یہی شکایت ہے' جس کا عربی پریس میں ہم نے بارہا اظہار کیا ہے ۔۔ خود شریف حسین کے بارے میں علامہ سید رشید رضا نے لکھا ہے کہ "اسے اپنے خاص وزراء پر بھی اعتماد نہیں تھا۔ مگر معتمدین برطانیہ کے وعدوں کو وحی ربانی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔" (المنار' محرم ۱۳۵۳ھ) م - ع "۔

میں نے تفصیل سے تمام حالات بیان کئے، اور آخر میں یہ بھی واضح طور پر کہہ دیا کہ میں ان لوگوں میں شامل نہیں ہونا چاہتا جن پر مستقبل میں بد دیانتی کا الزام لگایا جائے۔

گفتگو ذرا تلخ ہو گئی، سر مارک متوحشانہ انداز سے کمرے میں گھوم رہا تھا، غصہ کی حالت میں، یہ اس کی عادت تھی، مگر خوش قسمتی سے سر مارک دیر تک غصہ نہیں رہ سکتا، دفعۃً وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اور اسی معصومانہ مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا:-

"تم بھی عجیب گداگر ہو، بتاؤ، کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں کہ ان غریب لوگوں سے آپ صاف صاف کہہ دیجئے" میں نے جواب دیا۔

"اچھا تو کیا وہ اپنی آزادی کے لئے جنگ کر رہے ہیں"؟

"اس کے معنی یہ ہوئے، کہ اہل شام و نابلس و بغداد کے باشندے آزاد ہو جائیں گے"!! اب اس کا چہرہ متین ہو گیا اور کچھ دیر تک خاموش رہا۔

"بہت خوب، میں ان لوگوں سے، تمہاری حسب خواہش، صاف صاف کہہ دوں گا"

سرکاری بیان

ہم لوگ ناشتہ کے لئے بیٹھ گئے اور عرب افسروں کو طلب کیا گیا اور حلفا کی اصلی نیت کو ظاہر کئے بغیر اس نے پوزیشن بالکل واضح کر دی، اس نے ایک بات بہت صاف کہی کہ عربوں کا مستقبل خود ان کے ہاتھ میں ہے، اگر وہ چاہیں، تو آزاد ہو سکتے ہیں"

بحیثیت مجموعی، میں مطمئن ہو گیا، سر مارک سائکس کی پوزیشن بہت پیچیدہ تھی، اسے کوئی بیان دینے کا بالکل اختیار نہیں تھا، یہ حکومت برطانیہ کا منصب تھا، وہ سیاسی معاہدوں کو طشت از بام بھی نہیں کر سکتا تھا، بہر حال ممکن حد تک، اس نے بہت واضح گفتگو کی اور سچائی سے قریب رہا، میں اور تمام عرب سردار مطمئن ہو گئے۔

(کتاب کے اس ٹکڑے سے یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے، کہ عرب اپنی فہم کے مطابق، آزادی وطن کے لئے جنگ کر رہے تھے، ان پر دو الزام عائد ہوتے ہیں:- ایک ترکوں کے مقابلہ میں غیر مسلم طاقتوں کی اعانت ــــ دوسرے حلفا کے وعدوں پر بیجا اعتماد، ترکوں کے خلاف تلوار اٹھانا کتنا ہی سنگین الزام کیوں نہ ہو، مگر اس کی ذمہ داری بڑی حد تک انجمن اتحاد و ترقی کی مسلم کش اور عرب آزار پالیسی پر عائد ہوتی ہے، ہاں البتہ حلفا اور خصوصاً برطانیہ کے ساتھ بیجا حسن ظن کی کوئی وجہ نہیں)

ل مصنف کا یہ بیان صد درجہ قابل ستائش ہے کہ موجودہ استعمار پرستوں کی ڈکشنری میں "دیانت و ایفائے عہد" کے کوئی معنی نہیں۔ م-ع

صدائے جرس

از افصح الفصحا مولانا شفق رضوی عمادپوری از آلہ آباد

جہاں تھا جو شب بھر کا یہاں وہ قافلہ رخصت ہوتا ہے
ہوتی ہے سحر بجتا ہے گجر اٹھ نیند سے اب کیا سوتا ہے

غفلت کا حجاب آنکھوں سے اٹھا او نیند کے ماتے ہوش میں آ
جو جاگتا ہے وہ پاتا ہے جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے

جو یاد میں اُسکی روتے ہیں وہ قبروں سے ہنستے اٹھیں گے
ہے موت اُن ہنسنے والونکی جن پر اک عالم روتا ہے

جو کھوتا تھا وہ کھو ہی چکا جو ہونا تھا وہ ہو ہی چکا
تو عمر کو اپنی رو ہی چکا پچھتانے سے اب کیا ہوتا ہے

فرقت کی اکیلی رات ادھر یا ایک خدا کی ذات اُدھر
سب سونیوالے سوتے ہیں اک رونیوالا روتا ہے

لیجائیگا نسیم زار ترا خود ہی تجھے جھک کر زیر زمیں
پیری میں زیادہ طاقت سے کیوں بوجھ تو سر پر ڈھوتا ہے

نیرنگ جہاں کے دیکھے ہیں ہمنے بھی ہزاروں رنگ شفق
ہنستے تھے جو سارے زمانے پر اب اُن پہ زمانہ روتا ہے

فرض کی قربانگاہ پر

حضرت جمیل مظہری ایم۔اے

دو بھولے بھالے حسین بچے گھر کی انگنائی میں کھیل رہے تھے۔ کھیل رہے تھے اور گھروندے بنا رہے تھے ——— بنا رہے تھے اور توڑ رہے تھے۔ چھوٹے کے ہاتھ میں ایک گڑیا تھی کپڑے کی ایک خوبصورت گڑیا ——— معصوم جذبات کا کھلونا ——— نابالغ ذوق نظر کے لئے ایک حسین دھوکا ——— بڑے کے مضبوط پنجوں نے چھوٹے کے کمزور ہاتھوں سے وہ گڑیا چھین لی چھین لی اور لے بھاگا۔ گڑیا چھن گئی بغیر کسی عذر کے ایک ہاتھ سے دوسرے کے ہاتھ میں چلی گئی ——— گڑیا کے سینے میں دل ہوتا نہیں اور ہوتا بھی ہو تو زبان نہیں ہوتی کہ اپنی رائے ظاہر کرے کہ کس کے ہاتھ میں رہوں گی۔ جو چھین لیتا ہے اس کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے اور اس وقت تک رہتی ہے جب تک وہ خود اسے اٹھا کر پھینک نہ دے ——— اور اگر ٹوٹ جائے؟ تو بقول غالب "اور بازار سے لے آئیے ——— جو چیز کہ بازار میں کوڑیوں کے مول ملتی ہو اس کی قیمت؟ ——— ہاں تو گڑیا چھن گئی جس کے ہاتھ سے چھن گئی اس نے فریاد کی غل مچایا اور گھر میں جتنے کان تھے ان سب کو اپنی مظلومی کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ لوگ دوڑے معصوم نزاع نے سنگین مقدمے کی شکل اختیار کی ججوں نے فیصلہ یہ کیا کہ گڑیا اسی کی ہے جس کے ہاتھ میں ہے دوسرے کے لئے دوسری منگوا دی جائے ——— ایک گڑیا کے لئے دو کمسن بھائیوں میں یہ نوک جھونک دیکھنے والوں کے لئے تماشہ ہو کر رہ گئی لیکن زمانہ کی گرم رفتاری نے بہت جلد ہمیں دکھلا دیا یہ تماشہ تماشہ نہ تھا فطرت کا ایک استعارہ تھا۔ مجازی تاریکیوں سے ڈھکی ہوئی ایک حقیقت تھی تلخ حقیقت فطرت جس کی "زبان حال" سے ایک کہانی کہہ رہی تھی۔ ایک ہونے والی کہانی۔ قضاء و قدر کا فیصلہ جس کی بنیاد پر ایک افسانہ مرتب کر رہا تھا ——— ایک عجیب افسانہ۔

۱

صبح آفرینش کی پہلی کرن پھوٹی تھی کہ زمین کے سینے پر جو سورج سے الگ ہو کر ایک مستقل سیارہ بن چکی تھی ضرورت محسوس کی گئی ایک ایسی مخلوق کی جو مقاصد فطرت کی کارفرمائی کر سکے ——— ارادے نے صورت پکڑی "حجریت" نے جسم اختیار کیا۔ التہاب و حرارت نے روپ بدلا ——— مرد کی تخلیق ہوئی ——— اور فطرت کا یہ شاہکار اولین زمین کے سینے پر خوش خرامیاں کرنے لگا۔ فضائے بسیط نے مہمان عزیز کے استقبال کے لئے اپنی گود پھیلا دی ——— پھولوں سے بھری ہوئی گود۔ لیکن

پھولوں کی خوشبو اس کے مشام روح کو آسودگی نہ پہنچا سکی۔ ستاروں نے آنکھیں مٹکا مٹکا کر کچھ اشارے کئے۔ چاند کی روشنی نے دور سے بلائیں لیں۔ بجلی نے ابر کے پردے سے جھانک کر ادائیں دکھلائیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کے احساسات لذت کو لطف اندوز نہ کر سکا۔ مہمان خانے میں چیز بھی اپنے مطلب کی نہ دیکھ کر مہمان کا جی گھبرانے لگا —— فطرت کی پیشانی پر بل پڑ گئے —— تفکر کے بل۔ "شاہکار ابھی نامکمل ہے" —— ارادے نے دوسری کروٹ لی دوسرے شاہکار کے لئے جو پہلے شاہکار کو مکمل کر دے۔ کائنات کی ہر چیز نے اپنی لطافتیں پیش کیں لطافتوں کا رس نچوڑا گیا۔ اور رعنائی اور کہربائیت کے امتزاج کے ساتھ ایک مجسمہ تیار ہوا —— یہ عورت تھی —— جو دفعتاً آسمان کی بلندی سے شہاب ثاقب کی طرح ٹوٹی ——
مرد کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس نے دیکھا کہ کائنات پر ایک نیا رنگ پھر گیا ہے —— ہر چیز میں ایک نئی زندگی دوڑ رہی ہے پھولوں کی خوشبو اب بھی معلوم ہونے لگی۔ بجلی کی ادائیں اب بہت ہی پیاری نظر آنے لگیں۔ ستاروں کی چشمک میں مزا ملنے لگا۔ ان کے اشارے اب سمجھ میں آنے لگے —— یہ عورت تھی جس نے دنیا کو مرد کے لئے مزیدار اور پر کیف بنا دیا۔ یہ عورت تھی مرد نے جسے دیکھ کر پہلی ہی نظر میں اپنی خودداری کھو دی اور برابر کھوتا رہا۔ ذوق نظر نے مرکز ڈھونڈ لیا —— جذبۂ پرستش کو کھلونا مل گیا —— پیشانی میں جتنے سجدے تھے سب ایک ایک کر کے اس کے قدموں پر بکھیر دئے۔ اور بنانے والا منہ دیکھتا رہ گیا —— غرض دل کی یہ ملکہ اپنے حدود سے باہر نکل مرد کے دماغ پر بھی قابض ہو گئی۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن متمدن دنیا نے اصولی حیثیت سے اس کی ہستی کو مرد سے جداگانہ کوئی مستقل چیز کبھی تسلیم نہ کیا۔ اس کا جواب یہ کہ عورت تخلیق ہوئی مرد کی دلچسپی کے لئے مرد عورت کے لئے نہیں بنا۔ یہی وہ تخیل ہے جس نے ہمیشہ کے لئے مرد کی افضلیت کو عورت پر مسلم کر دیا —— "عورت کھیلنے کے لئے بنائی گئی ہے"۔ اس لئے بنائی گئی ہے کہ مرد کی ضرورتیں اس سے کھیلتی رہیں اس کو اس سے بحث کیا کہ کھیلنے والا کون ہے؟ ہاتھ کس کا ہے؟ لیکن یہ غلطی فطرت کی تھی کہ اس نے کھلونے کو بناتے وقت اس کے پہلو میں ایک دھڑکتا ہوا دل بھی رکھ دیا۔ ایک ننھا سا دھڑکتا ہوا دل جو مرد کی طرح دھڑکتا ہے مرد ہی کی طرح خواہش کرتا ہے۔ کچھ چاہتا کچھ نہیں چاہتا۔ اگر رکھنا ہی تھا تو دل کی جگہ پتھر کا ایک ٹکڑا رکھ دیا ہوتا۔ اور اگر پتھر کے ٹکڑے سے وہ افعال طبعی پورے نہ ہو سکتے تھے تو پتھر کا ٹکڑا نہ سہی ایک ایسا "نیم بیدار دل" سہی جو صرف دھڑک سکتا بول نہ سکتا۔ جو صرف جواب دے سکتا سوال نہ کر سکتا —— ہاں تو فطرت کی اس خطرناک غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرد اور عورت کی آبادی میں دلوں کی ٹکر شروع ہو گئی ایک کے غرور نے دوسرے غرور کو جھکانا چاہا۔ ایک کی خواہش نے دوسرے کی خواہش کو نگل جانا چاہا۔ فتنوں نے کروٹ لی۔ ہنگاموں نے سر اٹھایا تعلق کی زنجیریں اور جماعت کا نظام بکھرنے لگا۔ یہ دیکھ کر "تمدن حکیم" نے "فطرت نابینا" کی اس خطرناک غلطی کی تصحیح کرنے کی ضرورت محسوس کی اور عورت کے دل کو لوریاں دی جانے لگیں۔ لوریاں لوریاں پہ لوریاں یہاں تک کہ وہ سو گیا گہری نیند سو گیا۔ "تمدن جدید" کچھ سونچکر سوئے فتنوں کو جگا رہا ہے اور وہ جاگتے جا رہے ہیں ——

کل پوری طرح جاگ جائینگے اور اپنے تمام طوفان کے ساتھ جاگ جائیں گے۔ آپ کی اس معاشرت کا شیرازہ کیونکر بندھا رہتا ہے او حانہ دارانہ زندگی کے وہ گھروندے جو آپ نے بنا رکھے ہیں کیونکر بنے رہتے ہیں۔ تمدن قدیم نے عورت کے دل کو تو سلا دیا اور مرد کے دل کو ضرورت سے زیادہ بیدار کر دیا۔ انصاف کا تقاضا یہ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کو چین جیسا چاہئے تھا کبھی نہ ملا۔ دل کسی کا بھی ہو نیند اس کے لئے بہرحال بہتر ہے۔ گوشت کا یہ دھڑکتا ہوا لوتھڑا اپنے افعال طبعی کے لحاظ سے معاشرتی زندگی کے لئے ہمیشہ خطرناک ثابت ہوتا رہا ہے۔ جنہوں نے اس کی پرورش کی انہوں نے ہمیشہ اس کو اپنے اور اپنے ماحول کے لئے ایک مصیبت پایا۔ تمدن کی ارتقا اور معاشرت کی خیریت بس اسی پر مبنی ہے کہ یہ "لعنت متحرک" سرکش ہونے سے پہلے کچل دی جائے۔ آپ اس سے متفق ہوں یا نہ ہوں لیکن میں تو یہی سمجھتی آئی ہوں اگر نہ سمجھتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ محمود کی آغوش کو اپنی کنواری امنگوں کی بہشت سمجھنے کے باوجود پچکے سے اس کے بڑے بھائی حامد کی آغوش میں چلی جاتی اور زندگی کے بہترین حصے کو اس کے پہلو میں سو کر اس خندہ پیشانی کے ساتھ بسر کر جاتی جیسے واقعی میرے سینے میں دل نہ تھا۔ سلیمہ نے دل اور دل میں جذبات رکھنے کے باوجود رواج کے حکم اور سماج کے فیصلے کے سامنے گردن جھکا دی اور اس کے فیصلے کی لاج رکھنے کے لئے عمر بھر ان زنجیروں کا احترام کرتی رہی جو اس کے پاؤں میں ڈال دی گئی تھیں اب دیکھنا یہ ہے کہ سماج کے پاس سلیمہ کے لئے کیا ہے۔ گو سلیمہ خود نہیں جانتی کہ اس کی قربانیوں کا معاوضہ کیا ہونا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ وہ عورت جو عمر بھر اپنے دل کی سرکش ترین طاقتوں سے جہاد نفس برپا کئے رہی اب اپنے جذبات پر فتح پا لینے کے بعد اپنی تمناؤں کا خونبہا کیا طلب کر سکتی ہے۔

۲

یہ سطریں اس وقت قلمبند کر رہی ہوں جب جوانی کی بہار خزاں ہو رہی ہے۔ سہرے کے پھول مرجھا چکے ہیں ——— قسمت نے سہاگ کی وہ نعمت بھی چھین لی ہے جو عورت کے لئے سب سے بڑا ابل ہے ——— طوفان کا زور کم ہو چلا ہے لیکن محمود کی محبت کی سلگائی ہوئی چنگاری اب تک سلگ رہی ہے اور میری روح اس کی دھیمی آنچ سے پھنکی جا رہی ہے۔ پگھلی جا رہی ہے موم کی اس بتی کی طرح جو نصف سے زیادہ جل چکی ہو

مردانہ باش ختم ہے یہ امتحان بھی

ہوا کا ایک تند و تیز جھونکا اور بس ——— ایک آخری ہچکی اور شمع کی داستان شب ——— ہمیشہ کے لئے ختم۔

یہ چند اوراق جو آنسوؤں کے دھبوں سے داغدار ہیں زمانے کے ہاتھ میں اس وقت پہنچیں گے جب زمانہ میرے وجود کے دھبے و موت کی آغوش میں پھینک چکا ہو گا۔ میں نہ ہوں گی لیکن میری رام کہانی سننے اور سمجھنے کے لئے میری بہت سی ایسی بہنیں موجود ہوں گی

جنہوں نے میری ہی طرح عمر بھر اپنے دل سے لڑائی باندھ رکھی ہوگی - وہ میرے جذبات کو پوری طرح سمجھیں گی اور میری قربانیوں کی منصفانہ داد دیں گی - اور کیوں نہ دیں گی جب کہ وہ ان طوفانوں سے اچھی طرح واقف ہیں جو عورت کے دل میں اُٹھتے رہتے ہیں - اس عورت کے دل میں جس کی "فطرت" کو پابندیوں نے ہر طرف سے گھیر رکھا ہو ——— یہ اوراق انہیں بہنوں کے نام معنون ہیں ——— ہمدردی کے آنسوؤں کی چند بوندیں اور بس ——— میری زندگی بھر کی مشقتوں کا اجر ہیں اور قسم ہے اس خدا کی جو میرے دل کی ہر ہر جنبش کا نگراں رہا ہے کہ میں اس اجر کی مستحق بھی ہوں -

۳

یہ چند سطریں جو غیر ارادی طور پر قلم کی زبان سے ٹپک گئی ہیں انہیں میری داستان حیات کا مقدمہ سمجھئے - رہی داستان تو آگ اور لکڑی کی داستان کی درازی ہی کتنی ؟ بس یوں سمجھئے کہ آگ لگی - تیل چھڑکا گیا اور لکڑی دیکھتے دیکھتے راکھ کا ڈھیر ہو گئی - ایک ایسا راکھ کا ڈھیر جو اپنے سینے میں بہت سی چنگاریاں چھپائے ہو - اس مثال سے میں مجھے لکڑی فرض کر لیجئے لیکن یہ نہیں کہہ سکتی کہ آگ کس کو کہوں محمود کی محبت کو یا اس رشتہ ازدواج کو جو حامد کے دامن اور میرے آنچل نے ساتھ باندھ دیا گیا تھا - بہرحال نتیجہ جیسا تھا جلی اور بری طرح جھلس کر رہ گئی - تصور کا ہاتھ جب کتاب زندگی کے پچھلے اوراق الٹتا ہے تو مجھے ماضی کے دھندلکے میں ایک تصویر نظر آتی ہے ——— ننھی منی سی ——— گھر کی انگنائی ام رود کا درخت اور اس کے سائے میں ایک گھروندا جس میں دو بچے (میں اور محمود) کھیل رہے ہیں زندگی کا کھیل کھیل رہے ہیں - بڑی سنجیدگی کے ساتھ - خانہ داری کے لوازمات پھیلے ہیں - گھر بن رہا ہے - میاں بیوی کو جھڑک رہا ہے اور بیوی میاں کو ——— پھر تھوڑی دیر کے بعد دیکھو تو کچھ نہیں - چند قہقہے اور کھیل کا خاتمہ ——— یہ تھا ہمارا روزانہ کا کھیل جو اب دیکھتی ہوں تو واقعی کھیل ہو کر رہ گیا ——— حامد ہم دونوں سے عمر میں کچھ بڑا تھا اس لئے وہ ہم سے پہلے مکتب میں بٹھلا دیا گیا تھا - مکتب سے جب اُسے چھٹی ملتی تو سیدھا ایک حملہ آور کی طرح ہماری مملکت میں گھس آتا - اور اس کے چنگیز خانی حملوں سے ہمارے گھروندے کی چھوٹی سی دنیا میں تراہ تراہ مچ جاتی ——— خانہ داری کا نظام برہم ہو جاتا محمود الگ چھپتا میں الگ بسورتی، یہ بھی سچ پوچھئے تو ایک ہونیوالی بات تھی قسمت بس کی طرف رہ رہ کر اشارہ کر رہی تھی آگے چل کر قسمت نے بتلا دیا کہ حامد کی مداخلت نے واقعی ہمیں وہ کھیل کھیلنے نہ دیا جسے ہم جوان ہو کر بھی کھیلنا چاہتے تھے -

۴

بچپن اور بچپن کے بعد جوانی زندگی کی دوسری منزل ہے ——— لیکن اس منزل کو طے کرنے میں مدت ہی کتنی صرف ہوتی ہے ؟ بس ایک جھپکی ——— اس کے بعد جو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ بہار نہ تھی - ہاں تو آنکھیں کھلیں اور آنکھوں کے کھلتے ہی اپنی حقیقت نظر آئی اور اپنی حقیقت کو دیکھ کر محمود کی نگاہوں کو پہچانا - محمود اس منزل میں البتہ ہمارے ساتھ نہ تھا - اس کی وجہ یہ تھی

کہ جوان ہونے سے کچھ پہلے ہی میں اس سے چھپائی جانے لگی تھی اور یہ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ کیوں؟ محمود سے کوئی پردہ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا محمود سے ربط بڑھتا گیا اور ہم لوگ غیر محسوس طور پر ایک دوسرے کے ہوتے گئے۔ وہی انگنائی وہی امرود کا درخت لیکن اب اس کی چھاؤں میں گھر بھر کی نظریں بچا کر ایک دوسرے ہی قسم کا کھیل کھیلا جانے لگا ——— جوانی کا وہ کھیل جو آنکھوں ہی آنکھوں میں کھیلا جاتا ——— وہ کھیل جس کی بساط پر پانسوں کی جگہ دل پھینکے جاتے ہیں ——— وہ کھیل جس کی جیت اور ہار دونوں ہی لذت سے خالی نہیں۔

برسات کا موسم تھا ساون کی جھڑی برس کر کھل چکی تھی اور مناظرِ قدرت پر ایک ایسی "خوبصورت اداسی" طاری تھی جیسے کوئی حسین عورت رو دھو کر چپ ہو جائے۔ شام ہو رہی تھی ——— وہ شام جو میری زندگی کی تمام شاموں میں منتخب کیے جانے کی مستحق ہے۔ گھر میں سوائے بوڑھی باورچن کے کوئی نہ تھا ——— امی کسی تقریب میں گئی ہوئی تھیں۔ موسم کی ہوائیں دل کو گدگدا رہی تھیں۔ اور میں اکیلی پلنگڑی پر بیٹھی پھولوں کا ہار گوندھ رہی تھی: غرض قضا و قدر کا ہاتھ وہ تمام حالات جمع کر رہا تھا۔ جن کے بعد غالب کا یہ شعر پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے ؎

دلم بہ سبحہ و سجادہ و ردا لرزد　　　　کہ دزد مرحلہ بیدار و پارسا خفتہ است

ہاں تو میں پلنگڑی پر بیٹھی ہار گوندھ رہی تھی ——— کہ "محمود میاں" آئے۔ اور پائنتی کے کنارے بیٹھ گئے میں ہار گوندھتی رہی اور وہ شعر پڑھتے رہے ؎

یہ محویت نہیں بالکل کھلی بے اعتنائی ہے　　　　ہم آئے تھے ذرا تم مسکرا دیتے تو کیا ہوتا

میں مسکرا دی "اس زحمت کا شکریہ" انہوں نے کہا "پھولوں کا کلیجہ کب تک چھیدا جائے گا ——— پھولوں کے علاوہ اور لوگوں کے پاس بھی تو کلیجے ہیں"۔ "اس میں تو بقول ایک بیچے آدمی کے چھلنی کی طرح ستر چھید ہو چکے ہیں مزید سوراخ کی گنجائش کہاں"۔ میں نے شرماتے ہوئے کہا۔ وہ لاجواب ہو گئے۔ لیکن انہیں فضول بکواس کرنے کی بیماری تھی اور اس کا دورہ شروع ہو چکا تھا۔

"یہ آج نظر کی سوئی سے کیوں کام نہیں لیا جاتا" اس کے جواب میں بھی میں نے نظر کی سوئی سے کام نہ لیا۔

"مجھے ڈر ہے کہ بیکار رہنے سے زنگ آلود نہ ہو جائے" غرض زبان کی قینچی چلتی رہی میں نے سوالات کا سلسلہ توڑنے کے لئے نظر اٹھا کر باورچی خانے کی طرف دیکھا اور ان کی کلائی میں آہستہ سے سوئی چبھو دی ——— یہ انجکشن کارگر ثابت ہوا اور وہ یہ سمجھ کر کہ باورچی خانے میں کوئی لاش سانس لے رہی ہے کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے ——— لیکن کب تک؟

"ہاں تو یہ ہار کس کے لئے گوندھا جا رہا ہے آج تو اختر بھی نہیں ہیں" ——— یہ سوال نہ تھا بلکہ جواب تھا میری ایک

خاص حرکت کا جو ان کی سمجھ میں نہ آسکی تھی - بات یہ تھی کہ ایک دن اسی طرح میں ہار گوندھ رہی تھی اور انہیں کے لئے گوندھ رہی تھی
ایک ایسے عالم محویت میں کہ کلیوں کے ساتھ اس ہار میں میرا دل بھی گندھ گیا ہو تو تعجب نہیں - یہاں تک کہ جس کا نقد رتھا وہ خود آگیا
محمود کے ساتھ میرے چچا زاد بھائی اختر بھی تھے ـــــــ میں نے ہار پورا کر کے محمود کی طرف دیکھا - دیکھا اور پھر دیکھا -
مسکرائی اور ہار اختر بھیا کی گردن میں ڈال دیا۔ محمود کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا ـــــــ جہاں تک عورت کی ادافہمی کا تعلق ہے
مرد ہمیشہ سے غبی ثابت ہوا ہے محمود بھی میرے دل کی کیفیتوں کا مطالعہ نہ کر سکے۔ کئی دن تک منہ تھتھائے رہے ـــــــ
آج بے چارے کئی دنوں کے بعد بھرے ہوئے دل کو خالی کرنے کا موقعہ ملا تھا - بہرکیف آج میں نے اپنے بیوقوف دوست کے
روٹھے ہوئے دل سے صلح کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا - جلدی جلدی ہار ختم کیا اور ختم کر کے ایک شرمیلی ادا کے ساتھ ان کی طرف
جھکی - محمود نے میرے ارادے کو تاڑ کر گردن بڑھائی اور مجھے اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کی - میں نے پیچھے ہٹنے کا ارادہ کیا
لیکن آگے بڑھتی گئی - یہاں تک کہ وہ تصور سرزد ہو گیا جس کے بعد کم از کم ہونٹوں کو تو کنوارا نہیں کہا جا سکتا ـــــــ یہ تھا
میرا پہلا اور آخری گناہ ـــــــ جس کا میرے ارادے سے اتنا ہی تعلق تھا جتنا پانی کا بہاؤ سے - بہرحال جو نہ ہونا
چاہیے تھا وہ ہو گیا - اور صرف اس لئے ہوا کہ میرا دل اس وقت تک ہی "فطرت اصلی" پر تھا ـــــــ اس کے بعد احساس
گناہ نے خود میرے دماغ کی اس رگ کو چھیڑ دیا جو نیکی اور بدی میں تمیز کرتی ہے ـــــــ اور میں نے اپنی حالت پر غور کرنا
شروع کیا ـــــــ عقل نے روشنی دکھلائی اور مجھے نظر آنے لگا کہ میں جس راستہ پر چل رہی ہوں وہ راستہ مجھے کسی حال میں
منزل تک نہیں پہنچا سکتا ـــــــ مجھے مستقبل قریب میں "حامد کی بیوی" بننا ہے اور میں "محمود کی محبوبہ" بنتی جا رہی ہوں - آخر
اس کا نتیجہ کیا ہو گا ؟ یہ سوچ کر میں نے اپنے دل کو محمود کی طرف سے برانگیختہ کرنے کا فیصلہ کیا - اس کی شخصیت پر بے رحمانہ نقادی
شروع کی - اور اس کی صورت و سیرت میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نقائص نکالنے لگی لیکن دل جو اس کا ہو چکا تھا ہمیشہ میری تردید
کرتا رہا - طبیعت کو ادھر سے بہلانے کی غرض سے کتابوں کا مطالعہ شروع کیا ـــــــ کتابوں نے میرے دل کو کس حد تک
بہلایا یہ نہیں کہہ سکتی لیکن کتب بینی کا فائدہ اس حد تک ضرور ہوا کہ ان سے میرے دماغ کو وسعت اور میرے ارادوں کو قوت ملنے
لگی چنانچہ آئندہ زندگی میں میں نے اپنی فطرت سے جو جنگ چھیڑ رکھی تھی ان میں میری کامیابی ان کتابوں ہی کی رہین منت ہے - ہاں تو
میں محمود سے اب پرے رہنے لگی تھی محمود لاکھ مرد سہی لیکن اب اتنا بھی غبی نہ تھا کہ میرے اٹھتے ہوئے تیور کو نہ تاڑ لیتا ـــــــ
میری بے رخی نے آہستہ آہستہ اس کو بھی خودداری سکھلائی اور اس نے میرے پاس آنا اور بیٹھنا بالکل ترک کر دیا - بھولے بھٹکے کبھی
سامنا ہو جاتا تو اس کی روٹھی ہوئی نگاہیں مجھے "غدار" "بیوفا" "سنگدل" "حرافہ" غرض نجانے کیا کیا کہا کرتیں جس کے جواب
میں میری آنکھیں ، سے فلسفۂ معاشرت پر ایک مبسوط خطبہ سنانے کی کوشش کرتیں ـــــــ لیکن وہ شخص جو میری آنکھوں کی

معمولی گفتگو بھی سمجھنے سے معذور رہا ہو "خطبہ" کیا خاک سمجھتا۔ غرض دن گذرتے گئے اور میری جوانی اس گھٹا کی طرح بھرپور ہوتی گئی، ہوا کا ایک معمولی جھونکا بھی جس کے لئے کافی ہو۔ دل کبھی کبھی محمود کو ضرور ڈھونڈتا، کیوں ڈھونڈتا یہ بھی سن لیجئے۔ مجھے محمود سے زیادہ اس کی خوشامد عزیز تھی ——— یہ ہے عورت کی فطرت کا وہ کمزور پہلو جو تند و تیز ہواؤں میں ہمیشہ غیر متوازن ہوتا رہا ہے ——— وہ دکھتی ہوئی رگ جس کو پکڑ لینے کے بعد اس کے غرور کو سجدہ کئے بغیر چارہ نہیں ہوتا ——— میں جھوٹ کیوں بولوں میرے دل میں بھی یہ جذبہ ہر عورت کی طرح تمام جذبات لطیفہ سے زیادہ قوی تھا کہ "کوئی میرے حسن کی داد دیتا رہے" محمود نے میرے اس جذبے کی پذیرائی کی تھی اور میرے سامعہ کو اپنی چکنی چپڑی گفتگو کی ایسی چاٹ دے رکھی تھی کہ میں باوجود کوشش کے بھی اس سے بہت دنوں تک دور نہ رہ سکی ——— کچھ محمود ہی پر منحصر نہ تھی ہر وہ شخص جو سب سے پہلے میرے حسن کی داد دیتا میں شاید اسی کی ہو جاتی ——— یہ ہیں میری جوانی کی وہ کمزوریاں جن کے لئے آج میں اپنے ضمیر سے برابر معافی مانگتی رہتی ہوں۔

۵

یادش بخیر محبت جب اپنے پینگ بڑھا رہی تھی تو ایک دن میں نے سرسری طور پر محمود سے کہا تھا "دیکھتے نہیں کہ تمہارے بھیا کی ذات میرے تمہارے درمیان میں ایک دیوار کی طرح حائل ہو جانے والی ہے پھر کس امید پر بڑھے آرہے ہو؟" محمود نے اس کے جواب میں سر ہلا کر کہا "یہ نہیں ہونے دوں گا" اس جملے سے ایک ایسا عزم راسخ ٹپک رہا تھا کہ مجھے دھوکا ہوا کہ اس کے جسم میں لوہے کے عناصر غیر معمولی طور پر زیادہ ہیں لیکن وقت نے آکر یہ ثابت کر دیا کہ یہ خوبصورت ہاتھ پاؤں کا خوبصورت مجسمہ کچھ نہ تھا مگر بالو کا ایک تودا ——— ہاں تو امتحان کی گھڑی جب آئی تو اس بالو کے تودے نے اپنی ماں سے اپنی خواہش کا اظہار نہ معلوم کن لفظوں میں کیا کہ ادھر سے جواب ملا "توبہ کرو چھوکرے سلیمہ تجھ سے عمر میں کئی مہینے بڑی ہے" اس کے بعد ہماری پھپھیا ساس نے جو اپنے چھوٹوں سے بھی مذاق کرنے میں بے باک تھیں۔ اس خواہش پر یوں تبصرہ فرمایا "اے تو اس میں کیا حرج ہے سلیمہ تمہیں بہت پیاری معلوم ہوتی ہے تو بھاوج بنا کے پیار کر لینا بھائی ہی کی تو چیز ہے کوئی غیر تھوڑے ہی لئے جاتا ہے۔ غرض میری قسمت کا فیصلہ ہنسی ہنسی میں اڑ گیا اور محمود کی ہمت مفلس کے مکان کی طرح اس معمولی جھٹکے سے ایسی گری کہ پھر نہ اٹھی ——— ہاں تو سن لیا نہ آپ نے کہ محمود کی خواہش کس بنا پر ٹھکرائی گئی ——— صرف اس لئے کہ میں اس سے عمر میں کئی مہینے بڑی تھی لیکن وہ کئی مہینے کیا کئی برس بلکہ کئی جگ بھی بڑا ہوتا تو کوئی حرج نہ تھا میں اس سے بلا تامل نتھی کر دی جا سکتی تھی۔ عورت اگر دس سال کی بھی ہے تو کیا مضائقہ ہے شرعاً بالغ ہو چکی ہے لیکن مرد! وہ کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ ساٹھ برس کا بھی ہو تو پروا نہیں "ساٹھا پاٹھا" مشہور ہے ——— دنیا میں یہی ہوتا رہا ہے اور مصلحت اندیشوں نے اس رواج کی اہمیت قائم رکھنے کے لئے بہت سی

شرعی حیثیتیں بھی گڑھ ڈالی ہیں۔ چنانچہ ایک دن خود میں نے، وعظ کی ایک زنانی مجلس میں اپنے کانوں سے ایک مولوی صاحب کو یہ کہتے سنا کہ ایک بوڑھے صحابی نے (صحابی کا نام میرے حافظے سے محو ہو گیا ہے) ایک ہی ہم عمر عورت سے نکاح کیا۔ حضرتؐ کو خبر ہوئی تو آپ نے اثنائے ملاقات میں ان بڑے میاں سے ارشاد فرمایا کہ اگر تم کمسن عورت سے نکاح کرتے تو تمہاری تندرستی بھی ترقی کرتی اور عمر میں بھی اضافہ ہوتا ——— یہ لونڈی اس دن سے آج تک اس تمنا میں ہے کہ کاش میرے پیغمبر صاحب خواب میں بھی میرے گھر آجاتے تو میں اپنے بالوں سے پائے مبارک کی گرد جھاڑ کر پوچھتی کہ میرے ماں باپ صدقے ہوں یا رسول اللہ ان کلمات خیر کو ارشاد فرماتے ہوئے حضرت نے اپنی امت کی بیٹیوں کو کیوں بھلا دیا۔ کیا ان کا خون ان کی رگوں میں دوڑنے کے لئے نہیں بلکہ مردوں کے اعصاب کو جوانی کا عرق پلانے کے لئے بنا ہے ——— سنتی ہوں کہ فالج ہاتھ پاؤں کے علاوہ زبان پر بھی گرا کرتا ہے۔ لیکن آج تک میں نے کسی مولوی کی زبان پر اس مادے کو گرتے ہوئے نہیں دیکھا ——— نہ جانے خدا کا عذاب آج کل کس فکر میں خموش ہے۔

۶

چاہتی ہوں کہ آپ کو اپنی کہانی سناؤں لیکن کیا کروں کہ اثنائے گفتگو میں ان بہت سے پھوڑوں میں سے ایک نہ ایک پھوڑا ابھر اٹھتا ہے جو میرے دل و جگر پر درجنوں پا رہے ہیں اور میرا لہو پی پی کر جی رہے ہیں ——— ہاں تو وہ وقت آگیا دل جس کے تصور سے گھلا جا رہا تھا۔ شادی کی تاریخ مقرر ہونے کے بعد میں مایوں بٹھلائی گئی اور ایک ہفتہ تک اس حوالات میں دنیا کی کھلی ہوئی فضا سے دور رکھی گئی۔ اس "کال کوٹھری" میں جسے قید ازدواج کی تمہید سمجھئے مردوں کی صورت ہوا کے جھونکوں اور سورج کی روشنی کے علاوہ ہر چیز کا گذر تھا یہاں تک کہ محمود کی آواز بھی کبھی کبھی آکر دل کو ٹکر لگا جاتی تھی ——— گیتوں کے ذریعے سے مجھے آئندہ زندگی کے مراحل سمجھانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن میرا دماغ دل سے جنگ کرنے میں مصروف تھا کیا خاک سمجھتی۔ جب گیتوں کی گونج ڈھول کی گھنا گھن کے ساتھ بلند ہوتی تو میرا سامعہ کبھی کبھی چونک پڑتا اور میں ایسا محسوس کرنے لگتی جیسے سارا کنبہ میری میت پر بین کر رہا ہو۔ غرض اس گھما گھمی میں وہ تاریخ بھی آگئی جسے عدالت کی اصطلاح میں پیشی کی تاریخ کہہ سکتے ہیں مجھے سرخ جوڑا پہنایا گیا ناک میں نتھ جو ہندوستان میں سہاگ کی علامت سمجھی جاتی ہے ڈالی گئی۔ اس کے بعد چند سہاگنوں کی حراست میں پردے کے پاس لا بٹھائی گئی قاضی صاحب آئے اور آتے ہی یہ سوال کیا۔ "کیوں بیٹی کیا تم مجھے اپنا وکیل مقرر کرتی ہو کہ تمہارا نکاح پچاس ہزار روپیہ سکہ رائج الوقت اور پانچ دینار سرخ رقم معجل پر مد کے ساتھ پڑھ دوں"۔ کہئے اس سوال کے جواب میں مجھے کیا کہنا چاہیے تھا؟ ——— نہیں؟ ایک گرہست آشرم کی بیٹی جسے بچپن سے لے کر جوانی تک فرض کی کٹھ پتلی بننے کی تعلیم دی گئی ہو یہ کیونکر کہہ سکتی تھی۔ کیا میرے لئے قانون معاشرت بدل دیا جاتا کیا وہ طریقہ ازدواج منسوخ کر دیا جاتا جس کی برکت سے ہمارے ملک کی اہلی زندگیاں ہمیشہ سے پر امن رہتی آئی ہیں ——— پھر میں نے اپنے گرد و پیش نظر کی میری ممانیاں چچیاں پھوپھیاں ماں اور خالائیں جو اس وقت مجھے گھیرے ہوئے بیٹھی ہیں کیا ان کے لئے بھی ایک ایسا ہی

وقت نہیں آیا تھا؟ کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے دل میں بھی میری ہی طرح کوئی کھٹک موجود نہ ہو - آخر انہوں نے دل پر کیوں کر قابو پا لیا! اور کس طرح اپنی زندگی کے مراحل کو خندہ پیشانی کے ساتھ جھیل رہی ہیں ——— تو کیا میرا نفس ان کے نفس کے مقابلہ میں کسی طرح کمزور ہے ——— اس خیال سے میرے غرور کو چوٹ لگی اور میں نے پورے استقلال کے ساتھ قاضی صاحب کو جواب میں ہاں کہدی ——— قاضی صاحب چلے گئے - اس کے بعد رسم ہے کہ لڑکیاں رونے لگتی ہیں ——— اس خیال سے کہ وہ گھر جس گھر میں پل کر جوان ہوئی آج میرے لئے اجنبی ہو گیا مہمان کی طرح بلائی جاؤں گی اور مہمان کی طرح رخصت کر دی جاؤں گی - یہ احساس جدائی رونے کے لئے کم نہیں ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور رستا ہوا زخم بھی نہ پھوٹ بہتا ہو - بہرکیف مجھے بھی رونا چاہئے تھا گو میری سسرال میکے کی دیوار سے لگی ہوئی تھی اور میرے لئے جدائی کا کوئی سوال نہ تھا لیکن رسم بہرحال رسم ہے میں بھی روئی - محمود کی محبت کی انتہا ندی آنسوؤں کی کفیل تھی آنسوؤں کی کیا کمی ہو سکتی تھی ——— روئی اور پھوٹ پھوٹ کر روئی ——— یہاں تک کہ میرا گریبان اور امی کا آنچل دونوں بھیگ گیا -

۲

اب میں نے زندگی کی اس منزل میں قدم رکھا ہے جہاں پہنچکر زندگی کے مسلسل امتحانات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ امتحانات جن کے لئے عورت ماں کی گود سے سدھائی جاتی ہے ——— اس کے باوجود لوگ شادی کے پہلے سال کو جوانی کی بھری ہوئی گھٹاؤں کے برسنے کا موسم کہتے ہیں ——— لیکن یہ بھری برسات کا موسم میرے دل کی اس بستی کے لئے جس میں جاڑے کی سرد ہوائیں چل رہی تھیں کیا کیف انگیز ثابت ہوتا ——— ابر گھر کر آئے برسے اور برس کر کھل گئے لیکن برف کے وہ تودے جو میرے دل کے گرد جمے ہوئے تھے نہ پگھلنا تھا نہ پگھلے ——— جھوٹ کیوں بولوں میرا جسم رہتے تو رہا حامد کے پہلو میں لیکن تصورات محمود کی آغوش کا خواب دیکھا کئے ——— یہ تھا میری ازدواجی زندگی کا پہلا سال -

یہ کہنا بھول گئی کہ رخصتی کے دسویں دن میں نے محمود کو دیکھا تو اس کا خوبصورت چہرہ کمھلایا ہوا تھا اس کنول کی طرح جسے تالاب سے نکلے ہوئے کئی دن ہو چکے ہوں یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی ——— ایک ایسی "شریر خوشی" ہوئی جو فاتح کے دل میں مفتوح کو اپنے قدموں پر روندا ہوا دیکھ کر ہوتی ہے - میں اپنے نکاح کے وقت محمود کے "قلندرانہ سکوت" سے کچھ کبیدہ سی ہو گئی تھی میرا خیال تھا کہ اگر محمود کو مجھ سے سچی محبت ہوگی تو وہ کسی تیسری شخصیت کو ہمارے درمیان آنے نہ دیگا - اور تمام احتجاجی مظاہروں کے بعد وہ جارحانہ کارروائی پر بھی اتر آنے سے دریغ نہ کریگا - یہ تھی میری توقع جس کے بالکل ہی خلاف وہ اپنی پہلی کوشش کے بعد اس چراغ کی طرح جس میں تیل نہ ہو بھڑک کر خاموش ہو گیا - اور میں نے سمجھ لیا کہ وہ ان نوجوانوں میں ہے جو پھولوں سے تو کھیلنا چاہتے ہیں لیکن انگاروں سے کھیلتے ہوئے ڈرتے ہیں ——— اور جن کا نظریہ یہ ہے کہ "جو آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجئے جو جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجئے"۔

آج جو اس کا ستا ہوا چہرہ نظر پڑا تو مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اس کا دل اب تک میرے لئے روتا ہے۔ لیکن یہ خوشی ایک لمحے سے زیادہ نہ رہ سکی پھر جو نظر اٹھی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی آنکھیں میری اس مسرت پر تنقید کر رہی ہیں —— اور زبان حال سے کہہ رہی ہیں کہ "ہاں کیوں نہ خوش ہو گی سہاگ کی سیج پر جوانی کے ارمان نکل رہے ہیں" —— میرا دل دکھنے لگا۔ "آخر یہ کونسا خوشی کا موقعہ تھا۔ کہیں میرے ہونٹوں پہ مسکراہٹ نہ کھیل گئی ہو محمود نے مجھے کیا سمجھا ہو گا؟ کیا میرے چہرے پر اس بےحسی کے کوئی آثار ہیں جس نے میری سہاگ کی راتوں کو سوگوار بنا رکھا ہے"۔ یہ خیال آتے ہی میں اپنی خلوت میں آئینے کے پاس دوڑی گئی تاکہ اس سے پوچھوں کہ کیا میرا چہرہ میرے دل کا ساتھ نہیں دے رہا ہے؟ آئینے نے کہا "نہیں" —— آئینہ عورت کی طرح جھوٹا نہیں ہوتا کہ دل میں کچھ اور منہ پر کچھ —— اس کے جواب سے مجھے تکلیف بھی پہنچی اور خوشی بھی ہوئی۔ تکلیف اس لئے کہ "دل کا حال" محمود پر ظاہر نہ ہو سکا اور خوشی اس لئے کہ "حامدے میں اپنے دل کا چور چھپانے میں کامیاب ہوں" —— میں نے مسہری پر لیٹ کر دل کی الجھنوں کو اخبار میں بہلانے کی کوشش کی ایک گھنٹہ بھی نہ گذرا ہو گا کہ میرا چھوٹا بھائی دوڑتا ہوا آیا "باجی! یہ کتاب محمود بھیا نے دی ہے"۔ "محمود بھیا اور کتاب" —— دل دھڑکنے لگا —— کتاب کھول کر دیکھی تو وہ اس خط کا لفافہ ثابت ہوئی۔

۱۰۶

مجھے بہت جلد بھول جانے والی نسیمہ —— خوش ہو اور خوش رہو۔ اگر بچپن کی محبت اور دوشیزگی کے وعدے سہاگ کی سیج پر بھی پیچ کر یاد رہتے ہوں تو میں تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ میں محمود ہوں —— تمہارے گھروندے کا ساتھی —— محمود —— جس سے تم نے ایک بار نہیں بارہا جاڑے کی سنائی راتوں میں۔ گرمی کی سنسان دوپہروں میں۔ کھلی ہوئی چاندنی میں۔ بھری ہوئی برسات میں۔ نور کے تڑکے میں۔ شام کے دھندلکے میں۔ دھڑکتے ہوئے دل اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کیساتھ یہ وعدہ کیا تھا کہ "میں تمہاری ہوں" کیونکر انکار کرو گی؟ ستاروں کی کھلی ہوئی آنکھوں نے دیکھا۔ ہوا کے جھونکوں نے سنا ہے فطرت کے مناظر گواہ ہیں۔ فضا کا سکوت گواہ ہے۔ امرود کا درخت گواہ ہے۔ وہ امرود کا درخت جس کی چھاؤں میں میرا اور تمہارا دل جوان ہوا۔ گھر کی وہ انگنائی گواہ ہے جس کی خاک ہمارے معصوم آنسوؤں کے بہت سے قطروں کو جذب کر چکی ہے —— کیونکر انکار کرو گی سلیمہ! ۔ جھوٹ بولو گی؟ تمہاری آنکھیں تمہیں جھٹلا دیں گی۔ تمہارا حافظہ تم پر ملامت کریگا۔ تمہارا ضمیر تم سے روٹھ جائے گا —— قسم ہے محبت کے ان خاموش پیغاموں کی جو آنکھوں کی زبان سے بھیجے اور دل کے کانوں سے سنے گئے کہ دنیا اور اس کی تمام رعنائیاں بیوفا ہیں —— چکور کہتا ہے کہ چاند بیوفا ہے پاس بلاتا ہوں اور دور رہتا ہے۔ دن کہتا ہے کہ رات بیوفا ہے پیچھا کرتا ہوں اور بھاگی جاتی ہے۔ بلبل کہتی ہے کہ پھول بیوفا ہیں مجھ سے جدا ہو کر کبھی گلچیں کی ٹوکری میں

ہنستے رہتے ہیں ——— اور محمود کہتا ہے کہ سلیمہ بیوفا ہے دوسرے کی آغوش میں بیخ کر بھی خوش نظر آتی ہے۔ سلیمہ بیوفا ہے ہاں سلیمہ بیوفا ہے ——— برا نہ ماننا آنکھوں کی دیکھی کہتا ہوں انہیں حیرت زدہ آنکھوں سے تمہیں پھول کی طرح کھلا ہوا دیکھ چکا ہوں ——— کیا اب بھی کہو گی کہ تم اپنی موجودہ حالت سے مطمئن نہیں ہو ——— خدا کرے نہ ہو ——— تم کیوں انکار کرو میرا دل خود میرے مشاہدے کو جھٹلا رہا ہے اور تمہیں بیوفا سمجھنے پر راضی نہیں ہوتا ؎

اس ستمگر کو ستمگر نہیں کہتے بنتی　　کئی تاویل خیالات چلی جاتی ہے

خدا کرے کہ میری تاویلات صحیح ہوں اور تم اب تک وہی سلیمہ ہو جو آج سے کچھ دنوں پہلے تھیں لیکن ان دلیلوں کو کیونکر جھٹلاؤں جو تمہارے خلاف میرے شکوک کا ساتھ دے رہی ہیں بیشک تم مجبور تھیں کہ تمہارا نکاح کر دیا گیا لیکن کیا اقرار کے وقت قسمت کا پانسہ تمہارے ہاتھ میں نہ تھا تمہاری ایک "نہیں" مستقبل کا نقشہ بدل سکتی تھی ایک انکار بزرگوں کا فیصلہ اور فیصلے کا رُخ پھیر سکتی تھی۔ تمہاری ایک خموشی ——— ایک طویل خموشی قاضی صاحب کو واپس لوٹ جانے پر مجبور کر سکتی تھی لیکن تم نے میرے دل پر رحم نہ کیا، خدا بھی تمہارے دل پر رحم نہ کرے گا ——— یہ میں کیا کہہ گیا سلیمہ معاف کرو پیاری میں اب دیوانہ ہوں اس بری طرح کہ اب کچھ دنوں میں زنجیروں کی ضرورت ہو گی ———

کاش ہم تم یورپ کے آزاد ممالک میں جنم لئے ہوتے۔ ہندوستان غلام ہے اس لئے یہاں کے ہر رواج میں غلامی کی تکمیل ہے ——— یہ بدبخت فطرت کو بھی بیڑیاں پہنانا چاہتا ہے۔ نکل چلو پیاری نکل چلو حیوانوں کی اس بستی سے ——— رسوں کے اس قبرستان سے زندگی کے اس دوزخ سے دور ——— بہت دور ——— ایک ایسی دنیا میں جہاں محبت مصلحت کی غلام نہ ہو ——— جہاں حسن و عشق میں اجنبیت نہ ہو ——— جہاں درد و درماں میں بیگانگی نہ ہو ——— جہاں شوق کے لئے رواج کے کٹہرے نہ ہوں جہاں فکر کے لئے قانون کا پہرا نہ ہو ——— جہاں شمع کو ہوائیں نہ ستاتی ہوں۔ جہاں زندگی کو موت نہ دھمکاتی ہو ——— جہاں دریا بہتے ہوں اور موجوں کی زنجیر پاؤں میں پھندے نہ ڈالتی ہو۔ جہاں شبنم روتی ہو اور پھول اس کے گریہ بے اختیار کی ہنسی نہ اُڑاتے ہوں۔ جہاں نغمے فضا میں گونجتے ہوں اور ہوا کے جھونکے انہیں چرا نہ لیجاتے ہوں ——— ایک ایسی معصوم دنیا میں۔ بھاگ چلو سلیمہ بھاگ چلو توڑ ڈوان رواج کی زنجیروں کو جو تمہارے پاؤں میں زبردستی پہنائی گئی ہیں ——— ثابت کر دو کہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی زنجیروں کو نہیں پوج سکتی۔

ہاں تو سلیمہ بولو کیا کہتی ہو؟ میں نے صرف تمہارے لئے سارے کنبے سے ترک تعلق کر لینے کا تہیہ کر لیا ہے۔ دیکھیں اب تم میرے لیے کیا کرتی ہو ——— اگر تم میرے اس خطرناک ارادے میں حصہ لے سکتی ہو تو پھر کچھ دیر نہیں۔ آج بلکہ ابھی اسی شام کو ہمارے افسانہ محبت کا وہ دلچسپ باب شروع ہو سکتا ہے۔ شعر و موسیقی کی زبان میں جس کا عنوان "بسنت کا موسم" ہے ؎

چہ خوش است باد دیگ دل سر حرف باز کردن | گلۂ گذشتہ گفتن سخنے دراز کردن
اثر عتاب بردن ز دلے ہم اندک اندک | بہ بدیہہ آفریدن بہ بہانہ ساز کردن

میرے پاس روپے نہیں سچے دوست ہیں اور کچھ موجب بھی نسبت کرنے کے لئے تندرست ہاتھ پاؤں ہیں۔ میں تمہیں ہر طرح خوش رکھ سکتا ہوں اور اس دنیا سے اتنی دور لے جا سکتا ہوں جہاں سوسائٹی کی آواز تو کیا قانون کا تازیانہ بھی ہمارا سراغ نہیں لگا سکتا۔ ہاں تو بولو میرے دل کی ملکہ کیا کہتی ہو ——— اب دیکھنا یہ ہے کہ تم محبت کے قانون کا کتنا احترام کرتی ہو یاد رہے سلیمہ کہ محبت تمہارا امتحان لینا چاہتی ہے۔ [illegible] اگر تم میں میرا ساتھ دینے کی طاقت نہیں تو صرف لکھ بھیجو کہ میں اپنی قسمت پر قانع ہو کر جنگلوں کی طرف نکل جاؤں ——— کیونکہ یہ زنجیروں سے بھری ہوئی دنیا [illegible] کھا رہی ہے
——— بس اور کچھ نہیں۔

اپنی لیلا کا مجنوں
"محمود"

خط کی ابتدائی سطریں میرے لئے کافی رقت انگیز تھیں جی چاہا کہ انہی کے جواب میں ایک [illegible] خط لکھوں جس میں اپنے دل کی گرہوں کو کھول کر رکھ دوں لیکن جوں جوں آگے "بڑھتی گئی" غصہ [illegible] کی جگہ لیتا گیا ——— "[illegible]" کیا محمود نے مجھے بازاری عورت سمجھ رکھا ہے۔ یہی فرمائش کرنی تھی تو کسی بازاری عورت سے محبت کیوں نہ کی تھی اس خط کے جواب میں ایک ایسی تحریر جانی چاہئے جو اسے مایوس کر دے قطعی مایوس۔ آگ پر تیل چھڑکنے کا وقت اب ختم ہو چکا پانی ڈالنے کی ضرورت ہے
——— یہ سوچ کر میں نے قلم اٹھایا ——— خط تیار تھا

۷۸۶

میرے بھولے محمود ——— خوش رہو ——— خوش رہنے کی کوشش کرو ——— کیونکہ اس دنیا میں کوئی شخص خوش رہنے کی کوشش کئے بغیر خوش نہیں رہ سکتا۔ فطرت کا کارخانہ ہی یہی ہے۔

خیال نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

تم نے مجھے بے وفا لکھا ہے لیکن میں خوش ہوں کہ تم نے بہت جلد حقیقت کو پہچان لیا ——— دلوں کا حال تو وہی جاننے والا جانتا ہے جو دلوں کی رفتار گن رہا ہے۔ مجھ میں وفا ہے یا نہیں یہ بجائے خود ایک سوال ہے لیکن اس کا مجھے خود اعتراف ہے کہ میں نے تمہاری محبت کے ساتھ وفا نہیں کی۔ کیوں نہیں کی؟ اس لئے نہیں کی کہ بس ایک سنجیدہ فکر کے بعد اس سچائی تک پہنچی کہ تم سے وفا کرنا بہت سے لوگوں سے بے وفائی کئے بغیر ممکن نہیں ——— اور میری عقل سلیم نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک کے ساتھ بے وفائی کرنا بہت سے لوگوں کے ساتھ بے وفائی کرنے سے بہتر ہے۔ ماں کے ساتھ بے وفائی۔ باپ کے ساتھ بے وفائی۔ کنبے کے ساتھ بے وفائی۔ خاندانی روایات

کے ساتھ بیوفائی۔ معاشرت کے قانون کے ساتھ بیوفائی ـــــ اور صرف تمہارے ساتھ وفا؟ ـــــ تو کیا دل صرف تمہارے ہی پاس تھا ـــــ تم کہوگے یہ محبت کے قانون کے ساتھ کھلی ہوئی بغاوت ہے ـــــ ہوسکتی ہے ـــــ یوں سمجھ لو کہ میری محبت اس حد تک نہیں پہنچی تھی جہاں پہنچکر عقل دل کی لونڈی بن جاتی ہے۔ اگر "محبت" اسی کا نام ہے کہ اپنی خواہش کے لئے دنیا کی خواہش کو ٹھکرا یا جائے۔ اپنے جذبات کی آسودگی کے لئے کنبے بھر کے جذبات کو ٹھیس لگائی جائے تو خدارا بتاؤ کہ خودغرضی کسے کہتے ہیں۔؟ اگر حد سے بڑھی ہوئی خودغرضی جرم ہے تو پھر حد سے گذرا ہوا عشق کیوں جرم نہ ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جرم کی تاریخ ایسے لوگوں کے ناموں سے کیوں خالی ہے جو جذبات کی رو میں حدود سے باہر نکل گئے ہوں۔

ہاں تو اب اپنے خط کا جواب سنو تم لکھتے ہو کہ کاش ہم تم آزاد ممالک میں ہوتے بیشک اگر ہوتے تو ایک دوسرے کو آنکھوں آنکھوں میں انتخاب کرکے گرجا کی محراب کے نیچے کھڑے ہوجاتے اور بڑی آسانی کے ساتھ میاں بیوی بن جاتے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ دل کی تشنگی بجھ جانے کے بعد رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے غیر متعلق نہ ہوجاتے۔ عشق میری نظر میں عناصر کا ایک ہیجان ہے۔ اعصاب کی ایک کمزوری ہے۔ نفس کی ایک خواہش دل کا ایک مطالبہ ہے اور دل کی فطرت یہ ہے کہ وہ بہت جلد اپنی موجودہ حالت سے اکتا جاتا ہے۔ سیر ہوجاتا ہے۔ غیر مطمئن ہوجاتا ہے بچوں کی طرح پرانے کھلونوں کو پھینک کر نئے کھلونوں کی آرزو کرتا ہے۔ جب دل کی فطرت یہ ہے تو مشرق اگر اپنے قانون ازدواج میں اس کی خواہشوں کی رعایت نہیں کرتا ہے تو زمانہ اس سے کیوں تیوریاں چڑھائے ـــــ تم کہتے ہو کہ یہ بدبخت فطرت کو بیڑیاں پہنانا چاہتا ہے۔ تم شاعر آدمی زنجیروں کا فلسفہ کیا خاک سمجھوگے۔ کاش تمہارے پاس دھڑکتے ہوئے دل کے علاوہ ایک سوچنے والا دماغ بھی ہوتا تو تم دیکھتے کہ مشرق کے فلسفہ ازدواج میں کہاں تک سچائی ہے۔ میرے بیوقوف دوست مشرق مغرب کی طرح مزدوروں کا ملک نہیں بلکہ فلسفیوں۔ پیغمبروں اور جوگیوں کی بستی ہے یہاں ازدواج کا نظریہ یہ نہیں ہے کہ دو محبت کرنے والے دلوں کو ان کی خواہش کا احترام کرکے ایک دوسرے سے جوڑ دیا جائے۔ بلکہ یہ ہے کہ دو دلوں دو اجنبی دلوں کو ازدواج کے رشتے میں جکڑ کر ایک دوسرے سے محبت کرنے پر مجبور کیا جائے ـــــ اور جنہوں نے انسانی خواہشات کا نفسیاتی مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ زندگی کی کامیابی نفس کو مجبور کرنے میں ہے نہ کہ مطلق العنان چھوڑ دینے میں ہے۔ شادی نام ہے معاشرتی قیود کی سنہری زنجیروں کا ـــــ اور ظاہر ہے کہ ایک دل آزادی جس کی "فطرت اول" ہو بغیر کسی معقول تربیت کے قیدخانے کی بندشوں میں لذت نہیں پاسکتا۔ فرض کرو کہ دو دل ایک دوسرے کے لئے بھوکے ہیں اور سماج ان کی بھوک کی رعایت کرکے انہیں ان کی مطلوبہ غذا دیتا ہے ـــــ لیکن کیا تمہارا فلسفہ یقین دلاتا ہے کہ وہ آگے چل کر کچھ اور نہ چاہیں گے ـــــ کیوں نہ چاہیں گے جب کہ "ندرت پرستی" ان کا خاصہ طبعی ہے اور سوسائٹی نے شروع ہی میں ان کے ذوق کی رعایت کرکے ان کی ندرت پسندی کا حوصلہ بڑھا دیا ہے۔ دو جملوں میں یوں سمجھو کہ مغرب کی معاشرت دل کا حوصلہ

بڑھاتی ہے ۔ اور مشرق کی تہذیب اپنے طریقۂ ازدواج سے دلوں کو قناعت سکھلاتی ہے ۔ یہاں پر اگر یہ سوال پیدا ہوتا ہو
کہ رواج کو کیا حق حاصل ہے کہ شادی کے معاملے میں انتخاب کے حق کو جو فریقین کا فطری حق ہے فریقین سے چھین کر ان کے بزرگوں کو دیدے
کنبے کو دیدے سوسائٹی کو دیدے ۔ تو سنو انتخاب کا حق نوجوان جوڑوں کو دینا ننھے بچے کے ہاتھ میں چھری دیدینے کے برابر ہے
نوجوانی میں انتخاب کی نظر سطح پر لوٹ کر رہ جاتی ہے ۔ جلد اور ہڈیوں سے نیچے اترنے کی کوشش نہیں کرتی ۔ دور کیوں جاؤ خود اپنی
آنکھوں سے پوچھو کہ اس نے میری طرف کبھی اس ارادے سے بھی دیکھا ہے ؟ دیکھنا تو درکنار سینے کے اندر کی حقیقتیں کبھی اتفاق
سے نظر بھی آجاتی ہیں تو مئے عشق کے متوالے طرح دے جاتے ہیں کیوں نہیں ؟ مطلب تو صرف لطف اندوزی سے ہے اور وہ
بہر حال حاصل ہے ——— روح میلی ہے تو ہو صورت تو اجلی ہے ۔ آیا سمجھ میں کچھ ؟ یہی وجہ ہے کہ مغرب سے لے کر
مشرق تک "کورٹ شپ" والی شادیاں عموماً اپنے مقصد میں ناکام رہتی ہیں ۔ ہوتا یہ ہے کہ "آنکھ کا نشہ" جوں جوں کم ہوتا جاتا
اور دل کی پیاس جوں جوں بجھتی جاتی ہے ۔ نگاہیں نقاد ہوتی جاتی ہیں یہاں تک کہ تنقید کی روشنی اور تجربے کے جالے میں ایک دوسرے
کو ایک دوسرے کی کمزوریاں نظر آنے لگتی ہیں ——— نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعلقات کی زنجیریں اگر بیچ سے ٹوٹ نہیں جاتی
ہیں تو کم از کم ڈھیلی ضرور ہو جاتی ہیں ۔ ہاں تو یہی وہ صدیوں کا تجربہ ہے جس کی بنا پر ہمارے ملک نے انتخاب کا حق بزرگوں کے اور
کنبے والوں کے ہاتھ میں دے رکھا ہے ظاہر ہے کہ ان کا تجربہ اور ان کی پختہ مغزی اس کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہے کہ کون لڑکا کس لڑکی کے
لئے ہے اور کون لڑکی کس لڑکے کے لئے ہے اب رہا یہ کہ اگر کوئی شخص اپنی جہالت سے اپنے لڑکے لڑکیوں کو اندھا دھن کنویں میں
جھونکدے تو قصور اس کا ہے کہ اس نے اس حق کو ناجائز طور پر استعمال کیا ——— اصول کو کیوں برا کہا جائے ۔
اب تو سمجھ میں آگیا کہ "یہ بدبخت ملک فطرت کو کیوں بیڑیاں پہناتا ہے" ——— یہ ہے ہمارا نظریۂ ازدواج
جس نے ہمارے ملک کی ۹۰ فی صدی "متاہل زندگیوں" کو خوشگوار اور کامیاب بنا رکھا ہے اب رہی یہ ناگوار حقیقت کہ اس
نظریہ کے ماتحت تھوڑے سے "خواہش زدہ" دل فرض کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ جاتے ہیں تو چڑھ جائیں ۔ اس میں کیا مضائقہ ہے اکثریت
تو چین سے ہے ——— اس کے مقابلہ میں ذرا عینک لگا کر اپنے یورپ کے "آزاد ممالک" کو دیکھو "ان غلامان فطرت"
کو دیکھو کہ "فطرت" کے ہاتھوں ان کے نظام معاشرت کی بندشیں کس بری طرح کھلی جا رہی ہیں ——— اب تو نہ
کہو گے کہ یہ سب کچھ سمجھنے کے باوجود میں "جوش عشق" میں وہ حرکت کر جاتی جس کے بعد کنبے کی شرافت ہمیشہ کے لئے سوسائٹی کے سامنے
اپنی گردن نیچی کر لیتی ——— سوچو تو کہ میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہو کر نکاح کے وقت انکار کر جاتی تو اس میرے انکار
کا نتیجہ جماعت کی ذہنیت پر کیا مرتب ہوتا ——— کیا میری اس بے باکی کے بعد بھی "شرفا" کو اپنی لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے
کا حوصلہ ہوتا ——— تو کیا تم پسند کرتے ہو کہ میری ایک نفسانی خواہش کی بدولت قوم و ملک کی بہت ہی معصوم بچیاں

علم کی نعمت سے محروم رہ جاتیں ——— خدا تمہیں سوچنے والا دماغ عطا کرے تم مجھے ایک ایسی دنیا میں بلا رہے ہو جو کم از کم اس خلائے بسیط میں کہیں آباد نہیں ——— شاعر کے خواب میں آباد ہو تو ہو ——— تمہارے دماغ کی پرورش اور تمہاری ذہنیت کی تعمیر ان افسانوں نے کی ہے جو "روح" کو "دل" کا غلام بنانے کی جد و جہد کر رہے ہیں اسلئے تم میری اور اپنی محبت کو بھی افسانہ بنانا چاہتے ہو اور خود اس کا ہیرو بننے کے لئے بے چین ہو۔ یہی نہیں بلکہ مجھے بھی دعوت دے رہے ہو کہ میں "گھر ستمندر" کی چاردیواری سے نکل کر افسانے میں "ہیروئن" کا کام کروں ——— کس طرح کا افسانہ؟ اسی طرح کا ایک افسانہ جسے عورت اور مرد کی گمراہیاں آئے دن بناتی رہتی ہیں ——— وہی ہجر و وصال کی فرسودہ داستان جسے ادب کی زبان اور ادیب کا قلم نت نئی رنگینیوں کے ساتھ دہراتا رہتا ہے وہی "نگاہ اور دل" کی پرانی کہانی جسے موسیقی فضا میں بلند کرتی رہتی ہے۔ چھاتی رہتی ہے۔ کیا کہوں کہ کیسی کہانی؟ ایک عورت ایک نوجوان مرد کے ساتھ محبت کرتی ہے۔ شوق کی پیاس بجھانے کے موقعے نہیں ملتے اسلئے معاشرتی حدود سے باہر نکل جاتی ہے۔ اس کے بعد مرد بیوفائی کرتا ہے عورت خودکشی کرتی ہے یا بازار حسن کی رونق بڑھاتی ہے۔ ——— سنتے سنتے اور پڑھتے پڑھتے طبیعت اکتا گئی جی نہیں چاہتا کہ ایک ایسی بے مزہ اور فرسودہ داستان میں ایک اور کا اضافہ کروں۔ بنانی ہی ہے تو ایک ایسی کہانی کیوں نہ بناؤں جو آنکھوں میں سرمہ اور دماغ کو روشنی دے۔ ایک ایسی کہانی کیوں نہ بناؤں جو مغرب کی بیٹیوں پر یہ حقیقت روشن کردے کہ مشرق کی بیٹیاں کیا کر سکتی ہیں۔ ایک ایسی کہانی کیوں نہ بناؤں کہ دنیا حیرت کی انگلیاں دانتوں میں دبائے دیکھتی رہ جائے کہ ایک عورت ایک جوان عورت محبت نے جس کے سہاگ کی سیج میں کانٹے بو دیے تھے ان کانٹوں کی سیج پر زندگی کی آخری شام تک اس طرح سوئی اس خندہ پیشانی سے سوئی جیسے اس کا جسم گوشت و خون کا بنا ہوا نہ تھا ——— ایک ایسی کہانی کیوں نہ بناؤں کہ اونچے گھرانے کی بلند نظر لڑکی نے اپنے محبت بھرے دل کو نفس کشی کی سل پر رکھ کر فرض کے بٹے سے اس طرح کچل دیا جیسے وہ دل نہ تھا گوشت کا ایک معمولی ٹکڑا تھا جو قصاب کی دوکان سے منگوایا گیا تھا ———

تم گھبراؤ نہیں میں بھی ایک افسانہ مرتب کر رہی ہوں لیکن اس طرح کا ——— محمود! چکی چلتی ہے اور چلتی رہے گی ——— اس کا کام دانوں کو پیس کر مفید سے مفید تر بنا دینا ہے۔ کوئی بیوقوف دانہ اگر اپنے پسنے کی شکایت کرے تو یہ اس کی بے بصری ہے کاش اس کے پاس چکی چلانے والوں کی بصیرت ہوتی۔ محمود! میں وہ دانہ ہوں جس کے پاس اتفاق سے بصیرت کی آنکھیں ہیں ——— پس رہی ہوں لیکن اپنی حالت پر مغرور ہوں ——— یہ سمجھ کر مغرور ہوں ——— کہ کام آرہی ہوں ——— برباد نہیں ہو رہی ہوں۔ "نکل چلو پیاری سلیمہ نکل چلو" کاش یہ لکھنے سے پہلے تمہارے قلم پر فالج گر پڑتا۔ حافظ نے شاید تمہارے کانوں میں پھونک دیا ہے کہ ؎

من از آں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم ——— کہ عشق از پردہ عصمت بروں آرد زلیخا را

لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہندوستان کی ایک بیٹی نے "ایرانی شاعر" کے اس نظریہ کی تردید کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے ——— اور خدا نے چاہا تو زمانے کی آنکھیں دیکھ لیں گی کہ "سلیمہ" نے "حافظ" کو جھٹلا دیا۔ محمود اس لے کہ تیرا حسن میری نظر میں کسی طرح یوسف کے "حسن روز افزوں" سے کم نہیں ہے۔ لیکن وہ ایک مصر کی عورت تھی جو اپنے یوسف کے لئے "پردہ عصمت" سے نکل کھڑی ہوئی اور یہ ایک ہندوستان کی لڑکی ہوں جو عشق کے ساتھ فرض کی ڈوری کو بھی مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہے گی۔

تمہاری طرز تحریر سے یہ بو آتی ہے کہ تم خواہ مخواہ جنون کو دعوت دے کر اپنے پاس بلانا چاہتے ہو۔ اگر ہو تو تعجب نہیں اسلئے کہ بچپن سے لے کر جوانی تک تم ایک ایسا لٹریچر پڑھتے آئے ہو جو رودکی سے لے کر غالب تک علانیہ ڈنکے کی چوٹ جنون کو ہشیاری پر ترجیح دیتا آیا ہے۔ کیا اس کا کچھ اثر نہ ہوگا۔ لکھتے ہو کہ "اب کچھ دنوں میں زنجیر کی ضرورت ہوگی" خدا مبارک کرے یہ وہ گہنا ہے جس کو تم سے پہلے تمہارے بہت سے بھائی پہن چکے ہیں۔ لیکن خدا کے لئے اس گہنے کو اتار کر جوش جنوں میں صحرا کی راہ نہ لینا ورنہ یاد رہے کہ محبت کا قانون تمہیں ماخوذ کرے گا اور میں انصاف کی کرسی پر بیٹھ کر تم پر بیوفائی کی فرد جرم قائم کروں گی ——— آتش کی زبان سے ؎

قیس پھرتا جو رہا دشت میں دیوانہ تھا
اس کو لیلا ہی کے دروازے پہ مرجانا تھا

کہو شاعر ہو ——— کھسیانی ہنسی نہ ہنسو ——— اس شعر کا کیا جواب ہے۔ ہاں تو یہ سمجھ لو کہ لیلے کے دروازے پر رہوگے تو لیلے کی آواز تو سن سکو گے۔ لیلیٰ کی ایک جھلک تو دیکھ سکو گے۔ لیلیٰ کی کوئی خدمت تو کر سکو گے۔ پاک محبت کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔ کیا تمہاری آنکھیں مجھے روزانہ کئی بار دیکھ لینے پر قناعت نہیں کر سکتیں۔ کیا محبت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جس چیز سے تم محبت کرو وہ قانونی حیثیت سے تمہاری ملک بھی ہو ——— یہ تو ملکیت کا وہی جذبۂ قدیم ہے "اگر دیا خوبصورت ہے تجھے ملنی چاہیئے حامد بھیا کو کیوں مل گئی" ——— میں تو اسی میں خوش ہوں کہ قسمت نے تم کو مجھ سے چھین لیا اور چھین کر بھی مجھ سے قریب ہی رکھا۔ پاک محبت کو (گو پاک محبت اس آب و گل کی دنیا میں قطعاً ممکن نہیں) جوں توں کر کے نباہ جانے کے لئے دیور بھاوج کا رشتہ کیا کم ہے؟ میں ہندوستانی عورت ہوں اسلئے میری تخیل اور میرا مذاق دونوں ہندی ادب سے متاثر ہے ——— میرے لئے دیور بھاوج کا رشتہ بجائے خود عاشق اور معشوق کے رشتے سے کم مزیدار نہیں ہے کیا تم نے وہ گیت نہیں سنا ؎

دیورو! اپچھینے مورا ہار

تصور تو کرو کیسی حسین زندگی ہے کیسا مزیدار کھیل ہے۔ پاکیزہ بھی اور پر کیف بھی۔ پھر دنیا نے زمانے کو بھول کر بالکل بھول کر اس رشتے کے ماتحت کیوں نہ ہم تم بھی عمر بھر یہی کھیل کھیلتے رہیں۔ کھیلتے رہیں چہلیں کرتے رہیں۔ یہاں تک کہ بڑھاپا آکر دلوں کے دروازے بند کر دے۔ اس کے علاوہ میری ایک آرزو ہے۔ "آرزو" لفظ کی اہمیت پر غور کرو ——— اگر تم واقعی وفا کے مدعی ہو تو میری ہر آرزو کا احترام، عملی احترام تمہارا عاشقانہ فرض ہے۔ اچھا تو وہ یہ کہ تم جلد سے جلد اپنی زندگی کا شریک ڈھونڈ لو۔

———

—— ڈھونڈلو باغ میں ہر طرف پھول ہی پھول ہیں غور سے دیکھو کسی نہ کسی پھول پر تمہارا نام بھی ضرور لکھا ہوگا۔

"جوانی دیوانی" مشہور ہے اس عمر میں اس قسم کے جذباتی دورے کوئی عجیب چیز نہیں ہیں۔ خدا وہ دن کرے کہ جاند، دلہن بیاہ کر گھر میں لاؤ —— دنیا اجالی ہوجائے گی۔ اور جوانی کے وہ بخارات جو دماغ پر چڑھ کر ہتیں ایسے خواب دکھا ہیں جن کی کوئی تعبیر نہیں جب گھٹا بن کر برس جائیں گے تو پھر میں پوچھوں گی کہ تم کہاں تھے؟

محمود! آنکھیں کھولو! پھر کہتی ہوں اور نہایت سنجیدگی سے کہتی ہوں کہ جو راہ تم اختیار کر رہے ہو وہ بخارات ظلمات کو گئی ہوئی ہے —— چھوڑ دو اس راہ کو۔ نتیجے کی روشنی کا انتظار نہ کرو —— کیونکہ یہ اس وقت نمودار ہوتی ہے جب آدمی پوری طرح گم ہوچکتا ہے —— بس اور کیا کہوں زیادہ "داغ دل اور ماتم فراق"

راقمہ:- تمہاری بیلے

خط کتاب میں رکھ کر محمود کے پاس بھجدیا۔ اس کے بعد دل کو تو دھڑکنے کی عادت ہی ہوگئی تھی اس نے پھر دھڑکنا شروع کیا —— یہ سوچکر کہ کہیں محمود مجھ سے مایوس ہوکر سچ مچ جنگلوں کی راہ نہ لے۔ کئی دن تک انہیں اندیشوں میں الجھی رہی —— تیسرے دن محمود کی صورت نظر آئی —— تیوریوں کا چڑھاؤ کم ہوچکا تھا لیکن افسردگی پہلے سے زیادہ تھی محبت نے کہا کہ دوڑ کے اس کے مرجھائے ہوئے چہرے کی بلائیں لے لوں —— لیکن کیا کرتی جی مسوس کر رہ گئی ——

چوتھے دن رات کے کوئی دس بجے بھائی نے کھانے پر بلایا —— آئے تو عالم ہی دوسرا تھا۔ چہرے پر جیسے کسی نے سرخی مل دی ہو آنکھیں چڑھی ہوئی لال لال ڈورے قدم میں لغزش چال میں ایک طرح کی بے اختیاری —— بھائی ان کے سر جھکا کر کھانا کھا رہے تھے۔ انہوں نے ان کی حالت پر غور نہ کیا۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا —— اور دیر تک دیکھتی رہی "آج اس خدا کے بندے کو کیا ہوگیا ہے" —— بھائی لگے جب کھانا کھا کر ہاتھ دھونے کے لئے غسل خانے میں گئے تو میں نے آہستہ سے پوچھا "یہ کیا حال ہے"؟ کہنے لگے کہ ؎

عقل تو در سر نشست بہ مئے سودا کن　　کہ بلا ہر چہ رود بر سر عاقل بہ رود

یہ شعر پڑھا اور جوٹھا ہاتھ لئے لڑکھڑاتے ہوئے باہر چلے گئے —— میں دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی —— اسکے بعد ان کی حالت پر چند آنسو —— آج اس کہانی کو یہیں پر ختم سمجھے گو شمع اور رات دونوں میری عمر کی طرح آدھی باقی ہیں لیکن میرا فرض مجھے پکار رہا ہے —— میرا بچہ سوتے سوتے جاگ اٹھا ہے۔

جذباتِ عرش

از نتیجۂ فکر جناب سید ضمیر الدین احمد صاحب عرش گیاوی کفش بردارِ مومن

عدو کی دوستی میں ہو نہ دشمن آسماں میرا
کہ تیرے زیر سایہ ہے غبارِ ناتواں میرا

ہجومِ بیخودی میں کچھ پتہ اپنا نہیں چلتا
بتا۔ اے بے نشانی کچھ نشانِ بے نشاں میرا

غلط ہو یا کہ سچ۔ لیکن بگولوں کی زبانی ہے
کہ تھا پامالِ صرصر دشت میں کل آشیاں میرا

نہ زورِ بادباں قایم۔ نہ جوشِ ناخدا باقی
سفینہ اب ہے طوفانِ حوادث میں رواں میرا

شبِ ہجراں شریکِ رنجِ تنہائی فقط دل ہے
یہی ہے ہمنفس میرا۔ یہی ہے ہمزباں میرا

یہ اس پردہ نشیں کے عشق نے پردہ اُٹھایا ہے
کہ عالم پر عیاں ہے صاف ہر رازِ نہاں میرا

چھپا ہے آڑ میں پتوں کی کیا؟ صیاد گلشن میں
کہ حسرت سے کھڑا منہ دیکھتا ہے باغباں میرا

ہوائے تند و زورِ ابرِ باراں کو خبر کر دو
کہ شاخِ ناتواں میں جھولتا ہے آشیاں میرا

غبارِ ناتواں کو میرے پہونچا دو وہاں صرصر
عدم میں منتظر ہے مدتوں سے کارواں میرا

ہوئے ایک ایک کرکے ہمنوایانِ چمن رخصت
اُدھر تھا آشیاں اُن کا ادھر تھا آشیاں میرا

دمِ مُردن غزل یہ عرش لکھی حکمِ انجم سے
کہ بہرِ فاتحہ باقی رہے نام و نشاں میرا

حضرت شمس بدری

ڈاکٹر مبارک حسین ۔ مدرس عطیہ آفندی

ظہورِ اسلام سے قبل عربی و ایرانی تعلقات

(از جناب پروفیسر محمد طاہر صاحب رضوی ایم۔ اے پریسیڈنسی کالج کلکتہ)

عربوں کے ایران فتح کرنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد تقریباً سارا ملک مذہب کے سلسلہ میں فاتح قوم کا پیرو بن گیا۔ مگر جہاں تک تمدن کا تعلق ہے ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایرانیوں نے کبھی بھی عربی اثر قبول کرنا گوارا نہ کیا بلکہ اس کے برعکس خود عرب حکمران مفتوح ملک کے تمدن سے گرویدگی ظاہر کرنے نظر آنے لگے۔ اموی دربار میں شانِ کسروی برابر نمایاں رہی اور عباسیوں کا عہد تو ایرانی تہذیب و تمدن سے اسقدر متاثر دکھلائی دیا کہ فاتحین اپنی رفتار و گفتار۔ خوراک و پوشاک میں بھی مفتوح قوم کے پورے مقلد بن گئے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہارون و مامون کے زمانہ میں گو حکومت بظاہر عربوں کی تھی مگر دربار پر تسلط ایرانیوں ہی کا تھا۔ اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ قدیم ایرانی تمدن حد درجہ کا مکمل تھا اور اسی لئے کسی غیر قوم کی تہذیب سے متاثر ہونے کی گنجائش اس میں کم تھی۔ چنانچہ صدیوں قبل ایک بار اور بھی اسکا مظاہرہ ہوچکا تھا یعنی اسکندر اعظم کے ایران فتح کرنے کے بعد مدت تک یونانی حکومت وہاں قائم رہی مگر ایرانی تمدن کا یونانیوں کے زیر اثر ہونا تو درکنار خود فاتح قوم پر مفتوحین کی تہذیب کا ایسا رنگ جاکہ آجتک مغرب و مشرق کے علماء اور مورخین اس بات کا فیصلہ کرنے سے قاصر رہے کہ پارتھیوں (یونانی حکمرانانِ ایران) کا مذہب حقیقتاً کیا تھا۔ آیا وہ زرتشتی تھے یا آخر وقت تک اپنے دین آبائی یعنی یونانی اصنام پرستی پر قائم رہے۔ جسکا صاف مطلب یہی ہوا کہ پارتھیوں کے مذہب پر بھی ایرانی اثر غالب آچکا تھا۔ اب یہاں پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ عربوں کے ایران فتح کرنے پر اسلام میں ایسی کون سی بات نظر آئی جسنے ایرانیوں کو جلد ہی اپنے مذہب کو خیرباد کہنے پر مجبور کردیا اور وہ اس پایہ کے مسلمان بن گئے کہ آج اسلامی ادبیات سراسر ایرانیوں کی مرہونِ منت دکھلائی پڑتی ہیں۔ چنانچہ مفسرین اور محدثین کی تعداد۔ مورخین اور تذکرہ نویسوں کے گروہ۔ صوفیوں اور فیلسوفوں کی جماعت میں ایرانی عنصر غالب نظر آئے گا۔ اسکا بالتفصیل جواب دینا ہمیں موجودہ مقالہ کے اصل موضوع سے بہت دور ہٹالے جائے گا اس لئے اختصاراً اسقدر کہہ دینا کافی ہوگا کہ اسلام بلاشبہ دینِ فطرت ہے اور ہر ملک و ملت کے لئے ہر زمانہ میں مناسب۔ اس کی تعلیم کوئی نیا پیغام نہ تھا۔ اخلاقیات کا وہی سبق رسولِ عربی نے بھی دیا جیسا کہ زمانۂ سلف میں

لوگوں کو دوسروں کے ذریعہ مختلف موقعوں پر مل چکا تھا۔ ساسانیوں کے آخری زمانہ میں ایرانیوں کا مذہب موبدوں کے ہاتھوں مسخ ہو چکا تھا۔ عوام الناس کی زندگی بے انتہا اور غیر مفید دینی رسومات کی پابندی سے عاجز تھی۔ اُنکی نظر بار بار اپنی مقدس کتابوں کی اُس پیشگوئی پر پڑتی تھی جس میں ایک ایسی ہستی کے زمانۂ آئندہ میں ظہور کا ذکر تھا جس کے ذریعہ اُنکا مذہب اپنے اصلی اور حقیقی رنگ میں پلٹ جانیوالا تھا۔ عربوں نے جب اُنکی قومی سلطنت کا استیصال کیا تو دین محمدی کی سادگی نے بھی اُن کے دلوں کو رفتہ رفتہ مسخر کرنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ جلد ہی کُل کے کُل فاتحین کے ہم مذہب ہوگئے اور اگرچہ تمدن کے اعتبار سے وہ بہر طور پورے ایرانی رہے مگر جہاں تک دین کا تعلق تھا پکے محمدی بن گئے۔

اس تمہید کے بعد ہم اب اپنے اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور جہاں اختصاراً عربی و ایرانی تعلقات بعد از اسلام کا ذکر کیا جس سے ہماری اسلامی تواریخ بھری پڑی ہیں وہاں کچھ حال عرب و ایران کے تعلقات قبل از اسلام کا بھی بیان کرتے ہیں جو خالی از دلچسپی نہیں۔

اگرچہ ایرانیوں کے آریائی اور عربوں کے سامی النسل ہونے کے لحاظ سے کسی طرح کے تاریخی یا تمدنی معاشرتی یا اقتصادی تعلق کا ایسی دو مختلف قوموں کے درمیان موجود ہونا تقریباً ناممکن معلوم ہوتا ہے تاہم اگر غور سے دیکھیں تو یہ کوئی غیر معمولی اور حیرت خیز بات نہیں۔ ظاہر ہے کہ جغرافیائی حیثیت سے عرب اور ایران ایک دوسرے سے بالکل ملے ہوئے ہیں۔ پھر یہ کہ دونوں ملکوں میں رہنے والی قومیں زمانۂ قدیم ہی سے بحری سفر پر طبعاً قادر اور کشتی رانی میں مشاق نظر آتی ہیں۔ لہٰذا ہر دو اقالیم کے درمیان نہ فقط بری بلکہ بحری راستے بھی کھلے پڑے تھے۔ اس حالت میں دونوں اقوام کے مابین تعلقات کا پایا جانا ہرگز تعجب خیز نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ان کے متعلق قدیم ایران کی مذہبی روایات میں بھی کافی مواد ملتا ہے اور مسلمان مورخین کے بیانات کے علاوہ اب دورِ حاضر کی تحقیقات اور آثار قدیمہ کی کشفیات سے اُن کی پوری تصدیق بھی ہوتی جاتی ہے۔

مشہور سیاح اور مورخ مسعودی کے بیان کے مطابق اکثر یمنی عرب اپنا سلسلۂ نسب ایرانیوں سے متعلق بتاتے تھے اور جس کی تصدیق پہلوی بُندہشن کے باب اول سے بھی ہوتی ہے۔ خود لفظ یمن جو عرب کے ایک حصۂ زمین کا نام ہے قدیم ایرانی اور عربی تعلق پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ اگر اس لفظ کی اصل (Root) یمن مان لی جائے جس کے معنی برکت و سعادت کے ہیں تو یمن کا مطلب "جائے امن و امان" بہ آسانی سمجھ میں آ سکتا ہے۔

یہ مخصوص خطہ زمانۂ گذشتہ سے لے کر آج تک سارے عربستان میں اپنی زمین کی زرخیزی اور آب و ہوا کی خوبی کے لئے معروف رہا۔ اور یہاں کے کاروبار اور تجارتی سلسلوں کو بھی نمایاں حیثیت حاصل رہی۔ تاریخیں شاہد ہیں کہ ایرانی حکومت کے ماتحت (جس کا سلسلہ بعثتِ رسولِ عربی سے تھوڑی مدت بعد منقطع ہوا) یمن کی سیاسی فضا بہرطور پُرامن رہی اور یمنیوں نے اُن کے عہد میں کافی ترقی کی۔ جزیرۃ العرب کے دوسرے حصوں کے رہنے والوں کی نظر میں یمن کا خطہ بہت زیادہ مقبول تھا کیونکہ عربستان کے علاقے زیادہ تر ریگستان ہیں اور پیداوار کے اعتبار سے یمن کو کل مقامات پر فوقیت حاصل تھی اسی باعث وہ اسے جائے امن یا مقامِ سعادت کے نام سے یاد کیا کرتے تھے جو آخرالامر اسی نام سے مشہور ہو گیا۔ لوگوں نے اس لفظ کی تحقیق دوسرے طور پر بھی کی ہے وہ یہ کہ یمن لفظِ "یمین" (بمعنی دائیں۔ سیدھے) سے نکلا ہے چونکہ یہ کعبہ سے دائیں جانب یعنی سیدھے رُخ پر پڑتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

قدیم ایرانی تاریخ میں ضحاک تازی کی شخصیت بے حد نمایاں ہے۔ اِس نے بابل کی جانب سے ہو کر ایران پر حملہ کیا اور پیش دادی خاندان کا استیصال کر کے خود حکمراں بن بیٹھا۔ عرصہ تک اس عربی نژاد بادشاہ نے ایرانیوں پر حکومت کی اور انھیں اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنائے رکھا۔ یہاں تک کہ پیشدادی خاندان کے ایک شاہزادے فریدوں نامی نے کاوہ آہنگر کی اعانت سے ضحاک کو شکست دیکر قومی حکومت دوبارہ ایران میں قائم کی۔ اس واقعہ کا تفصیلی ذکر زند اوستا۔ دینکارت (پہلوی)۔ بندہشن (پہلوی) وغیرہ میں ملتا ہے۔

شاہنامۂ فردوسی میں فریدوں کے تین لڑکوں کی شاہ یمن (عرب) سَرب کی تین شاہزادیوں کے ساتھ مناکحت کا تذکرہ پایا جاتا ہے اور جس کی تصدیق زرتشتی ادبیات مثلاً ویندیداد۔ دینکارت۔ شتروہیِ ایران (پہلوی) مادیگانِ بنائے فرد دینِ یوم خورداد (پہلوی) وغیرہ سے بھی ہوتی ہے۔ ان کتابوں میں عربی (یمنی) وایرانی شاہانہ تعلقات پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ شتروہیِ ایران میں یہ بھی ذکر ہے کہ ملک عرب کا ایک علاقہ جسے ارضِ سلمان کہتے تھے شاہ یمن نے فریدوں کے لڑکوں کو اپنی لڑکیوں کی طرف سے جہیز کے طور پر دے ڈالا تھا۔ اس واقعۂ شادی کی یاد اب تک قوم مجوس کے درمیان ہر سال مذہبی رسم کی حیثیت سے تازہ ہوتی ہے اور بروز خورداد کہ جس دن یہ مناکحت عمل میں آئی تھی قومی عید منائی جاتی ہے۔

پہلوی کتابوں میں عربوں کو "تازیک" کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور مرقوم ہے کہ تازی کی نسل سے جو طہمورث (ایران کے سب سے پہلے بادشاہ) کی چوتھی پشت میں گذرا تھا۔ اُنکی قوم وجود میں آئی۔ ادبیات مزدایسنا میں یہ بھی مندرج ہے کہ

سترب شاہِ یمن کے عہد میں تازیوں نے بھی دین زرتشت قبول کیا تھا چنانچہ نیرنگ سروش پیشت میں جو پارسیوں کے ورد و وظائف سے متعلق ایک دعا ہے ان تازی زرتشتیوں کے حق میں دعائے خیر کی گئی ہے۔

طبری کا بیان ہے کہ یمن ایک زمانہ میں منوچہر شاہِ ایران کے زیر حکومت تھا۔ پھر فردوسی ناقل ہے (جسکی تصدیق مسعودی اور طبری دونوں کرتے ہیں) کہ کیکاؤس کے عہد میں اہل یمن پر ایرانیوں کا تسلط تھا چنانچہ ایکبار انھوں نے بغاوت بھی کی جو فوراً ہی کاؤس کے لشکر کے ہاتھوں فرو ہوئی۔ اس کے بعد نئے معاہدہ کی رُو سے یمنی عرب سردار کی لڑکی سُوابہ کا عقد شاہِ ایران سے کیا گیا۔ شاہنامہ سے اس بات کا بھی پتہ ملتا ہے کہ صباح (یمنی سردارِ عرب) نے بزمانہ کیخسرو ایرانیوں کی معاونت میں افراسیاب اور تورانیوں سے جنگ کی تھی۔

دارائے اعظم اپنے حجازی کتبوں میں تیس مفتوحہ ممالک کا شمار کرتے ہوئے اقلیم عربیہ کا بھی ذکر کرتا ہے جسے بحری راہ سے لشکرکشی کر کے اپنے قبضہ و اختیار میں لایا تھا۔

مسعودی ناقل ہے کہ پارتھیوں کے دورِ حکومت میں بھی تقریباً سارے ملک عرب پر ایرانیوں کا تسلط تھا۔ جوذرین شاپور (گودرز) کے زمانہ میں ایرانیوں کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اُٹھا کر اکثر عربی قبائل عراق عجم پر حملہ آور بھی ہوا کرتے تھے اور بسا اوقات حیرہ کے عرب سردار پارتھیوں کے لشکر میں شامل ہو کر رومی افواج سے جنگ کیا کرتے۔

سنہ ۲۳۰ء میں اردشیر بابکان نے پارتھیوں کا استیصال کر کے ساسانی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ حیرہ اور عنبر (عراق) کے عربی قبائل اردشیر ہی کے عہد میں زیر ہوئے اور ایرانیوں کی عربوں پر براہ راست حکومت خلاف مصلحت دیکھ کر اس بادشاہ نے ایک عراقی سردار جزیمہ کو حیرہ کا حکمراں بنایا اور ایک ایرانی لشکر بھی وہاں مقیم ہوا۔ جزیمہ کے مرنے پر قبیلۂ لخم کا سردار عمرو بن عدی اُسکا جانشیں مقرر کیا گیا اور حکومت اُسی کے خاندان میں جاری رہی یہاں تک کہ قباد (پدر نوشیروانِ عادل) کے عہد میں منذر فرمانروائے حیرہ ہوا۔ قباد نے جسوقت دین مزدک قبول کیا اپنے کل امرا اور صوبہ داروں کو بھی اس مذہب کی پیروی پر مجبور کیا۔ منذر کے مزدکی مسلک قبول نہ کرنے پر شاہ نے اُسے حیرہ کی حکومت سے برطرف کر کے حارث بن عمر کندی کو جو قبیلۂ بکر سے تعلق رکھتا تھا اُس کی جگہ پر مقرر کیا۔ بعد قباد کے نوشیرواں نے مزدکیوں کا قلع قمع کر ڈالا اور منذر دوبارہ حیرہ کا حکمراں بنایا گیا۔ مگر اُس کے بیٹے اور جانشیں نعمان سے شاہنشاہِ ایران نے کسی بات پر خفا ہو کر زمام حکومت بنی طے کے ایک سردار ایاس نامی کو دے ڈالی اور جس کے مرنے کے بعد حیرہ پر براہ راست

ایک ایرانی صوبہ دار کے ذریعہ حکومت کا آغاز ہوا۔ یہ صورت ۶۳۳ء تک قائم رہی جبکہ حیرہ پر غازیانِ اسلام نے قبضہ حاصل کرلیا۔

بہرام بن یزدگرد کے متعلق شاہنامۂ فردوسی میں ذکر ہے کہ اس شاہزادے کی پرورش اور تربیت عرب سردار حیرہ منذر کے یہاں ہوئی۔ چنانچہ جب یزدگرد کے مرنے پر اُس کی زیادتیوں کا خیال کرکے ایرانیوں نے اُسکا جانشیں بجائے بہرام (بیٹے) کے ایک دوسرے شاہزادے خسرو نامی کو بنایا تو منذر نے بہرام کا حق حاصل کرنے کے لئے ایک لشکرِ جرّار کے ساتھ ایران پر حملہ کیا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔

پہلوی کتاب شتروہئی ایران میں لکھا ہے کہ شہر حیرہ (عراق) کی بنا شاپور اردشیر نے ڈالی اور مترزاد نامی ایک ایرانی حاکم کو وہاں مقرر کیا تھا۔ اُس کے بیٹے شاپور ثانی کی کمسنی کے زمانہ میں اکثر اوقات عربوں اور ایرانیوں کے درمیان حیرہ کی حکومت کے سلسلہ میں جنگ بھی ہوا کرتی تھی۔

فردوسی کا بیان ہے (جس کی تصدیق اور لوگ بھی کرتے ہیں) کہ شاپور ثانی جسے عرب عموماً ذوالاکتاف کہتے تھے اپنی اوائلِ عمر میں قبیلۂ غسان کے ایک عراقی سردار طَیر نامی کے ہاتھوں بے حد پریشان رہا۔ طَیر اکثر ایرانی حدود میں داخل ہوکر حملے کیا کرتا تھا۔ ایک بار تو وہ کسی ایرانی شاہزادی کو قید کرنے میں بھی کامیاب ہوا اور جس سے اپنے ملک میں جاکر اُس نے شادی کرلی تھی۔ اس رشتہ سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جو آخر میں شاپور کی ملکہ بنی۔

مسعودی ناقل ہے کہ قباد کے عہد میں یَمَن پر اہلِ حَبَش (ابی سینیا) کا تسلط تھا جنھوں نے عرب سرداروں کے ہاتھوں سے وہاں کی حکومت غصب کرلی تھی۔ قباد کے جانشیں نوشیرواں کے زمانہ میں اَبرَہہ نامی حَبَشی سردار یمن نے صَنعَار میں ایک عالیشان کلیسا کی بنیاد ڈالی اور عربوں کی توجہ خانۂ کعبہ سے ہٹانے اور اس کلیسا کا احترام قائم کرنے کی غرض سے مکّہ پر حملہ آور ہوا۔ اَبرَہہ اور اُس کے ہاتھی نشیں سپاہیوں کا انجام کیا ہوا اس کے جاننے کے لئے قرآن شریف میں سورۃ الفیل کی تلاوت غالباً کافی ہوگی۔

اَبرَہہ کے بعد کچھ عرصہ تک یمن کی حکومت اُس کے خاندان والوں کے ہاتھ میں باقی رہی۔ اسی زمانہ میں ایک بار قدیم عرب حکمرانانِ یمن کے ورثا میں سے ایک شخص سیف بن ذی یزن نے شاہنشاہ رُوما سے استدعا کی کہ اہلِ حبش کے تسلط سے یمن والوں کو آزاد ہونے میں اُس کی اعانت کرے۔ مگر شاہنشاہ نے ہر قسم کی امداد سے اس بنا پر انکار کیا کہ

حبش والے مثل رومیوں کے دین مسیحی کے پابند ہیں اور اس کے برعکس سیف مذہبًا یہودی تھا۔ اس طرف سے جب مایوسی ہوئی تو سیف نے کسریٰ انوشیروان کے دربار کا رُخ کیا اور گذشتہ ایرانی و یمنی تعلقات کو یاد دلا کر مدد کا طالب ہوا نوشیروان نے مدد کا وعدہ ضرور کیا مگر تھوڑی ہی مدت بعد خود سیف بقضائے الہٰی فوت ہوگیا۔ اُس کے بیٹے معدی کرب نے کسریٰ کی خدمت میں حاضر ہو کر اُس کے وعدہ کی طرف توجہ دلائی جس پر شاہِ ایران نے اپنے سپہ سالار وہرز کے ماتحت ایک لشکر یمن کی جانب حبشیوں کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا۔ وہرز نے دشمنوں کو شکست دیکر نوشیروانِ عادل کے حکم سے معدی کرب کو یمن کا حکمران بنایا اور اس طرح پر تقریبًا بہتّر سال بعد اہل حبش کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ یمن والوں کی آزادی پر شعرائے عرب نے ایرانیوں کی تعریف میں قصیدے کہے اور وہرز و معدی کرب کے پاس متعدد عرب سردار بغرض تبریک پہونچے جن میں جناب سرورِ کائنات صلعم کے جدِّ امجد امیر قریش حضرت عبدالمطلب بھی تھے۔

معدی کی موت پند حبشی اشرار کے ہاتھوں فریب سے واقع ہوئی۔ جب یہ خبر ایران پہونچی تو مرکزی حکومت نے وہرز کو دوبارہ ایک فوج کے ساتھ یمن کی طرف بھیجا۔ جس نے ملک پر اپنا قبضہ کرکے ایرانی صوبہ دار کی حیثیت سے حکومت شروع کردی۔ اس طرح یمن پر ایرانیوں کی براہِ راست حکومت کسریٰ انوشیروان عادل کے عہد میں قائم ہوئی اور جس کا سلسلہ بعثتِ حضرت ختمی مرتبت صلعم کے کچھ مدت بعد تک بھی رہا جبکہ ہمیشہ کے لئے یہ خطّہ مسلمانوں کے قبضۂ اختیار میں آگیا۔

ایرانیوں کے زیر اثر یمنی عربوں نے تجارتی نقطۂ نظر سے کافی ترقی کی تھی۔ بُردِ یمنی اُس زمانہ سے لے کر آج تک اندرونِ عرب اور خارجی ممالک میں ہر جگہ مشہور ہے۔ اسلحہ جات کی تجارت کا سلسلہ عربوں اور عراق و بحرین کے قرب و جوار میں ایرانی ممالک کے رہنے والوں کے درمیان برابر قائم رہا۔ کتاب الاغانی میں ابوسفیان کے تجارتی کاروانوں کی ایرانی حدود میں آمد و رفت کا حال اور اکثر مشاہیر شعرائے عرب کی ساسانی دربار میں موجودگی کا ذکر جابجا ملتا ہے۔

ایک مغربی فاضل گلیزر اپنی جغرافیائے عرب میں ناقل ہے کہ پہلی صدی عیسوی میں ایرانیوں کی ایک جماعت عربستان کے معدن ہائے طلا کی تحقیق و تکشیف میں مصروف تھی۔ اسی طرح ایک عربی قبیلہ بنو عجل کے متعلق مشہور ہے کہ انھوں نے ایرانی رعایا کی حیثیت سے بحرین کے علاقہ میں سکونت اختیار کی تھی۔

ماخذ:- علاوہ اُن کتابوں کے جن کا اشارہ جابجا مقالۂ ہذا میں کیا گیا۔
کتبِ مقدسۂ شرق (میکسمولر)۔ مقالات راجع لعلم الانسان (جمشیدجی مودی)۔ تاریخہائے ایران و عربستان۔
تاریخ الامت (اسلم جیراجپوری) تاریخ زوال رُوما (گبن) تواریخ اسلام۔ وغیرہ وغیرہ۔

"بادۂ عرفاں"

از حضرت عرفاںؔ، رئیس اسلام پور، پٹنہ

نگاہِ ناز تری، جو کرشمہ بار بھی ہے
کسی کے دل تو کسی کے جگر کے پار بھی ہے

ہو فراق، تو بے لطف وصل یار بھی ہے
خزاں نہیں ہے تو بے قدر یہ بہار بھی ہے

جنوں میں ہوش کسے ہے خبر نہیں مجھکو
کہ میرے جیب و گریباں میں ایک تار بھی ہے

دلوں سے اپنے ہیں ہوشیار بزم میں دوست
کہ یار، یار بھی، عیّار روزگار بھی ہے

صفت ہے حشر کی مردوں کو زندہ کردینا
اگر یہی ہے تو محشر، خرام یار بھی ہے

خزاں جو آتی ہے گلشن میں، غم نہیں ایدل!
کہ خود خزاں سے عیاں جلوۂ بہار بھی ہے

ملا کے غیروں کو میں انکی بزم میں جاؤں!
مگر یہی تو مرے دل کو ناگوار بھی ہے

کسی کی برقِ تجلی سے دل کا جل جانا
یہی خزاں بھی ہے اسکی یہی بہار بھی ہے

یہی ادا تو نرالی ہے چشمِ جاناں کی
نشہ میں چور ہے، پھر اسپہ ہوشیار بھی ہے

وہ وعدہ کرکے نئی چال چل گئے عرفاںؔ
امیدِ وصل میں اب دردِ انتظار بھی ہے

نیرنگِ محبّت

ادبِ لطیف کے نادر نمونے

مندرجہ ذیل سطریں نمونہ ہیں ادبِ لطیف "ادبِ کثیف" ادبِ خفیف اور ادبِ نحیف کا "ادبِ لطیف" کی مختصر تعریف یہ ہو سکتی ہے جو بغیر دماغ پر زور دیئے لکھا اور پڑھا جا سکے۔ مضمون نگار نے اسی نظریے کو پیش نظر رکھ کر مضمون تحریر فرمایا ہے۔ توقع ہے کہ ناظرین بھی اس نظریے کو نظر انداز نہ فرمائیں گے۔ صاحبِ مضمون دنیائے ادب کے مشہور بہاری گنہگار ہیں۔ لیکن کسی وجہ سے انہیں اپنا نام ظاہر کرنا منظور نہیں۔ مجبوراً ہم اُن کے اصل خدوخال کو "ہزار چشم" کے نقاب میں چھپا ہی رہنے دیتے ہیں۔ (ادارہ)

نوٹ:- میرا ایمان ہے کہ اسی خیال کو میں نہایت ہی اچھے انداز میں نظم کر سکتا تھا یا پھر نثر ہی میں لکھ سکتا تھا۔ مگر میں نے جانتے بوجھتے ہوئے اس "مخنث طرز نگارش" کو اختیار کیا ہے کیونکہ بازار میں عجیب چیزوں ہی کی مانگ ہوتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ کثیف کا نام "لطیف" رکھ دیا جائے۔ ذیل کی "ٹیگوریت" میں انمول جواہر پوشیدہ ہیں۔ آپ انہیں حاصل کریں اگر پا گئے تو پو بارہ نہیں تو بہتر ہوگا کہ آپ گاندھی جی اور ہندی مہا "تیا سمیلن" پر ماتم کرنے کی بجائے اپنے ذوقِ سلیم پر رو لیجئے۔

ہزار چشم

جون کی رات تھی اور جاڑوں کا موسم ——— سرور بخش اور فرحناک ——— ہوا باصرہ نواز تھی اور موسم سامعہ آفریں ——— بارش موسلا دھار ہو رہی تھی ——— پانی کے حسین قطرے مرتعش ہو کر زمین پر اس طرح گر رہے تھے، جیسے زہرہ کی صراحی دار گردن سے نغمے اُڑ کر فضا میں تیرنے لگیں ——— دہقان کے کھیت لہلہا رہے تھے ——— وہ بہت دور ——— انسانی آبادی سے پرے ——— کھیل رہے تھے۔ ——— فضائے قدسی کے معصوم بچے اور اجرام نوریں کی حسین چھوکریاں ——— اُکی ——— کائنات مرمریں پردہ رہ تھا ——— بہت سخت ——— جان لیوا ——— سکتے کا ——— ایک بلبل بیٹھی تھی۔ ——— رو رو کر ——— ایک دھتورے کے پھول سے ——— سرو پر نہیں چنار پہ ——— یا شاید پیپل پر ——— جس کا نغمہ فضا میں لہرایا ——— عرش سے ٹکرایا ——— فردوس میں گونجا ——— تڑپا، چونکا،

رو دیا ـــــ قدسیوں نے آغوش میں لیا ـــــ حوروں نے لوریاں دیں ـــــ پھر سو گیا ایک نیند ـــــ بہت گہری لانبی اور طویل ـــــ معصوم بچے رونے لگے ـــــ حسین چھوکریاں ہنسنے لگیں ـــــ نغمہ جاگ گیا اور رونے لگا ـــــ بیچ چیخ کر ـــــ آہ بے تہلکہ مچ گیا عرش پر

شہنشاہ خاور جلوہ گر تھے ـــــ ایکدم نصف النہار پر ـــــ کائنات رعب سے چھپی پھرتی تھی شبنم کے قطروں کے نیچے "گرا" سے ـــــ دور ـــــ بہت دور ـــــ روشن تھی ایک شمع ـــــ آہ! ایک ہاشمی پروانہ وارجلا ـــــ جلکر خاک ہوگیا ـــــ پھر ـــــ پھر ـــــ ملکوتی فرشتے ـــــ آئے ـــــ رونے بسورتے ـــــ نہیں ہنستے کھیلتے ـــــ ایک تشت لے کر مگر آہ! ـــــ اس میں ہاشمی کی خاک، رکھ کر اڑ گئے ـــــ ایتھر میں ملکوتی ترانے گونج اٹھے ـــــ اس روز فردوس میں تعطیل ہوگئی۔ ہاشمی کی خاک کا حوروں نے قشقہ لگایا ـــــ محراب عرش پر لکھا تھا ـــــ "کسی کی یاد میں"

ایک مالی نے گلاب کا درخت لگایا ـــــ صبح کو ـــــ ایک کلی نکل آئی مگر شام کو ـــــ حسین ـــــ نازک ـــــ بہت نازک جیسے امرود کی ڈالی ـــــ گزری ایک بھینس گجراتی ـــــ موٹی بہت موٹی ـــــ گویا بھینس نے ایک نغمہ تعریف میں کلی کی ـــــ آہ! جو نشاط آہنگ بھی تھا اور خلش نواز بھی ـــــ حسرت نصیب بھینس کا نغمہ دلخراش وخوش آہنگ فضا میں گونجا ـــــ عرش معلیٰ سے ٹکرایا۔ اسے زہرہ نے لوری دی ـــــ مشتری نے تھوپ تھپایا ـــــ عرش اعظم تڑپ گیا ـــــ حوریں نعرا اٹھیں ـــــ حسین کلی نے بھی سنا ـــــ مگر آہ غرور حسن سے بد دماغ ہو کر ٹھکرا دیا ـــــ صبح کے وقت آہ ـــــ آہ ـــــ پھول کی پتیوں کے نیچے بدنصیب وحزیں بھینس کی لاش پڑی تھی ـــــ ٹمٹمائی ہوئی شمع کی لو کی طرح ـــــ ـــــ دور ـــــ دور ـــــ نورانی فرشتے کے رونے بلبلانے کی آواز آرہی تھی۔

وہ حسین تھا اور جوان ـــــ مگر آہ ـــــ بھونکدی تھی ـــــ خدائے عشق کیوپڈ نے ـــــ انگلی ـــــ نہیں تیر اس کی بائیں آنکھ میں ـــــ اور اور اگر آپ برا نہ مانیں تو وہ بھی حسینہ تھی اور جوان ـــــ اور شاید دوشیزہ بھی، پردۂ فلم کی بیاہتا کنواریوں کی طرح ـــــ اٹی تھی رات کی تاریکی میں چھپ کر "جالی لیٹ" کا برقع اوڑھے ہوئے ـــــ اپنے شوہر سے ـــــ نہیں اپنے باپ سے ـــــ دور بہت دور ـــــ وہ کھڑا مسکرا رہا تھا ـــــ مولسری کا ایک پھول گر پڑا ـــــ اس کے عریاں سر پر اور الجھ گیا اس کے بالوں کے سنبل زار میں ـــ ـــ حسن پھوٹ کر

پر نکلا ——— اس کے رخساروں سے ——— جیسے گنگوتری سے گنگا یا ٹیوب سے ٹوتھ پیسٹ ——— نوجوان ڈوبنے لگا ——— دریائے حسن کی ساحل نما موجوں میں ——— مگر بچا لیا حسینہ کی ناک کی کیل نے ——— ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ——— آہ مگر دیکھ لیا ——— اس کے باپ نے ——— اور بھونک دی انگلی اس کی دوسری آنکھ میں ——— فرشتے بلبلا اٹھے ——— حوریں ماتم کرنے لگیں ——— اس روز عالم بالا میں ہڑتال ہوگئی ———

"کسی کی یاد میں"

"ہزار چشم"

پریم کتھا

(از محمد یعقوب پریمی لودیہوی گیاوی)

پی بن ناہیں چین سکھی ری پی بن ناہیں چین

تم بن موہن کل نہ پڑت ہے
تمرے درس کو من ترست ہے
ہردے میں اک ہوک اٹھت ہے
آجا پریتم! داسی مرت ہے
پی بن ناہیں چین سکھی ری پی بن ناہیں چین

تمرے من کی آس ہے من میں
جیسے رہت ہے باس پھولن میں
مست ہو بھونرا جیسے بن میں
پریم بھکارن پریم لگن میں
پی بن ناہیں چین سکھی ری پی بن ناہیں چین

ڈھونڈھت ڈھونڈھت سب جگ ہاری
درس دکھا دو تم پرواری
رٹت پھرت ہے یہ دکھ کی ماری
کہاں گیو مورے پریم پجاری
پی بن ناہیں چین سکھی ری پی بن ناہیں چین

دکھیا پر اب دیا کرو تم
بانہہ گہے کی لاج رکھو تم
انت سمے ہے درشن دو تم
پریمی ~~[illegible]~~ داسی کی سن لو تم
پی بن ناہیں چین سکھی ری پی بن ناہیں چین

ازجناب پروفیسر عبد المنان صاحب بیدل ایم - اے

اسکواب یہ خبر کریں کیونکر
زندگی ہم بسر کریں کیونکر

تم جفا پر بھی تو نہیں قائم
ہم وفا عمر بھر کریں کیونکر

سر کو سودا ہے تیغ قاتل کا
اسکو ہم نذر در کریں کیونکر

چل گئے ہیں رقیب کے فقرے
میری باتیں اثر کریں کیونکر

پاؤں رکھتا ہے غیر بھی اسپر
سجدۂ سنگ در کریں کیونکر

ہے نزاکت کا اسکی ہمکو خیال
نالۂ با اثر کریں کیونکر

نالۂ شب کا کیا نتیجہ ہوا
ہم دعائے سحر کریں کیونکر

شوق پنہاں نے ہمکو مارا ہے
یہ خبر مشتہر کریں کیونکر

سجدۂ نقش پا روا لیکن
اسکو پامال سر کریں کیونکر

ہم نہیں بولتے ہیں ناصح سے
بات کو بے اثر کریں کیونکر

کہیں شرما کے وہ نہ پھر جائیں
ہم نظر سوئے در کریں کیونکر

تیرے شکوے بجا سہی بیدل
لیکن اسکو خبر کریں کیونکر

ایک مغل شاہزادہ بہار میں

از پرفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم اے اسمٰعیل کالج جوگیشوری بمبئی

صوبہ بہار جہاں اپنے تمدن، اپنی تہذیب، اپنی علمی و سیاسی خدمات، اور مذہبی و روحانی برکات کے لئے مشہور ہے، وہاں اس کے باشندے تواضع اور مہمان نوازی میں بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ کا مفصل مطالعہ آپ کو بتائیگا کہ یہ صوبہ اس حیثیت سے نہ صرف آج بلکہ ہمیشہ سے مساکین و مسافرین کا مرجع رہا ہے، ہر مصیبت زدہ و آفت رسیدہ نے یہیں آکر سکون و اطمینان کا سانس لیا اور آرام پایا ہے۔ صوفیوں کی فہرست پر نظر ڈالو، علماء کے طبقات پر غور کرو، شعرائے کرام کے نام کو یاد کرو، سیاسی مقہورین و مظلومین کے ناموں کو گنو تم کو صاف نظر آئے گا کہ جس صوبہ نے ان بے کس و بے یار غریب الدیار بزرگوں کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھ کر پناہ دی، اور نہ صرف پناہ دی بلکہ اپنے وسعت اخلاق، اپنی خلوص نیت اور اپنی وفاشعاری سے اپنا لیا وہ یہی صوبہ بہار ہے۔ جین اور بدھ مذہب کے بانیوں اور ان کے پیرووں کے حالات کو جانے دو، خود اسلامی عہد میں اس کی یہ خصوصیت اسے دوسرے صوبوں سے ممتاز کرتی ہے، چنانچہ اسی نظریہ کو پیش رکھتے ہوئے میں نے گذشتہ سال کے ندیم کے بہار نمبر میں صرف ایک عہد کے ایک صنف یعنی شعرا کی مختصر فہرست پیش کی تھی، اگر اس پر پوری توجہ صرف کی جائے اور اہل علم و تحقیق اصحاب اس طرف متوجہ ہوں تو میرا دعویٰ ہے کہ اس حیثیت سے بہار اگر سب سے بڑھ کر نہیں تو کسی سے کم بھی ثابت نہ ہوگا۔ اس عہد زریں کو تو جانے دیجئے جبکہ اپنی حکومت تھی، اپنا اقتدار و اثر تھا، اپنی دولت تھی، اور ہر کام کی صلاحیت، قوت اور توفیق، اس زمانہ میں بھی جبکہ ہندوستان اپنی تاریخ کے نازک ترین حالات سے گزر رہا تھا اس وقت جبکہ بعض لوگوں کو پناہ دینے کے معنی حکومت کی ناراضی اور اس کے تمام تباہ کن عواقب سے دوچار ہونا تھا اس زمانہ میں بھی جبکہ معمولی سا شبہہ یا ہلکی سی جھوٹی شکایت ایک شخص کو حاکموں کی نظروں میں خطرناک ثابت کر سکتی تھی، اس صوبہ کے ہندو مسلمان یکساں طور پر مصیبت کے مارے علماء فضلا اور شعراء کے لئے چشم براہ ہی نہ رہتے تھے بلکہ ان کی خدمت، ان کی تواضع اور انکے آرام و آسایش کو اپنے لئے قابل فخر و باعث عزت سمجھ کر اس میں مسابقت کرتے، یہی وجہ تھی کہ ہر مسافر یہاں چند دن قیام اپنے لئے ضروری سمجھتا، اور یہی چیز تھی جس نے لکھنؤ اور دہلی کے اجڑنے لٹنے تباہ ہونے کے بعد وہاں کے اصحاب علم و فضل اور ارباب کمال کو مجبور کیا کہ وہ پورب کا رخ کریں۔ ہمارے آج کے مضمون کا موضوع بھی اسی قسم کے ایک فلک زدہ و آفت رسیدہ بزرگ ہیں

پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم - اے

انقلاب پسند و تغیر زا زمانہ کا یہ آئین قدیم ہے کہ ہر کمالے را زوال، روز و شب کا انقلاب، عزت و ذلت کا ملاپ، افلاس و تونگری کا میل اس کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ روزانہ سیکڑوں خاندان بنتے اور بگڑتے ہیں، ساتوں آسمان کی گردش نے زمین و اہل زمین کو چکر میں ڈال رکھا ہے، جریدہ روز پر خطوط نورانی سے جو کچھ منقش ہوتا ہے منشی شب اس پر اپنی سیاہ روشنائی سے پرش پھیر کر محو کر دیتا ہے، سلاطین کشور کشا کی تیغیں بہت جلد زنگ آلود ہو کر ان کے کارناموں کو حرف غلط کی طرح مٹا دیتی، پھر تیمور و بابر کی بنا کردہ عمارت اس اصول سے کیوں مستثنیٰ ہوتی، انقلاب آیا اور اس زور سے کہ آیا چند عمارتوں اور اصطلاحوں کے علاوہ ان کا کہیں وجود بھی نہیں، جو خاندان تین سو برسوں تک ہندوستان کی زرخیز زمین میں پھلتا پھولتا رہا۔ طوفان اور انقلابات کے باد سموم سے ایسا مرجھایا، سوکھا اور غارت ہوا کہ آج اس کی خشک ڈالیوں اور خزاں دیدہ پتوں کا کہیں نام کو بھی پتہ نہیں، دنیا اسی کا نام ہے، ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے، یہی ہو رہا ہے، اور یہی ہوتا رہے گا۔

غدر نے غداروں کے ساتھ جو کچھ بھی کیا اور اس کے وہ مستحق تھے، لیکن جو کے ساتھ گیہوں بھی پسا اور بغاوت کے ساتھ سلطنت کا خاتمہ بھی ہوا، ہزاروں گھر بے چراغ، ہزاروں خاندان بے وطن اور ہزاروں امیر فقیر بن گئے، باغ حکومت میں خزاں کا دور دورہ تھا، کتاب سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا، اور گلدستہ خاندان مغلیہ کا ایک ایک پھول اور اس کی ایک ایک پتی منتشر ہو گئی، ان اکثریت کو زمانہ کی نظر کھا گئی، مگر ان میں سے ایک آدھ شاخ ادھر ادھر اڑ کر پہنچی اور اسی میں ایک آخری مغل تاجدار ابو ظفر سراج الدین خاں ظفر کے پہلے ولی عہد کے دوسرے صاحبزادے ہیں جن کو انتہائی عالم غربت و افلاس میں اس حوض نے اپنا عزیز ترین مہمان بنا کر رکھا اور اگرچہ وہ جسموں پر حکومت نہ کر سکے لیکن اپنی شیریں مقالی اور نغز گفتاری سے دلوں پر برابر حکمراں رہے۔

نام و خاندانی حالات

ان کا پورا نام ان کے دیوان پر یوں درج ہے

"سخنور رفیع الشان، شاعر فصیح اللسان، مالک اقلیم سخندانی، اریکہ آرائے بزم نکتہ دانی، عالی جناب معلی القاب حضور شاہزادہ مرزا محمد رئیس بخت بہادر المعروف بہ شاہزادہ محمد زبیر الدین صاحب متخلص بہ زبیر دہلوی گورگانی دام اقبالہ"

انہوں نے اپنے مجموعہ مثنویات موسوم بہ درشہوار میں خود بھی اپنا حال لکھا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:-

عنان قلم اب پھراتا ہوں میں ۔۔۔ جو گذری ہے وہ اب سناتا ہوں میں

لقب میرا شاہ عرف ہے وارا بخت ۔۔۔ پسر ان کا ہوں میں تو سن نیک بخت

وہی تھے ولی عہد شاہ ظفر ۔۔۔ سخنداں، سخن سنج، صاحب ہنر

یہ جو سب پہ ظاہر میرا لاکلام — زبیر الدین ہے نام مشہور عام
رئیس بخت بھی نام ہے دوسرا — مرے جد نے مجھ کو کیا تھا عطا"

لیکن جس طرح شاہجہاں کے پیارے لخت جگر داراؔ کو محرومی و ناکامی سے دوچار ہونا پڑا' اسی طرح منحوس نام کے اثر نے یہاں بھی اپنا رنگ جمایا اور دارا بخت کی قسمت نے ان کا ساتھ چھوڑ کر ان کے بھائی کے گھر کو جا بسایا۔ شہزادہ زبیر نے اپنے دیوان میں اپنے شاہی خاندان کے انتساب کی طرف بارہا اشارہ کیا ہے' اور گردش زمانہ کی شکایات سے تو ان کا سارا دیوان مرثیہ ہو رہا ہے' یہاں پر ہم صرف چند اشعار نقل کرتے ہیں'

خاندان

پرنبیرہ خاص ہوں سلطان عالمگیر کا — زنگ آلودہ ہے گو جوہر مری شمشیر کا

کیا زبیر آپ کی نظروں میں جچے گا کوئی — دیکھیں ہیں آپ نے جب شاہ ظفر کی آنکھیں

ہیں کہاں اکبر جہانگیر و ہمایوں اے زبیر — کس کی دنیا میں سدا جاہ و حشم باقی رہے

معتقد ہم ہوں زبیر اس کی غزل کے اسوقت — دوسرا کوئی ظفر سا جو سخنداں نکلے

غریب الوطنی

ہم سا آوارہ وطن کونسا انساں ہوگا — جیسے ہم ہیں' کوئی کیا بے سروساماں ہوگا

زبیر اقبال کیا ملنا ہے مجھے شاہان دہلی کا — مجھے تو پائمال چرخ ناہنجار رہنا تھا

نہ وہ جلسے حسینوں کے نہ وہ گلگشت گلشن پر — زبیر افسوس ہم سے خلد ساحب سے وطن چھوٹا

بدلے اس ماہی مراتب کے ترے پاس زبیر — بس غنیمت ہے یہی آہ و بکا کا جھرمٹ

بیکس و بے نوا ہو تم تو زبیر — کوئی پھر کیا کرے تمہارا درد

کشورِ ہندوستاں میں جاہ و حشمت لے زبیر — جانتا ہے ہر کوئی کس کو ہوا میری نمط

حالِ دہلی سن کے پھٹتا ہے کلیجا اے زبیر — کھد گئے ایوان شاہی کے وہاں آثار تک

فلک نے ایسا مٹا دیا ہے کہ حال اب یہ زبیر ہو چکا — بجائے ایوان شاہی اپنا نہیں ہے خس پوش بھی مکاں تک

فلک دشمنی

رحم آیا زبیر اس کو نہ کچھ حال زبوں پر — کیا جانے یہ گردوں کہ تم نازوں کے پلے ہم

زبیر آگیا ہائے کیسا زمانہ — کہ اپنے جو تھے وہ پرائے ہوئے ہیں

خاکساری کے سوا پاس ترے کیا ہے زبیر — کس طرح خوش ہو کوئی تجھ سے کہ زر کچھ بھی نہیں

زبیر اس خاکساری کے سوا کیا خاک باقی ہے — ہوا جب سے جدا جاہ و حشم آہستہ آہستہ

غرض سارا دیوان اسی ماتم اور اسی گریہ و زاری کا الم نامہ ہے، لیکن افسوس ہے کہ حکومت کے ساتھ انکے حالات کا ذخیرہ بھی مٹ گیا، اور آج کوئی ایسا نہیں کہ اس فلک زدہ شاعر کے حالات زندگی سے ہم کو آگاہ کرے میں نے آج سے پچاس سال قبل کی طبقاتی کتابوں کی ورق گردانی کی، اخبارات کے فائل دیکھے، بزرگوں اور دوستوں سے دریافت کیا مگر سوائے ناکامی و محرومی کے کچھ نہ آیا، اگر جناب لچھمی مرحوم اپنے تذکرہ میں ان کا تذکرہ نہ کرتے تو شاید ان کا نام بھی ہمیشہ کے لئے مٹ چکا تھا، مگر افسوس کہ اس میں تین سطروں سے زیادہ نہیں، اور اس اوس سے پیاس کبھی بجھتی نظر نہیں آتی، مجبوراً خود ان کے کلام سے ان کے حالات پر جو کچھ روشنی پڑتی ہے وہی ہدیہ ناظرین کرتا ہوں :-

حکومت دہلی کی کمزوری اور وہاں کی بدامنی سے پریشان ہو کر نہ صرف امراء و رؤسا دہلی چھوڑ چھوڑ کر اطراف ملک میں پھیل رہے تھے، بلکہ بہت سے شہزادوں نے بھی ہجرت ہی میں اپنی نجات سمجھ کر ممالک مشرقی کا رخ کیا تھا، اس میں لکھنؤ اور بنارس کو خاص امتیاز ہے، اور غدر کے بعد تو اس خاندان کا ایک بڑا حصہ حزین کے تتبع میں یہیں آ رہا تھا، ہمارا

ستم رسیدہ شاہزادہ بھی ساحل جمنا کو چھوڑ کر رام زار وبھجن آباد بنارس میں آتا ہے، اور مصائب و آلام کے ایام گذار کر وہیں مہاراجہ دربھنگہ سے ملتا ہے، مہاراجہ خود شعر و شاعری کا خاص ذوق رکھتے تھے، اس کو اپنے مصاحبوں میں شریک کرتے ہیں اور انقلاب زمانہ کا ادنیٰ کرشمہ ہے کہ جس خاندان کی معمولی ملازمت بڑے سے بڑے راجہ کے لئے باعث فخر وعزت ہوتی تھی اس کا ایک عزیز ترین رکن اس طرح خدمت رفاقت کرتے نظر آتا ہے، چنانچہ اپنی مثنوی میں لکھتے ہیں:-

فلک رتبہ مہاراج والا گہر | نسلا طون بدانش فریدوں بفر
ہے آگاہ اس سے ہر اک خاص و عام | مہاراجہ لچھمیشر سنگھ نام
انہیں سے یہ دربھنگہ آباد ہے | کہ چھوٹا بڑا جو ہے سب شاد ہے
مروت کے دفتر، فتوت میں فرد | سخاوت میں ہے نام حاتم بھی گرد
الٰہی رہے جب تلک آسماں | رہیں اپنی گدی پہ یہ شادماں
مری آرزو ہے یہ صبح و مسا | کرے ایک فرزند خالق عطا
مہاراج کا ایک ہوں میں جلیس | ۱۸۹۱ء اکیاسی سے ہوں بزم رئیس
مہاراج کا مجھ پہ احسان ہے | کروں شکر اس کا یہ امکان ہے؟
دعا ہے یہی میری ہر صبح و شام | الٰہی تو رکھ ان کو شاداں مدام

زبیر اپنی غزلیں مہاراجہ کو سناتے اور ان سے داد پاتے:-

مہاراجہ سخن کے قدرداں ہیں فرد عالم میں | زبیر ان کو سناؤ تم بھی یہ تحریر چھوٹی سی

ان کے خاندان کے متعلق ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ ان کے ایک بڑے بھائی بھی تھے، ان کا نام شاہزادہ مرزا محمد اختر بہادر تھا، اختر تخلص کرتے تھے، اور کرانہ ضلع مظفر نگر میں رہتے تھے، زبیر کے دیوان کی تاریخ بھی کہی ہے، اس کے علاوہ شہزادہ زبیر نے اپنے داماد مرزا زیبندہ بخت کا تذکرہ بھی کیا ہے، کہ درشاہوار انہی کی فرمایش سے لکھی گئی:-

بپاس عزیز مرزا زیبندہ بخت | پدر ان کے ہیں مرزا اورنگ بخت
نواسے بھی ہیں میرے اور ہیں وہ خویش | رکھے خوش انہیں حق تعالیٰ ہمیش
سعید و متین و ذکی و فہیم | عطا کی انہیں حق نے طبع سلیم
. . . . | . . . .

عرض ان کی خاطر مجھے ہے عزیز کہ ہیں باسعادت وو افر تمیز
لکھی آخرش نظم میں یہ کتاب کہ مضمون ہے اس کا ہر اک لاجواب
بہت انکساری سے مجھ سے کہا کہ تاخیر اس میں نہ کیجئے ذرا

ان دو کے علاوہ تقریباً پندرہ بیس دوسرے شہزادوں نے ان کے دیوان کی طباعت کی تاریخیں کہی ہیں اور ان سے نہ صرف ان خاندان کے مختلف افراد کی ان سے محبت ونسبت کا پتہ چلتا ہے، بلکہ اس سے شہزادہ زبیر کی ہر دلعزیزی کا بھی ثبوت ملتا ہے، اگر کبھی موقع ملا تو اس موضوع پر انشاء اللہ مستقل عرض کروں گا۔

بنارس والی روایت ایک معتبر دوست سے سن کر لکھی ہے، ورنہ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ وہ ابتدا ہی سے دربھنگہ میں تھے، اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ شاعری میں حضرت مولانا ظہیر احسن شوق نیموی کے شاگرد تھے، اور شاعری کی ابتدا اُس شعور کی آمد کے ساتھ ہو جاتی ہے، اس لئے بہت ممکن ہے کہ یہ خاندان غدر کے بعد ہی سے دربھنگہ میں سکونت پذیر ہو۔ العلم عند اللہ۔

شاگردی

نہ صرف زبیر بلکہ ان کے خویش مرزا زبینده بخت بھی حضرت شوق کے شاگردوں میں تھے، اور صوبہ بہار کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے ایک فرد نے اردو معلی کے مرکز لال قلعے کے شاہی خاندان کے ارکان کے اشعار کی اصلاح کی ہے، اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شاہزادہ صاحب ابھی تک اپنی زبان پر ناز اں اور اس کے لئے اپنا کہا مستند سمجھتے ہیں تو یہ فخر دہ چند بڑھ جاتا ہے، چنانچہ ایک غزل میں جس کی ردیف آخرش ہے حاشیہ پر ایک نوٹ تحریر فرماتے ہیں۔

"آخرش کو اگرچہ بعض شعراء نے ترک کر دیا ہے مگر یہ ہمارا روزمرہ ہے، ترک کرنے کی کوئی وجہ معقول نہیں"

اور اسی لئے مقطع میں ارشاد ہوتا ہے

کیا خوب یہ ردیف نکالی ہے اے زبیر کہتے ہیں بہت دنوں سے ہو اشعار آخرش

اسی طرح ایک غزل کی ردیف "انوٹ" ہے، اس پر یہ نوٹ ہے:۔

"انوٹ بمعنی وضع و انداز وغیرہ" قلعہ معلائے دہلی کا محاورہ ہے"

ان کی تعلّی کی شان ان اشعار میں ملاحظہ فرمائیے:۔

سند سمجھتے ہیں میری زباں ہزاروں کوس دروغ ہو نہ کہیں یہ بیاں ہزاروں کوس

خاص اردو ئے معلی ہے زباں میری زبیرؔ کشورِ نظم میں کیونکر نہ ہو شہرت میری

ایسی حالت میں حضرت زبیرؔ کا مولانا شوقؔ کی شاگردی پر ناز کرنا بہار کی عزت کو کتنا بلند کردیتا ہے

حضرت شوقؔ کا ہے فیض زبیرؔ تجھ میں ایسی جو خوشبیانی ہے

جب سے شوقؔ نیموی سے ہے تلمذ اے زبیرؔ پایہ کیسا بڑھ گیا تقریر کا تقدیر سے

استاد شوقؔ کا جو تصور بندھا زبیرؔ مضمون شوق دل سے اسی وقت ابل پڑے

لیکن پھر بھی ایک بگڑ دل کا چور اس طرح ظاہر ہی ہوگیا :-

شور ہوجاتا زبیرؔ اور بھی اس دیوان کا ذوق سا کوئی جو استاد سخنداں ملتا

نہ صرف زبان بلکہ اپنی شاعری کے متعلق بھی ان کا یہی خیال تھا اور اس میں کوئی شک نہیں وہ اپنے عہد کے بہترین شعرا میں تھے، حادثات زمانہ ان کے کلام میں خاص درد پیدا کر دیا تھا، قدرت کلام کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے، ایسی ایسی مشکل وسنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، لیکن چونکہ میں نے ادبی تنقید کو کسی دوسری صحبت کے لئے اٹھا رکھا ہے اس لئے یہاں پر ان کے صرف ان دعاوی کے متعلق جو مملکت شعر کی حکمرانی سے متعلق ہیں، چند شعر پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں،

میری شمشیر زباں سے لے زبیرؔ آج اعدا پر مرا جوہر کھلا

تری طبع رسا کے آگے زبیرؔ لائے گا کوئی ایسی جودت کیا

کس شمعرو کے عشق کا کھایا ہے تونے داغ تیرا جو اے زبیرؔ ہوا ہے سخن دراز

باغ مضموں سے چن لئے ہیں زبیرؔ آج جتنے تھے آب وتاب کے پھول

زبیرؔ لکھی ہیں غزلیں اگرچہ اوروں نے غزل تمہاری ہے اس طرز میں مگر مخصوص

اعدا یہ کہتے ہیں مرا دیوان دیکھ کر   ظاہر زبیرؔ کی ہیں اب ماہیت ہوئی

اپنے استاد حضرت شوق نیموی مرحوم سے اکثر ملنے کے لئے پٹنہ آیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مقطع میں اس طرف اشارہ کرتے ہیں۔

لطف ہم کو شعر گوئی کا ملا تھا اے زبیرؔ   سیر کرنے کو گئے تھے جب عظیم آباد ہم

تصانیف مجھے اس وقت تک ان کی صرف تین تصانیف کا پتہ چلا ہے، ان میں سے ایک تاریخ ہے، اس کا نام امواجی سلاطین ہے۔ اس میں مغلیہ سلاطین کے حالات ہیں اور یہ کتاب قلمی تصاویر سے مزین۔

(۲) چمنستان سخن۔ یہ ان کا دیوان ہے، اس میں اردو غزلوں کے علاوہ ایک قصیدہ نعتیہ اور ایک فارسی غزل بھی ہے، اس دیوان کی ترتیب و طباعت سے متعلق جتنے تاریخی قطعات ہیں ان کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے تمام اساتذہ میں ہر دلعزیز ہی نہ تھے بلکہ لوگ محبت و عزت سے پیش آتے تھے چنانچہ ان تاریخی قطعات کے ناظموں میں ہم کو داغؔ، امیرؔ، شمشاد لکھنوی، تسلیمؔ، شوقؔ وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔

(۳) درشہوار۔ یہ پانچ تاریخی مثنویوں کا مجموعہ ہے،

(الف) یہ دراصل نورجہاں و جہانگیر کے عشق و محبت کی مکمل تاریخ ہے۔

(ب) جہانگیر کا انتقال اور شاہجہاں کی تخت نشینی کے واقعات سے متعلق ہے۔

(ج) تخت طاؤس کی تیاری کے بعد جو سب سے بڑا جشن شاہجہاں نے قلعہ معلی میں آراستہ کیا تھا اسکا مفصل بیان ہے، اس مثنوی کے پڑھنے سے نہ صرف اس شان و شوکت، جاہ و حشم، زیبائش و آرائش کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے، بلکہ لوازمات جشن کی اتنی مکمل فہرست ہمارے سامنے آجاتی ہے، کہ وہ ایک تاریخی مقالہ کے لئے دلچسپ و پرازمعلومات موضوع ہو سکتی ہے۔

(د) یہ مذکورہ بالا قسم کی دوسری مثنوی ہے، اس موضوع پر خود زبیرؔ کے الفاظ میں یہ ہے۔

"جشن مہتابی در مہتاب باغ متصل دیوان خاص اندرون قلعہ دہلی"

اس مثنوی میں جس اہم واقعہ کا تذکرہ ہے، وہ اورنگ زیب کی وہ بہادری ہے جو اس نے نہایت ہی کم سنی میں ایک مست و غضبناک ہاتھی کے مقابلہ میں دکھائی تھی۔

(ہ) اس مثنوی کا موضوع یہ ہے:-

" روانہ شدن لشکر ظفر اثر حضرت معین الدین سلطان اورنگ زیب عالمگیر طرف ملک دکن حیدر آباد برابو الحسن تانا شاہ حاکم گولکنڈہ و تاراج کردن "

ابتدا میرا ارادہ تھا کہ میں اسی سلسلہ میں ان کے شعری و ادبی مرتبہ پر بھی روشنی ڈالوں لیکن اس خیال سے کہ ندیم کے بہار نمبر میں اس قسم کے عام مضامین طوالت کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ ندیم کو بے مزہ کردیں بلکہ اوس کے اوراق اس سے بہتر مضامین کے مستحق ہیں۔ اس کو ختم کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں ناظرین سے درخواست کروں گا کہ وہ اگر شہزادہ صاحب یا ان کی اولاد سے متعلق کچھ جانتے ہوں تو مجھے اطلاع بخشیں کہ یہ مضمون مکمل صورت میں ان کے سامنے پیش کرسکوں کہ میں اس تکرار داستان ہی کے ذریعہ داغہائے سینہ کو زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔

غزل

(از جناب سید محمد رضا خاں موج مرحوم بہ نیاز صاحب)

خیر یا رب بلبل ناکام کی — مشت پر اور یہ کشاکش دام کی

دل سے میں واقف نہیں تھا ہوئی — ہاں کبھی تھی کوئی شئے اس نام کی

کوئے قاتل میں چلو پہنے کفن — شرط ہے حج کے لئے احرام کی

خود گرے لیکن چھلکنے دی نہ مے — اپنے سر لے لیں بلائیں جام کی

اب تو کچھ حد سے سوا ہے اے نیاز — بے نیازی بس بت خودکام کی

میں نے مانا خلد میں ہوگی شراب — ہو مگر واعظ مرے کس کام کی

نزع میں آئے عیادت کو وہ موج
بس یہی فریاد تھی کچھ کام کی

پیمانہ

(از حضرت اصغر مجیبی بی۔ اے (علیگ) سابق اڈیٹر "بہارستان" پٹنہ)

جہانِ آب و گل کی ہو رہی تھی ابتدا گویا
کشا کشہائے ہستی سے نہیں تھی آشنا دنیا

نہ کچھ اظہار صانع نے کیا تھا اپنی صنعت کا
ابھی تجویز نے پہنا نہ تھا تشکیل کا جاما

خرامِ زندگی آسودہ تھا پہنائے امکاں میں
ابھی ہستی کا جوہر ارض کو اپنے ترستا تھا

ابھی تھی فکر قدرت کو بنائے ظرف اک ایسا
جہانِ آب و گل میں جو دکھائے رنگ الفت کا

ہوا اک جوشِ رحمت کو اُبل کر آب آ نکلا
ہوئی جنبش تفکر کو ہوا کا کارواں آیا

نمونہ عجز کا یعنی بنایا گِل کا اِک تودہ
اُسی قادر نے قدرت سے کیا آتش کو پھر پیدا

دیا فرمان دو حرفوں سے ان اربعہ عناصر کو
یکایک بن گیا مل جل کے اک چھوٹا سا پیمانا

شرابِ زیست تھوڑی سی اسی پیمانے میں رکھ کر
اسے دستِ فسونگر نے تمام عالم پہ پھر چھڑکا

تمنا سب کی بر آئی خرامِ زندگی پاکر
جہاں کا ذرہ ذرہ ہو گیا مرہونِ پیمانا

ہوئی ہے عجز کی تعلیم اس کو روز اول سے
پتہ دیتا ہے اسکا خود ہمیشہ سرنگوں رہنا

کمالِ عجز بھی ہے پر ہے خودداری کمال ایسی
جھکاتی ہے صراحی خود برابر آکے سر اپنا

حیاتِ جاودانی کا نشاں سبکو بتاتا ہے
بلا خوف و خطر اسکا برابر دور میں رہنا

× × × × × × × × × ×   × × × × × × × × × × ×

جسے تم موت کہتے ہو نہیں سکے سوا کچھ بھی
مقرر وقت پر لبریز پیمانے کا ہو جانا

کہاں انساں کہاں حیواں کہاں ارض و سما ہوتی
نہ آتا عالمِ امکاں میں قدرت سے جو پیمانا"

زنانہ رسائل کی تجارت

از جناب پروفیسر محمد مسلم ایم اے ام او ایل بسنت کالج۔ ہزاری باغ

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح　　کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

شادی کے بعد ایک سال حامد اور حسنیٰ کی یوں گذری کہ "یہ کہہ رہی تھی انا لقیس وہ انا لیلیٰ" دونوں کو اپنے اپنے رفیق زندگی پر فخر و ناز تھا،

حامد کو ملازمت کے سلسلے میں ایک بار حسنیٰ کو بکلخت تین مہینے گھر چھوڑ کر باہر رہنا پڑا، اکتوبر کی تعطیل میں قسم قسم کے تحائف کے ساتھ آرزوؤں اور ارمانوں کا ہنگامہ بغل میں دبائے گھر آیا۔ بیوی سے تخلیہ ہوا تو خیر مقدم ایسے سوالات سے کیا گیا جن کے لئے وہ بالکل تیار نہ تھا،

"ہفتہ وار دو خط لکھنے کا وعدہ تھا، مگر حساب سے دس روز میں ایک ہوتا ہے"؟

حامد — میرا دماغ طرح طرح کے سرکاری کاموں کی بھیڑ میں سخت منتشر رہا، اتنا سکون بہت کم نصیب ہوا جو تمہیں خط لکھنے کے لئے درکار ہوتا ہے، مگر "دل پیش تست من چہ بہ کابل چہ قندھار"

حسنیٰ — یہ فقرے تو مردوں کا تکیہ کلام ہوتے ہیں جن کے معنی میں اب سمجھنے لگی ہوں،

حامد — ماشاء اللہ بڑی ترقی کی ہے۔ یہ نئی سمجھ کہاں سے آئی، کس نے بتائی؟

حسنیٰ — خود بدولت نے اپنے رویہ سے بتائی۔ اور کون بتائے گا؟ کیا میرے آنکھیں نہیں؟ اچھا جنم اسٹمی کی تعطیل میں کیوں نہ آئے؟ پٹنہ سے چار گھنٹہ کی راہ تھی۔ میں کن امیدوں کے ساتھ رات آنکھوں میں کاٹ دی ہے، میں جانتی ہوں یا میرا خدا، کسی کو کیا خبر اور کیوں خبر ہو؟

حامد — میں اس دن پٹنہ میں تھا ہی کہاں، گاؤں میں مارا پھر رہا تھا، آخر آج یہ بدگمانیاں کیوں پیدا ہوئیں؟

تعجب اور مایوسی میں بے ارادہ حامد کی نظریں چاروں طرف کمرے میں پھر گئیں، میز پر تہذیب النسواں، عصمت، بنات، جوہر نسواں، سہیلی، نوبلی، حور، وغیرہ وغیرہ زنانہ رسالے بکھرے تھے، ایک پرچہ اس نے اٹھالیا، الٹ پلٹ کر دیکھا

شروع کیا، اور سلسلہ کلام بھی جاری رکھا، یونہی ایک دو صفحہ پڑھ لیا اور مسکرا کر رکھ دیا،
"یہ کب سے آنے لگا ہے؟"

حسنے۔ جی بہلانے کو دو ماہ سے جاری کرا لیا ہے، کیا کرتی وقت کیسے کاٹتی؟ کیا اس میں کچھ قباحت ہے؟

حامد۔ قباحت کیا ہے؟ میں اب سب کچھ سمجھ گیا، بکایک تمہارے سوالات کی بوچھاڑ اور تیکھی چتون نے مجھے بوکھلا دیا تھا کہ الٰہی حسنے کو آج ہو کیا گیا ہے، یہ انقلاب کیا معنی؟

حسنے۔ تو اب کیا سمجھے؟

حامد۔ یہی کہ تجارتی رسالوں نے اپنا کام کر لیا۔

حسنے۔ کیا؟ کام کیا کر لیا؟ رسالے تو سبھی تجارتی ہوتے ہیں،

حامد۔ تجارتی سے میرا مطلب یہ ہے کہ ہماری ادبیات میں ایک کثیر مقدار ایسی کتابوں اور رسالوں کی ہوتی ہے جن کا اصلی مقصد خدمت ملک و ملت نہیں، اشاعت علم و فن نہیں بلکہ قومی خدمت کے بہانے سے کمزور دل و دماغ کو کسی ذاتی غرض کے لئے تیار کرنا یا صاف لفظوں میں اشتہار بازی، سیاسی غرض رکھنے والے ہر قصہ کہانی، تاریخ، نظم و نثر میں اپنے خیالات کی اشاعت میں بڑی عیاری کا ہنر صرف کرتے ہیں اور قوموں اور نسلوں کے خیالات پھیر دیتے ہیں یونہی مذہبی مصنفین مختلف اسلوب سے اپنے مذہبی عقائد کی تبلیغ کرتے ہیں، اسی طرح تجارتی مقصد رکھنے والے لٹریچر کو اپنی دوکان کے اشتہار کا آلہ بناتے ہیں،

حسنے۔ (کچھ گرم ہو کر) تو یہ زنانہ پرچے سر پر خوانچے رکھ کر کیا بیچتے پھرتے ہیں؟ ان کی دوکانیں کس چیز کی ہیں؟

حامد۔ اگر یہ سر پر خوانچے رکھ کر بیچتے پھرتے یا کوئی دوکان پسارتے تو کوئی عیب نہ تھا، تجارت پر اعتراض نہیں، اعتراض دھوکے فریب اور عیاری پر ہے۔ پڑھے لکھے جویائے روزگار اور ہوشیار آدمیوں نے دیکھا کہ تجربہ کار مردوں سے بھولی بھالی پردہ نشیں عورتوں اور لڑکیوں کو جال میں پھنسانا زیادہ آسان ہے۔ یہ ہوتی ہیں فطرۃً نرم دل، سہل الاعتقاد، کان کی کچی، مذہبی، خدا اور رسول کے نام پر پیٹ کاٹ کر خیرات کرنے والی، جوش ہمدردی میں بدن سے سارا زیور اتار کر بخش دینے والی ایسی بیش قیمت اور منفعت بخش ہمدردی حاصل کرنے کے لئے ضرورت تھی فریب سخن کی اس غرض کے لئے مردوں سے بدظن کرنا سب سے اہم اور پہلا قدم تھا تا کہ مردوں کی جھاڑ پھونک ان کے مقصد میں حاصل نہ ہو، اسی لئے چاندی کے زیوروں کو سونے میں منتقل کر دینے والے یا ایک ایک کے دو دو بنا دینے والے پیر فقیر عامل بیانے سادھو تاکید اور اصرار کے ساتھ پہلی ہدایت یہی کرتے ہیں کہ خبردار کسی محرم کو عمل کی خبر نہ ہونے پائے ورنہ زیور اڑ جائیں گے۔

حسنے ـــــ (ذرا تیز ہو کر) تو آپ کے خیال میں علامہ شاہد آزبیری، مولانا سید نواز علی، قمر جہاں بیگم رسالہ عفت حرم، نویلی کے ایڈیٹر عیار دھوکے باز فریبی ہیں؟

حامد ـــــ میں سب کو نہیں کہتا، اگر ایک بھی ایسا ہے تو ایک مچھلی پورے تالاب کو گندہ کرتی ہے، ہاں تو یہ بے زبان مظلوم ستم رسیدہ فرقہ نسواں کے وکیل بن کر ان کی وہ ہمدردی اور حسن ظن حاصل کرتے ہیں جس سے یہ صرف اپنا رسالہ کی گرم بازاری ہی نہیں حاصل کرتے بلکہ اور دوسرا کاروبار بھی چلاتے ہیں اور منفعت کے ساتھ مثلاً کتب فروشی۔

حسنے ـــــ کتب فروشی میں کیا عیب ہے؟

حامد ـــــ عیب کچھ نہیں مگر جن کتابوں کی کھپت سیدھی طرح نہیں ہوتی وہ ان زنانہ رسائل کی گاہکوں میں گرما گرم پکوڑے کی طرح ہوتی ہے، خیر یہ بھی عیب نہ سہی سنتی جاؤ، بچوں کے پچاسوں معتبر یتیم خانے ملک میں کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہیں، سرمایہ کی قلت سے کام نہیں چلتا، اسی شہر میں بیس پچیس برس سے یتیم خانہ موجود ہے، تم اس کے کارکنوں اور خدمات سے بھی واقف ہو، ہماری مستورات کو اس کا خیال تو بقر عید کی قربانی کے سوا کبھی نہیں آتا، قربانی کے چمڑے بھی اب وہاں نہیں بھیجے جاتے مگر فلاں ایڈیٹر صاحب کے کاغذی یتیم خانہ پر اتنا دل دکھتا ہے کہ افطاریوں، عیدیوں، تنخواہوں سے کاٹ کاٹ کر، تقریبوں سے بچا بچا کر نقدیاں اور کپڑے ان کی دل ہلا دینے والی اپیلوں کی بدولت بے خرخشہ ان کے ہاں پہنچتے رہتے ہیں، میں یہ بھی تسلیم کر لیتا ہوں کہ وہاں واقعی یتیم بچوں کا ایک یتیم خانہ اور درسگاہ موجود ہے مگر ہمسایہ یتیموں کو بھوکا اور جاہل چھوڑ کر اتنے دور دراز ملک کے یتیموں کی امداد کرنا جن کی خبر منتظم صاحب کی زبانی فریاد کے سوا کسی اور طرح نہیں مل سکتی کونسی دانائی یا دیانتداری ہے؟ کیا تمہارے نرم دلوں کے ساتھ کھیل کر یہ تجارتی اور ناحق نفع اٹھانا نہیں؟

تمہیں بتاؤ آج تک پٹنہ کے یتیم خانہ کو ہمارے گھر سے کئے ٹکے بھیجے گئے ہیں اور اس نادیدہ ملتانی یتیم خانہ کو کتنی رقم گئی ہے؟ بولو بولو، چپ کیوں ہو؟ مجھے بتاؤ،

حسنے ـــــ پٹنہ کے یتیم خانہ کو یہاں سے کیا مدد ملی ہے مجھے خبر نہیں، میرے میکے سے تین سال پیشتر تک کچھ جایا کرتا تھا یہ میں البتہ اقرار کرتی ہوں کہ پچھلے مہینے بھابھی (جٹھانی) اور میں نے مل کر پانچ روپے بھیجے تھے۔

حامد ـــــ ہمارے ہاں سے بھی تین سال سے بقر عید کے چمڑے کے سوا کچھ نہیں گیا، اور اب یہ پانچ پانچ کی قسط معلوم نہیں سال میں کتنی جاتی ہوگی، ہمیں خبر نہیں اور کیوں ہو ہم سب مرد عورتوں کے بدخواہ، یا بے پروا، یتیم بچوں سے کیوں ہمدردی ہونے لگی، ہم تو چاہیں گے کہ یہ دہقان ہوں یا بھیک مانگ کر یا محنت بیچ کر زندگی کاٹیں، کیوں ہے نا یہی؟

حسنے ـــــ اب بگڑے آپ، کھڑنے، اس کی سہی نہیں، بھلے ہو قدمے جا رہے تھے، ہاں اپنے ہمسایہ یتیموں سے غفلت

بجا ہے، خدا معاف کرے، یہ کس نے کہا کہ مرد یتیم بچوں کو بھیک منگوانا اور آوارہ پھرانا چاہتے ہیں ؟

حامد ——— آپ کے وکیل نسواں صاحب کے طرزِ عمل نے، یہی تازیانہ ہمارے قدم اکھاڑتا اور چھڑکت چلاتا ہے،

حسنے ——— کیسے ؟

حامد ——— مردوں میں ان یتیم بچوں کے لئے اپیل کیوں نہیں کی جاتی ؟ افشائے راز کے خوف کے سوا اور کیا سبب ہو سکتا ہے ؟

حسنے ——— اس لئے کہ لڑکیوں کا معاملہ عورتیں ہی سدھارلیں تو اچھا، مردوں کے لئے اور بہتیرے کام پڑے ہیں،

حامد ——— مردوں کے کام بقول وکیل نسواں صاحب آفس کے گھنٹوں کے سوا کلب، سیر و شکار، دعوتیں، مجلسیں، نفلیں، ٹینس، شطرنج، تاش، نظر بازی، شاہد بازی، عیاشی کے مشغلے ہیں، بیوی سے غافل، ستمران حقوق نسواں کے غاصب، بے حس، سنگدل، ہر زنانہ رسالے کے افسانہ کا موضوع یہی ہے، یا کچھ اور بھی، نسوانی کتابوں کو چھوڑو، تازہ افسانے لے لو، (ایک رسالہ اٹھا کر) ایک کا ہدف وہ جورو والے مسن مولانا ہیں، دوسرے کا نشانہ ایک ولایت کے تعلیم یافتہ کتب خانہ اور تجربہ طانہ کے گوشہ نشین پروفیسر سائنس، تیسرے کا آماج ایک منچلے لاابالی رئیس زادے، دلہنیں کسی سے خوش نہیں۔ سب ان کے حقوق کے غاصب، لاپرواہ، نالائق، ظالم، دلہنیں سب شائستہ، پریزاد، فرشتہ خو، مظلوم، صابر،

اتنے میں آ دھمکیں بھاوج، بولیں

میں کچھ دیر سے تمہارا لیکچر دروازہ پر سن رہی تھی آخر نہ رہا گیا، کیا کہہ رہے تھے حامد ؟ دلہنوں پر طنز کر رہے تھے ؟ اور مردوں کی حمایت ؟ منہ نہ کھلواؤ، بنگالی سررشتہ دار صرف ۵۰ تنخواہ پاتا ہے اور اپنی جورو کو روز نئی نئی وضع کی ساریاں اور بلاؤز پہناتا ہے، خوبصورت رنگ لیس اور پانچ پانچ پازنگ لے دئے ہیں، تمہارے بھائی جان ماشاءاللہ چار سو ہم پاتے ہیں میرے پاس نہ ویسا ستھرا ایک جوڑا ہے نہ ویسے خوش وضع زیور صرف دو اچھے جوڑے دو برس کے ہیں وہی اوڑھنا وہی بچھونا۔ دو جوڑوں میں کہاں کہاں منہ دکھاؤں اور دقیانوسی پچلڑے کب تک گلے میں پہروں، گوشوارے، ختنہ اور مکتب کی تقریبوں پر بیویوں کے جلسے، چادر چڑھانا، منت اتارنا، بدعت، فضول خرچی، جہالت، اپنے لئے چار سوٹ نئے، چار سوٹ ادھیڑ، نصف درجن ہیٹ اور ٹوپی، نصف درجن جوتے جن پر فی سوٹ ساٹھ ستر سے کم لاگت نہیں، کلب کا چندہ، ڈرائنگ روم کے فرنیچر، چار مالی کی تنخواہیں بڑی کفایت شعاری ہے، شمسو میاں کی تنخواہ سو روپے، گھر میں دو مامائیں ایک چھوکری ایک چھوکرا تمہارے ہاں باہر جتنے بھی نوکر ہوں، اندر ایک باورچن ایک چھوکری، چولھا دیکھوں، بچوں کی خبر لوں یا سلائی کروں ؟ پڑھنا لکھنا کیا چولھے میں، ہر قسم کی دلبستگی حرام، نہ ٹہلنا پھرنا ہے نہ کتب بینی، نہ گانا بجانا، پچیس پچیس روپے کو نگوڑا گراموفون

مارا پھرتا ہے، ہر کھڑے قصائی کے پاس ہے، میں کہتی رہی کلکتہ کے سفر سے ایک پتے آتا یا منگواؤ، مگر صرف منگوا لو کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے۔ اپنے لئے دوست احباب، کلب، مجلسیں، محفلیں، ڈراما، سینما، ہوا خوری، شکار سب جائز، گھر کی موٹر میں کبھی پارک یا آبشار کی سیر کرائی؟ جب کہا تو جواب ملا جاؤ دیکھ آؤ، رات دن انہیں چار دیواریوں میں گھٹا کریں،

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

حامد ــــــ اللہ اللہ! بھری بیٹھی ہیں شاعری اور منقری کا دریا بہا دیا،

حسنے ــــــ تو جواب کیوں نہیں دیتے ہیں کہ نہ بھری سنی۔ بھابھی یہ دیر سے مجھے زچ کئے ہوئے تھے،

حامد ــــــ انہیں کی صحبت نے تمہیں بھی بگاڑا ہے، آپ کی تمام شکایتوں کا خلاصہ وہ کرتی ہے نا کہ بھیا آپ کے لئے کچھ نہیں کر دیتے؟ مگر کسی جائز کام سے روکتے بھی ہیں؟ آپ اپنی مدد آپ کیوں نہیں کرتیں۔ جو چاہئے پہنئے، جہاں چاہئے جائیے، سیر کیجئے، جتنے نوکر چاہئے رکھئے، جس طرح چاہئے رہئے، رہتے آپ کو کس نے منع کیا ہے؟ یہ خود آپ ہی کا انتظام ہے روز مامائیں رکھی اور نکالی جاتی ہیں، یا بھاگ جاتی ہیں، اس میں بھیا کا کیا قصور؟ یہی تو رونا ہے کہ خود ہماری بیویوں کو نہ بننے سنورنے کا شوق ہے نہ پرلطف زندگی گذارنے کا ہنر آتا ہے

بھاوج ــــــ کیا کہتے ہو، منع نہیں کیا؟ تھیٹر آیا اور گیا، سینما روز ہوتا ہے، سرکس آئے دن آتے جاتے رہتے ہیں۔ جب کہا تو یہی جواب ملا اپنے شہر میں معیوب معلوم ہوتا ہے، سیکڑوں احباب اعزا وہاں موجود ہوتے ہیں کیا کہیں گے؟ شرافت سے بعید ہے، کس گھر کی بہو بیٹیاں ان تماشوں میں نہیں جاتیں۔ شہر میں سب کینے، سب کی ناک کٹی ہوئی، ایک تمہاری ناک سب سے اونچی اور صرف تم شریف ہو۔ تمہارے لئے کچھ عیب نہیں، رنڈیوں اور بھانڈوں کی محفلیں تمہارے لئے نہایت مہذب صحبتیں ہیں؟

حامد ــــــ آپ کی میراثنیں ہمارے بھانڈوں سے زیادہ مہذب نہیں ہوتیں، رہیں رنڈیاں تو بیویوں کو گانے بجانے اور دلکش بننے کا ہنر ہو تو مرد رنڈیوں کے ہاں کیوں جائیں؟

بھاوج ــــــ پھر ہمیں گانے بجانے ناچنے تھرکنے کی تعلیم کیوں نہیں دی جاتی؟ یہ کس کا قصور ہے؟ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے، دلہن ابھی نوخیز ہیں، دو انہیں کو گانے بجانے ناچنے بھاؤ بتانے کی تعلیم، بسم اللہ، آج ہی پکڑ لاؤ کسی استاد سازی گویئے کو، یہ البتہ شرافت ہوگی، رذالت تو ہمارا سینما دیکھنا ہے،

ایک منٹ کو حامد کی زبان کو مہر لگ گئی، بھاوج جھنک کر اٹھیں، اور "چلو دسترخوان چنا ہوا ہے" کہتی کمرے سے نکل گئیں۔ حسنے نے ایک ہلکا قہقہہ لگا کر حامد کی طرف دیکھا، گویا آنکھیں کہہ رہی تھیں "اب کیا کہتے ہو؟"

دونوں اُٹھ کر کھانے کے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔

کھانا کھا کر حامد حسنے کے ساتھ بھاوج کو پکڑے ہوئے اپنے کمرے میں آتا ہے۔ بھاوج ماماؤں کے کھانا دینے اور دوسرے کاموں کا عذر کرتی ہے۔

حامد ——— آپ ابھی مجھے حسنِ اسانی سے شکست دیکر بھاگی ہیں یہ اتنی آسان نہیں، میں نے آپ کو چھیڑا تھا اور چھیڑ چھاڑ میں آپ ہمیشہ غالب رہتی ہیں، وہ بات اور ہے، اب ذرا سنجیدہ باتیں سنئے،

بھاوج ——— خوب رہی، گھنٹے بھر سے دلہن کو پکڑ پکڑ بلا کر ناک میں دم کر رکھا ہے، اب بڑی بے بھاؤ کی تو کہتے ہیں یہ چھیڑ چھاڑ تھی سنجیدہ گفتگو نہ تھی، اچھا کہو کیا کہتے ہو؟

حامد ——— کہنا یہ ہے کہ ہمیں عورتوں کی قابلِ رحم حالت، مظلومی، اپنی فرض ناشناسی سے انکار نہیں، اور شاید کسی پڑھے لکھے مرد کو نہ ہوگا۔ وکلائے نسواں کی وکالت، مستورات کی فریاد و ستم اپنی جگہ پر درست اور بجا ہیں مگر اس کا علاج کیا ہے، عورتوں کی فریاد عورتوں کو سنانا یا مردوں کو؟

بھاوج ——— مردوں کو

حامد ——— تو کیا یہ امید کی جاتی کہ مرد زنانہ رسائل اور اخبار پڑھیں گے؟ خیر خواہ نسواں حضرات یا بیبیاں مردوں کے رسالوں میں اس قسم کی فریادیں اور اصلاحی مضامین کیوں نہیں شائع کرتیں؟ کبھی کسی طرف سے مردوں کی یہ آواز بھی اُٹھی ہے کہ عورتیں قابلِ رحم نہیں، ان کے حقوق کا مطالبہ جائز نہیں؟ بعض پرانی کھوپڑیوں کے سوا اب تو یہ ہر تعلیم یافتہ بھلے مانس کو تسلیم ہے، ضرورت صرف نوجوانوں کو اکساتے رہنے اور مؤثر مضامین شائع کرنے اور مردوں میں پروپگنڈا کرنے کی ہے نہ کہ عورتوں میں۔

حسنے ——— یہ بالکل درست ہے، بھلا عورتوں میں ان مضامین کی اشاعت کا کیا فائدہ

حامد ——— صرف بے فائدہ نہیں، بے انتہا مضر، ہماری ازدواجی زندگی خراب کرنے کا باعث۔ جن عورتوں کے دل و دماغ پر ہر وقت مردوں کی زبردستی، زیادتی، خود غرضی کا خیال چھایا رہے گا ان کے تعلقاتِ زناشوئی کا کیا حال ہوگا جہاں ہر فعل بدگمانی کی نظر سے دیکھا جائے گا، صلح و امن، خلوص و محبت کہاں باقی رہے گا، زندگی کا کیا رنگ ہو جائے گا؟ مغربی رنگ سے عورتوں کو روشناس کیا جا رہا ہے، مغربیت کی کچھ تعلیم ہم مردوں نے بشوق لی جو باقی ہیں وہ تم پڑھ لو اور معاشرت کو مغربی مزید برباد۔ ہماری خانگی زندگی انہیں کی سی جہنم بن جائے گی۔ جہاں عورتیں مردوں کی حریف و رقیب بن رہی ہیں۔

ہانڈی، چولھا، سلائی، پرونی تو مدت سے ان کے فرائض کی فہرست سے خارج ہے۔ اب بچہ جننا بھی علحدہ کیا جا رہا ہے یہاں تک کہ نکاح کا جھگڑا بھی مٹا چاہتا ہے، نہ کوئی بیوی نہ میاں، سب آزاد۔ بچوں کی پرورش حکومت کے ذمہ، عشق و محبت کوئی شے نہ باپ بیٹے کی الفت نہ ماں کی ماتما'

بھاوج ——— یہ کیا خرافات بک رہے ہو'

حامد ——— کیا آپ نہیں جانتیں بھابی؟ آپ کے زنانہ رسالوں نے مغرب کی ازدواجی زندگی اور معاشرت کی تصویر کبھی نہیں دکھائی؟ اس سے ان کو کیا مطلب، کیوں دکھائیں؟ بھابی طلاق جس پر عیسائی ہمیشہ مسلمانوں پر منہ آتے رہے ہیں ان کے ہاں جاہلین عرب کی طرح وبا بن گئی ہے۔ اور بے سبب آج بیاہ ہوتا ہے چھ مہینے میں طلاقا طلاقی' سبب؟ کچھ نہیں۔ بس پسند نہیں۔ خود مدبرین مغرب اس حالت پر ماتم کر رہے ہیں۔ اخلاقی پہلو سے نہ سہی اقتصادی نظر سے' اجتماعی حیثیت سے خوفزدہ ہو رہے ہیں۔ اور ہم انہیں صفات کو مغرب پرستی کے جوش میں اختیار کر رہے ہیں۔ اب تک ہماری خانگی زندگی اس لعنت سے آزاد تھی اب یہ مغربیت کا بھوت زنانخانوں میں بھی گھس آیا رہا ہے اوہ ہمیں تحقیق نہ باہر چین ہوگا نہ اندر۔

پھر میں آپ کی غلط فہمی دفع کرنے کو کہتا ہوں کہ آپ لوگوں کے مطلوبہ حقوق میں سے بہتیرے جائز ہیں' مردوں کی غفلت نالائقی ہے مجرمانہ ہے' مردوں میں پروپگنڈا اور تبلیغ کی ضرورت ہے' مگر ساتھ ہی بہت سی خواہشیں ناجائز اور تباہی خیز ہیں' زنانہ رسائل اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے ان میں امتیاز نہیں کرتے۔ وہ مغربی زندگی کی ہر بات سراہتے اور عورتوں کو ان کا مشتاق بناتے ہیں' مردوں کی طرح ہماری عورتوں کی زندگی بھی مسرفانہ' نمائشی' جھوٹی ہوتی جاتی ہے' ادنی آدنی آمدنی والوں کی بیویاں بچوں کے لئے دایہ اور کھلائی رکھتی ہیں۔ کھانا مرد نوکر پکاتا ہے۔ کپڑے درزی سیتا ہے' خود آزاد گھر گھر اپنے لباس اور زیور دکھانے اور گپیں اڑانے کے سوا کام نہیں' کیا یہی آزادی آپ لوگ چاہتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو گھر پچاس روپے ماہوار کی آمدنی میں سفید پوش تھا آج ایک سو پچاس روپے میں ہر مہینے قرض کے ڈیوڑھہ پر گذر ہوتی ہے۔ مرے تو گھر سے کفن کو نہ نکلے' ولایت میں تو خیر عورتوں نے زنانہ فرائض سے پیچھا چھڑایا تو کام کرتی ہیں اور اپنے فیشن کا خرچ نکالیں ہیں بیکاری سے جو افلاس پیدا ہوتا ہے وہاں نہیں ہوتا۔ مگر یہ مغرب کی متعدد نقلی مم صاحبین افلاس بڑھانے کے سوا اپنی اس بیکاری یا آزادی سے اور کیا پھل دے سکتی ہیں

بھابی آپ نے کہا تھا' فلاں تحصیل سرشتہ دار اسی روپے تنخواہ پاتا ہے اور بیوی کو روز نئے جوڑے پہناتا ہے اور ہمیشہ نئے زیور لے دیتا ہے۔ یہ تو آپ نے دیکھا۔ مگر یہ نہ دیکھا ہوگا کہ میاں بیوی میں انہیں وڑدوں اور زیور کے لئے کیسی تھکم فضیحتی رہتی ہے' ان کے تعلقات کیسے ناگوار اور بابو صاحب نے قرض رشوت چوری سے یہ فرمائشیں پوری کی ہوں گی' جن کی بدولت ہر وقت ان کا ایک پاؤں جیل میں ضرور ہوگا۔ ابھی کل کی بات ہے' ایک صاحب نے بیٹی کے بیاہ میں واہ واہ کے لئے

بڑی رقم ہضم کی اور چل پہنچے،

بھاوج کو ماما پکارتی ہے وہ چلی جاتی ہیں۔

حسنی! تمہیں یہ زندگی پسند ہے؟

کہ تم بلاشرکت غیرے میری آمدنی کے نصف حصہ کی قانونی حصہ دار ہو یا خود کماؤ، مجھ سے آزاد بے نیاز جس کے ساتھ چاہو رہو، جس سے چاہو ملو، صرف سوسائٹی میں دکھانے کو ہم تم ایک دوسرے سے مسکرا کر ملیں، پیاری اور پیارے کہہ کر مخاطب کریں، تنہائی میں ہم اجنبی، ایک دوسرے سے بے تعلق، بچوں سے آزاد، ممتا کی لہر سے ناآشنا، سیاسیات میں حریف، مذہب و اخلاق سے بے لگاؤ، زندگی کی مسرتوں کی پیمائش صرف پونڈ شلنگ پنس کے وزن سے کی جائے اور محبت و ایثار کا رومانس ختم، جذبات بے معنی ہو جائیں،

یہ زندگی!؟

کہ تم میری نصف لطیف ہو، میری درشتی اور تمہاری نرمی، میری طاقت اور تمہاری نزاکت حسن، میری کمائی اور تمہارا سلیقہ ملا کر ایک عدد کامل بنتا ہے، میری آغوش حمایت تمہارے دل کا ڈھارس اور زور ہے، ہماری باہمی عافیتیں اور بچوں کی الفت ہمارے درمیان رشتۂ مشترک و محکم ہو، میرا بم اور تمہارا زیر مل کر ایک غم ربا، رنج فرسا، روح نواز نغمہ بنے؟

حسنی کا جواب آنکھوں سے تھا اور حامد کی باقی تقریر دست شوق اور لب تشنہ سے ادا ہوئی۔

صبح کو ناشتہ پر حامد حسنی اور بھاوج اکٹھے ہوتے ہیں تو حسنی چھیڑتی ہے۔

رات مباحثہ ہی مباحثہ رہا، اب سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ عورتوں کی اصلاح کی صحیح تدابیر کیا ہیں اور ان پر کس طرح عمل کیا جائے؟

حامد ——— یہ بات کام کی ہے، جیسا کہ میں شب کو کہہ چکا ہوں ان کی اصلاح کی طرف مردوں کو متوجہ کرنے کے لئے صحیح میدان مردانہ اخبار رسائل ہیں۔

حسنی ——— کیوں نہ اس غرض سے ایک مخصوص پرچہ مردوں میں جاری ہو؟

حامد ——— یہ مؤثر نہ ہوگا، کسی مخصوص موضوع پر کوئی رسالہ مقبول نہ ہوگا نہ پڑھا جائے گا۔ بلکہ اردو کے موجودہ مؤقر رسالوں ہی میں اس غرض کو خاص طور پر مدنظر رکھ کر مضامین شائع کئے جائیں جن کے مطالعہ سے ناظر کو چارہ نہ ہوگا۔ اور کم و بیش یہ ہو رہا ہے۔ ماڈرن ریویو، انڈین ریویو، ہمایوں، الناظر، ندیم، نگار میں اس قسم کے متعدد مضامین افسانے نظمیں شائع ہوتی رہتی ہیں، مگر یہ کافی نہیں۔ تم مضامین لکھا کرتی ہو مردانہ رسائل میں بھیجا کرو یہ تشکر کے ساتھ شائع کریں گے۔

حسنے ـــــــ اصلاحات کس قسم کی ہوں ؟

حامد ـــــــ ترقی تعلیم، خانگی صنعت، حرفت جو بیوہ بیکس عورتوں کی زندگی کا سہارا ہو، خانہ داری میں کفایت شعاری کے ساتھ صفائی ستھرا پن، ورزش جسمانی کے بلاخرچ طریقے، تفریح، بچوں کی جسمانی اور اخلاقی پرورش، اکثر برائیاں صرف تعلیم سے دور ہو جائیں گی، مثلاً رسوم و رواج اور توہمات پر اسراف، شہر میں لاچارانہ پردے میں اعتدال و اصلاح، لباس و معاشرت میں پھر پھیلے پن اور خوش مذاقی جس کے لئے فضول خرچی ضروری نہ ہو۔ اور سب سے بڑھ کر اس شاعری کو برقرار رکھنا ہے جو ایشیائی زندگی کی جان ہے یعنی محبت، عورت کچھ ہو جائے عورت ہی رہے، بجلی کی کڑک سے چونکے تو شوہر کی آغوش ڈھونڈے۔ اس ادا و ناز کا وار ایک ہی دل پر رہے، اسی طرح مرد کے دریائے جذبات کا تلاطم ایک چاند سے متعلق ہو، یہ لذتیں یورپ کو کہاں نصیب، خدارا ان کو برقرار رکھا جائے، جہاں یہ ایشیائی رومانس غائب ہوا اور ہماری رہی سہی زندگی جل کر خاک سیاہ ہو جائے گی۔ سیاسی جان کب کی نکل چکی ہے، معاشرتی سانس جو ابھی چل رہی ہے ٹوٹنے نہ پائے، یورپ میں تو اس کمی کی تلافی آزادی، سلطانی دولت و ثروت نے کر دی ہے، غریب ہندوستان کے پاس کونسا بدل اور کیا تلافی ہے؟ محرومی، بدنصیبی، دنیا ہی میں جہنم کے مزے۔

غزل

حکیم ظفر بہریوی ایڈیٹر طبی میگزین پٹنہ

زیر لب جب وہ مسکراتا ہے
قلب پر بجلیاں گراتا ہے

کیوں رہوں مبتلائے رنج و محن
کیوں تصور میں کوئی آتا ہے

نزع میں آرہی ہے کچھ آواز
کیا کسی کو کوئی بلاتا ہے

دل کا ہر تار کانپ اٹھتا ہے
دھیمے دھیمے کوئی جو گاتا ہے

"حسن مغرور" ایک نظر دیکھے
"عشق مجبور" جو دکھاتا ہے

آپ کی بزم ناز سے اٹھ کر
ہر کوئی نامراد جاتا ہے

یوں جلوہ فگن ہوا ہے ظفر
گھر کا ہر ذرہ جگمگاتا ہے

صدقے اور خیرات کی بدولت ہیں لیکن تھوڑی سی اس مقبولیت میں میری جدت پسندی اور اپچ کو بھی دخل ہے۔ اگر قدیم شاعری کے اصول و قواعد کی پابندیوں سے آزاد ہو کر نئے نئے الفاظ اور نئی نئی ترکیبوں اور بندشوں سے جدت اور ندرت پیدا کر کے زمانہ حال کے مذاق کے مطابق عام پسند نہ بنایا تو کالج کے مشاعروں اور قومی اسٹیجوں پر شعر سننے سے پہلے ہی مجھ پر تالیاں تو کیا کوئی چٹکی بھی نہیں بجاتا'

مجھے ان جاکر خیال والے شعرا کی سمجھ پر حیرت ہے وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ آجکل نئی روشنی اور جدید خیال کی تعلیم یافتہ جماعت کے سامنے شاعری میں ایسی پرانی باتیں دہرانی جو آوٹ آف ڈیٹ ہو چکی ہیں کس قدر مذاق سلیم کی توہین ہے۔ مثلاً آپ اسی شعر کو لے لیجئے ؎

گھیرا ہے روئے یار کو زلف دراز نے — قرآں اُٹھا لیا ہے بڑے جعلساز نے

اب میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ آجکل کے حسینوں کی ترشی ہوئی زلفوں کے اپٹوڈیٹ فیشن کو دیکھتے ہوئے درازی زلف کو حسن کا معیار قرار دینا ایک روشن خیال عاشق کے لئے کس قدر تکلیف دہ ہے اور صرف دراز گیسوی کہہ کر چپ نہیں ہو جاتے اور بھی کھینچ تان کر زلف کو اس قدر بڑھا دیا کہ کسی شاعر کا یہ مصرعہ زبان زد ہو گیا ع "طول شب فرقت سے بھی دو بانس بڑی ہو" اصل مصرعہ میں تو "دو ہاتھ" ہے مگر ہاتھ کا ناپ صرف دو ہی فٹ کا ہوتا ہے اور بانس کی لانبائی بیس ہاتھ کے برابر ہوتی ہے اور مضمون ہے درازی زلف کا۔ تو ہاتھ کے بدلے اگر میں نے بانس رکھ کر مبالغہ کی تھوڑی سی کمی کو پورا کر دیا تو کئے جنابت میں نے کوئی بیجا اصلاح تو نہیں دی۔ خیر تو اب میں خدا اور رسول اور بزرگان دین کا واسطہ دے کر آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ تھیم کی طرف رخ کر کے آپ ہی ایمان اور دیانت سے کہئے کہ اس مغربی تہذیب کے زمانہ میں ترشی ہوئی زلف کی طوالت کے مبالغہ میں بال کی کھال نکالنا آوٹ آف فیشن قسم کی شاعری ہے یا نہیں؟ آجکل جبکہ مار گیسو دم کٹا سانپ ہو کر رہ گیا تو آپ کا زلف دراز کے مضمون کو طول دینا سوائے اس کے کیا کہا جائے ع گیا تو سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر۔ اسی طرح پرانے خیال کے شعرا اپنی شاعری میں زیادہ تر کمسن ہی معشوق کو تختۂ مشق بناتے رہتے ہیں ثبوت ملاحظہ ہو ؎

ادھر یہ شوق وہ کمسن و مدعا باریک — انہیں جواب بتا کر سوال کرتے ہیں

نتار دھا ایکٹ پاس ہو جانے کے بعد کمسن معشوق کے ساتھ چھیڑ خوانی کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ کوچۂ یار کی خاک چھاننے کے بدلے کچہری کی گرد پھانکئے اور جیل میں فرہاد کی طرح تیشہ کے عوض ہتھوڑے سے پتھر توڑئیے' میں کہتا ہوں کہ ایسے بکھیڑے کے مضامین باندھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

قدیم رنگ کے تغزل میں عام طور سے معشوق کو ظالم' قاتل' سفاک کہنا گویا روزمرہ کی بات ہے اگلے زمانہ میں چونکہ

معشوقوں میں حسن کے ساتھ شرم و حیا کافی مقدار میں ہوتی تھی اس لئے رسوائی و بدنامی کے خیال سے ظالم اور سفاک جیسے توہین آمیز الفاظ سن کر کھا جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اگلے زمانے کے معشوقوں کو کمر کی طرح دہن بھی نہیں ہوتا تھا اس لئے ستمگر، جلاد جو بھی آپ کہئے یہ غریب بے منہ کے حسین کچھ بول تو سکتے نہیں تھے لیکن آجکل مغربی خیال کے شریر و شوخ عیار معشوقوں کی شان میں ظالم سفاک جیسے مجرمانہ الفاظ زبانی نہیں بلکہ شعر میں لکھ کر تحریری ثبوت آپ نے بہم پہنچایا۔ اور اس شریر ستم ظریف نے کہیں دفعہ تفتیش کی نالش ٹھونک دی تو بس سمجھ لیجئے کہ

ع ——— ہے مشق سخن جاری چکی کی مصیبت بھی۔ گویا آپ ہی کا مصرعہ ہے اور صرف بیداد گر، جفاجو، ظالم ہی کہنے پر بس نہیں کیا جاتا اس سے بھی زیادہ خطرناک مصرعہ سنئے ع پھیر کر منہ ذبح کرنا اس ستم ایجاد کا۔ معشوق نہ ہوا کوئی قصائی یا بوچڑ کہ جہاں شامت اعمال سے کوئی عاشق کوئے یار میں پہنچا معشوق صاحب نے جھٹ چھری لے کر بسم اللہ اللہ اکبر شروع کر دیا۔ اب ذرا ان بسمل صاحب سے کوئی پوچھے کہ اس ناجائز قربانی کی رپورٹ کسی نے پولیس میں کر دی تو آپ تو تڑپنے و پھڑکنے کے کام سے فرصت کر کے گرد جھاڑ کر سیدھے اپنی اوفس میں اس طرح کے شعر موزوں کرنے میں مصروف ہو گئے

قریب ہے یار روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکاریگا آستیں کا

اور آپ کا ظالم معشوق قتل عمد کے باعث پولیس کی حراست میں

اور یہاں اس شعر میں "لہو پکارے گا آستیں کا" پرانا تخیل بھی بالکل غلط، اس لئے کہ موجودہ فیشن میں سرے سے آستین ہی غائب۔ باقی رہا دامن۔ تو یہ بھی آجکل اتنی بلندی پر پہنچ گیا ہے کہ آپ کا خون لاکھ اچھل کود کرے مگر وہاں تک پہنچ کہاں سکتا ہے، دیکھی آپ نے اولڈ فیشن کی شاعری؟ ابھی کیا ہوا ہے یہ تو صرف اس قسم کے اشعار ہیں جن میں جناب معشوق صاحب کے پھنسانے کا کافی مواد ہے، اب وہ شاعری بھی سن لیجئے جس میں حضرت شاعر خود بدولت اپنے ہاتھوں اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

ظلم کب تک ترا سہا کرتا
جان دیتا نہ میں تو کیا کرتا

اچھا صاحب جان دینے کو تو آپ نے دیدی لیکن خودکشی کے جرم میں پولیس نے آپ کی لاش کی چالان کر دی اور پوسٹ مارٹم کے بعد خودکشی والا دفعہ آپ پر جو قائم ہو گیا تو اب مقدمہ کی ہر پیشی کی تاریخ میں قبر سے اٹھ کر نامۂ اعمال کے بدلے مسل کا بستہ بغل میں دابے کچہری میں حاضری دیا کیجئے۔ اور نکیرین کے سوال و جواب کے عوض وکیلوں کی جرح کا تختۂ مشق بنئے۔ ان مثالوں کے بعد آپ کو کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ پرانی شاعری کے مضامین ایک تو بجائے خود بکھیڑے سے خالی نہیں دوسرے موجودہ معاشرت تہذیب کے بھی کس قدر خلاف ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی مگر قدامت پرست شعرا ابھی تک پرانے ہی قصے کو دہرائے چلے جا رہے ہیں۔ آجکل حسن و عشق کے سلسلہ میں آئے دن ہزاروں جانیں بندوق پستول ہو کر جان نثاران محبت کی فہرست میں اضافہ کر رہی ہیں

مگر یہ ہیں کہ ابھی تک صرف مجنوں اور فرہاد ہی کا ماتم کر رہے ہیں، سیکڑوں شوخ و طرار حسن کی پریاں موٹروں پر ادھر ادھر اڑتی پھرتی ہیں
مگر یہ قدامت پرست شعرا ابھی تک "محو کر زور دھوم سے آتی ہے ناقۂ لیلیٰ" ہی پر وجد کر رہے ہیں۔ آپ آپ ہی تلاش
کہ اگر چشم حسینان فرنگ کو موٹر سے کھینچ کر ناقہ پر بٹھلانا "اونٹ کے گلے میں بلی" کی مثل ہوگی یا نہیں۔ چڑیا خانہ میں آپ نے دیکھا
ہوگا کہ سیکڑوں خوش رنگ اور خوشنوا پرندے اپنی نغمہ سنجی کے شور سے ایک ہنگامہ مچائے رہتے ہیں مگر انہیں اس نقار خانہ میں صرف
طوطی کی آواز دلکش' اور بلبل کے نغمہ کے سوا اور کچھ سنائی نہیں دیتا۔ مشاعرہ کا سارا ہال برقی قمقموں سے بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔
لیکن یہ ابھی تک موم بتی یعنی شمع ہی پر آنسو بہا رہے ہیں، اس کورانہ تقلید کی وجہ پوچھئے تو جواب ملتا ہے کہ لیلیٰ و مجنوں، شیریں و فرہاد، گل و
بلبل، شمع و پروانہ ان میں کا ہر لفظ حسن و عشق کی ایک پوری داستان اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے، شاعری کے لیے گویا یہ
ایسے شورٹ ہینڈ ہیں جن کے ذریعہ سیکڑوں ورق کے مضامین ایک لفظ میں ادا کر دیئے جاتے ہیں، ان کی یہ عذر داری کہاں تک
قابل سماعت ہے اس کا فیصلہ کرنے کے پہلے یہ بھی غور کرنے کی چیز ہے کہ اگر یہ جواب صحیح مان لیا جائے تو ہر شاعر کے لئے وسیع معلومات
کا حاصل ہونا لازمی ہو جاتا ہے اور ایک نئی تعلیم یافتہ شاعر کے پاس اتنا وقت کہاں کہ وسیع معلومات حاصل کرنے کے لئے مختلف علوم
فنون کی کتابوں کی ورق گردانی کرے۔ سچ پوچھئے تو قدیم رنگ کی شاعری سے میری نفرت کا سبب زیادہ تر شاعری کے یہی قیود
و ضوابط ہیں۔ کیا صاحب' تو خلاف محاورہ کوئی کلمہ نہ بندھے' اضافت و عطف وغیرہ میں نون غنہ کا اظہار نہ ہو' ایطاء ناجائز' شتر
گربہ معیوب' اشعار معینہ بحر اور مقررہ اوزان کے اندر ہوں۔ لاحول ولاقوۃ۔ شاعری کیا ہوئی ایک مستقل مصیبت ہوگئی' آپ
لیں گے شعر گفتن چہ ضرور۔ واہ جناب! جب مشاعرہ میں داد لینے کو جی چاہے اور رسالوں میں چھپنے کا شوق ہو تو آپ ہی بتلائیے
(اس کے لئے شعر گوئی کے علاوہ اور کون سی صورت ہے' انہیں بکھیڑوں سے بچنے کے لئے میں نے اپٹوڈیٹ شاعری شروع کر دی اور
دریں کیا ہر نئی روشنی کا آزاد خیال شاعر آجکل اپٹوڈیٹ شاعری کا وہ ہنگامہ مچائے ہوئے ہے کہ قدیم شاعری کی صدا اب
نقار خانہ میں طوطی کی آواز سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی' اس مختصر تمہید کے بعد جی چاہتا ہے کہ اپنی اپٹوڈیٹ شاعری کی کچھ "بانگی"
آپ کی خدمت میں پیش کروں اگر آپ بھی میری طرح جدت پسند مذاق رکھتے ہوں گے تو امید ہے کہ مجھے کلمۂ خیر سے یاد کریں گے ورنہ
خدانخواستہ آپ کہیں جامد خیال کے آدمی واقع ہوئے تو چشم پوشی فرما کر اپنی بزرگانہ شفقت کا ثبوت دیں گے جیسا کہ کسی نے کہا ہے ع
خطائے بزرگان گرفتن خطا ست ——— پہلے چند مختلف اشعار ملاحظہ ہوں۔

۱۔ سایہ کا دامن تھا او نچا دل میں حسرت رہ گئی — صرف ٹانگوں سے لپٹ کر خاک تربت رہ گئی
۲۔ سانولی صورت پہ پوڈر ہے کہیں یہ دھل نہ جائے — رخ سے جاری ہے پسینہ مس کی قلعی کھل نہ جائے
۳۔ عاشق ہوں ایک نرس کے حسن و جمال کا — کہتے ہیں سب مریض مجھے ہسپتال کا

۴ احباب سے بھی لیجا کے ملا ہیں خود ہی ہانکیں موٹر بھی ڈیوٹی کیا ہے کچھ مت پوچھو شوہر بھی ہیں شوفر بھی
۵ کورٹ شپ کے بعد پہلو گرم ہوگا یا نہیں یہ پر وبشنر کبھی کنفرم ہوگا یا نہیں

مناظر قدرت

"دیہات کی صبح"

دلکش عجیب ہے وقت سحر گاؤں کا سماں جانا مویشیوں کا چراگہ رواں دواں
وہ بکریوں کا قافلہ بھیڑوں کا کارواں بھینسوں کی وہ قطاریں وہ بیلوں کی ٹولیاں
کچھ لڑکے ساتھ ان کے چرانے کے واسطے
کچھ بچیاں ہیں گوبر اٹھانے کے واسطے

گوبر کی بھینی بھینی سی خوشبو کی وہ لپک کوڑے کا ڈھیر، گڈھے کے پانی کی وہ مہک
ہوتے ہی صبح نکلا ہر اک گھر سے بے دھڑک وہ سلسلہ کسانوں کا بستی سے کھیت تک
رخ ہے کسی گرہست کا کھلیان کی طرف
لوٹا لیے چلا کوئی میدان کی طرف

ارہر کے کھیت میں کوئی بیٹھا جھکا کے سر جھاڑی میں جا چھپا کوئی تنہائی دیکھ کر
بے جھجک کوئی بیٹھ گیا جا کے آل پر بیڑی ہے منھ میں اور نگاہیں ادھر ادھر
ان میں کسی کو شرم نہ غیرت سے کام ہے
ہر اک کو اپنے رفع ضرورت سے کام ہے

کھول وہ ساہوجی نے بھی ٹٹی دکان کی لوٹیا اٹھا کے جلدی سے میدان کی راہ لی
اک میلی دھوتی وہ بھی کھلی کچھ بندھی ہوئی ہے دید فی وہ ننگے بدن کی بھی فربہی
یادش کو حلقہ بنا کر وہ گھیرنا
وہ بار بار توند پہ اک ہاتھ پھیرنا

نیچرل نظم
(مینڈک)

اے بے قرار مینڈک اے دل فگار مینڈک

پھیلائے ہاتھ پاؤں کیوں سطحِ آب پر ہے
گویا ہے لاش بے جان دنیا سے بے خبر ہے

کیوں جسم مردہ تیرا بہتا ادھر ادھر ہے
ہے تاک میں وہ بگلا انجام کی خبر ہے؟

خطرہ میں آہ تیری ہے جان زار مینڈک
اے بے قرار مینڈک اے دلفگار مینڈک

جب شب کو گونجتا ہے نغمہ ترا ہوا میں
پڑ جاتی ہے اک ہلچل مرغانِ خوش نوا میں

موسیقیت بھی لرزاں ہو جاتی ہے فضا میں
کیا جانے کیا اثر ہے ظالم تری صدا میں

یہ نالہ تیرا ہوتا ہے دل کے پار مینڈک
اے بے قرار مینڈک اے دلفگار مینڈک

شب کے سکوت میں وہ ٹرٹر تری صدائیں
لیتی ہے خوش نوائی سر کی ترے بلائیں

اس دلخراش نغمہ کو تیرے سن جو پائیں
کوئل پپیہا کوکو پی پی کو بھول جائیں

تو ہار مونیم ہے یا ہے ستار مینڈک
اے بے قرار مینڈک اے دلفگار مینڈک

اپٹوڈیٹ سراپا

نیم بریدہ سر میں بال
شلجم جیسے پھیکے گال

بلی سی وہ کرنجی آنکھیں
فتنہ ہیں وہ فرنجی آنکھیں

کرتی ہے ابرو کی قینچی
قطع و برید جامۂ ہستی

انجکشن کی سوئی ہے مژگاں
بہر علاج دردِ ہجراں

ناک ہے اک پستول دونالی
گولی اور بارود سے خالی

دانت دہن میں چھپاں ایسے
بھٹے کے ہوں دانے جیسے

دبلی پتلی اونچی گردن اونٹ کی جیسی لانبی گردن
سینہ پر اس کمسن مس کے بول ہیں دو گویا ٹینس کے

مذکورہ بالا اشعار ایڈوڈیٹ شاعری کے وہ نمونے ہیں جو پرانی شاعری کے مضامین خیالات وتشبیہات کی تقلید سے تو آزاد ہیں مگر پھر بھی عروض وقافیہ کی بیڑی پاؤں میں پڑی ہے اس کے بعد اب ان اشعار کو بھی آپ گوش زد فرمائیں جو ان قیود وضوابط کی سطح سے بھی بلند ہیں:۔

نظم معرّا

ہم نے تجھے دیکھا ہے — جاتے ہوئے تھیٹر ہیں اور نیز سینما میں — جاتے ہو شب کو اکثر
غیروں کو ساتھ لے کر — یوں سیر کو نہ نکلو سن لو یہ صاف ہم سے — اک روز ہوگا دھوکا
تم مانو یا نہ مانو — ہے اختیار باقی افسوس پھر کروگے — پچھتاؤگے بہت ہی
ضد اس طرح سے کرنا — اچھا نہیں ہے دیکھو کچھ رحم بھی کرو تم — تنہائی پر ہماری

نظم مبرّا

ہے مجھے عشق کی بیماری

کوئی کرتا نہیں غمخواری دلجوئی و دلداری نہیں دنیا میں وفاداری کس درجہ ہے لاچاری
ہے وقت عزاداری
ہے مجھے عشق کی بیماری

اب جان سے بیزار ہوں میں عاجز و لاچار ہوں ہر سو ذلیل وخوار ہوں مفلس ہوں اور نادار ہوں
مدت سے ہے بیکاری
ہے مجھے عشق کی بیماری

ہوں میں اک فرقت زدہ حیرت زدہ آفت زدہ [illegible] زدہ حسرت زدہ ذلت زدہ غربت زدہ
اب کرنہ دل آہ [illegible]ی
ہے مجھے عشق کی بیماری

بیمار لاچار　　زار نزار　　اشکبار سوگوار　　شرمسار دلفگار

ہر دم ہے بے قراری
ہے مجھے عشق کی بیماری

ممکن ہے اشعار موصوف کو سن کر آپ یہ اعتراض کر بیٹھیں کہ کسی میں وزن ہے تو قافیہ ردیف ندارد اور کسی میں قافیہ ہے تو سر کا بحر وزن غائب۔ تو جناب وہ زمانہ لد گیا جب اشعار کے لئے بحر در اوزان لازمی تھے اور ہر شعر کے دونوں مصرعوں میں رتی بھر کا بھی فرق ادبی جرم سمجھا جاتا تھا اب تو آپ کی دعا سے ایک مصرعہ اگر وزن میں پورا اترا اور دوسرے مصرع میں چھٹانک دو چھٹانک کیا پاؤ آدھ سیر کی کمی ہو گئی بلکہ پہلے مصرع کے مقابلہ میں دوسرے مصرع ½ سے لے کر ¼ تک بھی ہے تو پورا شعر مکمل۔ اور دونوں مصرعے ایک بحر میں ہونے کی بجائے شعر مجمع البحرین ہو گیا۔ تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ باقی رہی قافیہ ردیف کی قید تو آپ ابھی مختلف البحر اور مستغنی القافیہ اشعار ہی کو رو رہے ہیں اور یہاں اس ادبی ارتقا کے زمانہ میں شاعری اتنی بلندی پر پہنچ گئی کہ سرے سے بحر اور اوزان ہی سے مستغنی ہو گئی۔ عروض و قافیہ وغیرہ کی آلودگیوں سے پاک و صاف اشعار کو —— نظم منثور کہتے ہیں اور یہ الٹرا ماڈرن شاعری کی اعلیٰ قسم ہے۔ ملاحظہ ہو:—

۱۔ محبت کے اتھاہ سمندر میں آنکھ بند کر کے
۲۔ میں کود پڑا چھپاک سے
۳۔ موجوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا
۴۔ گرداب نے اپنا آغوش پھیلا دیا
۵۔ حبابوں نے آنکھیں بچھا دیں
۶۔ آہ مجھے چاہیے تھا اس وقت
۷۔ سمندر کی گہرائی میں میٹھی نیند سو جاتا۔ مگر افسوس
۸۔ موجوں کے جھولا جھولانے اور ہواؤں کی لوریاں دینے کے باوجود
۹۔ گرداب کے گہوارے میں
۱۰۔ ابدی نیند سو جانے کے عوض
۱۱۔ لگا بچوں کی طرح ہاتھ پاؤں مارنے
۱۲۔ اس سعی لاحاصل کا حشر وہی ہوا جو ہونا تھا۔
۱۳۔ گھس گیا پانی حلق میں ضرورت سے زیادہ اور
۱۴۔ بن گیا پیٹ اک پھولا ہوا مشک اور
۱۵۔ پھٹ گیا بھڑام سے اور
۱۶۔ تیرنے لگی لاش بغیر ہاتھ پاؤں چلائے
۱۷۔ اس کے تیسرے دن
۱۸۔ دور اک مقام پر
۱۹۔ ساحل کے کنارے
۲۰۔ چیلوں اور گدھوں کی ایک جماعت
۲۱۔ اک لاش کے گرد
۲۲۔ سوم چہارم کی فاتحہ خوانی میں مصروف تھی

یوں ادبی تقلید کے تعصب میں اس مجتہدانہ شاعری پر ناک بھاؤں چڑھانا اور بات ہے لیکن اپٹوڈیٹ شاعری جس تیزی کے ساتھ بلندی پر جا رہی ہے اس کو دیکھتے ہوئے قدامت پرست شعرا کو ہزار ہزار شکر بجالانا چاہیے کہ جدید شاعری میں کم سے کم ابھی تک موضوع الفاظ اور با معنے جملے تو استعمال ہو رہے ہیں ورنہ شاعری کا تخیل تو اب الفاظ اور معنے کا بھی شرمندۂ احسان نہیں رہنا چاہتا۔ بہت کم لوگوں کو شاید یہ معلوم ہو کہ الفاظ کی قید و بند سے آزاد ہو کر شعریت اب دنیا بھر کی چیزوں میں حلول کر گئی ہے۔ بقول بھائی شمسی ۔ شام کا دلفریب منظر بھی ایک رنگین شعر ہے ۔ صبح کا روح پرور سماں بھی قدرت کی شاعری ہے۔ بلبل کا نغمہ، غنچہ کا تبسم، پھولوں کی خوشبو یہ سب بجائے خود شعر ہیں ۔ گویا مناظر فطرت کو قدرتی اشعار کا اچھا خاصہ مجموعہ یا دیوان کہنا چاہیے۔ ایک روز بھائی شمسی پر جو شعریت کا دورہ ہوا تو ایک حسین دوشیزہ کو سامنے جاتے ہوئے دیکھ کر مجھ سے فرمانے لگے کہ دیکھو اس کی چال ڈھال صورت شکل ناز و ادا میں کیسی لطیف شعریت ہے قدرت کا یہ شعر اس لائق ہے کہ اسے دل میں جگہ دی جائے ۔ میں نے کہا بھائی صاحب! زیادہ سے زیادہ اسے آپ ایک مصرعہ کہہ سکتے ہیں ۔ جب تک کوئی اور دوسرا مصرعہ اس کے ساتھ چسپاں نہ ہو شعر کہہ دینا آپ کی زبردستی ہے ۔ بگڑ کر کہنے لگے کہ یہ مذاق تمہاری بد مذاقی کی صاف دلیل ہے ۔ میں نے چھیڑنے کے لئے ہنس کر کہا کہ یوں پسند ہو جانے پر ایک مصرعہ کو بڑھا کر شعر کیا غزل بلکہ دیوان یا اس سے بھی بڑھ کر کلیات ہی کوئی کہہ دے تو کون منہ بند کرے گا۔ لیکن ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اسے دو مصرعے ملائے بغیر جو ایک دوسرے سے وابستہ ہوں شعریت پیدا ہو نہیں سکتی ۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا کہنا اصل یہ ہے کہ شاعری زبان اور الفاظ سے مستغنی ہے ۔ جو حسن آنکھوں میں کھب جائے جو نغمہ کانوں کو بھلا معلوم ہو، جو خوشبو مشام جاں کو معطر کر دے بجائے خود ایک مستقل شعر ہے تو اب یہ کہنے کی بجائے کہ کیا خوب آپ نے شعر کہا ہے یوں داد بھی دی جا سکتی ہے کہ ماشاء اللہ کیا شعر آپ نے سونگھا ہے۔ کس قدر بلیغ شعر آپ نے دیکھا ہے ۔ اس پرکیف نغمہ میں جس میں شعریت کوٹ کوٹ کر بھری ہے اس کی فی البدیہہ سماعت قابل داد ہے ۔ جدید شاعری کی اس غیر محدود وسعت کو دیکھتے ہوئے جس میں دنیا بھر کی چیزیں سما جائیں کوئی سمجھدار آدمی ہوگا کہ اپٹوڈیٹ شاعری کو چھوڑ کر قدیم شاعری کی تہ میں اپنے آپ کو پھنسائے گا ۔ اول تو الفاظ و زبان کی یہ شاعری محتاج ہی نہیں دوسرے اگر کسی کو آنکھ کان ناک سے شعر کہنے کے عوض زبان ہی سے شعر گوئی کا شوق ہوا تو قواعد و ضوابط، وزن و عروض وغیرہ سے آزاد ہونے کے باعث شعر میں غور و فکر کی ضرورت ہی نہیں ۔ بے سوچے سمجھے بلکہ بلا ارادہ بھی کوئی جملہ سرزد ہو جائے تو سمجھئے کہ ایک اپٹوڈیٹ شعر تصنیف ہو گیا۔ سمجھے آپ اپٹوڈیٹ شاعری کس کو کہتے ہیں ؟

مانپوری

"درسِ حُرّیت"

یوں اہلِ فرانس ہوں نہ مغرور — جب شاہِ نپولین ہے مشہور
لی تھی کہ اسکی تیغ خونبار — پیکانِ قضا کہ نوکِ سو فار؟
ل اسکا بہادری کا پیکر — عزم اسکا ہمالیہ کا ہمسر
رپ کو ہلا دیا تھا اس نے — وہ زہر پلا دیا تھا اس نے
نسان کا خون تھا جو ارزاں — تھے خوف سے شیر زمیں لرزاں
لوا رہ اسکی قہر و خونخوار — ممکن نہیں جس سے تاب زنہار
موں کا یہ گھونٹتا گلا تھا — ہر ملک کو لوٹتا چلا تھا
پین کی اسکے تھی جو باری — کی فوج نے مشق گولہ باری
ں ملک کے لوگ بہنے والے — بیچارے غریب بھولے بھالے
ن کو جو ہوا یہ حال معلوم — "قدرت اب لٹنے کو ہے مقسوم"
ہا نیکو ہے دورِ خرمی اب — آتا ہے غمِ محرّمی اب
ٹنے کو ہے عہدِ شاد کامی — ملنے کو ہے لعنت غلامی
ھنے کو ہے خیرباد اقبال — ہونیکو ہے اوجِ ملک پامال
طرے میں ہے حریت کی جان اب — جھکنے کو ہے قوم کا نشان اب
زادیٔ ملک جانیکو ہے — بلبل تہِ دام آنے کو ہے

سنکر ہوئی ساری قوم دلگیر — سوچی یہ مدافعت کی تدبیر
رنکی نہیں ہے تاب ہم میں — دشمن کا نہیں جواب ہم میں
چھا ہے کسی کی بندگی سے — ہم ہاتھ اٹھائیں زندگی سے

سب مال و متاع کو چھپا کر — بھاگے شہروں کو یہ جلا کر
مٹی میں تو مال و زر کو گاڑا — ہر کھیت کو باغ کو اجاڑا
کھلیان میں آگ خود لگا دی — جو چیز تھی کھانے کی جلا دی
غلّے کا نہ چھوڑا ایک دانہ — تھا برق کا خرمن آشیانہ
ترسا کریں دودھ کو بدیشی — جنگل کو ہنکا دئے مویشی
ویران ہوئی ہر ایک بستی — ارزاں ہوئی جنس فاقہ مستی
اُگلے لہو پانی پینے والا — ہر ایک کنوئیں میں زہر ڈالا
کچھ رہ گئے بوڑھے لنگڑے لولے — تھے ضعف سے جنکے پاؤں پھولے

اک گاؤں میں تھا بڑا کلیسا — مسجودِ جبینِ قوم عیسیٰ
موجود یہاں برائے مہماں — ہر طرح کے عافیت کے ساماں
آرام کا اہتمام سب کچھ — کھانے کا بھی انتظام سب کچھ
بریانی مرغ پک رہی تھی — خوشبو سے فضا مہک رہی تھی
بسکٹ کلچے پراٹھے اور کیک — شامی وہ بندے ایک سے ایک
زردے کی مطبّق اک طرف قاب — پوڈین کہیں کہیں مٹن چاپ
سیخوں میں کباب مرغ و ماہی — نعمیں جس سے فرشتے بھی چاہی
ہر قسم کے حلوے اور مٹھائی — الماریوں میں بھی سجائی
شیشوں میں شراب ارغوانی — سوڈے کا وہ بوتلوں میں پانی
خدمت کے لئے کئی خواتین — لطف انکا شعار خلق آئین

سرگرم تھیں اپنے کام میں سب   مخمور تھیں ایک جام میں سب

جسوقت کہ پہونچا لشکر اسپین   حیراں ہوا یہ دیکھ کر عجب سین
ویرانہ ہر ایک شہر دیکھا   آنکھوں نے نزولِ قہر دیکھا
اجڑی ہوئی بستیاں جلے گھر   منزل بھی زمین کے برابر
سنسان پڑا ہر ایک بازار   بے جنس و قماش و بے خریدار
کھانے کا نشاں کہیں نہ پانی   آفت میں پڑی تھی زندگانی
اب جوش کہاں وہ ولولوں میں   خاک اڑتے جو دیکھی ہوٹلوں میں
گھوڑوں کو کہاں سے ملتا چارا   نذر آگ کی ہو چکا تھا سارا
شہروں سے گئے جو سوئے دیہات   ہاتھ آیا وہاں بھی کچھ نہ ہیہات
دیکھی برباد ساری بستی   تھی سامنے شہروں ہی کی پستی
جس قریہ میں جاتے تھے سپاہی   کرتی تھی سلام انہیں تباہی
تھے گاؤں کے گاؤں غیر آباد   آدم نہ کہیں نہ آدمی زاد

اس گاؤں میں لشکر آخر آیا   آباد جہاں تھا وہ کلیسا
پہونچے جو کلیسے میں کچھ افسر   پایا الٹے اک بہشت منظر
جان آگئی انکے جسم و تن میں   ویرانے سے پہونچے انجمن میں
ہر طرح کا اہتمام دیکھا   آرام کا انتظام دیکھا
خاتونیں کئی قریب آئیں   خوشیاں بہت آنے کی منائیں
بولے وہ "کہ لاؤ پہلے کھانا   مہمانوں کو چاہئے کھلانا"
"یہ بولیں پیاس ابھی بجھاؤ   کچھ لطف شراب کا اٹھاؤ"
کانٹے تھے پڑے ہو پیاس سے زبانیں   جان آگئی سن کے انکی جاں میں
شیشے میں شراب لائیں بھر کر   زہراب فنا تھا جس کے اندر

پھر انکی طرف بڑھا دیا جام   وہ جام کہ موت کا تھا پیغام
آثار جو دیکھے کچھ جبیں سے   پہلے کہ شروع ہو نہیں سے
پینے لگیں عورتیں غٹاغٹ   خالی کئے شیشے جام جھٹ پٹ
پیتے ہی یہ گر پڑیں زمیں پر   دم بھر میں نے جان دی یہیں پر

مرجھا گئی افسروں کی صورت   ہوش اڑ گئے دیکھ کر یہ حالت
اک قہر تھا یہ مہیب منظر   کانپا تھا دلِ امیر لشکر
جاتی رہی بھوک پیاس انکی   ٹوٹی تھی ہر ایک آس انکی
دل سیر ہوا جو خوف کھا کر   کھانے کو نہ دیکھا آنکھ اٹھا کر
کچھ کھایا پیا نہ ڈر کے مارے   تھے خوف و خطر سے جان ہارے

اتنے میں نپولین بھی آیا   بھوکا پیاسا تھکا تھکایا
تھی پیاس بہت تو مانگا پانی   کرنل نے سنا دی سب کہانی
فق ہو گیا سنکر اسکا چہرا   کچھ غور کے بعد آپ بولا
جس ملک کی عورتیں ہوں ایسی   ممکن نہیں اسکو لیں بدیسی
بیکار ہے قصدِ جنگ و پیکار   ہے انکی غلامی امرِ دشوار
بس کوچ کرے یہاں سے لشکر   اب تو ہے یہی صلاح بہتر

جینے کا مزا ہے حریت میں   مے کا ہے فروغ کیفیت میں
حق بات تو یہ کہ سن لو اے یاس   ذلت کا ہمیں نہیں کچھ احساس
کہتے ہیں سگ اسکو آدمی زاد
جس نے نہ کیا وطن کو آزاد

یاس بہاری

SPECIAL PRESS, CAL

ہماری[ل] قدیم قومی و وطنی تہذیب

مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی

مسلمان کہتے ہیں، کہ ان کی قوم وہی ہے، جن کا دین اسلام ہے۔ ہندو کہتے ہیں، کہ ان کی قوم میں بھی وہی داخل ہو سکتے ہیں، جن کا کسی نہ کسی وجہ سے نام ہندو پڑگیا ہے۔

لیکن قرآن نے نوحؑ کی قوم ان کو کیوں ٹھہرایا جو حضرت نوح سے عقائد و اعمال، خیالات و مسلمات میں قطعی اختلاف رکھتے تھے، اس نے عاد والوں کو کہا، کہ وہ ہود (علیہ السلام) کی قوم تھی، اور ہود ان عادیوں کا بھائی تھا، لیکن قومیت و اخوت کے اس رشتہ میں کیا دھرم اور دین کا کوئی ادنیٰ رشتہ بھی شریک ہے؟ اور نوح و ہود ہی کیا، صالح کی قوم ثمود، شعیب کی قوم مدین والے ایکہ والے ٹھہرائے گئے، کون نہیں جانتا، کہ ان میں کوئی بھی ان پیغمبروں سے دینی وحدت کا رابطہ نہ رکھتا تھا، یہی نہیں بلکہ لوط علیہ السلام جن کا آبائی وطن مسوپوٹیمیا (دوآبہ دجلہ و فرات) میں تھا، سدوم اور عمورہ کے باشندوں کے متعلق قرآن نے نہیں کہا؟

ولوطا اذ قال لقومہ — اور لوط نے جب اپنی قوم سے کہا۔

حالانکہ ان مغضوب شہروں کے رہنے والے حضرت لوط سے نہ نسلی اتحاد رکھتے تھے اور نہ وطنی، اور یقیناً لوط کی مادری زبان وہ نہ تھی جو فلسطین کی ان بستیوں میں بولی جاتی تھی، اور دین تو ظاہر ہے کہ ان کا لوط علیہ السلام کے دین سے بالکل جدا تھا، وہ موحد تھے اور ان کی قوم مشرک تھی، ان کے عادات و اخلاق، اعمال و عبادات سب ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم کے نتائج تھے، جن سے عمورہ اور سدوم والوں کو قطعاً کوئی لگاؤ نہ تھا۔ بہرحال قومی وحدت کے لئے قرآن سے قطعاً یہ معلوم ہوتا ہے، کہ نہ وطنی وحدت کی ضرورت ہے اور نہ نسلی اتحاد کی، نہ زبان کی یکسانی پر یہ مبنی ہے اور نہ دین اور دھرم کی موافقت پر قومیت کی بنیاد کھڑی کی جاتی ہے۔

پھر قرآن نے کس بنیاد پر ان جماعتوں اور امتوں کو ان مختلف پیغمبروں کی قوم قرار دیا؟ اس کے سوا اور کیا تھا، کہ جو پیغمبر

[ل] تشکر و امتنان کے ساتھ میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ اس مضمون میں سنسکرت کے جن قدیم وثیقوں سے فائدہ اٹھایا گیا ہے وہ بالکلیہ پروفیسر معین الدین ام۔اے (فاضل ... استاذ ولسن کالج کے ترجموں سے ماخوذ ہیں، اور اسی لئے ترجمہ کی صحت و عدم صحت کے ذمہ دار بھی وہی ہیں ۱۲

انسانوں کی جس جماعت کی اصلاح واحیاء کے لئے کھڑا کیا جاتا تھا، وہی لوگ اس کی قوم قرار دیے جاتے تھے۔

اب اگر اسی بنیاد پر ہندوستان کے مسلمان ہندوستان کے ان تمام باشندوں کو جن کی ہدایت وارشاد ان کا دینی فریضہ ہے اور جن کو اندھیرے سے روشنی میں لانے کے لیے مسلمانوں کی ایک جماعت گنگا اور جمنا کے دوآبہ، کرشنا اور گوداوری کی وادیوں میں آباد کی گئی، ان کے اسلاف بھی غرض سے اس ملک میں آئے (اگر مسلمان ان ساری جماعتوں کو دینی قوم قرار دیں، تو قرآن کی اصطلاح سے کیا اسی کی توثیق نہیں ہوتی، یقیناً اس بنیاد پر ہندی مسلمانوں کی قوم ہندوستان کی قدیم قبائل ڈراوڑی، کول اور بھیل بھی ہیں آریہ اور اچھوت بھی ہیں، کایستھ اور برہمن بھی ہیں، کہ ان ہی لوگوں کے لئے ان ہی کی اصلاح و درستی کے لئے اس ملک میں وہ آئے اور ہندوستان میں قیام کیا۔ یقیناً اسی اصلاح کی بنا پر چینی مسلمانوں کی قوم چین ہی کے وہ باشندے ہیں، جن کی طرف چین کے مسلمان مبعوث

در قسطنطنیہ و تھیریس بلقان، البانیہ، ہرزی گوینا و بوسنیا کے مسلمانوں کی قوم یورپ کے وہ باشندے ہیں، جو ان ملکوں میں ان کے ساتھ آئے ہیں۔ قازان و سرسئے باغچہ کے مسلمانوں کی قوم روس کے وہ باشندے ہیں جن کے درمیان مسلمانوں کی یہ جماعت آباد ہوگئی ہے۔ مصری مسلمانوں کی قوم الازہرمیوں کی رہنے والی ہے، جو ارد گرد ممالک میں رہتے ہیں اور جن کو اسلام کی دعوت دینا ان کا قرآنی فریضہ ہے۔

الغرض قوم کے لفظ کو قرآن نے جس مفہوم میں استعمال کیا ہے، ہم کبھی غلطی نہیں کریں گے، اگر اس قرآنی اصطلاح کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان کے ہندوؤں، بودھوں، جینیوں اور اچھوتوں کو ہم اپنی قوم قرار دیں، اور اسی تبلیغی علاقہ کی وجہ سے اگر ہندی مسلمان ہندوؤں کے بھائی، اور ہندو ان کے بھائی سمجھے جائیں، تو قرآن سے بجز اس دعوی کے اور کس دعوی کی توثیق ہو سکتی ہے؟ عجیب بات ہوگی کہ نوح کالڈیا کے مشرکین کے بھائی ہوں، ہود حضرموت یمن کے اصنامیوں کے بھائی ہوں، صالح پیٹرا اور رقیم شمال عرب کے بت پرستوں، ڈاکوؤں کے بھائی ہوں، لوط سدوم و عمورہ کے بدکاروں کے بھائی ہوں اور حد تو یہ ہے، عرب کے کفار اور ایسے کفار جن کا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب اور جھٹلانے کے سوا کچھ اور نہ تھا، لیکن ان ہی مکذبین اور جھٹلانے والوں کو قرآن کہتا جاتا ہے،

وکذب بہ قومک   اور جھٹلایا اس کو تیری قوم نے

پھر ہم کیوں تو کہا جائے گا اگر ہم ہندوستان کے ہندوؤں کو بھی اپنا بھائی اور اپنی قوم کے نام سے موسوم کرتے ہیں، قرآن نے انسانوں کے جس گروہ کو جن جن پیغمبروں کی قوم قرار دیا ہے، کیا اپنے پیغمبروں کے ساتھ ان کی قوم کا سلوک اس سے بھی کہیں زیادہ ناخوشگوار نہ تھا، جتنا کہ آج ہماری قوم ہنود ہم سے روا رکھتی ہے، محض برے سلوک، برے تعلقات کی وجہ سے قرآن نے ان قوموں کو جب ان پیغمبروں کی قوم سے باہر نہ کیا، اور اخوت کے رشتہ کو نہ توڑا تو کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ ان ہی اسباب و وجوہ کو محسوس کر کر کے ہم اپنی قوم ہنود کو اپنی قومیت اور اخوت کے دائرہ سے باہر کریں یقیناً جب تک ہر مسلمان کی ناصیہ ایمانی پر

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون باللہ

تم ایک بہترین جماعت ہو، جو تمام انسانوں کو نفع پہنچانے کے لئے (عدم سے وجود کی طرف) نکالے گئے ہو تاکہ لوگوں کو نیکی کا حکم دو اور بری باتوں سے روکو اور اللہ پر ایمان لاؤ۔

یہ قرآنی فریضہ قدرت کی طرف سے کندہ ہے، اس وقت تک ہر ملک کے مسلمان کی قوم وہی لوگ رہیں گے جو ان سے دین میں، مذہب میں، دھرم میں، عمل میں، اخلاق میں، خون میں، نسل میں، زبان میں، خواہ جس قدر بھی اختلاف رکھتے ہوں لیکن ہم جب تک ان کی طرف مبعوث ہیں وہ ہماری قوم رہیں گے، اور قیامت تک، اب اس عہدہ کو ہم سے کوئی چھین نہیں سکتا، کہ ختم نبوت کے بعد آئندہ ارشاد و دعوت کے سلسلہ کو جاری رکھنے کے لئے قرآن نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے کہ انفرادی نبوتوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا، لیکن اجتماعی نبوت ایک خاص رنگ میں امت محمدیہ کے اندر قیامت تک جاری کر دی گئی ہے، اور اس امت کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے جس ملک میں جائے، جس علاقہ میں جائے، وہاں کے باشندوں کو اپنا مخاطب بنا کر ان کو اپنی قوم بنائے، خود ان کا بھائی بن جائے اور ان کو اپنا بھائی بنائے خواہ یہ لوگ اس کو اپنی قوم میں داخل کریں یا نہ کریں ان کو اپنا بھائی بنائیں یا نہ بنائیں،

اور اسی قرآنی اصطلاح کی بنیاد پر مضمون کے عنوان میں

"ہماری قدیم قومی و وطنی تہذیب"

سے میری مراد قدیم ہندوستان کی تہذیب ہے، اسی کے متعلق چند سرسری باتیں لکھنا چاہتا ہوں،

کسی ملک کی معاشرت، اس کی تہذیب، اگر اجنبی اور بیرونی اثرات سے جدا رہے گی تو ممکن ہے، کہ ایک مدت تک اپنی زندگی کو وہ دراز کر سکے۔ لیکن جس ملک میں آئے دن شمالی دروں سے مختلف اقوام اور امتیں آآ کر بس رہی ہوں، اور پھر خود اس ملک میں مختلف خیالات، مختلف زمانوں میں پیدا ہو رہے ہوں، قدیم ویدک دھرم پر کبھی یوگ دھرم کبھی جین دھرم کبھی بودھ دھرم کے حملے ہو رہے ہوں، ہزار ہا سال میں ان اجنبی اختلاطوں کی بدولت ہم موجودہ حال میں پہنچ گئے، تو اس میں کیا تعجب ہے تہذیب کا یہ انقلاب ہزار ہا سال کی مختلف تاثیرات کا نتیجہ ہے، ہم دیکھتے ہیں، کہ اس ملک میں ابھی مغربی تمدن کو داخل ہوئے سو سوا سو برس سے زیادہ زمانہ نہیں گذرا ہے، لیکن کئی ایسی باتیں جن پر ہماری قومی شرافت اور سعادت کی تعمیر کھڑی تھی، بتدریج اس طرح منہدم ہو رہی ہے کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ان قوانین سے ہمیں دور کا بھی تعلق نہ تھا۔

آج ملک کے اعلیٰ گھرانوں کی استریاں کالجوں میں داخل ہو رہی ہیں، ڈگریاں وصول کر رہی ہیں، کھلے منہ کانفرنسوں، مجلسوں میں تقریریں کر رہی ہیں، صرف اپنے وطن میں نہیں بلکہ اجنبی ملکوں اور قوموں میں جا جا کر بے محابا اجنبی اقوام کے مردوں سے مل جل رہی ہیں، کیا واقعی ہمارے ملک کی حقیقی تہذیب کے یہی اجزا تھے،

والمیکی سے زیادہ ہماری قومی تہذیب کا صحیح ترجمان اور کون ہو سکتا ہے رامائن میں لکھتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے:۔
لنکا فتح کر کے جب رام مہاراج آرام سے دربار میں رونق افروز ہوئے اور ہر طرف تماشائیوں کا ہجوم تھا تب انہوں نے راجہ وبھیشن کو حکم دیا کہ جاؤ سیتا کو نہلا دھلا کر لاؤ' راجہ سیتا کو پالکی میں سوار کرا کے لایا' اور مہاراجہ کو اطلاع دی حکم ملا کہ ہمارے سامنے پیش کرو' راجہ وبھیشن نے تعمیل کی اور ارد گرد کے لوگوں کو ہٹا دینے کا حکم دیا کہ پردہ ہو جائے اور سیتا حضور میں آئے' لوگوں کے ہٹنے میں شور و غل ہوا' مہاراجہ نے نظر اٹھا کر دیکھا اور کہا کہ ہمارے حکم کے بغیر لوگوں کو کیوں ہٹایا جاتا ہے۔
اس کے بعد بحیثیت عالم وید و شاستر ہونے کے رام چندر جی حسب ذیل مذہبی فتویٰ صادر کرتے ہیں:۔

سنو! غم کے موقعوں پر مجبوریوں میں' لڑائیوں میں' سویمور کے وقت' اور قربانیوں میں
اور بیاہوں میں عورت کا سامنے آجانا اور مرد کی نگاہ اس پر پڑجانا گناہ نہیں'
یہ سیتا بھی مصیبت زدہ مجبوریوں میں گرفتار ہے' اس کے سامنے آنے میں کوئی حرج نہیں
خاص کر جبکہ میں موجود ہوں (رامائن یدھ کانڈم سرگ ۱۱۴ - صہ ۹۴۲)

کیا اس سے صاف طور پر نہیں معلوم ہوتا' کہ بجز استثنائی موقعوں کے ہماری قدیم معاشرت کا یہ اہم جز تھا' کہ عورتوں کی سوسائٹی مردوں سے بالکل جدا رہی' اسی واقعہ کے تکملہ میں جو الفاظ والمیکی نے لکھے ہیں' ان سے معلوم ہوتا ہے' کہ قدیم ہند و شرفا کی عورتیں کس درجہ حیا پرور' شرمیلی اور پردہ کی عادی تھیں لکھتے ہیں:۔

" جب راجہ وبھیشن سیتا رانی کو پالکی سے اتار کر رام مہاراج کی حضور میں
لے چلے' تو سیتا رانی بے پردگی کی شرم سے دوہری ہوئی جاتی تھیں۔ گویا اپنے
آپ کو اپنے ہی بدن کے اندر چھپاتی تھیں" (یدھ کانڈم سرگ ۱۱۴)

کس قدر عجیب بات ہے' کہ بن باس ہونے کے وقت لکشمن سیتا جی کے ساتھ ساتھ رہے' لیکن ان کا خود اپنا بیان یہ ہے:۔
" میں نے سیتا جی کے صرف پاؤں دیکھے خود سیتا کو نہیں دیکھا"
اف! جس تہذیب کی اصولی کتاب منو کی شاستر میں یہ تک تصریح ہو " احساس انسان کو مغلوب کر لیتا ہے' لکھے پڑھے آدمی بھی پھسل پڑتے ہیں' اس لئے ماں بہن یا بیٹی کے ساتھ بھی تنہائی میں نہ بیٹھے"۔ (ادھیا ۲ صہ ۹۳)
لیکن آج ہماری قوم کی شریف بہو بیٹیاں ریل کے ڈبوں' جہازوں کے تختوں پر بیٹھ بیٹھ کر یورپ اور امریکہ کے ہوٹلوں کی سیر کرتی ہیں اور کوئی نہیں پوچھتا کہ کیا ان کی قدیم تہذیب بھی اس کی اجازت دیتا ہے' حد یہ تھی کہ شریف گھرانوں کی عورتوں کے لئے سخت بے حیائی کی

بات بھی جاتی تھی، اگر وہ اپنے شوہر کا نام بھی زبان پر لائے۔ نل ودمن کے مشہور قصہ میں یہ عجیب فقرہ درج ہے،

راجہ نل نے جوئے میں سلطنت ہاردی، اور رانی دمینتی سمیت جنگلوں کی راہ لی، اور آخر مایوس ہو کر دمینتی کو سوتی چھوڑ کر بھاگ نکلا، یہ وفادار بیوی تنہائی و افلاس کی مصیبتوں میں مبتلا صبر و استقلال سے میکے جا پہنچی اور وہاں بھی راجہ نل کو یاد کرتی اور نالہ و زاری کرتی اس کی ماں نے اپنے خاوند سے شکایت کی کہ

تمہاری بیٹی دمینتی تو بے حیا ہو گئی اور اپنی زبان سے خاوند کا تذکرہ کرتی ہے

(شلوک ۳۴ مہابھارت دن پردہ ادھیا ۶۹ صفحہ ۶)

رام چندر جی نے اپنے بھائی لکشمن کو پیغام لیکر سگریوہ راجہ کے پاس بھیجا، لکشمن محل میں داخل ہوئے، لیکن سوگریو مارے ڈر کے خود باہر نہ نکلا، اور اپنی رانی کو لکشمن سے بات کرنے کے لئے بھیجدیا، لکشمن نے عورت کو دیکھ کر منہ پھیر لیا، اور گردن نیچی کرلی۔

(رامائن کشکا نڈم سرگ ۳۳)

اسی رامائن کشکانڈم میں ہے

جب رام مہاراج جلاوطنی کو جانے لگے اور رانی سیتا ان کے ساتھ پیدل محل سے نکلیں تو لوگوں نے شور مچایا کہ

کیا برا وقت ہے کہ وہ سیتا رانی جن کو کبھی آسمانی دیوتا نے بھی نہ دیکھ پائے تھے آج ہم بازاری لوگ ان کو دیکھ رہے ہیں (رامائن یودھیا کانڈم سرگ ۳۳ صفحہ ۱۹۷)

پانڈوں کے عہد میں عورتوں کا ان کی عفت اور عصمت کا کیا اقتدار تھا، مہابھارت میں ہے کہ جب یودھشٹر جوئے میں اپنا سب کچھ حتی کہ اپنی بیوی کو بھی ہار گیا اور دریودھن نے ان کی بیوی دروپدی کو بر سر دربار بلوایا، اس وقت دروپدی کی جو تقریر ہوئی، اس سے ملک میں عورتوں کی بلند رتبہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اے بزرگو! راجاؤں نے مجھے سویمور کے موقعہ پر دیکھا تھا، اس سے پہلے مجھے کسی نے نہیں دیکھا تھا ہوا اور سورج بھی مجھے نہ دیکھ پاتے تھے آج بدقسمتی سے مجھے غیر مردوں کے سامنے آنا پڑا اور اب بھی لوگ مجھے دیکھتے ہیں اس سے بڑھ کر اور کیا ذلت ہوگی کہ مجھ جیسی پاکدامن عورت کو مجمع میں آنا پڑا، ہزار افسوس کہ راجہ ازلی دھرم کو کھو بیٹھے، ہم تو سنتے آئے ہیں کہ قدیم شرفا بھی منکوحہ بیوی کو مجمع میں نہ لیجاتے تھے افسوس کہ کورو خاندان سے دھرم جاتا رہا (شلوک ۴-۵-۰-۹ مہابھارت سبھا پردہ ادھیایہ ۶۹ صفحہ ۶۱)

لیکن اس غریب درَوپدی کو کیا معلوم کہ کسی زمانہ میں اسی کی قوم اور اسی کے ملک میں عورتوں کی عزت ہی یہ ہوگی کہ وہ بے تحاشا اجنبی مردوں کے سامنے جائیں، منکوحہ اور غیر منکوحہ ہر قسم کی عورتوں کو اس کی عام اجازت مل جائے گی، اور اس کے بعد بھی دھرم باقی رہے گا۔

آج اس ملک کا جو حال ہے سب کے سامنے ہے، لیکن ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ عام اجنبی مرد تو خیر، اپنے پیرو مرشد، گرو اور اتالیق کے سامنے بھی جوان بیویاں نہیں جاتی تھیں، ان کو اگر کچھ کہنا ہوتا تھا، تو کسی محرم کے ذریعہ سے کہلواتی تھیں،

جلا وطنی کے وقت جب رام چندر جی بن باس ہونے کے لئے چلے تو اپنے گرو کو بلایا، اور بہت کچھ دان دیا، رانی سیتا نے بھی اپنے زیوران کی نذر کرنا چاہا، مگر اپنی زبان سے نہ کہا

رام سے کہلوایا کہ سیتا فلاں فلاں زیور تمہاری بیوی کی نذر کرتی ہے۔

(شلوک ۱۷۔ رامائن۔ ایودھیا کانڈم سرگ ۲۲)

قدیم ہندوستان میں عورتوں کے چہرہ پر نقاب کا ہونا، ان کی شرافت کی علامت تھی، ہرش چرتیم کے فاضل مورخ بان اپنی کتاب میں ایک موقعہ پر ایک تشبیہی فقرہ میں لکھتے ہیں

جیسے شریف اور خاندانی عورتوں کے منہ پر نقاب کی جالی۔

(ہرش اچھواس ۳)

پریچھکیکا اگرچہ ناٹک کی کتاب ہے۔ لیکن اس عہد کی معاشرت کا اندازہ تو اس سے بھی ہو سکتا ہے۔ چوتھے انک میں ایک عورت کو مخاطب کرتے ہوئے مبارکباد دی گئی،

"نقاب سے تجھے غیر معمولی عزت حاصل ہوئی پہلے تو کھلے منھ والی بازاری کیسی تھی"

شکنتلا کو راجہ دوشمنتہ نے جب پہلی دفعہ دیکھا تو کہا،

آہ! یہ تو کوئی نقاب پوش، تمام بدن کو برقعہ سے لپیٹے ہوئے لڑکی سی دکھائی دیتی ہے، جس کے جسم کی خوبصورتی ذرا بھی دکھائی نہیں دیتی ان فقیروں کے گھر میں وہ تو ایسی دکھائی دیتی ہے جیسے سوکھے پتوں میں لپٹی ہوئی نئی کونپل (شلوک ۱۳ اسکنتلا انک)

سری کرشن جی کے مشہور ماموں راجہ کنس نے متھرا میں کشتی کا جو دنگل قائم کیا تھا جس میں ملک کے تمام پہلوانوں اور لڑنتوں کو مدعو کیا گیا تھا، اس دنگل میں عورتوں کے لئے بھی تماشہ دیکھنے کا نظم کیا گیا تھا لیکن کیا مردوں کے ساتھ عورتوں کو ایک ہی گیلری میں بٹھایا گیا تھا۔ ہری ونش پران کے وشنو پرو شلوک ۱۲ ادھیا ۱۹ میں کتنے شاعرانہ لفظوں میں اس کی تصویر کھینچی گئی ہے۔

عورتوں کی نشست کے لئے جو مکان بنائے گئے تھے وہ بلندی میں اڑتے ہوئے راج ہنس جیسے
دکھائی دیتے تھے' جن میں باریک جالی تماشہ دیکھنے کے لئے لگائی گئی تھی"

ملک کے قدیم بزرگوں کو معاشرتی انقلاب کے اس طوفان کا اپنے مکاشفات' یا پیش بینیوں کے ذریعہ سے جب علم ہوا' تو
خصوصیت کے ساتھ ناموس ہندکی اس بے پردہ دری کا انہوں نے دردناک لہجوں میں تذکرہ کیا' برہما پران میں ہے :-

کل جگ میں عورتیں ایسی بگڑ جائیں گی کہ کھلم کھلا بے پردہ دونوں ہاتھوں سے سر کے بال بنائیں اور سنواریں گی
خاوند اور شوہروں کی ممانعت کی کچھ پرواہ اور ان کا لحاظ نہ کریں گی" (شلوک ۳۹ - ادھیا ۲۲)

خصوصیت کے ساتھ سر کے بالوں کا بناؤ سنگار' اور خاوند گھر کے بڑوں کا بھی خیال نہ کرنا' اس عہد کی کتنی سچی تصویر ہے' جس میں ہندوستان
کی عورت اپنی قیمت' اپنی عظمت و منزلت کھو چکی ہے' یا کھو رہی ہے -

الغرض پہلے ملک کی تہذیب و شائستگی وہ کیوں تھی' اور موجودہ حالت نہ کن موثرات کے تحت پہنچی' اس وقت میرا موضوع
بحث یہ نہیں ہے . وقت نے مساعدت کی تو انشاء اللہ ان اسباب و علل پر ایک مبسوط مضمون پیش کیا جائے گا . اس وقت تو صرف
اپنے وطن کی قدیم تہذیب کا ایک سرسری خاکہ کھینچنا چاہتا تھا' لیکن افسوس ہے کہ چند ہی باتوں میں مضمون کافی طویل ہو گیا . صرف
پیش کردہ مواد سے بھی ملک کی قدیم تعمیری' لباسی' سواری' طریق نشست و برخواست' بڑے چھوٹوں کے تعلقات' عورتوں
اور مردوں کی باہم اختیاری روابط' اور ازیں قبیل بکثرت ایسی چیزوں پر روشنی پڑ سکتی ہے' لیکن استخراج نتائج اور ان پر
کرنے میں وقت اور کاغذ کا ایک کافی حصہ ضائع ہو جائے گا' اس لئے محض اشارات پر اکتفا کرتے ہوئے . اب ہم اپنی وطنی تہذیب
کے اندرونی رُخ کے چند نمایاں خط و خال کو سامنے لانا چاہتے ہیں -

اندرونی رُخ

اندرونی رُخ سے میری مراد' ملک کے وہ عام جذبات و خیالات' ذہنی تموجات' عقائد و مسلمات پر ہیں جن پر اعمال و
افعال کی بنیاد قائم تھی -

"ستیہ اور کرت جگ (خیر القرون) میں ہر کوئی اپنا اپنا فرض کرتا تھا
.... صرف برہما (خالق عالم) ہی یوگیوں (عارفوں)
کا ماوی و ملجا تھا' سب کی جان برہما تھا . . سب ایک دیوتا کو مانتے تھے
اور سب ایک طرح کی پوجا کیا کرتے تھے"

پانڈوں کے بھائیوں میں بھیم سین مشہور ہندی سورما اور پہلوان گذرے ہیں' پہاڑوں میں گشت کرتے ہوئے' ان کی گذر ایک
درویش اور عارف ہنومان نامی کی کٹیا کی طرف ہوئی' بھیم سین نے اس عارف سے ملک کی ذہنی اور عقلی احساسات کی تاریخ کے متعلق

کچھ سوالات کئے تھے، جن کے جواب میں درویش مذکور نے ایک مبسوط و مفصل تقریر کی، اور ہندوستان کے مختلف قرون یا طبقات میں جو مختلف ذہنی، دماغی، جذباتی انقلابات ہوئے، ان کا تفصیل سے ذکر کیا، اسی تقریر کے چند فقرے وہ ہیں جو اوپر نقل کئے گئے اس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ ہمارے وطن کے قدیم اسلاف عالم کے خالق ہی کو ایک مانتے تھے، جیسا کہ ملک کے اکثر حصہ کا فکری مرکز اب تک یہی عقیدہ ہے بلکہ آج جس ہندوستان میں خالق کے سوا مخلوق کے ہر طبقہ میں معبودوں اور دیوتاؤں کا ایک گروہ نظر آتا ہے ملائکہ سے لے کر عناصر تک وجود کے ہر دائرہ میں کسی نہ کسی مخلوق کی پوجا کی عبادت کی جاتی ہے ملائکہ، جن، شیاطین، حیوانات، نباتات، عناصر، علویات، وسفلیات ہر ایک میں ہندوستان کا کوئی نہ کوئی معبود ضرور نظر آتا ہے، اسی ملک کے ارباب فکر و بصیرت پر ایک دور وہ بھی گذرا ہے، کہ خالق کے سوا کسی مخلوق سے ان کا دعائی یا عبادتی تعلق قطعاً نہ تھا۔ باشندوں کا اعلیٰ ادنی ہر فرد اسی کی پوجا کرتا تھا، اسی سے مدد مانگتا تھا، اور اس پر لطف یہ ہے، کہ عبادت کے اشکال اور طریقوں میں بھی کسی قسم کا کوئی اختلاف نہ تھا، سب ایک ہی کو مانتے تھے۔ ایک ہی کو پوجتے تھے، اور ایک ہی طرح پوجتے تھے، حق تعالیٰ کے پوجنے یا اس کے احترامات کے اظہار کے طریقے کیا کیا تھے، ست جگ ہی میں نہیں بلکہ ایک مدت تک ان کی نوعیت جو کچھ تھی اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے، کہ سری رام چندر جی کی عام تلقین یہی تھی،

یگیہ (اضحیہ[1] یا قربانی) دان (زکوۃ وصدقات) تپہ (نماز ودعا، ومراقبہ) اور وید (خدا کی کتاب)

یہ سب ست (صداقت) پر مبنی ہیں، اسی لئے انسان کو ست پر قائم رہنا چاہئے۔

(مہابھارت ایودھیا کانڈم سرگ ۱۹ - شلوک ۱۳-۱۴)

سری کرشن جی ملک کو ہمیشہ عبادت کی ان ہی صورتوں پر ابھارا کرتے تھے،

یگیہ (اضحیہ یا قربانی) دان (زکوۃ وصدقات) تپہ (نماز ودعا، ومراقبہ) یہ تینوں نیکیاں مسلسل کرنی چاہئے، کیونکہ یہ انسان کے گناہوں کو دھوتی ہیں اور دل کو روشنی بخشتی ہیں"

(شلوک بھیشمہ - پروہ گیتا - ادھیا ۱۸ صفحہ ۶)

اس وقت جب ہندی توحید میں تثلیث کا رنگ بھرنے لگا، اور ایک ہی خدا کے تین صفات یعنی پیدا کرنے والا، باقی رکھنے والا، فنا کرنے والا، کو سامنے رکھ کر ایک کو تین کر کے اس کا نام برہما (پیدا کرنے والا) وشنو (باقی رکھنے والا) شیو (فنا کرنیوالا)

---

[1] یگیہ کا سنسکرت تلفظ یدنیہ بھی ہے، جس کو ف کی جگہ دال پڑھا جاتا ہے، اسی کا ہم شکل لفظ عربی میں اضحیہ ہے، جس کے معنی بھی قربانی کے ہیں، عربی میں ضاد کا تلفظ بھی دال کے قریب قریب ہے، اسی لحاظ سے یگیہ اور اضحیہ میں معناً وشکلاً مناسبت تھے۔

رکھا گیا۔ تو اس وقت بھی علاوہ صلوٰۃ و زکوٰۃ قربانی کے ملک میں روزہ کا بھی زور باقی تھا، جیسا بھارت میں ہے،

"کاتک کے مہینہ کی بارہویں تاریخ کو وشنو کی پوجا میں روزہ کا ثواب اتنا ہے جتنا گائے کی قربانی کا"

(شلوک ۱۴- انوپردہ ادھیا ۱۰۹ صفحہ ۱۲۱)

"اشون (آسن) کے مہینہ کی بارہویں تاریخ کو جو وشنو کی پوجا میں روزہ رکھے اس کو ہزار گایوں کی قربانی کا ثواب ملتا ہے" (شلوک ۱۳- ادھیا ۱۰۹)

"یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عام روزوں کے سوا ایک روزہ ایسا بھی تھا جس میں دن کے ساتھ رات کو بھی فاقہ کرایا جاتا تھا، جیسا بھارت میں ہے:"

"جو کوئی جیٹھ کے مہینہ کی بارہویں تاریخ رات دن روزہ رکھے، اور وشنو کی نذر کرے اس کو گائے کی قربانی کا ثواب ملتا ہے اور بہشتی حوروں کے ساتھ مزہ اڑاتا ہے" (شلوک ۹- ادھیا ۱۰۹)

الغرض ملک کے قدیم باشندوں کی ایمانی فکر و معرفت کا تعلق صرف خالق کائنات کے ساتھ تھا، وہ اسی کی عبادت کرتے تھے، اسی کی نمازیں پڑھتے، اسی کا دھیان جاتے اسی کے نام پر زکوٰۃ و خیرات و قربانی دیتے، اسی کے لئے روزہ رکھتے تھے صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم سب کا رواج تھا، یہی چیزیں ان کے ذہنی خیالات و جذبات کی ترجمانی کرتی تھیں،

حج اور ہند قدیم

"قدیم زمانہ میں برہما نے ہاٹکیشور تیرتھ میں قربانی کا اہتمام بڑے دھوم دھام سے کیا" (سکندپران ناگر کھنڈ ادھیا ۱۰۶ صفحہ ۲۰۰)

اور ہاٹکیشور کی حقیقت کیا تھی اسی سکندپران ناگر کھنڈ ۶ کے ادھیا ۱۰۲ صفحہ ۱۰۹ میں ہے،

جب رام دیمان پر سوار ہو کر اجودھیا جا رہے تھے تو آسمان میں جاتے جاتے وہ دفعتاً ٹھہر گیا، اور سب حیران رہ گئے، فضا آسمانی میں دیمان کو اترتے ہوئے دیکھ کر رام نے متعجب ہو کر ہنومان سے کہا جاؤ! زمین پر دیکھو کیا ہوا جس سے دیمان چلتا چلتا رک گیا، یہ تو خدا کی قدرت کا بنایا ہوا دیمان کبھی رکتا نہیں جاتا رام کا حکم سن کر ہنومان فوراً زمین پر جا پہنچے اور واپس آکر یہ خبر دی کہ یہاں نیچے زمین پر ہاٹکیشور کا مندر ہے اور یہاں خالق خود موجود ہے، اور سب دیوتا (ملائکہ) و صلحا یہاں حاضر ہیں، اس وجہ سے اس متبرک مقام کی پوجا بغیر دیمان آگے بڑھنا نہیں چاہتا"

سکندپران کے ان دونوں فقروں کو سامنے رکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ہاٹکیشور قدیم ہندوستان کی تیرتھ (حج وزیارت) کا مقام تھا اور اس مقام کے متعلق یہ عقیدہ تھا کہ یہاں خود خالق تعالیٰ کا براہ راست جلوہ ہے۔ یعنی بیت اللہ ہے۔ گویا وہ اللہ کا

گھر ہے" برہما نے یہاں دھوم دھام سے قربانی کی" سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ برہما کون ہیں؟ ہندی ادبیات میں اس لفظ کا اطلاق کبھی خود خدا اور خالق عالم پر کیا جاتا ہے، اور کبھی اس کا اطلاق ایک ایسے شخص پر ہوتا ہے، جس کے متعلق عام عقیدہ تھا کہ وید اسی کے منہ سے نکلے، کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ واقعہ کیا ہے، لیکن علماء اسلام خصوصاً عبدالکریم جیلی کا یہ بیان اگر صحیح ہے، کہ برہما در اصل لفظ ابراہیم کا ہندی تلفظ ہے، اور برہمن در اصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کے ماننے والوں کا قدیم نام ہے، تو واقعات کچھ عجیب شکل میں رونما ہوتے ہیں: ہاکیشور کا بیت اللہ ہونا، برہما کا یا ابراہیم کا وہاں قربانی کرنا، اور قدیم ہندوستانی کے تیرتھ یا حج کا اسی کو مرجع قرار دینا، کیا اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ہندوستان کے پرانے باشندوں کے حج اور تیرتھ کا مقام وہی جگہ تھی جسے آجکل کے مسلمان کعبہ یا بیت اللہ کہتے ہیں؟ اور حضرت ابراہیم ہی کو اس کا بانی، اور اس کے آگے قربانی کرنے کی رسم کا موجد کہتے ہیں۔ واللہ عالم بالصواب۔ بات بہت طویل ہو جائے گی، ورنہ ہندوستان کے برہما اور توراۃ کے ابراہام یا ابرام اور قرآن کے ابراہیم کی وحدت پر ایک دلچسپ بحث ہو سکتی ہے۔ موقعہ ہوا تو کسی مستقل مضمون میں اس کی تفصیل کی جائے گی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مہابھارت میں برہمنوں کے متعلق جو فقرہ مذکور ہے کہ

"اصل کشتری سرخ و سفید رنگ کے تھے اور برہمن سفید رنگ کے اور بنئے زرد رنگ کے"

اس سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مذہبی پیشوا یعنی برہمن نسلاً چھتریوں اور دیشوں سے بالکل جدا تھے اور یہ لوگ ہندوستان میں وہاں سے نہیں آئے، جہاں سے سرخ و سفید رنگ والے آریہ آئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اصلی وطن بابل اور کالڈیا سے قدیم ہندوستان کے کتنے گہرے تعلقات تھے، جب تک کہ تاریخ کے سارے واقعات سامنے نہ ہوں آسانی کے ساتھ آدمی کسی صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتا، بہر حال مجھے صرف اشارہ کرنا تھا، اور اس کے لئے بالفعل صرف اتنی بات کافی ہو سکتی ہے۔

خیر یہ تو قدیم ہندوستان کے اندرونی رخ کا وہ پہلو تھا جس کے زیر اثر وہ دنیاوی زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن اس زندگی کے بعد آیا وہ کسی دوسری زندگی کا تصور بھی اپنے اندر رکھتے تھے، اگر رکھتے تھے تو اس کی نوعیت کیا تھی، مضمون ختم کرتے ہوئے چند جملے میں آخر میں اس کے متعلق بھی کہنا ہے۔

"رگ وید - یجر وید اور سام وید سے بہشت کے شہد کے حوض، گھی کے حوض، دودھ کے حوض حاصل ہوئے ہیں۔" (اشلوک ۴۲ - بھاگوت پران، ادھیا ۱۳)

"جو کوئی جیٹھ کے مہینہ کی بارہویں تاریخ رات دن روزہ رکھے اور وشنو کی نذر کرے اس کو گائے کی قربانی کا ثواب ملتا ہے اور بہشتی حوروں کے ساتھ مزہ اڑاتا ہے" (اشلوک ۹ - ادھیا ۱۰۹، مہابھارت)

"جو کوئی ویدوں کی جڑ کاٹے اس سے بڑھ کر کوئی گنہگار نہیں وہ اندھیرے دوزخ میں ڈوب مرتا ہے"

اسکند پران رہا کھنڈ - شلوک ۱۱ - صفحہ ۱۶)

بطور نمونہ کے صرف ان تین فقروں پر قناعت کی جاتی ہے ورنہ ہندی ادبیات اخروی زندگی کے اس نقشہ سے جس میں نیکوں کے لئے بہشت اور پاپیوں کے لئے جہنم اور دوزخ کی دھمکی دی گئی ہو بھری پڑی ہوئی ہیں۔ قدیم ہندوستان میں جنت پر بھی ایمان تھا اور دوزخ پر بھی۔ جنت میں یہاں بھی حوروں کا وجود مانا جاتا تھا اور دودھ، شہد کی نہریں بھی اس میں تسلیم کی جاتی تھیں۔ کس قدر تعجب ہے کہ ہندوستان کے قدیم مذہب کے ان عناصر کو جاننے سمجھنے کے بعد بھی سوامی دیانند نے بڑی دلیری سے قرآن کی جنت کا مضحکہ اڑایا ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ صداقت صرف ایک ہی چیز ہے۔ سچائی کا جو بھی مبلغ ہوگا، خواہ وہ ہندوستان میں پیدا کیا جائے یا عرب میں، وہ چین سے اٹھے یا یونان سے اگر اس کی تبلیغ کی بنیاد مشاہدات، تجربات، مکاشفات یا الٰہی تعلیمات پر ہوگی تو وہ وہی کہے گا جو دوسرے دیکھنے والوں، مشاہدہ کرنے والوں نے کہا۔ البتہ جو غیب کے متعلق صرف لحاف میں منہ ڈال کر محض اٹکل اور تخمینوں سے باتیں کرتے ہیں ان کے بیانات میں جس قدر بھی اختلافات ہوں "ہونا چاہئے"۔ چاہیں وہ آدمی کو مرنے کے بعد خدا بنا دیں یا انسانی احساسات سے معرا کر کے فرشتوں کے مانند بھوک پیاس اور ہر قسم کے لذائذ و احساسات سے محروم ہستی قرار دیں۔ بدی کے بدلہ میں آدمی کو گھوڑا، ہاتھی، مکھی کی شکل عطا کریں۔ لیکن سچوں نے ہمیشہ آدمی کو آدمی قرار دیا اور پچھلی زندگی کو انسانیت کی اگلی زندگی کا تکملہ ٹھہرایا۔ یہی ہونا بھی چاہئے اور دیکھنے والوں نے یہی دیکھا، یہی سمجھایا - والسلام -

---

ترانۂ وحشی

از نتھونی لال وحشی جیلی

ہستی گر تلخ حقیقت کوئی پیمانے میں
آج تک ہوش کسی کو نہیں میخانے میں

نیچی نظروں کے تبسم میں ہے اک راز لطیف
سو اشارات ہیں اک آپ کے شرمانے میں

عالم عشق کی دنیا ہی نئی ہے کہ یہاں
جو تڑپنے میں ہے لذت وہی تڑپانے میں

تیری آنکھوں میں ہے اس طرح سے کیفیت غم
جیسے آتی ہو گھٹا جھوم کے میخانے میں

چند اشجار مغیلاں تو صد آشوب بہار
عقل سودا زدگاں گم ہوئی ویرانے میں

چاہئے گمرہیٔ شوق کو منزل کا فریب
ورنہ کعبہ میں خدا ہے نہ ہے بتخانے میں

مئے رنگین میں ہے کن آنکھوں کی مستی وحشی
لوگ بے ہوش ہوئے جاتے ہیں میخانے میں

(ازجناب عرشی عظیمی صاحب۔ بلوا گنج دربھنگہ)

"میں بہت عرصے سے کہہ رہا ہوں اور آپ ٹال رہی ہیں۔ آج بغیر سنے چھوڑوں گا نہیں۔ میں تہیہ کر چکا ہوں۔" میں نے صوفہ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"قریشی صاحب! داستانیں سننے کا شوق ہے تو تعجب ہے کیسی؟ کہئے تو دلچسپ ترین داستانیں سنا دوں۔ مگر یہ شرط ذرا مشکل ہے"

نجمہ نے زمین پر نظریں جمائے ہوئے کہا

"اس سے فائدہ؟ میں مان تو سکتا نہیں۔"

"خیر تو سنئے! مگر خفا نہ ہوجئے گا' یہ افسانہ مرد کی تصویر کا تاریک رخ ہے۔"

اس نے کہنا شروع کیا:۔

"مجھے اپنے ماں باپ یاد نہیں۔

ہمیشہ سے —— جب سے مجھے ہوش ہوا میں نے اپنے کو یتیم پایا۔ ماں باپ کیا ہوتے ہیں اسکا مجھے کوئی تجربہ نہیں۔ ہاں دوسروں کو دیکھا کرتی کہ ماں باپ کی بدولت ناز و نعم کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لاڈ پیار سے گذر رہی ہے۔ کوئی خواہش نہیں جو پوری نہ کی جاتی ہو۔ کوئی تمنا نہیں جو کسی طرف سے بھی ٹھکرادی جاتی ہو۔

میں نے ابھی تک صرف ایک تمنا کی تھی —— اللہ سے —— جو بندوں کو ماں باپ سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے "کاش! میرے بھی ماں باپ ہوتے" مگر اس دربار میں بھی میری تمنا محتاج توجہ ہی رہی۔ شاید اسی لئے کہ میں یتیم تھی۔

"زندگی کی پندرہ منزلیں میں طے کر چکی تھی۔ سولہویں کا آغاز تھا۔ میں نے یہ سارا زمانہ اپنے ماموں کے یہاں گزارا تھا۔ میرے ماموں بلند شہر کے رئیس تھے۔ مردوں کا جہاں یہ عالم ہے کہ بیوی کے مرتے ہی اپنی اولاد کی محبت جاتی رہی' وہاں میں تو پھر بہن ہی کی لڑکی تھی۔ بہن کے مرنے پر جو قدر ہوگی ظاہر ہے۔

ہندوستان کے مسلمان گھرانے کی عورتوں کا بہترین مشغلہ آپ جانتے ہیں کیا ہے؟ بس یہی کہ جب دو چار اکٹھی ہو بیٹھینگی خاندان کے ہر ہر فرد کے متعلق تنقیدیں شروع ہو جائیں گی۔ اگر مرد ہے اور روپیہ والا ہے تو اس کے کردار کی پاکیزگی' اسکا اعلیٰ تعلیمیافتہ

ہونا ذہین ہونا، وغیرہ خوبیوں پر نظر ڈالی جائے گی۔ بدقسمتی سے کچھ عجیب واقع ہوا ہے تو انہیں کے مقابل اس کے عیوب گنائے جائیں گے۔ اسی طرح خاندان کی تمام عورتوں کے متعلق رائیں دی جائیں گی۔ کسی کی تعلیم، سلیقہ، کفایت شعاری اور ہنرمندی بتلائی جائے گی۔ تو کسی کی انہیں صفات کو آزادی پھوہڑپنا اور بدتمیزی سے یاد کیا جائے گا اور پھر جب یہ سب ہو جائے گا تو شادی بیاہ کے قصے چھیڑے جائیں گے۔ پرانے گڑے ہوئے مردے اکھیڑے جائیں گے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں بھی ان بیچاریوں کا کوئی قصور نہیں۔ انسان تو اپنے ماحول کا بندہ ہوتا ہے وہ جن لوگوں کے ساتھ رہتا ہے، انکو جس طرح کرتے ہوئے دیکھتا ہے اسی طرح کرنے لگتا ہے۔ پھر عورتیں جنھیں تعلیم تو دی نہیں جاتی پھر تو وہ دنیا کے کسی بڑے 'اہم' اور مفید مسئلہ کی طرف منعطف ہو تو کیونکر۔ لازماً ذہن کی جودت انہیں غیر اہم اور بغیر مفید بلکہ مضر کاموں میں صرف ہوتی ہے۔

بالکل یہی حالت، بلند شہر کے اس رئیس گھرانے کی تھی۔ خاندان کی عورتیں جب کبھی جمع ہو جاتیں تو گفتگو کا اہم ترین موضوع 'میں' ہوتی۔ ماموں کی لڑکی کے مقابلے میں میرے عیوب گنائے جاتے۔ پھوہڑ، نکمی اور آزاد وغیرہ قسم کے اوصاف سے متصف کیا جاتا۔

پہلو میں دل ہے تو ذرا میری اُسوقت کی کیفیت کا اندازہ کیجئے۔

دنیا اندھیر ہو جایا کرتی۔ کاش کہ زمین پھٹتی اور اس میں، میں سما جاتی۔ یا آسمان گر پڑتا اور مجھے اپنے دامن میں چھپا لیتا۔

لیکن میں تو دنیا میں پیدا ہی اس لئے کی گئی تھی کہ مصیبتیں جھیلوں۔ نہ معلوم کس گناہ کی پاداش میں؟ حقیقت یہ ہے کہ مجھ پر دنیا شروع ہی سے اب تک ایک عذابِ الیم اور مصیبتِ عظمیٰ بنکر چھائی رہی ہے۔ ایک دن کے لئے بھی دنیا، دنیا والوں اور دنیا کے خدا نے میرے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ محسوس نہ ہوا اور محسوس ہونے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی کہ میں بھی ان ہی انسانوں میں سے ہوں جو ہنسی خوشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

یہ تھا وہ نقشہ، روزمرہ کی زندگی کا جس میں میں نے پندرہ برس کی عمر تک زندگی بسر کی۔ آپ سمجھ سکتے ہیں، پندرہ برس کی عمر میں ہندوستانی لڑکی اچھی خاصی جوان ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد واقعات نے خفیف سی کروٹ لی جس کی بدولت میری زندگی میں اہم ترین تغیرات رونما ہو گئے اور میرے تخیلات کی دنیا، صرف خواب ہو کر رہ گئی۔"

کچھ دیر کے لئے وہ رکی۔ پھر کہنا شروع کیا۔

"میرے ماموں کا ایک ہی لڑکا تھا ———— نصیر۔ مجھ سے پانچ برس بڑے، اگر میرے دل نے ابھی تک کسی مرد کو چاہا ہے تو وہ نصیر تھے۔ لیکن اب؟ ... ———— میں مردوں سے سخت نفرت رکھتی ہوں۔ پھر بھی میری روح کی گہرائیوں میں نصیر کے لئے ایک جذبہ، جس کے اظہار اور تشریح کے لئے الفاظ نہیں ملتے، موجود ہے۔

نصیر سات ہی برس کی عمر میں علی گڈھ بھیج دئے گئے تھے، گھر چھٹیوں میں بھی بہت کم آیا کرتے۔ اکثر دوستوں کے ساتھ مختلف مقامات کی سیر کو چلے جایا کرتے یا علی گڈھ ہی میں رہتے۔ کبھی کبھی گرمی کی چھٹیاں گھر پر بھی گذاری تھیں

بیس برس کی عمر میں انھوں نے بی۔ اے کر لیا، اور گھر آ گئے۔

ہمارے درمیان ابھی تک گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ بچپن کی باتیں مجھے یاد نہیں۔

بھی کبھی نظریں ملتیں مگر فوراً جھک بھی گئی تھیں۔ ظاہرا دونوں بے تعلقی برتتے تھے مگر میں اپنے متعلق تو کہہ سکتی ہوں کہ انہیں چاہنے لگی تھی شدت سے۔

نصیر کے آنے کا یہ پہلا روز تھا۔ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، کہ چکے تو میں پانی دینے چلی۔ نہ معلوم کیوں جسم میں تھرتھری سی پیدا ہو گئی۔ انھوں نے پانی کے لئے ہاتھ بڑھایا، گلاس چھوٹ کر اُن کے کپڑوں کو بھگوتا ہوا فرش زمین پر گر پڑا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ نظریں ملیں اور پھر جھک گئیں۔ بس کچھ جھل سی ہو گئی۔

عاصمہ، نصیر کی بہن نے دوسرے گلاس میں پانی دیا۔ اور یہ قصہ رفع دفع ہو گیا۔ رات کے بارہ بجے نیند نہ آنے کی وجہ سے میں بےچینی سے کروٹیں بدل رہی تھی، کسی نے قریب سے پکارا "نجمہ!" اور میں چونک کے اٹھ بیٹھی۔

سرہانے نصیر خاموش کھڑے تھے۔

میں نے گردن جھکائے آہستہ سے کہا "آپ اسوقت یہاں کیوں آئے؟"

وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس دئے۔

میں نے پھر کہا "ذرا خیال کیجئے! کوئی یہیں یوں دیکھ لے تو کیا کہے گا۔ آپ کے لئے تو خیر کچھ نہیں مگر میری رہی سہی دنیا اور بھی تاریک ہو جائے گی۔

وہ بولے "نجمہ ...."

جملہ ابھی غیر مکمل تھا۔ دالان میں کسی کے پیروں کی چاپ سنائی دی اور وہ دبے پاؤں کمرے سے نکل گئے۔

اس رات مجھے مطلق نیند نہیں آئی۔

دوسرے روز کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔

رات کے وقت نہ معلوم کیوں، میں نے قصداً دروازہ بند نہیں کیا۔ صرف بھیڑ کر چھوڑ دیا، کمبل اوڑھ کر لیٹ رہی اور کچھ دیر بعد سو گئی۔

خبر نہیں کتنے بجے میں نے اپنی پیشانی پر گرم گرم سانس محسوس کی جس نے مجھے بیدار کر دیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اور نصیر

میرے سر کو زانو پر لئے بیٹھے تھے۔ مجھے غصہ آگیا ——— یہ میری توہین تھی ——— تمام "عورت ذات" کی شدت غم و رنج سے میرے منہ سے الفاظ نکل سکے اور میں رونے لگی۔

نصیر بولے "ہائیں! نجمہ! ذرا سنبھلو"

میں بمشکل یہ کہہ سکی "نصیر میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتی تھی ------ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس کے بعد نصیر کی کچھ ہمت نہ پڑی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھکر چلے گئے۔

اب ہم لوگ ایک دوسرے سے اور علیحدہ رہنے لگے۔ سامنے آتے ہوئے بھی جھجکتے۔ کھانے کے وقت درد سر کا بہانہ کرکے میں کمرے میں لیٹ رہی۔ سامنے آنے کے دوسرے مواقع بھی میں اس طرح ٹال گئی۔ انھوں نے بھی اندر آنا بہت کم کردیا۔

چوتھے روز مجھے پھر پیروں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ کسی نے میرا شانہ چھوا۔ میں متوحش سی ہوگئی اور اٹھکر بیٹھ گئی میں نے آج بھی دروازہ بند نہیں کیا تھا۔

"نجمہ! تم اسقدر مجھ سے کیوں ڈرتی ہو؟ میں کھا نہیں جاؤنگا" نصیر نے ذرا بے تکلفی سے کہا۔

"خود نہیں کھائیے گا تو کھلوا دیجئے گا" میں نے نیچی نظروں سے کہا۔

"کیا مطلب؟" اس نے مطلب سمجھتے ہوئے بناوٹی انداز میں کہا۔

"تشریح غیر ضروری ہے" میں نے آہستہ سے کہدیا۔

تھوڑی دیر تک وہ خاموش بیٹھے رہے۔ پھر اٹھکر چلے گئے۔

اسی طرح وہ روز آیا کرتے اور ادھر ادھر کی باتیں کرکے چلے جایا کرتے۔ اب میں بھی انکی منتظر رہنے لگی۔

حقیقت یہ ہے کہ تنہائی اور بے رفیقانہ زندگی سے میں عاجز ہوچکی تھی۔ عاصمہ بھی مجھ سے علیحدہ رہتی تھی یا علیحدہ رکھی جاتی تھی میری دنیا تھی تو گھر کا باورچی خانہ یا ایک کمرہ۔ اب جو مجھے ایک "رفیق ملا" تو زندگی قدرے دلچسپ معلوم ہونے لگی۔ وہ ایک گھنٹہ کی صحبت اگرچہ خاموش سہی، میرے لئے اپنے اندر انتہائی دلچسپی رکھتی تھی۔ نصیر آتے یا تو خاموش رہتے یا ادھر ادھر کی گفتگو کیا کرتے اب ہم ایک دوسرے سے کافی بے تکلف ہوچکے تھے۔

اسی طرح وہ روز آتے رہے۔ میں صرف خوشباشی کی زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی اور خیال نہ تھا۔ لیکن مرد و عورت کی تنہائی کی ملاقاتیں اب میرا تجربہ ہے کبھی خطرہ سے خالی نہیں۔ خاص کر اسوقت جبکہ مرد ہوس پرست ہو۔ عورت میں اپنے کو بچانے کی قابلیت نہیں ہوتی۔ کسی نے سچ کہا ہے "عورت تیرا نام ہی کمزوری ہے" لیکن میں اسوقت بالکل مجبور تھی جس ماحول میں میری زندگی گذری تھی اس کے لحاظ سے وہ بالکل فطری تھا۔

خیر اسی طرح گذرا کی۔ کچھ عرصہ بعد معاملہ میرے قابو سے باہر ہو گیا اور نتیجہ وہی ہوا جس کی ان حالات میں توقع کیجا سکتی تھی
کچھ عرصہ بعد نصیر کہیں چلے گئے۔ جانے کے روز رات کے وقت وہ میرے پاس آئے اور بے شمار انکار کے باوجود ۱۰۰ سو
روپیہ کا نوٹ میرے پلنگ پر چھوڑ گئے۔

چھ ماہ کا عرصہ گذر گیا۔ نصیر برابر گھر سے باہر رہے۔ بہن کے پاس اُن کے خطوط اکثر آیا کرتے' لیکن میرے متعلق کچھ اشارہ بھی نہ ہوتا۔ اب مجھے خطرہ کا شدید احساس ہوا۔ ایک ماہ تک تو میں اُن کے انتظار میں رہی' اس امید میں کہ شاید وہ اس گناہ کی پاداش بھگتنے کے لئے' جس میں ہم دونوں برابر کے شریک تھے۔ مجھے تنہا نہ چھوڑیں گے۔ لیکن اس طویل مدت کے گذرنے کے بعد بھی جب ان کے آنے کی کوئی امید نہ رہی تو مجبوراً میں صرف ان کے دئے ہوئے نوٹ کو لے کر ایک رات تن تنہا گھر سے نکل پڑی۔

اب میں دلی میں تھی۔ پرانی دلی کے پرانے کھنڈرات میں مقیم۔

"کچھ عرصہ بعد ننھا نذیر اس مسرت نیست کی دنیا میں چند روز کے لئے آگیا۔" آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے اس کی آنکھوں سے ڈھلک پڑے۔

"وہ روپے جو میں لے کر نکلی تھی' اب ختم ہونے لگے' اس لئے میں نے پڑوس ہی میں ایک ملازمت کر لی"۔

"حسن علی کے یہاں؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ آپ کے دوست انسپکٹر حسن علی کے یہاں۔ اس کے بعد واقعات تو آپکو معلوم ہی ہیں یقین جانئے میں نے کچھ اپنے لئے نہیں صرف نصیر کی خاطر۔ آپکے دوست انسپکٹر کو زہر دیا۔ میرا عقیدہ تھا کہ عورت ایک کی ہونے کے بعد دوسرے کی نہیں ہو سکتی۔ ورنہ یوں تو میں اسوقت بھی دنیا کے نزدیک بیسوا ہی تھی۔ اسکا جو نتیجہ ہوا وہ بھی آپ کے سامنے ہے جیل خانہ کی ہوا کھانی پڑی"۔

"نصیر نے اس عرصہ میں آپ کی کوئی خبر نہ لی؟" میں نے پوچھا

"انھوں نے اسی زمانہ میں جبکہ میں آپ کے دوست انسپکٹر کے یہاں تھی کچھ روپے بھیجے تھے مگر میں روپیہ کی بھوکی نہ تھی۔ میں نے واپس کر دئے ———— تین سال بعد' میں قید سے چھوٹ کر آئی۔ اب میرے دل میں ایک نیا جذبہ موجزن تھا انتقام کا۔ میں نے اب انتقام کی ٹھانی تھی —— کس سے؟"

"نصیر سے" میں نے کہا۔

"نہیں نصیر سے نہیں۔ نصیر تو بیچارا رسم و رواج کی پابندیوں سے' عزیز و اقارب کے طعنوں اور دوست احباب کی انگشت نمائی کے ڈر سے مجبور تھا۔ اس میں جہاں تک میرا خیال ہے' کمزوری تھی تو صرف ایک۔ وہ بزدل تھا۔ اس میں ہمت نہ تھی کہ اس چیز کی طرف ہاتھ بڑھائے جسے دنیا نے ٹھکرا دیا تھا۔ ورنہ یوں وہ آدمی دل کا کچھ برا نہ تھا۔ میں نے انتقام کا ٹھانی تھی انسانوں سے

اُن کے رسم ورواج سے اور رسموں کے خالق ومعبود سے"۔

کچھ ٹھہر کر بولی:۔

"میں نے نصیر کو دکھا دینا چاہا کہ وہ جن سے مغلوب ہوگیا میں نے انہیں شکست دی۔ وہ مرد تھا، جنس قوی کا اعلیٰ رکن۔ میں عورت تھی، کمزوری جس کی پیشانی پر ثبت ہے۔ وہ، دنیا کے الفاظ کی تاب نہ لاسکا اور اپنے گناہ چھپانے پر آمادہ ہوگیا۔ میں گناہ کی مرتکب ہوچکی تھی، چھپاتی کیوں؟ دنیا والوں کے لعن وطعن کے جواب میں میں نے بڑی ہی لاپروائی سے انکا منہ چڑا دیا۔ بالکل ویسے ہی جیسے معصوم بچہ اپنے کھیلنے والے ساتھی کو چڑایا کرتا ہے۔

گناہ کے مرتکب دونوں تھے۔ نصیر نے دنیا کو دھوکہ دیا۔ اور میں نے حقیقت ظاہر کردی۔ لیکن دنیا نے اس حق گوئی کی قدر نہ کی۔ اسے شریف کہا اور مجھے بیسوا کے نام سے یاد کیا۔ میں نے انتقام لیا اور کامیاب ہوئی۔

انتقام لیا، عفت وعصمت کے ذریعہ۔ میں نے بدی کا مقابلہ بدی سے کیا۔ اب وہی لوگ جو سماج کی بندشوں کے خالق ہیں، حلال حرام کا ڈنکا پیٹتے ہیں اور جنت اور دوزخ کے ٹھیکہ دار ہیں میرے پاس آتے ہیں۔ سونے کے چند گول گول ٹکڑوں کے بدلے میں کچھ دیر میرے جسم سے کھیلتے ہیں۔ بعض سر پھرے عشق ومحبت کا اظہار بھی کرتے ہیں، مگر میں — ؟ — منھ پھیر کر ہنس دیا کرتی ہوں!!

وہی جن کے نزدیک میں موردِ لعن و ملامت تھی — اپنے گناہ کی وجہ سے۔ آج میری چوکھٹوں پر سر جھکاتے آتے ہیں۔ مگر میں — ؟ — بڑی بے توجہی سے ٹھکرا دیا کرتی ہوں!!

میں اپنے حسن، اپنی جوانی اور اپنے عشووں کے ذریعہ انتقام لے رہی ہوں، اور اسوقت تک لیتی رہوں گی، جب تک سماج کی دھجیاں نہ اڑ جائیں، "خود ساختہ اخلاقیات" کی اینٹ سے اینٹ نہ بج جائے اور تم — ستم مرد — شریف کو بیسوا بنانیوالے خونی درندو! دنیا کے سامنے ننگے نہ دکھائی دو۔"

غزل

از محترمہ رضیہ خاتون صاحبہ رعنا پام ولا اروول

شکیب وضبط بھی آ ایک بار لیتا جا — سکونِ قلب بھی لے لے قرار لیتا جا

ٹھہر ٹھہر ذرا اک یادگار لیتا جا — گندھے ہیں جو میرے آنسو کے ہار لیتا جا

وہی بتائیں گے چھپ چھپ کے حال اس دل کا — الجھ رہے ہیں جو دامن میں خار لیتا جا

وفورِ غم سے یہ نازک نہ چور ہو جائے — سنبھل سنبھل کے دلِ بیقرار لیتا جا

لوٹ لیا

بس اک نظر نے دلِ جاں نثار لوٹ لیا
مرا وہ مایۂ صد افتخار لوٹ لیا

طلسمِ جوشِ تصور سے گل بداماں ہوں
قفس میں رہ کے بھی لطفِ بہار لوٹ لیا

متاعِ توبہ جو بیحد عزیز رند کو تھی
اسی کو تو نے تو ابرِ بہار لوٹ لیا

کمالِ یاس میں راز سکوں تھا سربستہ
فریبِ شوق نے دل کا قرار لوٹ لیا

نہ دل پہ زور نہ قابو رہا طبیعت پر
بس اک نگاہ نے کل اختیار لوٹ لیا

ہوا نصیب کسی کو ملالِ صبحِ وصال
کسی نے لطفِ شبِ انتظار لوٹ لیا

شکستِ عہدِ محبت نے عمر بھر کے لئے
حریمِ دل سے ترا اعتبار لوٹ لیا

بھلا ہو تشنگیٔ ناکامیٔ محبت کا
مئے حیاتِ زبوں کا خمار لوٹ لیا

دلِ غریب پہ دزدِ حنا نے وار کیا
سمجھ کے بیکس و بے اختیار لوٹ لیا

پسِ فنا ستمِ عندلیب کیا کہئے
مزارِ نجم سے پھولوں کا ہار لوٹ لیا

نجم ندوی بی-اے

محترمہ حضنفر بانو خیری بہاری

مدیر اتحاد کی تحریک پر اتحاد کے بہار نمبر کے لئے "مکتبہ یوسف" کے صیغۂ اخبارات و مجلات کی مدد سے صحافت بہار کی ایک فہرست تیار کر کے مدیر اتحاد کو بھیجدی تھی، پر عجب اتفاق اس مخصوص نمبر کا صرف اعلان ہی شائع ہو کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ میرا مضمون بھی گیا گذرا۔ اسکے بعد فطرت کا اعلان شائع ہوا اور مجھ ناچیز کو بھی کچھ لکھنے کی ہدایت کی گئی، مانی ہوئی بات ہے کہ محنت سے حاصل کی ہوئی چیزیں عزیز جان ہوا کرتی ہیں، یاد آ گیا کہ اسی مضمون کو مدیر فطرت کے پاس بھیجدوں، پر فطرت کے سالنامہ کا بھی وہی حشر ہوا جو اتحاد کا ہوا تھا اب ندیم کا نمبر ہے "الا ماشاء اللہ" خدا کا نام لیکر بھیج رہی ہوں، چونکہ ایک ہفتہ اپنے تعلیمی مشغلہ کو نذر جستجو کر کے اس مضمون کو مرتب کیا تھا اس لئے اُمید ہے کہ یہ میری ناچیز حدمت جو بظاہر چند بکھری ہوئی پنکھڑیوں کو اکٹھا کر دینا ہے وہ ناظرین کی حوصلہ افزا نگاہوں میں گلدستہ ثابت ہوئی تو جانوں گی کہ محنت ٹھکانے لگی۔

واضح رہے کہ الف با تا کے قاعدے سے یہ فہرست لکھی گئی ہے۔ اس فہرست میں پہلی تعداد ان اخبارات و مجلات کی ہے جو صوبہ بہار میں بہاریوں کے اہتمام سے جاری ہوئے۔ دوسری فہرست اُن بہاری ارباب قلم کی ہے جنہوں نے دیگر مقامات سے اخبار و رسائل جاری کئے، یا بہ حیثیت ایڈیٹر ملک و ملت کو مستفید کرتے رہے ان فہرستوں میں چند ایسے اخبارات کے نام بھی آ گئے ہیں جنکا ایک نمبر بھی مکتبہ یوسف میں نہ ملا لیکن جو کچھ معلوم ہوا اُسے نوٹ کر لیا۔

پہلی فہرست

۱۔ آزاد۔ زیر معائنہ جلد ا نمبر ا مورخہ ۱۱ مئی سنہ ۱۹۲۹ء اس کے ایڈیٹر مولوی محمد ولی حسن اور مالک مولوی رشید احمد سجاد تھے۔ صوبہ بہار کا علمی، ادبی، تاریخی اور سیاسی ہفتہ وار اخبار پٹنہ سے شائع ہوتا تھا۔

۲۔ اتحاد۔ زیر معائنہ جلد ا نمبر ۲۳ مورخہ سنہ ۱۹۱۳ء بہار شریف سے جاری ہوا تھا پر کچھ عرصہ بند رہنے کے بعد گذشتہ کئی سال ہوئے بانکی پور سے نہایت پابندی وقت کیساتھ شائع ہوا کرتا ہے اس کے بانی بہار شریف کے رئیس محترم مولوی شیخ نور محمد صاحب ہیں۔

۳۔ ادیب۔ میرے پاس اس کی کوئی کاپی نہیں ہے، صحیفہ فطرت کے ایک نمبر سے معلوم ہوا ہے کہ اس نام کا کوئی اردو رسالہ پٹنہ سے شائع ہوا کرتا تھا۔

۴۔ اسٹار آف انڈیا۔ زیر معائنہ نمبر ۵ جلد ۲۰ مطبوعہ سنہ ۱۹۱۳ء اس کے ایڈیٹر منشی محمد ظہور الحق صاحب آروی اور نگراں مرحوم مولوی سید صفا حسین صاحب

وحشت بہاری تھے اس کے سرنامہ پر یہ لکھا ہوا ہے۔

The oldest The cheapest and the largest circulation in the province Behar and Orissa

اس میں شک نہیں مجھے معلوم ہوا ہے کہ جب تک حضرت وحشت بہاری اس کے ایڈیٹر رہے اس وقت تک یہ اخبار آرہ سے شائع ہوتا رہا اور چند ہی سال کے بعد بند ہو گیا۔

۵۔ اصلاح ۔ زیر معائنہ جلد ۳ نمبر ۴ مورخہ ۲۹ جمادی الثانی ۱۳۲۱ھ مقام اشاعت کھجوہ ضلع سارن مرتبہ مولوی حیدر علی صاحب حلقہ اثنا عشری کا ایک ماہوار رسالہ تھا۔ اور بہت بہتر تھا۔

۶۔ الاصلاح ۔ زیر معائنہ جلد ۳ نمبر ، مورخہ ۲۰ جمادی الثانی ۱۳۴۲ھ ، اس کے ایڈیٹر ابو محمد مصلح صاحب نائب ایڈیٹر ڈاکٹر نور الدین مخشرؔ مسلمانوں کی اصلاح وفلاح اور عامۂ خلائق کی بہبودی کے لئے سہسرام سے ہفتہ وار شائع ہوتا تھا۔

۷۔ الاکرام ۔ زیر معائنہ جلد ۱ نمبر ۱ مورخہ ۱۵ اپریل ۱۹۲۶ء مقام اشاعت بہار شریف محلہ خاص گنج ، اس کے مدیر مسئول عاصم بہاری اور معاون ظفر بہاری تھے،

۸۔ الامین ۔ زیر معائنہ بابت نومبر و دسمبر ۱۹۲۶ء ، محترمی جناب مولوی شاہ سید نجم الدین احمد صاحب نجم وغیرہ اس کے ایڈیٹر تھے ، بہار شریف سے ماہوار شائع ہوتا تھا اور ایک برس تک جاری رہا۔

۹۔ الپنچ ۔ زیر معائنہ جلد ۱۲ نمبر ۴۹ مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۹۰۵ء اس کے بانی مولوی سید رحیم الدین صاحب استھانوی تھے ان کی رحلت کے بعد ایڈیٹوریل اسٹاف میں مولانا مولوی سید محمد احسن اور مولانا مولوی سید ابوالخیر مظہر عالم خیر ؔ دربھنگوی اور مولوی سید معاحب حسین صاحب وحشتؔ جیسے ذی علم حضرات مختلف زمانوں میں رہے ہیں ، کبھی پٹنہ ، کبھی بانکی پور سے مدتوں شائع ہوتا رہا ۔ تھا تو ایک ظریفانہ اخبار مگر اس کی منزلت ملک میں بہت ہی بلند و بالا رہی ، مکتبہ یوسف میں اس کی متعدد جلدیں ہیں۔

۱۰۔ الحق ۔ زیر معائنہ جلد ۲ نمبر ۱ مورخہ ۸ جنوری ۱۹۲۹ء اس کے ایڈیٹر مولوی سید عابد حسین بی اے بی ایل تھے ۔ ہفتہ وار مسلم پریس ضلع سارن (سیوان) سے شائع ہوا کرتا تھا۔

۱۱۔ الرشید ۔ زیر معائنہ جلد ۱ نمبر ۱ بابت صفر ۱۳۴۲ھ ، اس کے ایڈیٹر سید محمد محبوب صاحب حسین آبادی ہیں ماہوار رسالہ مونگیر سے شائع ہوتا تھا۔

۱۲۔ الشرف ۔ زیر معائنہ جلد ۱ نمبر ۱ بابت صفر ۱۳۱۹ھ ، اس کے ایڈیٹر منشی جناب مولوی محمد احسن صاحب تخلص بہاری مدظلہ تھے ۔ ابتدا میں اس کی اشاعت کی غرض " اشاعت تصوف " تھی مگر بعض ذی علم حضرات کی توجہ دلانے پر علمی ، ادبی سیاسی ، و تمدنی اغراض بھی شامل کر دی گئیں

یہ ماہوار رسالہ محلہ تولیہ بہار شریف سے شائع ہوتا تھا ۔

۱۳ - العدل ۔ زیر معائنہ مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۲۹ء اس کے ایڈیٹر سید فضیل الرحمن صاحب تھے ۔ ہفتہ میں دو بار بانکی پور سے شائع ہوتا تھا ۔

۱۴ - المبشر ۔ جلد ۵ نمبر ۷ مورخہ ۹ اگست ۱۹۲۹ء صوبہ بہار کا ہفتہ وار اخبار تھا جسکی داغ بیل جناب مولوی غلام محمد صاحب وکیل ہائیکورٹ نے ۱۹۲۱ء میں ڈالی تھی چھ مہینے کے بعد جب آپ اپنی عدیم الفرصتی کے باعث علیحدہ ہوگئے تو مولوی سید منظر علی ندوی صاحب نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا مگر اب مدتوں سے بند ہے، عرصہ تک جاری رہا۔

۱۵ - المدبر ۔ بانکی پور سے ہفتہ وار اخبار جاری ہوا تھا ۔ مگر کچھ ہی زمانے کے بعد بند کر دیا گیا ۔

۱۶ - امارت ، یہ بہار کا مذہبی اخبار تھا جو مہینہ میں دو دفعہ پھلواری شریف سے پابندی وقت کے ساتھ زیر ادارت مولانا شاہ محمد عثمان غنی صاحب شائع ہوتا تھا ۔ اسکی تحریریں پُر اثر ہوتی تھیں، دو بار گورنمنٹ کی جانب سے اس پر بغاوت وغیرہ کا مقدمہ بھی دائر ہو چکا ہے ۔

۱۷ - بہار ، زیر معائنہ جلد ۱ نمبر ۱ بابت اگست ۱۹۰۳ء شعرائے صوبہ کا ماہوار صحیفہ پٹنہ سے شائع ہوتا تھا ، اس میں ایک حصہ نظم اور دوسرا حصہ نثر کا تھا جس میں صوبہ بہار کے قادر الکلام سخنوروں اور مشاق نثر نویسوں کے بیش بہا علمی مضامین شائع ہوا کرتے تھے جناب سعادت علی خان صاحب سعادت والی ریاست بیرپور اور جناب حاجی حافظ سید شاہ نذر الرحمن صاحب حنیف عظیم آبادی اس کے سرپرست تھے اور غالباً اخبار الپنچ کے اسٹاف کی نگرانی میں نہایت آب و تاب سے شائع ہوا کرتا تھا ۔

۱۸ - بہار پنچ ، ایک اشتہار سے معلوم ہوا ہے کہ اس کے ایڈیٹر بہار کے مشہور ادیب اور اودھ پنچ اور الپنچ کے نامہ نگار مولانا مولوی سید ضمیر الدین صاحب عرش گیاوی تھے اور گیا محلہ دولہن گنج سے شائع ہوا کرتا تھا۔

۱۹ - بہارستان ۔ زیر معائنہ جلد ۱ نمبر ۲ بابت مئی ۱۹۳۱ء اس کے ایڈیٹر محترمی مولوی اصغر مجیبی تھے، اس کا زیر معائنہ نمبر علمی ادبی پہلو سے بہت کامیاب نظر آتا ہے، انکی محترم مولانا مولوی ابو یوسف صاحب سخی ندوی علیین مکان اس کے بڑے مداح تھے، پر اس بہارستان کی بہار چند روزہ ٹھہری۔

۲۰ - بہار گزٹ ، زیر معائنہ جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۱۱ اپریل ۱۹۰۹ء اس کے مدیر مراد علی خان تھے بانکی پور سے ہفتہ وار شائع ہوا کرتا تھا۔

۲۱ - بوقلمون صدق ، زیر معائنہ جلد ۱ نمبر ۲ بابت ۵ ذی الحجہ ۱۳۰۳ھ اس کے ایڈیٹر مولانا سید شاہ عبد القادر صاحب اور مہتمم مولوی سید لطیف الرحمن صاحب تھے، یہ اخبار اتحاد و اتفاق کا حامی اور حریت کا علمبردار تھا محلہ خانقاہ بہار شریف سے ہفتہ وار شائع ہوتا تھا۔

۲۲ - بیباک ، بانکی پور سے شائع ہوا تھا اس کا کوئی نمبر میرے سامنے نہیں ہے اسلئے اس کے مدیر و مہتمم کی خبر نہیں ملی ۔

۲۳ - پٹنہ اخبار ، زیر معائنہ جلد ۱ نمبر ۱۱ مورخہ ۲ جون ۱۹۱۳ء اس کے ایڈیٹر مولوی حاجی سید جان صاحب تاجر کتب پٹنہ سیٹی تھے ۔ بڑے سائز پر ہفتہ وار شائع ہوا کرتا تھا ۔

۲۴ - پنچ ، فی الحال یکم اپریل ۱۹۲۵ء سے مولوی سید محی الدین صاحب تمنا منعمی کے زیر ادارت ہفتہ وار پنچ بہار شریف سے جاری ہوا ہے

جس کے کئی نمبر میرے سامنے میز پر ہیں کہا جاتا ہے کہ مرحوم اپنچ کے بعض معزز نامہ نگار بھی اس کی قلمی معاونت فرماتے ہیں۔

۲۵۔ پیغام ، زیر معائنہ جلد ا نمبر ۱ ۲۱ اگست ۱۹۲۹ء، مولوی عبدالحلیم پرنٹر و پبلیشر اور مولوی عبدالمجید صاحب ایڈیٹر تھے سنتی ہوں کہ اس اخبار میں نسائیات کے کالم نے صوبہ بہار کی مستورات میں نئی روح ڈال دی تھی، مگر افسوس ایک ہی سال کے اندر بند کر دیا گیا۔

۲۶۔ تاج ، رسالہ تاج ندرہ ضلع گیا سے شائع ہوتا تھا، اس کے ایڈیٹر جگیشر پرشاد صاحب خلش ندروی سابق ایڈیٹر بزم سخن تھے۔

۲۷۔ تربیت ، مجلہ بہارستان ماہ مئی ۱۹۳۱ء سے معلوم ہوا ہے کہ "تربیت" خاص بچوں، بچیوں کے لئے بہار شریف سے شائع ہوا مگر ایک دو نمبر کے بعد بند ہو گیا۔

۲۸۔ تہذیب ، اس کا کوئی نمبر میرے سامنے نہیں ہے مگر معلوم ہوا ہے کہ مرحوم مولوی سید مصاحب حسین صاحب وحشت اس کے ایڈیٹر تھے۔

۲۹۔ جمہور ، ہفتہ وار دسمبر ۱۹۳۲ء میں جاری ہوا، اس کے مدیر صوبہ کے مشہور اخبار نویس سید نسیم الرحمٰن صاحب تھے اخبار آزاد خیالی اور حق گوئی میں نہایت بیباک تھا۔ حکومت کے مطالبہ ضمانت کے باعث جون ۱۹۳۵ء میں بند ہو گیا۔

۳۰۔ رہنما ، زیر معائنہ جلد ۲ نمبر ۹۷ مورخہ ۱۶ نومبر ۱۹۲۶ء، مولوی شاہ خلیل الرحمٰن بی۔ اے اور ضیاء الملک منظور الحق صاحب صدیقی ایڈیٹر تھے بہار شریف کا دو روزہ اخبار تھا جو نہایت کامیابی کے ساتھ شائع ہوتا رہا مگر اب بند ہے۔

۳۱۔ شرف الاخبار۔ اس کے ایڈیٹر سید شاہ عبدالقادر صاحب تھے، یہ بہت ممکن ہے کہ ۱۸۶۲ء کے کچھ ہی پہلے یا بعد محلہ خانقاہ بہار شریف سے جاری ہوا تھا۔

۳۲۔ شہرۂ آفاق ، زیر معائنہ جلد ا نمبر ۳۶ مورخہ ۱۱ اکتوبر ۱۸۹۵ء مولوی سید محمد طاہر ایڈیٹر تھے، گیا سے ہفتہ وار شائع ہوتا تھا۔ ظرافت کا رنگ چوکھا تھا، متانت میں بھی اس اخبار کی پالیسی زبردست تھی۔

۳۳۔ عفت ، زیر معائنہ جلد ا نمبر ۱ ۱۹۲۶ء، مرتبہ جنابہ صالحہ خاتون مقام اشاعت آستانہ گورگا نواں ڈاکخانہ کھگول ضلع پٹنہ یہ رسالہ صوبۂ بہار کا واحد زنانہ ماہوار مجلہ تھا۔ خدا کرے پھر شائع ہو!

۳۴۔ غریب نواز ، زیر معائنہ جلد ا نمبر ۱ ۱۹۲۵ء، مولانا حاجی سید شاہ حسین میاں صاحب کے زیر ادارت پھلواری شریف سے شائع ہوا کرتا تھا۔

۳۵۔ نظرت ، زیر معائنہ جلد ا نمبر ۱ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۳ء اس کے مدیر جناب صبا رشیدی بی اے اور معاون خصوصی محترمی جناب رخشاں بدالی مرحوم ہیں رسالہ خاصی ترقی کر رہا ہے۔ مقام اشاعت راجگیر ضلع پٹنہ ہے۔

۳۶۔ گیا پنچ ، ایک خط سے معلوم ہوا ہے کہ بابو ہر پرشاد اگروالا نے گیا سے ہفتہ وار شائع کیا تھا۔ وہ خط مکتبہ یوسف میں محفوظ ہے اس کے ایڈیٹر مولوی محمد محسن مختار گیا تھے۔

۳۷ ۔ گنجینہ ۔ دارالسلطنت بہار کا واحد علمی، ادبی، ماہوار مجلہ ہے جو ۱۹۳۲ء سے جاری ہوا ہے اس کے مدیر محترم جناب ناصح کریموی (مدیر اتحاد) ونیز گیاوی ہیں جو محلہ چوہٹہ بانکی پور سے شائع ہوتا ہے۔ لیکن آج کل بند ہے۔

۳۸ ۔ گلدستہ بہار، زیر معائنہ نمبر ۱ جلد ۱ بہ سرپرستی محبوب العاشقین حضرت شاہ عطا حسین صاحب عطا قدس سرہ سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ بہار شریف سے شائع ہوا کرتا تھا۔ نثر کے ساتھ شعرائے صوبہ بہار کی طرحی غزلیں چھپا کرتی تھیں، مکتبہ یوسف میں اسکی متعدد و مسلسل نمبر ہیں۔

۳۹ ۔ مسلم ، زیر معائنہ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۲ء مدیر محترم جناب مولانا مولوی سید منظر علی ندوی دام مجدہم ہیں۔ مقام اشاعت سبزی باغ بانکی پور پٹنہ۔ صوبہ بہار کا اگر مسلم ارگن ہے تو یہی مسلم ہے۔

۴۰ ۔ منیر بہار ، بانکی پور پٹنہ کی مقتدر جماعت سے جاری ہوا تھا۔ اسکے ایڈیٹر بھی کہنہ مشق بزرگ مولانا ظفر الملک مقرر کئے گئے تھے۔ مگر زیادہ زمانہ تک قائم نہ رہ سکا، مکتبہ یوسف میں ایک خط سے خبر ملی ہے جس سے نوٹ کر لیا ہے۔

۴۱ ۔ ندیم ، زیر معائنہ بہار نمبر ۱۹۳۳ء مالک و مدیر انجم گیاوی صوبہ بہار کا ایک کثیر الاشاعت اور سربرآوردہ ماہوار صحیفہ ہے۔ مقام اشاعت گیا۔ (جون ۱۹۳۱ء سے اس وقت تک برابر شائع ہو رہا ہے۔)

۴۲ ۔ نسیم سحر ، بابت ۱۹۰۲ء مہتمم جناب سید حسن مرتضیٰ صاحب شفق عماد پوری ضلع گیا۔ اس رسالہ میں شعرائے صوبہ بہار اور یوپی کے کلام بھی درج ہوا کرتے تھے۔

۴۳ ۔ نقیب ، پھلواری شریف سے شائع ہوا کرتا ہے اس کے مدیر و مہتمم کی خبر نہیں۔

۴۴ ۔ نغمہ آرزو ، زیر معائنہ جلد ۱ نمبر ۱ بابت ۱۳۱۹ھ، اس کے مدیر مطلوب العاشقین جناب سید شاہ فدا حسین صاحب قبلہ سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ قدسیہ تھے ماہوار رسالہ محلہ دائرہ بہار سے شائع ہوتا تھا نغمہ آرزو اس کا تاریخی نام ہے۔

۴۵ ۔ نوید ۔ پٹنہ سے عبدالباری محمد ساقی صاحب وکیل کی ادارت میں شائع ہوتا تھا اور چند برس تک جاری رہا۔

۴۶ ۔ نور الاسلام ، معلوم ہوا ہے کہ اس نام کا ایک مذہبی رسالہ پٹنہ سیٹی سے شائع ہوتا تھا۔ یہ رسالہ اپنچ کے دور اول کا ہمعصر تھا۔ افسوس کہ اس وقت رسالہ پیش نظر نہیں ہے کہ زمانہ اشاعت کا پتہ چل سکے۔

ان چھیالیس ۴۶ ناموں کے دینے کے بعد حضرت رخشاں مدظلہ العالی نے ذیل کے سترہ ۱۷ اخبار اور رسالوں کے حالات قلمبند فرما کر مجھے عنایت فرمائے ہیں جنہیں میں نہایت مسرت کے ساتھ اپنے مضمون میں شامل کئے دیتی ہوں۔

(۱) الجامعہ ، مذہبی رسالہ مقام اشاعت مونگیر ایڈیٹر مولانا سید محمد ندوی، اس کا مقصد اصلاح اور مذہبی خدمات اور غیر مذاہب کا رد ہے۔

(۲) اقدام ، اس نام کا روزانہ اخبار مولانا عبدالجبار وجیدی کی ادارت میں پٹنہ سے ۱۹۳۱ء میں جاری ہوا تھا۔ شاید ماہ دو ماہ جاری رہا ہو۔

(۳) آفتاب ، اس نام کا ایک ہفتہ وار پورنیہ سے شائع ہوتا ہے۔

(۴) البدر ، ایڈیٹر مولانا سید محمد طٰہٰ فکری الٰہی ہفتہ وار اخبار تھا ۱۹۲۱ء میں جاری ہوا مقام اشاعت دربھنگہ۔

(۵) بزم سخن ، ایڈیٹر جگدیشر پرشاد صاحب خلش ندروی۔ مقام اشاعت ندرہ ضلع گیا۔ غالباً ۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۲ء میں کامیابی کے تھا جاری تھا۔ چند برس تک خدمت زبان کرتا رہا۔ صوبہ کے اکثر ادبا و شعرا کی سرپرستی اسے حاصل تھی۔ اچھا رسالہ تھا۔

(۶) پروانہ ، ایڈیٹر مولانا سید محمد طٰہٰ الٰہی فکری، ادبی و علمی رسالہ مقام اشاعت دربھنگہ۔

(۷) تحفۂ حنفیہ ، ندوۃ العلماء کا ابتدائی زمانہ تھا اور بریلی کے "اہل سنت والجماعت" علما کی مخالفت ندوہ اپنے شباب پر تھی اسی زمانہ میں زیر ادارت ..... تحفۂ حنفیہ نکلتا تھا۔ مذہبی ماہوار رسالہ تھا، مخالفت ندوہ اور رضا خانی مسلک کی اشاعت اس کا خاص مقصد تھا۔ بہت عرصہ تک یہ رسالہ جاری رہا۔ اور ہندوستان کے حلقہ میں اسے خاصی مقبولیت حاصل تھی۔ تکفیر اہل قبلہ اس کا شعار تھا۔

(۸) خورشید ، اس نام کا اخبار بھی جاری ہوا تھا۔

(۹) حسن و عشق ، مقام اشاعت ڈہری ہسرام، ایڈیٹر مولانا محمد ابو مصلح سابق مدیر قرآن ادبی اور صوفیانہ رسالہ تھا۔

(۱۰) طبیب ، طبیہ سکول پٹنہ کی انجمن خادم الطب کی جانب سے ۱۹۳۱ء میں نکلتا تھا۔ اسکول کے اساتذہ پر مشتمل بورڈ کے ہاتھ میں اس کی ادارت تھی۔

(۱۱) طبی میگزین ، طبیب کے بعد اسی انجمن کی سرپرستی میں دسمبر ۱۹۳۳ء سے ماہ بہ ماہ نکلنے لگا تھا۔ ایڈیٹر حکیم مظاہر حسن منا تھے۔

(۱۲) معارف ، تصوف کی نشر و اشاعت اس کا مقصد تھا، پھلواری شریف سے شائع ہوتا تھا چند سال تک کامیابی کے ساتھ نکلتا رہا۔

(۱۳) مسیحا ، طبی رسالہ پھلواری شریف سے حکیم عبد اللسان صاحب کی ادارت میں نکلتا رہا۔ شاید اب بھی کبھی کبھی نکلتا ہے۔

(۱۴) موج نسیم ، اوڈیٹر سید بہار الدین فیض نیانوی۔ مقام اشاعت بانکی پور ۱۹۳۲ء میں اس کے پانچ نمبر شائع ہوئے تھے۔

(۱۵) مالیات ، یہ ماہوار رسالہ تھا جو پٹنہ سے زیر ادارت سید محمد حفظ الرحمٰن صاحب شائع ہونا شروع ہوا تھا، رسالہ اقتصادی تھا، شاید پہلے نمبر کے بعد بند ہو گیا۔

(۱۶) مساوات ، پھلواری شریف سے زیر نگرانی سردار محمد اسلام نگمتیا کئی سال سے جاری ہے۔

(۱۷) مجلۂ سلفیہ ، دربھنگہ سے .... ماہانہ شائع ہوا کرتا ہے۔

دوسری فہرست

(۱) آزاد ، زیر معاینہ نمبر ۲، جلد ۱، مورخہ ۹ اکتوبر ۱۹۳۳ء محترمی مولانا سید محفوظ جامعی ۱۹ اگست کے ایک گرامی نامہ میں میرے والد ماجد کو تحریر فرماتے ہیں کہ "آپ یہ سن کر غالباً خوش ہوں گے کہ ہم چاروں مولانا عبد الباقی صدیق طبیب مولانا اسماعیل و خوشی

اور راقم الحروف بہاری ہیں" یہ کس قدر نفرت آمیز الفاظ وطنیت کے رنگ میں تنزل وبہیں، اب بہاریوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں! لاہور سے روزنامہ شائع ہوا کرتا تھا، پر اب بند ہوگیا ہے۔ بعرصہ دراز سے اس اخبار نے جو وطنی خدمت کی ہے وہ امٹ ہے۔ یہ روزنامہ کاش اسی طرح پٹنہ سے شائع ہوتا!

(۲) احرار ، زیر معائنہ مورخہ ۲۲ اگست ۱۹۲۰ء مقام اشاعت کلکتہ ایڈیٹر ام غلام رسول۔

(۳) ادیب ، زیر معائنہ جلد ۲ نمبر ۶ جون ۱۹۱۳ء ایڈیٹر میر حسین عظیم آبادی سابق محقق اسسٹنٹ مشرقیہ سرکار حیدرآباد سے مصور شائع ہوتا تھا۔

(۴) الشمس ، زیر معائنہ جلد ۱ نمبر ۴ ۱۹۲۰ء اس کے ایڈیٹر منشی محمد اسمٰعیل صاحب فرحت بہاری تھے مقام اشاعت کلکتہ۔

(۵) الضیاء ، (عربی ماہنامہ) زیر معائنہ اگست ۱۹۳۲ء اس کے ایڈیٹر معظمی و محترمی سید مسعود عالم ندوی صاحب مدظلہ العالی ہیں مقام اشاعت لکھنؤ دارالعلوم ندوہ۔

(۶) المومن ، زیر معائنہ جلد ۴ نمبر ۱ مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۲۶ء اس کے ایڈیٹر مولوی محمد یحییٰ صاحب بہاری و محترمی حمایت حسین صاحب ہیں، بند ہوگیا تھا، لیکن ۱۹۳۲ء سے پھر جاری ہوا ہے۔ مقام اشاعت کلکتہ۔

(۷) دارالسلطنت ، زیر معائنہ مطبوعہ مارچ ۱۹۰۸ء مقام اشاعت کلکتہ اس کے مالک مولوی عبدالباری عظیم آبادی و عبداللطیف عظیم آبادی تھے، اس کے مختلف ایڈیٹروں میں قابل ذکر مولوی سید محمد صاحب حسین وحشت بہاری تھے اور کبھی علامہ ابوالکلام آزاد تھے،

(۸) دور جدید ، زیر معائنہ جلد ۱ نمبر ۲ مقام اشاعت کلکتہ۔ پرنٹر و پبلشر مولانا حکیم مولوی سید شاہ راحت حسین بہاری مدمجدہم تھے۔

(۹) رسالت ، روزنامہ مقام اشاعت کلکتہ، مولانا ابوالقاسم دلاوری تھے ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا کرتا تھا۔

(۱۰) عصر جدید ، زیر معائنہ مورخہ ۲۲ اگست ۱۹۲۰ء مقام اشاعت کلکتہ ایڈیٹر مولانا شائق احمد صاحب شائق بھاگلپوری۔

(۱۱) قرآن ، مقام اشاعت حیدرآباد دکن ایڈیٹر مولانا مولوی ابومحمد صاحب مصلح تھے۔

(۱۲) گوہر اصفی ، زیر معائنہ مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۹ء مقام اشاعت کلکتہ اس کے ایڈیٹر بھی مولوی محمد صاحب حسین رضا وحشت تھے۔

(۱۳) معارف ، زیر معائنہ جلد ۱ نمبر ۱ مقام اشاعت اعظم گڈھ ایڈیٹر حضرت علامہ سید سلیمان ندوی دام مجدہم ہیں۔

(۱۴) مذہب ، زیر معائنہ بابت جمادی الثانی ۱۳۲۶ھ ، ایڈیٹر ابومحمد مصلح تھے۔

(۱۵) نئی دنیا ، زیر معائنہ جلد ۱ نمبر ۱۹ مورخہ ۱۱ جون ۱۹۲۶ء مقام اشاعت کلکتہ ایڈیٹر محمد صدیق بہاری۔

(۱۶) نصیحت ، زیر معائنہ جلد ۱ نمبر ۱ مورخہ ۲۶ اگست ۱۹۳۱ء ، ایڈیٹر قمرالہدیٰ فردوسی، مقام اشاعت کلکتہ۔

(۱۷) وطن ، زیر معائنہ جلد ۱ نمبر ۲ مقام اشاعت کلکتہ مولانا شائق احمد صاحب عثمانی ایڈیٹر تھے۔

س ش ص

از جناب سید وصی احمد صاحب بلگرامی ڈپٹی کلکٹر پلاموں

تمہید

آبِ سوہن کی بھی کیا بات ہے ۔ یہ بات قند میں نہیں ۔ مصری میں نہیں ۔ پھر نیل و جیحون و فرات کو کون پوچھے؟ ہندوستان سچ پوچھو تو جلی بن ہے ۔ ظلمات ہے ۔ اس ظلمات میں آبِ حیات کون کہ آبِ سوہن ؎

خوشتر بود آبِ سوہن از قند و نبات — باد ے چہ سخن ز نیل و جیحون و فرات
این پارۂ عالمے کہ ہست بہش نامند — گوئی ظلمات و سوہن است آبِ حیات — غالب

سکندر کی نادانی دیکھو کہ اس آبِ حیات کے لئے وہ کہاں کہاں کی خاک چھانتا رہا ۔ اس بیوقوف کو چاہئے تھا کہ آنکھ بند کئے ہوئے آرہ شاہ آباد چلا آتا ۔ یہاں سوہن کا پانی اسکو سرتا پا روح کر دیتا ۔ یعنی زندۂ جاوید ؎

چو اسکندر ز نادانی ہلاک آبِ حیوانی — خوشا سوہن کہ ہر کس غوطہ زد در وے تنش جاں شد — غالب

ایک دن کا ذکر ہے کہ غالب کے ہاتھ میں پیالہ تھا اور ساقی کون کہ خود حضرتِ جبرئیلؑ ۔ ساقی نے پیالہ میں شراب ڈھالی شراب رگوں میں دوڑنے لگی ۔ بادہ نوش بہکنے لگا ۔ نشہ میں ہاتھ بڑھا کر بے محابا جبرئیلؑ کا دامن پکڑ لیا ۔ کہا کہ اے یارِ غمگسار! ذرا یہ تو بتلاتا جا کہ :—

۱ ہمیں اپنے کو ہاں کہنا ہے ۔ یہ دعویٰ درست ہے یا نہیں؟ ---------- گفت ۔ کفر ست در طریقت من
۲ تو پھر زمین و آسمان کی نمود کیسی؟ ---------- گفت ۔ ہے ہے نمی تواں گفتن
۳ دشمن جان کا گاہک ہے ۔ ہم کریں تو کیا کریں؟ ---------- گفت ۔ طرحِ بنائے صلح مفگن
۴ جاہ و منصب کے پیچھے دنیا اسقدر کیوں مٹی ہوئی ہے؟ ---------- گفت ۔ دامِ فریب اہرمن
۵ دہلی سے کلکتہ ہمکو کھینچ کر کون لایا؟ ---------- گفت ۔ جور و جفائے اہلِ وطن
۶ حضرت دہلی آخر ہیں کیا؟ ---------- گفت جان ست و ایں جہاں تن
۷ اور راجکاری بنارس؟ ---------- شاہدے مست ۔ محوِ گل چیدن

دہلی اور بنارس کے بعد عظیم آباد اور آرہ کی باری آئی ؎

گفتمش چوں بود عظیم آباد؟ — گفت رنگیں ترا ز فضائے چمن .

گفتمش سلسبیل خوش باشد؟ — گفت - خوشتر نباشد از سوہن — غالب

غالب نے پوچھا عظیم آباد - جبریل نے کہا - بھلا چمن میں یہ رنگینی کہاں؟ پوچھا سلسبیل؟ جبریل نے کہا - دور کا ڈھول سہاون! آزمانا ہو تو آرہ چلے جاؤ - دریائے سوہن کا ایک چلو پانی پی لو - پھر سلسبیل کا کبھی نام بھی نہ لو

دریائے سوہن کے ساتھ ساتھ آرہ میں دریائے سخن بھی موج زن ہے اور موجوں سے آواز آ رہی ہے کہ ؎

اے اہل نظر عجیب جا ہے آرہ — گلزار ہے - باغ پُر فضا ہے آرہ

اس باغ کو انقلاب کا خوف نہیں — او لٹیں یہ اسے - تو بھی ہرا ہے آرہ — صفیر بلگرامی

آرہ جن لوگوں کی وجہ سے جہاں آرا ہوا اُن میں موہان ضلع اُناؤ کے سادات زیدی کا وہ خاندان بھی تھا جس کے چشم و چراغ سید وارث علی - سید طالب علی اور سید امیر علی مرحومین تھے - رائٹ آنریبل سید امیر علی کی شادی لندن میں مس اسپیلی بنت مسٹر کونسٹاج سے ہوئی - یہ وہی مس اسپیلی ہیں جن کے صدقہ میں دنیا کو اسپرٹ آف اسلام کے ایسی نادر تصنیف نصیب ہوئی - نوشاہ عروس کو لے کر لندن سے کلکتہ آیا تو ریبن پریس کلکتہ نے ایک قطعۂ تہنیت پیش کیا جس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

۱	میرے اشعار ہیں شایان مبارکبادی	ہیں یہ رنگیں گل بستانِ مبارکبادی
۵	فال کھولی تو پڑی حالِ زلیخا پہ نظر	مل گیا مطلعِ دیوانِ مبارکبادی
۶	رسم شادی کا ہوا تیرے لئے لندن میں	اب یہاں بھی تو ہے شایانِ مبارکبادی
۷	عقد سے تیرے شگفتہ ہوئی مس اسپیلی	خوب پھولا تھا گلستانِ مبارکبادی
۹	مولوی بھی تو ہے - سید بھی ہے مشہور جہاں	پھر امیر اور علی جانِ مبارکبادی
۱۲	حق ممدوح میں ہر وقت دعا ہے یہ وزیر	ہو عیاں مہرِ درخشانِ مبارکبادی

پانچویں شعر میں حالِ زلیخا سے مراد یہ ہے کہ مس اسپیلی نے اپنے کنبہ سے لڑ جھگڑ کر یہ عقد کیا تھا - وہ خود بڑی عالمہ و فاضلہ تھیں اور اُن کا گھرانہ دولت علم و وجاہت سے مالامال تھا -

رائٹ آنریبل سید امیر علی کے بڑے بھائی ڈپٹی سید وارث علی خاں' انکی شادی نواب بہادر سید ولایت علی خاں بہادر رئیس عظیم آباد کی خالہ زاد بہن شاہ بیگم سے ہوئی - شاہ بیگم اپنے میکہ میں آج تک آرہ والی بیگم مشہور ہیں - کیونکہ اُن سے پہلے یا بعد خاندان گذری عظیم آباد سے' یا یوں کہئے کہ صاحب سیر المتاخرین میر غلام حسین خاں کے خاندان سے کوئی لڑکی آرہ نہیں گئی -

تقریباً اسی برس ہوئے کہ ڈپٹی وارث علی خاں نے عظیم آباد میں اپنی صاحبزادی کی چھٹی کی - رقعۂ نوید نواب بہادر سید ولایت علی خاں کی طرف سے تقسیم ہوا - نواب بہادر ہی کے دولت خانہ میں جلسہ تھا - صحن میں محفلِ نشاط - صحن کے بعد پھاٹک

اور اُس کے بعد وہ سڑک جو پچھم دروازہ سے پورب دروازہ کو جاتی ہے۔ اس صحن میں چند احباب جمع تھے۔ ایک نووارد اپنے اشعار سنا رہا تھا پاس ہی دو لڑکے کھیل رہے تھے۔ ایک کی عمر آٹھ برس۔ دوسرے کی گیارہ برس۔ کھیل یہ تھا کہ ایک مونڈھے کو دونوں اس طرح ٹھکراتے کہ وہ صحن سے پھاٹک تک چلا جاتا۔ پھاٹک کے بعد ہی سڑک تھی۔ اس لئے دونوں لڑکے دوڑ کر پھاٹک سے مونڈھے کو لے آتے۔ اسی طرح پھر ٹھکراتے۔ پھر دوڑ کر جاتے۔ پھر لے آتے۔ اور جب دوڑتے دوڑتے تھک جاتے تو وہی مونڈھا بچھا کر خود اُس پر بیٹھ جاتے!

لڑکوں کی یہ ادا نووارد کو بھاگئی۔ نووارد ان دو میں سے ایک کو پہچانتا تھا جس کو نہیں جانتا تھا اُس کی عمر اُس وقت گیارہ برس کی تھی۔ پوچھا۔ نام کیا ہے؟ لڑکے نے نووارد کو اپنا نام بتلا دیا۔

کیسی شاہ بیگم؟ کہاں کا جلسہ؟ کیسی شعر خوانی؟ کہاں کا مونڈھا؟ —— بات صرف اتنی تھی کہ قضا و قدر کو ایک دن یوں منظور ہوا کہ آرہ اور عظیم آباد کی ملتا ہیں کھینچ جائیں اور وہ نووارد ان دونوں لڑکوں کے ساتھ ایک ہی جال میں اس طرح آجائے کہ مرنے کے بعد بھی چھٹکارا نہ ہو۔ قضا و قدر کے جال میں ان تینوں کا بہ یک وقت آجانا ایسا ہی تھا جیسا حروف تہجی کی محفل میں س۔ ش۔ ص کا ایک ساتھ جگہ پانا اور اسی واقعہ سے اُن کہانیوں کا آغاز ہوتا ہے جن کیلئے ایک ہزار ایک راتیں بھی کم ہیں ۔

تمہارا ہم سے ملنا یادگار اے جانِ عالم ہے　　جو گذرا آج آنکھوں سے وہ کل افسانہ ہوتا ہے　(صفیر بلگرامی)

دونوں لڑکے کون تھے؟ نووارد کون تھا؟ —— جواب یہ ہے کہ س۔ ش۔ ص۔

باب اول در بیان س

نواب بہادر کے ہاں جو تقریب تھی اُس کے چند سال بعد عظیم آباد میں ایک اور تقریب ہوئی۔ اس تقریب میں لکھنؤ سے حیدر جان آئی۔ تھی تو لکھنوی مگر نکھرا دیکھو تو ملیح آبادی۔ اور آنکھیں دیکھو تو جامی۔ اور نیچی نگاہیں دیکھو تو بلند شہری۔ اور سرمہ کی تحریر دیکھو تو اصفہانی۔ اور زلفیں دیکھو تو شامی۔ اور صباحت دیکھو تو بنارسی۔ اور شان دیکھو تو شکوہ آبادی۔ اور جذبۂ دل دیکھو تو نجدی۔ اور کافر ماجرائی دیکھو تو الہ آبادی۔ اور بے نیازی دیکھو تو فتحپوری! —— الغرض حیدر جان عظیم آباد آئی تو کسی نے کہا کہ خانۂ انوری کو ڈھونڈنے والی بلا آئی۔ کسی نے کہا کہ کرشن جی کی بانسری آئی۔ کسی نے کہا کہ نواب مرزا کی مثنوی زہر عشق آئی۔ مگر خانقاہوں سے صدا آئی کہ خبردار! ہوشیار! نادر کی تلوار آئی!!

اِدھر حیدر جان محفل میں آئی اُدھر زلفِ شب تا بہ کمر آئی۔ مگر دیکھنے والوں کی آنکھیں بھی عجیب آنکھیں تھیں جس سے پوچھو یہی کہتا ہے کہ آفتاب سوا نیزہ پر آگیا۔ اس سحر کو باطل کس نے کیا کہ خود حیدر جان کی ٹھہری نے ؎

نواب سید محمد حسین خان - عرف سید سلطان مرزا - سلطان عظیم آبادی

توری ساؤری صورت مورا من بھائے　　مدھ بھری انکھیاں۔ گجرا سُہائے

چال البیلی — نٹ نو یلی ہے　　دیکھو حیدرا مورا جیرا تڑپائے

محفل آئینۂ حیرت تھی۔ اُس محفل میں ایک رئیس زادہ بھی تھا قضا کار اس رئیس زادہ پر حیدر جان کی نظر پڑی تو ایسی پڑی کہ دفعتاً شمع محفل خود پروانہ ہوگئی۔ تاادر کی تلوار جس سے دو ٹکڑے ہوگئی۔ مثنوی زہر عشق میں آگ لگ گئی۔ کرشن جی کی بانسری کھو گئی۔ اور خانۂ انوری کو ڈھونڈنے والی بلا خود بلاؤں میں گرفتار ہوگئی۔ اب اُس رئیس زادہ کا حال پوچھو تو حال یہ ہے کہ :- "الفت کی آنکھ بیچ میاد لال ہوگئی"

تقریب ختم ہوئی اور قافلہ ذروان لکھنؤ نے لکھنؤ کا قصد کیا تو عشق نے حیدر جان کو راہیں تبلادیں۔ اُس نے اپنی ماں سے صاف کہہ دیا کہ عظیم آباد دامن نہیں چھوڑتا۔ ماں مجبوراً ٹھہر گئی۔ جب سال بھر ہوگیا اور پھر بھی حیدر جان نے جانے کا نام نہ لیا تو آخر اُسکی ماں بیماری کا بہانہ کرکے خود لکھنؤ چلی گئی اور وہاں سے اپنی بہن کو بھیجا کہ جس طرح بنے اُس دیوانی کو عشق کے پھندے سے چھڑا کر لے آ۔ اس علّامہ نے یہاں پہونچکر آسمان زمین ایک کردیا اور غریب حیدر جان کو عظیم آباد آخر چھوڑنا ہی پڑا۔ رئیس زادہ عشق کا مارا اپنی روداد یوں بیان کرتا ہے :-

کیا کہوں اُس فراق کا احوال　　وہ مرا رنگ۔ وہ مرا احوال
نہ اُسے اختیار رہنے کا　　نہ مجھے وقت بات کہنے کا

شاق تھی اُس نگار کی دوری　　تا بہ آرہ گیا بہ مجبوری
ریل جسوقت آرہ میں ٹھہری　　جمع تھے سب دیہاتی اور شہری

اُس گھڑی میں اٹھا جو پہلو سے　　بھرے آنکھوں کو اپنی آنسو سے
اور بولا کہ لو۔ خدا حافظ!　　مجکو اب جانے دو خدا حافظ!

گو کہ دل کو ذرا قرار نہیں　　آگے جانے کا اختیار نہیں
سنتا تھا یہ کہ وہ بجوش فغاں　　بولی ہیں ہیں! کہاں کہاں یہ کہاں؟

میں نہ مانونگی۔ میں نہ مانوں گی!　　اتروگے تم۔ تو جان دے دونگی!

کہکے یہ میرا تھام کر دامن　　چاہا بٹھلائے ریل میں فوراً
میں نے ہٹ کی۔ بہ التجا ہٹکر　　دامن لینے میں رہ گیا پھٹ کر!

کھول کر کھڑکی اور دے کے دعا　　ریل کے نیچے میں اُتر ہی پڑا
اور کھڑکی کو تھام کر اک بار　　بولا۔ چلنے میں مجکو کیا انکار

پر مناسب نہیں مرا جانا　　تمہیں سمجھو کہ ایسا کیا جانا
عزتِ خانداں کا بھی ڈر ہے　　دمبدم باپ ماں کا بھی ڈر ہے

کہنے تو یہ کہا۔ مگر کہوں کیا　　دل پہ بس جو کچھ گذرتا تھا
ریل کی سیٹی اُسطرف کو بجی　　اور دونوں کا سنسنا گیا جی

اُسطرف آہ تھی۔ ادھر نالے　　آنکھوں سے آنسوؤں کے پرنالے
دونوں حیرت سے تکتے تھے باہم　　ہائے کچھ کہہ نہ سکتے تھے باہم

رئیس زادہ محبت کا مارا چھاتی پر پتھر رکھ کر حیدر جان سے رخصت ہوا۔ وہ لکھنؤ گئی۔ یہ آرہ سے عظیم آباد واپس آیا۔ مگر کس حال میں؟

میری حالت وہ تھی معاذ اللہ　　کہ نہ دکھلائے وہ گھڑی اللہ
آرہ سے آیا تو میں گھر کو۔ مگر　　لانے والوں کو ہے کچھ اسکی خبر

آہ ایسا ہوا جو میں دلگیر　　دل نے کی جان لینے کی تدبیر
کھانے پینے کو بھی جواب دیا　　بلکہ جینے کو بھی جواب دیا

سارے دروازے بند اندر سے　　لوگ چلائے آکے باہر سے
بند آنکھیں۔ زمین پہ تھا پڑا　　نقشِ پا تھا امیدِ رفتہ کا!

ماں کو خبر ہوئی تو صاحبزادے کے پاس تشریف لائیں۔ دیکھ کر بہت روئیں۔ پوچھا کھانا کیوں چھوڑ دیا ہے؟ بیٹے نے لحاظ سے کچھ جواب نہ دیا۔ مگر اور لوگ پوچھنے آئے تو شرط پیش کی کہ کھلانا ہو تو حیدرجان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا لاؤ۔ یہ راز کھلا تو اُسی وقت ایک آدمی لکھنؤ بھیجا گیا۔ اسکی خبر رئیس زادہ کے باپ کو ہوئی تو حکم آیا کہ ہم آج کلکتہ جا رہے ہیں۔ تم بھی تیار رہو۔ رئیس زادہ اُسی فاقہ کی حالت میں اُٹھ کھڑا ہوا اور باپ کے ساتھ کلکتہ پہونچا۔ ادھر یہ کلکتہ پہونچا اور اُدھر لکھنؤ سے حیدرجان کے تحائف عظیم آباد پہونچے۔ رائے ہوئی کہ ان چیزوں کو اسی طرح کلکتہ پہونچ جانا چاہئے۔ چیزیں کلکتہ پہونچیں تو خدا خدا کر کے پورے سات دن کے بعد رئیس زادہ نے فاقہ شکنی کی ؎

بسکہ دلبر کے ہاتھ کا تھا طعام　　ہوئے خوشبو مرے دماغ و مشام　　میری مرغوب تھیں وہ سب چیزیں　　خوب سے خوب تھیں وہ سب چیزیں
لقمہ جو تھا وہ بس تھا وجہ حیات　　شکر رازق کہ اُس نے رکھ لی بات!　　ورنہ میں اور صفت بھر یہ ضبط؟　　اور قائم رہے حواس کا ربط؟
عقل کہتی ہے زور امید کا تھا　　کہ ہے قائم امید پر دنیا　　اُس ملنے کی گو تھی ٹوٹی ہوئی　　اور عنانِ شکیب چھوٹی ہوئی
پردہ الفت کہ جس نے دونوں پر　　سحر کی طرح سے کیا تھا اثر　　جانتے کب تھے اسکو ظاہر ہیں　　ایک الفت تھے اس کشش کے ہیں
اس کی حالت کو بس وہ ہی جانے　　جو کہ نبضِ وفا کو پہچانے　　الغرض جبکہ کھایا وہ کھانا　　من و سلویٰ جسے کہ تھا جانا
اور امید کو ہوئی قوت　　اب تو بڑھنے لگی مری طاقت　　رات دن یہ خیال گھر جائیں　　جلد اُس مہ لقا کو بلوائیں

——— رہنا کلکتہ کا ہوا دوبھر　　سر پہ منزل سوار آٹھ پہر ———

رئیس زادہ الفت کا مارا کلکتہ سے عظیم آباد آیا تو ایک قاصد کو نامۂ شوق[۱] دیکر حیدرجان کے پاس لکھنؤ بھیجا ؎

اے تمنائے عاشقِ ناکام　　دلربائے زمانہ۔ دلبر نام　　تو سلامت رہے بصد خوبی　　روز افزوں ہو تیری محبوبی
تو مسلمان ہے جو اے کافر　　یاد کر اپنے قول کو آخر　　تجکو سوگند شاہ خیبر ہے　　بالیقیں تو کنیز حیدر ہے
کیا میں دوں اس سے بڑھ کے اور قسم　　کیا یہ کہتا کہ اے خجستہ صنم　　تجکو اپنی اداؤں کی سوگند!　　تجکو میری وفاؤں کی سوگند!
اپنے حیرانِ نیم جاں پہ نظر!　　جلد لے جلد۔ آ کے میری خبر!　　ختم اب داستان حیراں ہے　　خط سلطانِ عشق بازاں ہے

حیدرجان نے یہ خط پایا تو تڑپ گئی۔ ماں سے کہا کہ اب لکھنؤ کو سلام ہے۔ ماں نے کہا کہ دیوانی لکھنؤ چھوڑنے کی چیز ہے؟ ؎

گل سے رنگیں تر ہیں خارِ لکھنؤ　　نشہ سے بہتر خمارِ لکھنؤ
——— تیر الفت کی ماری نے جواب دیا: ———

سب سمجھتی ہوں میں۔ یہ زد نہیں　　دل چھڑاتا ہے لکھنؤ کی زمیں　　گو ہو غربت میں ہر طرح ایذا　　ہو گوارا جو دل کو۔ کیا پروا

---

[۱] نامۂ شوق میں ۱۷ ابیات ہیں۔ یہاں صرف ۸ بیتیں لکھی گئیں۔ اول بیت میں دلبر اور آخری دو بیتوں میں حیران فرضی نام ہیں۔ دلبر بروزن حیدر چنانچہ چوتھی بیت میں اصل نام حیدر موجود ہے۔ رئیس زادہ کا نام بھی اس خط میں پوشیدہ ہے۔

ماں نے جب دیکھا کہ عظیم آباد جانے پر یہ تُلی ہوئی ہے تو اُس نے رؤسائے لکھنؤ کو اُبھارا کہ ؎

یہ حسین جانے کی سناتی ہے ۔ آبروئے لکھنؤ کی جاتی ہے ۔ اب رئیسوں کو یہاں کے لازم ہے ۔ کہ وہ دلبر ہزار عازم ہے

روک لیں اسکو جس طرح سے بن آئے ۔ کوئی فقرا دے۔ کوئی بات بنائے ۔ پھر تو کیا تھا۔ تمام اہلِ دوَل ۔ ہو گئے سن کے یہ خبر بیکل

کوئی آیا۔ کسی نے بلوایا ۔ خوب سمجھایا۔ خوب سمجھایا ۔ پر سمجھتے کہیں ہیں دل دادہ؟ ۔ کہیں گرتا ہے کارِ افتادہ؟

سب کی جانب خطاب ایک ہی تھا ۔ سبکو اُسکا جواب ایک ہی تھا ۔ بس نہ اس امر میں کلام کریں ۔ میرا جینا نہ اب حرام کریں

میری حالت پہ چھوڑ دیں مجھکو ۔ قصدِ غربت ہے چھوڑ دیں مجھکو ۔ کیا ہوا۔ گو کہ دور جاؤں گی ۔ جاؤں گی میں۔ ضرور جاؤں گی

میرا دل اس جگہ نہیں لگتا ۔ دلِ وحشی بھی ہے کہیں لگتا

جب یہ تیر بھی خطا ہوا تو حیدرجان دھوکے سے ایک مکان میں بند کر دی گئی۔ باہر سے قفل لگا دیا گیا۔ اس طرح کہ ؎

التفاتِ جہاں سے نا امید ۔ مثلِ یوسف ہوئی زلیخا قید ۔ سر پہ چھت۔ زیرِ پا زمیں خالی ۔ گرد دیواریں۔ روکنے والی!

تھے طبیعت کی طرح بند کواڑ ۔ اور چاکِ دل و جگر تھے دڑاڑ ۔ ناامیدی جو ہوش کھو دیتی ۔ پھر تو مایوس ہو کے رو دیتی

باتیں۔ اور ہم زباں نہیں کوئی! ۔ راز۔ اور راز داں نہیں کوئی! ۔ سوچ ہی سوچ کر وہ چپ رہنا ۔ اپنے ہی دل سے کہنا جو کہنا

الغرض اُسپہ بندشیں لاکھوں ۔ اُس کے رہنے کی سازشیں لاکھوں ۔ پر محبت میں جو کہ کامل ہو ۔ کب وہ اِن بندشوں سے بیدل ہو

انھیں باتوں میں اُس نے خاطر خواہ ۔ سوچتے سوچتے نکالی راہ ۔ واہ رے زورِ جذبِ کامل کا! ۔ ٹوٹتا کب ہے سلسلہ دل کا؟

کشش جذبۂ محبت ہے! ۔ تار برقی کی کیا حقیقت ہے؟

نتیجہ یہ ہوا کہ ؎

سلسلہ وعظ و پند کا ٹوٹا! ۔ قفل سب قید و بند کا ٹوٹا ۔ کھلے بندوں وہ پائے بندِ وفا ۔ لکھنؤ سے چلی بصدق و صفا

کون کہتا ہے عشق کو مذموم؟[1] ۔ حال اسکا اُسے نہیں معلوم ۔ کون کہتا ہے یہ ہے بے تاثیر؟ ۔ اس کی ظاہر نہیں اُسے تاثیر!

کون کہتا ہے۔ عاشقِ ناکام ۔ مفت ہوتا ہے عشق میں بدنام ۔ دلبروں کو اثر نہیں ہوتا؟ ۔ کوئی اُن میں جگر نہیں ہوتا؟

بے خبر خود ہے جو یہ کہتا ہے ۔ یاں تو مجھ پر یہ حال گذرا ہے ۔ اپنی گذری کو جھوٹ کیوں جانوں ۔ باتیں ناواقفوں کی کیا مانوں؟

عشق کی مہم سر کرتی ہوئی حیدرجان پھر عظیم آباد پہونچی۔ نادر کی تلوار پھر مسلط ہو گئی۔ حیدرجان کے ہاتھوں عظیم آباد نو برس تک دار الحرب بنا رہا۔ نادر کی تلوار نو برس تک عظیم آباد میں قتلِ عام کرتی رہی۔ اس قتلِ عام کی وجہ حیدرجان کی صورت نہیں بلکہ سیرت۔ اُس کا بانکپن نہیں بلکہ کمالِ فن تھا۔ حاضر جواب تھی۔ خوش مزاج تھی۔ ادیب تھی۔ سنجیدہ تھی۔ مہذب تھی۔

---

[1] ان چھ بیتوں میں اُس محلہ کا نام پوشیدہ ہے جہاں رئیس زادہ کا محل تھا۔

شاعرہ تھی۔ باوفا تھی۔ پاکباز تھی۔ واضح رہے کہ بقول عبید زاکانی پاکباز اُسکو کہتے ہیں جو ایک ہی عاشق پر اکتفا کرے۔

حیدرجان کی پاکبازی اُس کے سر پر قیامت لائی۔ یعنی جب لوگوں نے دیکھا کہ نو برس کے بعد بھی وفا کی مہندی حیدرجان کی ہتھیلیوں کو اور لال کرتی جا رہی ہے تو سازش کر کے لکھنؤ سے امراؤ کو بلوایا۔ اس سازش میں خود حیدرجان کی ماں شریک تھی۔ حیدرجان محرم میں ہر سال لکھنؤ جایا کرتی اور صفر میں واپس آجاتی۔ یہ سلسلہ نو برس تک رہا۔ دسویں برس کیا ہوا اسکا حال رئیس زادہ یوں بیان کرتا ہے ؎

سنو یہ طرفہ داستان سنو　　نئی تجویز کا بیان سنو!
دلبر اک سال لکھنؤ جو گئی　　گذرے اُسکو وہاں مہینے کئی
اُس کی ماں نے کنیز اک پالی　　نام امراؤ۔ رنگ میں کالی
بدشمائل۔ کریہہ صورت تھی　　طبع کو جس سے خود کراہت تھی
دلبر آنے لگی جو پٹنہ کو　　دم دیا۔ میرا دم الٹنے کو
یعنی امراؤ کو بھی ساتھ کیا　　اور سمجھا کے اُسکو کہہ بھی دیا
دل کو نواب کے لبھالینا　　سختیاں جو پڑیں۔ اٹھالینا
فتنہ تھی۔ وہ بلائے مبرم تھی　　شعبدہ بازوں کی وہ محرم تھی
یاں جو آئی تو کچھ زیادہ بڑھی　　ناگہاں ایک روز سر پہ چڑھی

امراؤ کس ضرورت سے بلائی گئی ہے۔ کس ضرورت سے بھیجی گئی ہے۔ نہ رئیس زادہ کو معلوم۔ نہ حیدرجان کو معلوم۔ ان غریبوں کو یہ بھی خبر نہیں کہ سازش میں کون کون لوگ ہیں اور کیا کیا جال بچھائے جا رہے ہیں۔ بہرکیف امراؤ کی شعبدہ بازیوں نے رئیس زادہ اور حیدرجان کے بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دی۔ اور حیدرجان اب اپنا سر پھوڑنے لگی ؎

واہ نواب صاحبِ ذیجاہ　　آپ کی آنکھ سے خدا کی پناہ
سچ ہے۔ جی بھر گیا حضور کا بھی　　اور پڑا ہے مجکو دور کا بھی!
لیجئے لکھنؤ میں جاتی ہوں!　　پردۂ درمیاں اٹھاتی ہوں
خیر یہ بھی مقدر اپنا ہے!　　کیوں میں سمجھی تھی گھر یہ اپنا ہے؟
گذرے کیا جانیں نو برس کیونکر　　پورے اب مجھ سے ہونگے دس کیونکر؟

نتیجہ یہ ہوا کہ ؎

روٹھ کر میرے پاس سے اٹھی　　دیکھ کر چشم یاس سے اٹھی
گر پڑی جاتے ہی پلنگڑی پر　　اور رونے لگی مری دلبر
لاگ دل کی یہی سو جھاتی ہے　　یوں ہی الفت میں آفت آتی ہے

اس افتاد ناگہانی نے رئیس زادہ کو مجنوں اور حیدرجان کو نیم جان کر دیا۔ عالم یاس میں وہ لکھنؤ جانے لگی تو عظیم آباد نے پھر دامن پکڑا۔ کہا کہ جاتی ہے تو پہلے دل اپنا یہیں چھوڑ سے جا۔ باوفا نے جواب دیا کہ دل! دل! دل ہے کہاں؟ وہ تو کب کا مر چکا۔ نماز میت بھی ہو چکی۔ قبر بھی کھد چکی! لے اب ہم کو لکھنؤ جانے دے ؎

نہ دوری دلیل صبوری بود　　کہ بسیار دوری ضروری بود

لکھنؤ جا کر حیدرجان پھر عظیم آباد آئی۔ پھر گئی۔ پھر آئی۔ عشق اپنی نیرنگیاں دکھلاتا رہا۔ ساقی نے غالب سے سچ کہا تھا کہ عظیم آباد

کی رنگینی چمن کو بھی نصیب نہیں!

عہد محمد شاہ میں محمد حسن اور شام سندر کا واقعہ عظیم آباد سے دلی تک آگ لگا چکا تھا۔ وہی شام سندر جس کا واقعہ خدائے سخن میر تقی علیہ الرحمہ نے اپنی مثنوی شعلۂ عشق میں اس سرخی کے ساتھ قلمبند کیا ہے:-

"آغاز قصۂ جانکاہ کہ در عہد محمد شاہ در عظیم آباد روبرو دی وضیع و شریف بظہور پیوستہ"

جناب شوق نیموی مرحوم یادگار وطن میں لکھتے ہیں کہ محمد حسن عظیم آبادی کا مکان چھوٹی پٹن دیوی محلہ میں تھا۔ اور شام سندر عظیم آبادی کے نام پر سندر باڑا محلہ عظیم آباد چوک کے قریب باڑے کی گلی اور کچہری گلی کے درمیان واقع ہے۔ شام سندر ایک مہاجن کی لڑکی تھی۔ بہرکیف واقعۂ شام سندر سے تقریباً ڈیڑھ سو برس بعد اسی عظیم آباد میں تیغ محبت نے حیدر جان کو گھائل کیا تو جناب سلطان عظیم آبادی نے مثنوی دردِ دل لکھی۔ شام سندر کے عاشق نے ایک وصیت نامہ چھوڑا تھا جس کی اصل اب ناپید ہے۔ مگر نقل خواجہ عبداللہ تمنا سید عظیم آبادی نے شاہزادہ جہاندار کو بھیجی تھی۔ یہ نقل شوق نیموی کی یادگار وطن میں موجود ہے۔ حیدر جان کے عاشق نے بھی ایک خط لکھا تھا۔ وہ اصل خط راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے۔

انتخاب از نقل وصیت نامہ محمد حسن عظیم آبادی	انتخاب از اصل مکتوب ... عظیم آبادی
اے یارانِ وفاکیش ...... شما از حالِ من آوارۂ کوچۂ محن ...... محمد حسن آگاہی ندارید؟ و نائرہ شعلۂ عشق انگیز کہ ...... کاشانۂ دلم را خاک سیاہ نمودہ، ازاں بے خبر ہستید؟ شمع زخیکہ دلم را پروانہ وار کردہ، و آخر در سوگِ من جاں دادہ، در حقیقت دختر مہاجنے بود (اس سے مراد شام سندر ہے) کہ ...... روزے بلب دریا باد و دو چار شدم ...... از احبائے من میر محمد رضا کہ فی الحال بدلی ہستند مفصلاً آگاہی دارند۔ از ایشاں پرسید فی است ...... اکنوں بہ تحقیق پیوست کہ از روز بعد نصف شب شعلۂ بشکل بودج از آسماں سرخی زندہ و بہ آں روئے دریا (اس سے مراد گنگا پار ہے یعنی خواجہ کلاں گھاٹ کے اس پار جہاں چھتر کے میلے سے واپسی میں محمد حسن کی کشتی تباہ ہوئی تھی) فرود می آید	...... تب لوگوں نے (امراؤ سے) کہا کہ ارے ظالم! تجھکو عاشق و معشوق کے چھڑانے سے کیا مل جائے گا؟ (امراؤ نے) کہا تم نہیں جانتے؟ ...... (بہرکیف) یہاں ایک مہینہ تک اس قیامت کا صدمہ اور رنج تھا کہ بیان سے باہر ہے اور انھوں نے (حیدر جان نے) ایسا رنج کیا کہ علیل ہو گئیں۔ کبھی تو اُن کو اُس کے (امراؤ کے) بیان کا یقین ہوتا تھا۔ کبھی لوگوں کی گواہی اور میری قسموں پر اعتبار آتا تھا اور میں نے اس کا ایسا صدمہ اٹھایا کہ تین مہینے تک تپ آیا کہ ...... اب ہم کو اکثر صدمہ ہوتا ہے اور اگلی باتیں یاد کرکے رنج ہوتا ہے کہ یا اللہ یہ کیا ہو گیا ......

و بعدائے حسرت آمیز و لہجۂ درد انگیز مرا یاد می کند۔ نیک دانستم کہ روح پاک آں غیرت حور لاثانی (یعنی شام سندر)۔ ... بتلاش من زندہ در گور می آید۔ ہیہات ہیہات کہ من زندہ مانم و دعویٰ عشق بر زباں رانم!...۔"

واضح رہے کہ اس وصیت نامہ میں بار بار شعلۂ عشق کا ذکر ہے ملک الشعراء میر تقی نے یہی نام اپنی مثنوی کے لیے چن لیا

.... کیونکہ پندرہ برس کی محبت ہے۔ آج تک پندرہ برس ملاقات کو ہو گئے۔"

واضح رہے کہ اس تحریر میں بار بار درد دل کا بیان ہے۔ جناب سلطان عظیم آبادی نے یہی نام اپنی مثنوی کے لئے چن لیا۔

مثنوی دردِ دل کے علاوہ حیدر جان نے اپنا نقش عظیم آباد کی شاعری پر کہاں کہاں چھوڑا ہے اس پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ یہاں چند شعر ایک یادگار مشاعرہ کے لکھے جاتے ہیں۔ یہ اشعار طرحی غزل کے ہیں۔ ظاہرا انکو حیدر جان سے کوئی واسطہ نہیں۔ مگر غور سے دیکھئے تو بہت کچھ واسطہ ہے ۔

سلطان عظیم آبادی

باغ میں میلہ، میلہ میں جلسہ، جلسہ میں شیشہ، شیشہ میں بادہ
لالہ رخوں کی مست ادائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے!

موسم گل میں دیکھ گلوں کو۔ جوش طرب نے مست کیا ہے
پھٹ گئیں کیا کیا چست قبائیں۔ اُف ری جوانی ہائے زمانے

آنے کی اُن کے دھوم ہے سلطاں۔ پر ہے قیامت آنا کیا ہے
راہ میں کب تک آنکھیں بچھائیں۔ اُف ری جوانی ہائے زمانے!

جناب سلطان کے پہلے شعر میں لالہ رخوں سے مراد عظیم آباد کی ولیان شوخ و شیریں کار ہیں جو ہر سال برسات میں حیدر جان کے ہاں جھولا جھولنے آتی تھیں۔ اور دھانی جوڑے پاتی تھیں۔ جناب شاد کا پہلا شعر دیکھئے اور ان دھانی دوپٹوں کا [illegible] لطف اٹھا دیکھئے۔

جناب سلطان نے دوسرے شعر میں موسم گل کی جو تصویر کھینچی ہے۔ اس میں کسی کو شک ہو تو عبدالرحیم خانخاناں کا

شاد عظیم آبادی

کالی گھٹائیں۔ باغ میں میلے۔ دھانی دوپٹے۔ لٹ چھٹکائے
مجھ پہ یہ قدغن آپ نہ آئیں۔ اُف ری جوانی ہائے زمانے

اپنی ادا سے آپ جھجکنا۔ اپنی ہوا سے آپ کھٹکنا
چال میں لغزش۔ منھ پہ حیائیں۔ اف ری جوانی ہائے زمانے

شاد نہ وہ دیدار پرستی۔ اور نہ وہ بے نشہ کی مستی
تجکو کہاں سے ڈھونڈ کے لائیں۔ اف ری جوانی ہائے زمانے

جناب شاد کے پہلے شعر میں کالی گھٹائیں ہیں۔ اسکا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ پری جمالوں کا جمگھٹ تھا۔ اُس جگہ جہاں آج پٹنہ محمڈن اسکول ہے۔ ہوا بند تھی۔ گرمی سخت تھی۔ آسمان پر بادل کا نام نہیں۔ مہمانوں نے میزبان سے یعنی حیدر جان سے کہا کہ۔ تمہارے [illegible] آسمان کا یہ رنگ؟ حیدر جان نے کہا۔ میں کچھ خدا تو ہوں نہیں۔ تم لوگ کفر بکتی ہو۔
اس کے بعد حیدر جان کا جھولے کی طرف بڑھنا۔ جھولے کا

ایک دو ہا ملاحظہ ہو ؎

بار بار درجن گھر جھگرت عطا ٹر
جوئی جوئی انگیا سیوت۔ سوئی سوئی کاڑھ

یعنی یہ جھگڑا کچھ آج کا نیا جھگڑا نہیں ہے۔ اسکو جب دیکھو جب دیکھو کہ درزن کے گھر کھڑی ہوئی جھگڑ رہی ہے۔ کہہ رہی ہے کہ انگیا ہم نے تجکو دی تھی درست کرنے کے لئے یا اور تنگ کر دینے کے لئے تو یقینی چور ہے!

جوئی جوئی انگیا سیوت — یعنی جیسے جیسے تو انگیا سیتی ہے
سوئی سوئی کاڑھ — یعنی ویسے ویسے تو کپڑا اور کاڑھ (نکال) لیتی ہے۔

کہیں جواب ہے اس الھڑپن کا؟ جرم موسم گل کا۔ اور چور بنائی جا رہی ہے درزن!

جناب سلطان کا مقطع بول رہا ہے کہ حیدر جان اسوقت لکھنؤ میں ہے۔ نامۂ شوق جا چکا ہے۔ قاصد کا ہر روز انتظار ہے۔ حیدر جان کسی طرح آ نہیں چکتی۔ اور عظیم آباد میں یہ کسی کو ابھی تک خبر ہی نہیں کہ ؎

"مثل یوسف ہوئی زلیخا قید"؟

پلنگ میں آنا۔ حیدر جان کا کھری لگانا۔ ہوا کا چلنا۔ زلفوں کا ہوا میں لہرانا۔ آسمان کا گھٹا ٹوپ ہونا۔ صاحب کی فیکو فن کا اپنی ایک کنیز کی ہٹ رکھ لینا۔ سقائے ابر کا اپنی مشک کی گرہ کھول دینا اور مہمانوں کا انگشت بدنداں ہونا یہ سماں وہ تھا جو عظیم آباد دیکھ چکا ہے!

جناب شاد کا دوسرا شعر ہے۔ اپنی ادا سے آپ جھجکنا اپنی ہوا سے آپ کھٹکنا۔ چال میں لغزش۔ منھ پہ حیا ہیں۔ یہ تصویر یاد ہیں بخیر خود حیدر جان کے ہاتھوں کی کھینچی ہوئی تصویر ہے ؎

چال البیلی۔ نیچی نظر نویلی!

جناب شاد کے مشہور مستزاد کا ایک شعر ہے ؎

رس بھری ہائے وہ آنکھیں تری کالی کالی۔ بے پئے متوالی
سانولا رنگ، نمک زیر جراحات جفا، اف کہاں دھیان گیا؟

یہ تصویر بھی پہچانی ہوئی ہے ؎

توری سانوری صورت مورا من بھائے
مدھ بھری انکھیاں۔ کجرا سہائے

اب معلوم ہوا کہ شاعر کا دھیان کہاں گیا تھا!

اب سوال یہ ہے کہ سلطان عظیم آبادی کون تھے؟ اس کا جواب شاد عظیم آبادی کے قلم سے سنئے ؎

(۱) عنوان نامۂ شاد بنام سلطان:-

شفیق حال دل مبتلائے کاکل یار — انیس خلوت راز و جلیس عاشق زار
کرم نہاد خطا پوش و خسرو ذیشاں — تمام ہند مروت کے سرور سلطاں
خدا جہاں میں سلامت رکھے قیامت تک — قریب آنہ سکے تیرے کوئی آفت تک

بصد نیاز و بصد امتیاز و رسم قدیم　　قبول: مت عالی میں ہو مری تسلیم

(۲) حیات فریاد مؤلفہ شاد عظیم آبادی ص ۱۹۰

"نواب سید تجمل حسین خاں عرف سید سلطان مرزا صاحب تخلص سلطان خلف نواب بہادر نواب سید ولایت علی خاں مرحوم سلطان میرزا صاحب مرحوم نہایت شہ زور۔ خوشرو۔ خوش گفتار خلق مجسم۔ رئیس ابن رئیس تھے۔ بہت کم عمری میں انتقال کیا۔ گو ان کے انتقال کو ۲۵۔ ۲۶ سال ہوئے۔ لیکن اہل عظیم آباد کے دلوں سے انکی یاد بھولی نہیں ہے۔ انکی ہمشیر کے پوتے نواب سید اسمٰعیل خاں بہادر عرف تجن نواب صاحب انکی یادگار ہیں۔ سلطان صاحب مرحوم کو شاعری میں تلمذ میر فرزند احمد صفیر بلگرامی سے تھا"

غالب کی ایک مشہور غزل کے دو شعر ہیں ؂

دیکھے خلق کو بھی۔ تا اُسے نظر نہ لگے　　بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا　　کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے

اگرچہ یہ جامہ کسی اور کے لئے قطع ہوا تھا۔ مگر نواب سید تجمل حسین خاں عظیم آبادی کے جسم پر بھی ٹھیک ہو رہا ہے ذرا جھول نہیں ہے۔

جناب سلطان عظیم آبادی اپنے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"........ میری کیا لیاقت تھی کہ شاعروں کے زمرے میں فروغ پاؤں۔ مگر یہ سب فیض اوستاد کامل الفن سخن آموز سخن حضرت صفیر بلگرامی کا ہے کہ آج ۱۴ برس سے سوائے اُن کے کسی سے فیض نہیں پایا اور انھوں نے شفقت سے بہت کچھ بتایا سنہ ۱۲۹۷ھ میں بدولت خانۂ سید علی محمد صاحب شاد شاگردی کا اتفاق ہوا۔ اس چودہ برس کے زمانے میں دو دیوان عاصی کے مرتب ہیں۔ ایک دیوان بحر خفیف کا۔ دوسرا مختلف اور بحروں میں۔ اور دو مثنویاں تیار ہیں ...."

ان دو مثنویوں میں ایک مثنوی دردِ دل ہے جس کا انتخاب گذر چکا ہے۔ اب ایک رباعی ملاحظہ ہو ؂

شہرہ جو یہ میری خوش کلامی کا ہے　　یہ شور جو میری نیک نامی کا ہے

واللہ ہزار میں کہوں گا سلطاں　　سب فیض صفیر بلگرامی کا ہے

مثنوی دردِ دل کے بارے میں جناب سلطان کا ایک خط حضرت صفیر بلگرامی کو گیا تھا۔ وہ یہ ہے :۔

"حضرت اوستاد صاحب قبلہ و کعبہ دام ظلہٗ۔ تسلیم۔ حضور نے بندہ سے فرمایا تھا کہ جب میں آرہ اپنے مکان پر جاؤنگا تمھارا آدمی اپنے ہمراہ لیتا جاؤنگا۔ ...... بلکہ میں نے میر پناہ علی کے بیٹے جو حضور کے حکم سے میرے پاس واسطے لینے کتاب یدبیضا کے آئے تھے اون سے میں نے کہا تھا کہ جناب اوستاد صاحب کی خدمت میں عرض کرنا کہ حضور کب تشریف لے جائیں گے؟ آدمی میرا آپ کے ساتھ جائے گا ...... اور میری غزلوں کی کتاب حضور کے پاس ہے اور مثنوی بھی حقیر کی آپکے پاس ہے۔

امیدوار ہوں کہ از راہ شاگرد نوازی مثنوی اصلاح دیکر اور تمام فرماکر عنایت ہو کہ ۔۔۔۔۔۔۔ یہ ہماری یادگار رہ جائیگی ۔۔۔۔۔ میں وہی سلطان ہوں جو تھا اور وہی شاگرد ہوں جو تھا۔ آج یہ عریضہ نہایت رنج وغم میں تحریر ہوا۔ از خورداں خطا واز بزرگاں عطا ۔۔۔۔۔۔ پس امیدوار ہوں کہ کتاب غزلوں کی اور مثنوی اصلاح فرماکر یا خود حضور کے ہمراہ آئے۔ یا آدمی روانہ کردں۔ اوسکو عنایت ہو۔

"نامہ سیاہ سید تجمل حسین خاں"

یہ سب کچھ ہوا۔ مگر سلطان و شاد و صفیر کو اب تک کسی نے پہچانا نہیں۔ یہ وہی س۔ش۔ص ہیں جن کے لئے ایک دن عظیم آباد اور آرہ کی طنابیں کھنچ گئی تھیں اور جن کے لئے تقضاء قدرت نے نواب بہادر کے صحن میں اپنا جال بچھایا تھا۔ اوس صحن میں آٹھ اور گیارہ برس کی عمر کے دو لڑکے ایک مونڈھے سے کھیل رہے تھے اور ایک پردیسی اپنے اشعار سنا رہا تھا۔

آٹھ برس کا لڑکا سلطان عظیم آبادی۔ گیارہ برس کا لڑکا شاد عظیم آبادی اور پردیسی صفیر بلگرامی۔ وہ پردیسی نواب بہادر کا رقعۂ نوید پاکر شرکتِ تقریب کے لئے آرہ سے عظیم آباد آیا تھا۔

باب دوم دربیان ش

میرزا اہلی شیرازی کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

جانم بروزِ واقعہ پہلوئے او کنید   اوقبلۂ من است۔ رخم سوئے او کنید

اوقبلۂ من است اور رخم سوئے او کنید کا معمّا اسوقت حل ہوا جب میرزا اہلی شیرازی کو خواجہ حافظ شیرازی کے پہلو میں جگہ ملی۔ اور سنگِ مزار پر یہی غزل کندہ ہوئی۔ رحلتِ حافظ کی تاریخ خاکِ مصلّٰی (۷۹۲) اور رحلت اہلی کی تاریخ بادشاہِ شعرا بود اہلی (۹۴۲) اسکا مطلب یہ ہوا کہ ایران میں ڈیڑھ سو برس تک ایک شخص بھی اس اہلیت کا نہ مل سکا کہ حافظ کے پہلو میں جگہ پاتا۔ اسکا اہل صرف اہلی شیرازی تھا جو عالمِ غیب میں آج تک حضرت لسان الغیب سے غیب کی باتیں کر رہا ہے۔

میرزا اہلی شیرازی کا برادر عینی میرزا محمد ہاشم شیرازی۔ ہاشم کا چراغ ملّا محمد رفیع شیرازی۔ رفیع کا پارۂ دل ملّا غلام محمد شیرازی۔ ملّا غلام محمد کا ماہِ دوہفتہ میرزا غلام حسین۔ یہ چاند اکبر آباد میں دیکھا گیا۔ یعنی حضرت جلال الدین شاہ عالم بادشاہ غازی نے ۱۳ جلوس میں اس بچہ کی پیدائش کی خبر سنی تو پرورش کے لئے خزانۂ عامرہ سے

ایک سو روپیہ ماہانہ وظیفہ عطا فرمایا۔ فرمان شاہی مورخہ رمضان المبارک سنہ ۱۱۹۰ھ ہجری کے الفاظ یہ ہیں :۔

لطیفہ جس میرزا غلام حسین کی پرورش خود حضرت شاہ عالم بادشاہ دہلی نے کی اُسکو مولوی عبد الغفور خاں نساخ تعصب کی راہ سے کاغذ فروش لکھنوی لکھتے ہیں (تذکرہ سخن شعرا ص ۱۵۰) میرزا غلام حسین کا سنگین جرم یہ تھا کہ مرزا دبیر لکھنوی کے وہ باپ تھے۔ اور میرزا دبیر کا سنگین جرم یہ تھا کہ لیلائے شاعری اُن کے قدم چومتی تھی۔ نساخ کو اس کی تاب کہاں؟ نساخ کا ادنیٰ کمال یہ ہے کہ شہنشاہِ اقلیم سخن میر انیس کے بارے میں فرماتے ہیں (ص ۵۶) :۔ "سوائے مرثیہ کے اور کسی صنفِ سخن میں مطلق دخل نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ مرثیہ بھی انکا ایسا نہیں کہ عیوبِ شاعری سے پاک ہو"۔ اور پھر میر انیس کی رسوائی کیلئے نمونۂ کلام میں صرف تین شعر دئے

ہوا ہے۔ ابر ہے۔ ساقی ہے۔ مے ہے   پر اک تو ہی نہیں۔ افسوس۔ ہے ہے

کس سے ای شوخ ہوئی رات کو ہاتھا پائی   نورتن آج جو ڈھلکا ہے ترے بازو سے
کل تو آغوش میں شوخی نے ٹھہرنے نہ دیا   آج کی شب تو نکل جاؤ مرے قابو سے

حضرت غالب نے اسی موقع کے لئے کہا تھا ؎ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے!

۔ نساخ کو اکثر فضلائے روزگار سے خلش تھی۔ حضرت شاہ الفت حسین صاحب فریاد عظیم آبادی کے بارے میں پہلے تو یہ لکھا کہ اپنی شاعری کا بہت غرور رکھتے ہیں اور پھر انتخاب میں صرف دو شعر دئے جس میں ایک شعر یہ ہے (ص ۳۶۷)

نفس کو نالۂ دل سے اسیر درد کرتے ہیں   صبا کے پاؤں میں زنجیر بوئے گل سے بھرتے ہیں

مصرعۂ ثانی مہمل ہے کیونکہ زنجیر بھرنا کوئی محاورہ نہیں ہے۔ مگر نساخ کو ثابت بھی یہی کرنا ہے کہ فریاد عظیم آبادی اگرچہ اپنی شاعری کا بہت غرور رکھتے ہیں مگر جاہل ہیں۔

نساخ نے میر انیس و میرزا دبیر کے کلام میں غلطیاں نکالیں اور رسالۂ انتخاب نقص شائع کیا اسکا جواب حضرت ناسخ کے شاگرد مرزا محمد رضا معجز نے رسالۂ نسخ النساخ میں دیا۔ مطبوعہ سنہ ۱۲۹۶ ہجری مطبع شعلۂ طور کانپور۔ اعتراضات نساخ کا نمونہ یہ ہے

یاں تیغ جگر بند علی میان سے نکلی   کس زرق سے کس برق سے کس شان سے نکلی
(میر انیس)

اعتراض یہ تھا کہ توابع کا جدا ہونا جائز نہیں۔ اسلئے زرق برق کو جدا کرنا غلط ہے۔ جواب دیا گیا کہ فارسی میں توابع کے درمیان واؤ عاطفہ لاتے ہیں مثلاً زرق و برق۔ گفت و شنید اور اسی کا نام جدا کرنا ہے۔ چنانچہ خانِ آرزو کا فیصلہ ہو چکا ہے :۔

"آنچہ نوشتہ کہ تابع بہ عطف مستعمل نہ شود غلط صریح است"

اور میر انیس کی طرح نیشاپوری بھی فرماتے ہیں ؎

نو بحق بر لبِ نغلیسری خوش   عشق در گفت و در شنود آمد

دریں وقت میمنت اقتران از وقایع مولود فرزند ملا غلام محمد نواده ملا ہاشم شیرازی و نام نہاد مسمیٰ غلام حسین
بہ سمع ہمایوں رسیدہ۔ حکم جہاں مطاع عالم مطیع بنام خازنِ خزانۂ عامرہ سلطانی بارشاد ماموری یکصد روپیہ سکۂ
ماہانہ مصارف مرضعہ وغیرہ ہم شرف صدور فرمودہ ... ... "

میرزا غلام حسین کا لختِ جگر میرزا سلامت علی وہ سلامت علی جس کے گھر دولتِ سیادت بھی ہاتھ باندھے آئی۔
یعنی سیدہ بی بی بلبل ہزار داستان میر انشاءاللہ خاں کی حقیقی نواسی سیدہ بی بی بنت میر معصوم علی۔ اور میر معصوم علی؟

بود اوزوجِ دخترِ انشا سید و شاعرِ فصیح زباں!

میرزا سلامت علی کون؟ تخلص دبیر۔ شاگرد میر مظفر حسین ضمیر۔ اوستاد ضمیر اپنے شاگرد دبیر کو دیکھ کر باغ باغ ہوا جاتا ہے۔ پھولا نہیں سماتا۔ خط میں لکھتا ہے:۔ "برہانِ من۔ اسنادِ من۔ اعتنادِ من۔ اعتمادِ من سلمہ اللہ تعالیٰ۔"

میرزا سلامت علی دبیر وہ ہیں جن کے غلاموں کی فہرست میں خود سلطان ابن سلطان خاقان ابن خاقان حضرت جہانِ عالم محمد واجد علی شاہ نے اپنا نام لکھوایا تھا۔ ثبوت؟ ثبوت یہ کہ:۔

"...... روزے در مجلس بالائے منبر بحضور اعلیحضرت بخواندن مرثیہ اتفاق افتاد۔ ناگاہ شامیانہ کہ بالائے منبر ہمچو ابرِ رحمت سایہ گستر بود از ہوا پراگندہ گشتہ یکسو شد۔ و عکس آفتاب بر روی آنجناب افتاد۔ فی الفور ظل اللہ چتر خود طلبیدہ، و چتر بدست خود گرفتہ قریب منبر استادہ" تا اختتامِ مرثیہ سایہ افگن ماند...... "

شمس الضحیٰ مصنفۂ مولوی صفدر حسین ص ۱۶۶۔

لکھنؤ کا واقعہ ہے کہ مجلس عزا میں ایک دن اعلیحضرت واجد علی شاہ بھی شریک تھے۔ منبر پہ میرزا دبیر۔ بالائے سر شامیانہ۔ اتنے میں ہوا جو زور سے چلی تو شامیانہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ اعلیحضرت نے دیکھا کہ میرزا دبیر کے رخ پر دھوپ ہے۔ فوراً چترِ شاہی طلب فرمایا خود اٹھ کھڑے ہوئے۔ منبر کے پاس تشریف لے گئے۔ اپنے ہاتھ میں چتر لیا۔ اور میرزا دبیر کے سر پر سایہ کیا۔
جب تک تاجدارِ ملکِ سخن منبر پر جلوہ فرماتا رہا تب تک تاجدارِ ملک اودھ چتر برداری کی خدمت بجا لاتا رہا

نازبرداری اسکو کہتے ہیں۔ مجنوں بھی لیلیٰ کی کفش برداری کرتا تو اس سے زیادہ کیا کرتا؟ — اودھ کی تباہی کے بعد ۱۲۷۴ھ ہجری میں جب امام باندی بیگم صاحبہ نے میرزا دبیر کو عظیم آباد آنے کی تکلیف دی۔ اور میرزا دبیر منبر پر تشریف لے گئے تو یہ رباعی پڑھی

جو پھول کبھی نہ بوستاں سے نکلے — اس دور میں جورِ آسماں سے نکلے
صد شکر کہ شہرِ لکھنؤ تھا جنت — آدم ٹھہرے۔ جو ہم جناں سے نکلے

مطلب یہ کہ جب تک جنت تھی تب تک عالمِ سرور تھا۔ بیداری کیسی؟ عالمِ خواب تھا! ہم کون ہیں؟ یہ جانتا کون تھا؟ جب وہ جنت چھن گئی تب آنکھ کھلی۔ مدہوشی کیسی؟ خمار تھا! آدم کو اب معلوم ہوا کہ وہ آدم ہے۔ آدم کی پہچان یہی ہے کہ وہ جنت سے نکال جائے۔ جو نکالا نہیں گیا وہ آدم نہیں۔

میرزادبیر نے ایک دوسری رباعی امام باندی بیگم کے امام باڑہ میں پڑھی اسکا چوتھا مصرع تھا ؎

پختہ جو ثمر ہوا۔ چمن سے نکلا!

مطلب یہ کہ پھل جب تک لکھنؤ میں تھا خام تھا۔ خام کو پوچھتا کون ہے؟ پھل جب پوچھنے کے قابل ہوا تو گاہک بھی دوڑ آیا۔ گاہک کون کہ عظیم آباد۔ اس گاہک کو دیکھو کہ ڈالی ہاں ہاں کرتی ہی رہی اور یہ پھل توڑ ہی لایا۔ مگر اسکا رونا کیا؟ ڈالی سے جدائی تو پھل کی قسمت میں روزِ ازل سے لکھی ہوئی ہے۔

جس روز یہ رباعی گلزارِ باغ میں پڑھی گئی اُسی روز سہ پہر کو بانکی پور میں چوہٹہ پر میر اسمٰعیل کے ہاں مجلس تھی۔ مجمع تھا مگر مجلس شروع نہیں ہوئی تھی۔ لوگ ابھی آرہے تھے۔ مجلس میں میرزادبیر پر تبصرہ ہو رہا تھا۔ میر جان علی اصدقی عظیم آبادی شاگرد نثار علی وکیل عدالت باقر گنج نے کہا کہ — صاحبو! میرزادبیر فرماتے ہیں ؎ "پختہ جو ثمر ہوا۔ چمن سے نکلا" سوال یہ ہے کہ چمن میں پھول ہوتا ہے یا پھل؟ سب کے کان کھڑے ہوئے۔ ہر طرف سے آواز آئی کہ — پھول! پھول! پھول! — مگر ایک اجنبی جو ابھی ابھی صحن میں داخل ہوا تھا بول اٹھا کہ — پھول بھی۔ پھل بھی! حضرت سودا فرماتے ہیں ؎

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی | او خانہ بر اندازِ چمن! کچھ تو ادھر بھی

اجنبی کو مجمع نے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پوچھا آپ کون؟ اجنبی نے جواب دیا ؎

انتخابِ زمانہ ہوں میں صفیر | کہ وطن بلگرام ہے میرا

وہاں عصائے موسیٰ نے دریائے نیل کو' اور یہاں اس واقعہ نے بانکی پور کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا — اہلِ یقین اور اہلِ شک۔

اہلِ یقین صفیر بلگرامی کا کلمہ پڑھنے لگے۔ میر جان علی اصدقی پہلے خود شاگرد ہوئے۔ پھر میر رفعت حسین و میر کفایت حسین اپنے بھانجوں کو استاد کی خدمت میں پیش کیا۔ بڑے بھانجے نے کبیر اور چھوٹے نے صغیر تخلص پایا۔ مولوی محمد بخش شائق عظیم آبادی نے اصرار کیا کہ عظیم الاخبار کا کام آپ اپنے ہاتھ میں لیں۔ نواب سید الطاف حسین خاں رئیس باڑھ مقیم باقر گنج نے کہا کہ ڈپٹی سید حسین علی کو آپ کی میزبانی کا کوئی حق نہیں ہے۔ خاندانی مراسم کی رو سے یہ حق ہمارا ہے۔ اسی طرح سیکڑوں قدرداں پیدا ہو گئے۔ اور اس قدردانی نے صفیر بلگرامی کو آرہ نہیں جانے دیا۔ اسی زمانے میں نواب سید الطاف حسین خاں رئیس باڑھ کی فرمائش سے

صفیر بلگرامی نے آٹھ سَو صفحوں کی ایک کتاب فارسی زبان میں "مرغوب القلوب" نام، مذہب واخلاق میں تالیف کی ۔ چند سطریں ملاحظہ ہوں :۔

گویند وقتے ابلیس نزد فرعون آمد۔ وشاخے از انگور دست گرفتہ بود۔ بفرعون گفت کہ ہیچ کس می تواند کہ این خوشہ را مروارید کند؟ فرعون گفت نہ۔ ابلیس درحال یک دم بدمید۔ مروارید گشت۔ فرعون تعجب کرد وگفت عجب استادی۔ ابلیس سیلی برگردن فرعون ۔ زد وگفت مرا بایں استادی بہ بندگی قبول نہ کردو تو بایں نادانی دعوی خدائی چوں کنی؟

ابلیس ہاتھ میں انگور کا خوشہ لئے ہوئے ایک مرتبہ فرعون کے پاس پہونچا۔ پوچھا ـــــ ہے کوئی یہاں ایسا جو ان انگور کے دانوں کو موتی کردے؟ فرعون نے کہا۔ نہیں! تب ابلیس نے ایک ہی پھونک میں خوشۂ انگور کو موتیوں کا گچھا بنادیا۔ فرعون کو بڑا اچنبھا ہوا۔ کہا کہ او استادی اسکو کہتے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ ابلیس نے فرعون کی گردن پر ایک مکّا مارا۔ اور کہا ـــــ مردود! اس استادی پر بھی تو بندگی ہماری اُس جناب میں قبول نہیں ہوئی۔ اور تو ابوجہل ہوکر آیا ہے خدائی کا دعویٰ کرنے؟

صفیر بلگرامی کی کتاب مرغوب القلوب ایک مرتبہ نواب سہراب جنگ بہادر نے نواب سید الطاف حسین خاں سے دیکھنے کو لی۔ اور اس رقعہ کے ساتھ واپس کی :ـــ

"الطاف گستر بے پایاں۔ سلامت!

اخلاص پرست یکرنگ، بندۂ بے ریا سہراب جنگ بدیں رنگ مدعا طراز۔ نسخۂ مرغوب القلوب کہ بہت مطالعہ از ان الطاف گستر آوردہ بودم الاول آخرہ مطالعہ نمودہ بصحابت حامل واپس می دارم ـ ..... بمطالعہ نسخۂ مذکور خیلے محظوظ شدم۔ ومؤلف را، وآں شفیق راکہ باعث تالیف ہستند، بدعائے خیر یاد کردم۔ وشک نیست کہ آں الطاف گستر از تالیف کنانیدن نسخۂ مذکور خیلے ماجور ومثاب شدند۔ خدا جزائے خیر دہاد۔ بہ محمدٍ وآلہ الامجاد۔

زیادہ والسلام خیر الانام۔ سہراب جنگ عفی عنہ۔ یوم الادینہ"

اس رقعہ سے معلوم ہوگا کہ آج سے ستر برس پہلے بانکی پور اور عظیم آباد کی کیا فضا تھی۔ غالب فرماتے ہیں :ـــ

جاہ زعلم بے خبر۔ علم زجاہ بے نیاز

مگر یہ رقعہ شاہد ہے کہ نواب سہراب جنگ بہادر کے ایسے ذی جاہ بھی علم سے باخبر تھے۔ اہل علم کی قدر کرتے تھے۔ عربی و فارسی تصانیف کے پڑھنے کا ذوق رکھتے تھے۔ منشیانہ فارسی قلم برداشتہ لکھتے تھے اور شب وروز فضائے علم میں بسر کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دلی اور لکھنؤ کی خزاں بہار پر تھی۔ اور بہار کی ملکہ پچھم سے منہ موڑکر پورب میں، یعنی عظیم آباد میں جلوہ فرما تھی۔

چمن آتشِ گل سے دہکا ہوا ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا

جب حالت یہ تھی تو ظاہر ہے کہ کسی بیرونی شخص کا عظیم آباد میں فروغ پانا آسان نہ تھا۔

چنانچہ اہلِ شک نے کہا کہ بلگرام خطۂ یونان سہی مگر بغیر اچھی طرح سمجھے بوجھے کسی کو یوں ہی مان لینا درست نہیں۔ اس فیصلہ کی روسے باقر گنج دار الامتحان قرار پایا۔ اور میر تمت علی حشمت کے ہاں مشاعرے شروع ہوئے۔ مشاعرے نہیں۔ معرکے شروع ہوئے یہ آگ بڑھتے بڑھتے شہر عظیم آباد پہونچی۔ وہاں ایک مرتبہ خالہ گذری میں نواب سید محمد حسین خاں بیحرقی شاگرد ناظر وزیر علی عبرتی کے ہاں مشاعرہ تھا۔ یہ عظیم آباد کا پہلا مشاعرہ تھا جس میں صفیر بلگرامی کی شرکت ہوئی۔ طرح میں جو غزل انھوں نے پڑھی بہت دقیق تھی۔ اہلِ شک کو موقع ملا۔ مولوی یوسف علی شہید شاگرد نجم نے کہا کہ سر مشاعرہ امتحان ہونا چاہئے۔ صفیر بلگرامی نے کہا بسم اللہ! اُسی وقت مشاعرہ میں دیوانِ ناسخ لایا گیا۔ کھولا گیا تو یہ غزل نکلی ؎

(۱)	ہے دلا کسکو دوام اس گردشِ افلاک میں	خاک کے نیچے ہزاروں مل گئے ہیں خاک میں
(۷)	کہہ رہی ہے یہ لبِ جو پر زبانِ موج سے	پاک میں ہو کب وہ کیفیت جو ہے ناپاک میں
(۱۰)	مست عالم کو کیا چشمِ سیاہِ یار نے	ساغرِ مے کا ہے عالم ساغرِ تریاک میں

ممتحن نے خیال کیا کہ افلاک میں۔ خاک میں پامال زمین ہے۔ ممکن ہے صفیر بلگرامی کی غزل اس زمین میں پہلے سے موجود ہو۔ اور نہ بھی ہو تو وہ امتحان ہی کیا جس میں لوہے کے چنے نہ چبائے جائیں۔ اس لئے حضرت ناسخ کے ساتویں شعر کا پہلا مصرع دیا گیا۔ یعنی ؎ "کہہ رہی ہے یہ لبِ جو پر زبانِ موج سے" — صفیر بلگرامی نے فی البدیہہ ۲۱ شعر کی دو غزلیں کہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مستِ استغنا نہ ہو۔ سن لے بیانِ موج سے
ہے لبِ ساغر سے کچھ کہتی زبانِ موج سے

عکس تیرا جب پڑا ساقی میانِ موج سے
سایۂ افگن خم سے ہوگا سائبانِ موج سے

دُردِ مے اسکی زمیں ہے۔ تو حباب سے فلک
دیکھ لے ساقی زمین و آسمانِ موج سے

پی کے مے سیرِ جہانِ لامکاں کر شوق سے
عالمِ امکاں سے باہر ہے جہانِ موج سے

چشمِ مست ساقیٔ خود بیں ہے کیا جامِ شراب
آنکھ کے ڈوروں پہ مجکو ہے گمانِ موج سے

جستجو اسکو ہے یہ کس یوسفِ گم گشتہ کی
گردشوں میں رات دن ہے کاروانِ موج سے

جس سے دو باتیں ہوئیں وہ مست و بیخود ہو گیا
آپ کی موجِ تبسم میں ہے شانِ موج سے

عیش میں بھی بانکپن سفاک کا جاتا نہیں
وقتِ مینوشی ہے ہاتھوں میں کمانِ موج سے

— اے صفیر اک اور لکھئے ابتو مستانہ غزل
یاروں کو منظور ہے یاں امتحانِ موج سے —

صفیر بلگرامی یہ غزل کہہ کر اُٹھے تو یوسف علی شہید نے انگشت شہادت اٹھائی اور کہا کہ لاریب قادر الکلامی اسکو کہتے ہیں ۔ مگر ایک دوسرے مشاعرہ میں جوش نے کہا کہ شاعر ہم اُسی کو مانیں گے جو خنجر تہِ خنجر باندھ کر دکھلا دے ۔ صفیر بلگرامی نے ۱۲ شعر کی فی البدیہہ غزل کہی ۔ دس شعر یہ ہیں ؂

تھامے ہوں تری زلفِ معنبر تہِ خنجر　　ہے سلسلۂ عمرِ خضر در تہِ خنجر
خنجر کو جو دیکھا تو بندھا ابروؤں کا دھیان　　پڑھنے لگا میں بچھو کا منتر تہِ خنجر
سفاک نے رگڑا جو دیا حلق پہ میرے　　بل کھا گیا میں صورتِ خنجر تہِ خنجر
قاتل مری میت پہ رہے تیغ کا سایہ　　جائے بھی تو اک شۂ خنجر تہِ خنجر
سر دینا بھی مجھ عاشق جانباز کو ہے کھیل　　دیکھا کیا میں جوہرِ خنجر تہِ خنجر
جس طرح سے جی چاہے مجھے قتل کرو تم　　تڑپونگا نہ اے صاحبِ خنجر تہِ خنجر
اک خنجرِ ابرو نہیں پلکیں بھی ہیں نیچے　　رکھے ہیں وہاں سیکڑوں خنجر تہِ خنجر
کہنے لگا سرمہ کی وہ تحریر دکھا کر　　خنجر تہِ خنجر ہے یہ خنجر تہِ خنجر
ہے جوش کو دعویٰ یہ کہ شاعر اُسے سمجھوں　　باندھے جو کوئی قافیہ خنجر تہِ خنجر

شاعر مجھے کہتے ہیں صفیر سخن آرا
یوں باندھتے ہیں قافیہ خنجر تہِ خنجر

اسی طرح نئی نئی اور سنگلاخ زمینوں میں سات امتحان لئے گئے ۔ چنانچہ صفیر بلگرامی فرماتے ہیں ؂

کام رستم کا نہ تھا ۔ جو کیا فردوسی نے　　نہیں ہر ایک سے کھنچتی ہے کمانِ شاعر

رستم یعنی ہفت خوانِ رستم ۔ فردوسی یعنی شاہنامہ ۔ مطلب یہ کہ رستم سے اگر کہا جاتا کہ کمانِ موج سے تیر اندازی کر اور جوہر خنجر تہِ خنجر دکھلا تو وہ کمان اپنے ہاتھوں سے پھینک دیتا ۔ اور خنجر اپنے سینہ میں بھونک لیتا ۔ امتحان کبھی نہ دیتا ۔ ہفت خوانِ رستم کو ان سات امتحانوں سے کیا نسبت جو عظیم آباد میں لئے گئے ۔ رستم فردوسی نہیں ہو سکتا ۔

میدانِ جنگ میں آج سناٹا ہے ۔ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ وہی عظیم آباد ہے وہی گذری ہے جہاں ہجرتی عظیم آبادی کے مشاعرے ہوتے تھے ۔ شہید و جوش مسلح ہو کر آتے تھے ۔ توپیں سر ہوتی تھیں چھتیں اُڑتی تھیں ۔ دیواریں ناپید ہوتی تھیں ۔ آج ہر طرف سناٹا ہے بقول حضرت صفیر بلگرامی ؂　　زمینِ سخن میں پڑے سو رہے ہیں　　شہیدانِ تیغِ سخن کیسے کیسے !

ان شہیدانِ تیغِ سخن میں جناب بدر آروی بھی ہیں جن کی مدح میں میر عنایت حسین صاحب امداد عظیم آبادی شاگرد شاد

شادؔ عظیم آبادی فرماتے ہیں ؎

مرقع محنتوں کا ہے یہ دیواں — ریاضت ہائے عمر بے وفا ہے
یہ اب مقبول ارباب سخن ہو — یہی امداد خستہ کی دعا ہے
نہ کیوں ہو شان استادی نمایاں — کہ یہ تصنیف بدر بے ریا ہے
یہ وہ اہل ہنر ہے صاحب فن — وطن میں اس کا شہرہ جابجا ہے
خلیق و خوش مزاج و با مروت — شکستہ نفس و خوشخو با وفا ہے
نہ دیکھا انکسار نفس ایسا — خودی جس میں نہ مطلق ادعا ہے

شکستگی النفس کے ثبوت میں جناب بدرؔ آروی کا ایک خط ملاحظہ ہو :-

"عزیز گرامی مولوی سید وصی احمد صاحب بلگرامی - بخیریت رہکر نوید صحت مزاج کا خواستگار ہوں - میرا دیوان ۲۸ جزوں پر چھپ کر تیار ہو گیا - ...... یہ دیوان آپ کے جد امجد (حضرت صفیر بلگرامی) بہشت مکان کی زندہ یادگار ہے - ناپسند ہونے پر بھی ایک جلد آپ کی الماری میں ہونا ضرور ہے -

بذل زنداں کردم از ساقی گرفتہ جام مُل ! — نذر سلطاں ساختم از باغ سلطاں چند گل !

حضرت استادی علیہ الرحمہ کی کفش برداری کا فیض ہے جو دیوان کی شکل میں آپکی آنکھوں کے سامنے ہے - آپ کی چیز ہے - آپ کے گھر کی چیز ہے ......"

سید محمد امیر حسن بدر
آرہ - یکم مارچ ۱۹۲۹ء روز جمعہ

اس خط میں زندہ یادگار کی تشریح کے لئے ایک دفتر چاہئے - مختصر یہ کہ آج عظیم آباد کا میدان جنگ خموش ہے - گزشتہ چہتر برس پہلے جو توپیں وہاں سر ہوئی تھیں اُنکا دھواں اب تک اُڑ رہا ہے - اُن معرکوں کی یاد اب تک تازہ ہے - یعنی جن زمینوں میں صفیر بلگرامی کا عظیم آباد میں امتحان ہوا تھا اُن زمینوں میں ایک مدت دراز کے بعد جناب بدرؔ نے اپنے استاد کی اجازت سے غزلیں کہیں اور پتھر کو پانی کی طرح بہا دیا ؎

	صفیر بلگرامی	بدر آروی
(۱)	شاعر مجھے کہتے ہیں صفیر سخن آرا یوں باندھتے ہیں قافیہ خنجر تہ خنجر	اے بدر بجا حضرت استاد کا ہے قول یوں باندھتے ہیں قافیہ خنجر تہ خنجر
(۲)	اے صفیر اک اور کہئے اب تو مستانہ غزل یاروں کو منظور ہے یاں امتحانِ موج مے	بدر لکھتا ہوں ابھی اک اور مستانہ غزل ہے طبیعت موج پر پانی لبانِ موج مے

زبانِ موج مے کی زمین میں حضرت صفیر بلگرامی نے ۲۱ شعر کہے تھے جناب بدر نے ۱۸ شعر کہے اور ۱۲ قوافی باندھے -

مثلاً استخواں ۔ بادبان ۔ داستان ۔ نردبان وغیرہ ۔ مگر امتحان سے قصداً پرہیز کیا ۔ کیونکہ امتحانؔ اور وہ بھی سر مشاعرہ امتحانؔ استاد کا ہو چکا تھا ۔ شاگرد کو اس کی نوبت نہیں آئی ۔ اس لئے سعادتمند شاگرد نے اس قافیہ کو ہاتھ لگانا سوء ادب سمجھا ۔

سہسرام کے ایک مشاعرہ میں جناب بدر کو داستانِ موج سے سنانے کا اتفاق ہوا ۔ اس کی خبر کسی نے جناب سید حسن مرتضیٰ شفق رضوی عمادپوری کو پہونچائی ۔ ظالم آسمان شفق کو بدر سے کبھی ملنے نہیں دیتا مگر ایک مشاعرہ[1] میں یہ ناممکن بات بھی ممکن ہو گئی تو جناب شفق نے جناب بدر سے کہا کہ داستانِ موج سے سننے کے لئے کان مشتاق ہیں ۔ اس داستان کو سنکر جناب شفق کے دل پر کیا اثر ہوا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سنہ ۱۳۴۲ھ ہجری میں خمخانۂ بدر طبع ہوا اور جناب شفق نے قطعۂ تاریخ کہا تو اس قطعہ میں اس داستانِ موج سے کا خاص طور سے ذکر کیا ؎

لِلّٰہ الحمد آب و تابِ طبعِ رنگیں سے شفق — صورتِ صحنِ چمن ہے گلفشاں دیوانِ بدر
ہے مئے جامِ کہن میں کہنہ مشقی کا اثر — مست ہوں پڑھ کر نہ کیوں پیر و جواں دیوانِ بدر
اس کی ہر ہر بیت ہے گویا بیانِ موج سے — کیوں نہ ہو پھر ترجمانِ میکشاں دیوانِ بدر
جلوۂ حسنِ معانی سے دکھاتا ہے مجھے — لمعۂ فیضِ صفیرِ نکتہ داں دیوانِ بدر

حضرت ناسخ نے سنہ ۱۲۵۴ھ ہجری میں رحلت کی ۔ یہ سنہ ۱۳۵۴ھ ہجری ہے ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کاروانِ موج سے اس ایک سو برس میں کن کن منزلوں سے گذرا ہے ۔

(۱) پہلی منزل لکھنؤ ۔ محلہ ٹکسال ۔ جہاں کلکِ ناسخ نے ایک شعر کے مصرع اول میں اتفاقیہ زبانِ موج سے لکھ دیا ۔

(۲) دوسری منزل عظیم آباد ۔ محلہ گذری ۔ جہاں ہجرتی عظیم آبادی کے مشاعرہ میں یوسف علی شہید نے حضرت صفیر بلگرامی کا امتحان لینا چاہا ۔ اور اس امتحان کے لئے دیوانِ ناسخ کھولا گیا تو عجیب اتفاق کہ وہی مصرع طرح قرار پایا ۔

(۳) تیسری منزل آرہ ۔ ٹکی محلہ ۔ جہاں جناب بدر اروی نے مسلسل پانچ غزلیں کہہ کر دکھلایا کہ موجِ سے کتنی زبان دراز ہے ۔

---

[1] اس مشاعرہ میں جناب شفق نے ایک رباعی کہی تھی جس کا پہلا اور دوسرا مصرع یہ ہے ؎

روشن ہو جہاں میں بدر سے نامِ صفیر — ناچیز شفق ہے کشش بردارِ امیر

حضرت امیر مینائی کے پہلے جناب شفق کو شوق نیموی سے تلمذ تھا ۔ اُس زمانہ کا نمونۂ کلام یہ ہے ؎

۱۔ تو گرفتارِ محبت ہوں ۔ ابھی کیا جانوں ! — فرقت اچھی ہے کسی کی کہ وصال اچھا ہے
۲۔ کیا مزا ہو ۔ انقلاب ایسا اگر ہو دہر میں — میں تو روٹھوں اور وہ آئیں منانے کے لئے

(۴) چوتھی منزل عماد پور۔ علاقہ رفیع گنج ضلع گیا۔ جہاں جناب شفق عماد پوری نے خمخانۂ بدر کی تاریخ طبع کا قطعہ لکھا تو بیانِ موج سے آہی گیا۔ اور تماشے کی بات یہ ہے کہ دیکھنے میں تو کاروانِ موج سے لکھنؤ سے عظیم آباد اور آرہ ہوتا ہوا گیا پہونچا' لیکن غور کیجئے تو یہ کارواں جس نقطہ سے چلا تھا ایک سو برس کے بعد پھر اُسی نقطہ پر آ گیا۔ نقطۂ اول ناسخ کی ایک بیت کا پہلا مصرع۔ نقطۂ آخر شفق کی ایک بیت کا پہلا مصرع !

جناب شفق کے اس قطعہ کا ایک مصرع قابل توجہ ہے ؎ "لمعۂ فیض صفیر نکتہ داں دیوانِ بدر" یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس مصرع میں نکتہ داں محض قافیہ پیمائی ہے۔ جناب شفق نے نکتہ داں اُس شخص کو لکھا ہے جس کی مدح میں مرزا محمد باقر محبت لاری شیرازی کے قصائد موجود ہیں۔ تین شعر ایک قصیدہ کے یہ ہیں ؎

کیست آں نخلِ نبی شبل علی۔ میر صفیر　　کہ دروئش لبصفا مجمع اسرار آمد
در فنِ شعر یکے کہنہ ادیبے استادیب　　کہ بوصفش قلم از شرح بتکرار آمد
دیدۂ وہم نیابد بہ سخن سنجیٔ او　　انجم آسا اگرش خود ہمہ تن بیدار آمد

جنابِ شفق نے نکتہ داں اُس شخص کو لکھا ہے جس کو حضرت غالب کے دربار سے نورِ بصر لختِ جگر۔ قرۃ العین اسد۔ خطاب ملا تھا۔ اور جس کو خود جنابِ شفق کے استاد حضرت امیر مینائی اپنے خطوں میں "بلبل شیراز و طوطیٔ ہند کے بصفیر" لکھا کرتے تھے۔

راجہ کے بھنڈار میں اللہ کا دیا سبھی کچھ ہے۔ بھنڈار کے ایک کونے میں مصری کا پہاڑ بھی ہے۔ چیونٹی کہتی ہے کہ یہ پہاڑ اپنے

؎ فہرست تصانیف حضرت صفیر بلگرامی تا ۱۲۹۴ء ہجری

نظم	نثر	
دیوان ــــ فارسی ۳ - اُردو ۸	بوستانِ خیال ۱۸ جلد	سراج العقول ۱ جلد
مثنویات ــــ فارسی ۴ - اُردو ۲۶	فیضِ صفیر ۲۱ "	نوالنامہ ۱ "
قصائد ــــ فارسی ۲ - اُردو ۴	تذکرہ مردم دیدہ ۱ "	ترجمہ تفسیر ۱ "
کلیات مولود و مراثی - ۲ جلد	مضامین مختلف ۷۵	ترجمہ کتب مختلف ۵
دیوان خمسہ جات - ۱ جلد	گلبن موزوں ۳۲	
دیوان رباعیات - ۱ جلد	قصص ۷	
قطعات - ۱ جلد	مرغوب القلوب ۱ جلد	
واسوخت ۴ جلد - نظم مختلف - ۱ جلد	جوہر مقالات ۲ جلد	

سر پر کیونکر اٹھا لائیں۔ ہاں اپنی بساط بھر ایک ریزہ منھ میں داب کر لائے ہیں کہ مہمان بھوکے نہ اٹھ جائیں۔

نمونۂ کلام حضرت صفیر بلگرامی۔

قطعہ

ذرا شوق سے بھیجتا ہوں میں قاصد
رہے گی نظر راہ پر دیکھ لینا
نہ تو خیر سے پھر کے آئیگا جب تک
نہ ٹھہریگا دل نے جگر دیکھ لینا

پتا کوئے قاتل کا بتلا دوں تجھکو
جو کہتا ہوں میں ڈھونڈ کر دیکھ لینا
پڑے ہر جگہ پہ ہیں ٹکڑے جگر کے
تڑپتے ہیں دل خاک پر۔ دیکھ لینا

کہیں خاک اڑاتے ہیں گیسو کے الجھے
کسی کا ہے دم ہونٹھوں پر دیکھ لینا
خراشوں سے سینہ گلستاں کسی کا
کوئی گل ہے داغِ جگر۔ دیکھ لینا

کوئی ہوگا ایڑی رگڑتا زمیں پر
کسی کا عدم کو سفر دیکھ لینا
کہیں چاک دامن کئے ہیں ہزاروں
کھڑے ہیں کہیں بخیہ گر۔ دیکھ لینا

کوئی شامِ غم میں گرفتارِ کلفت
کسی لب پہ آہِ سحر۔ دیکھ لینا
ہلا دیں گے دل تیرا نالے کسی کے
کسی کی فغاں بے اثر۔ دیکھ لینا

کوئی ہوگا دھونی رمائے وہاں پر
کسی کو کھڑے ننگے سر دیکھ لینا
نہ کھانے کی سدھ بدھ نہ پانی کی پروا
غذا سب کی خونِ جگر۔ دیکھ لینا

کہیں ہڈیاں طائرِ نامہ بر کی
کسی جا کبوتر کے پر۔ دیکھ لینا
یہ ساماں گلی میں وہ کوٹھے پہ ہونگے
بھری ہوگی سب سے نظر۔ دیکھ لینا

ہوا ایک حسرت بھری عین در پر
لکھا شعر یہ لوح پر۔ دیکھ لینا
تجھے اپنی آنکھوں کی سوگند قاتل
ذرا تو ادھر اک نظر۔ دیکھ لینا

ا سہ یہ کوٹھا وہی کوٹھا ہے جو عرش سے باتیں کر رہا ہے۔ اس کوٹھے کے نیچے زنجیروں کی جھنکار ہے۔ تیروں کی بوچھار ہے۔ رسن ہے۔ دار ہے۔ خون کی ندیاں ہیں۔ ظلم کی بجلیاں ہیں ——

ماہِ کنعاں قید خانہ جا رہا ہے۔ زلیخا کھڑی ہوئی ہنس رہی ہے —— سید الشہدا ایک شیرخوار کو ہاتھوں پر لئے ہوئے فریاد کر رہا ہے "ایک گھونٹ پانی خدا کی راہ میں" حرملہ کا تیر علی اصغر کی پیاس بجھانے آتا ہے۔ ادھر معصوم کے حلق سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے اور ادھر فوجِ یزید میں عید قربان ہے —— ایک ماں اپنی گدڑی کے لعل کو صندوق میں بند کرکے دریائے نیل کو سونپ رہی ہے اور صندوق بہتا ہوا فرعون کے محل کی طرف جا رہا ہے —— اللہ کا ایک فرماں بردار غلام یہودیوں کے نرغہ میں ہے اور اس غلام کے لئے سولی کھڑی کی گئی ہے —— سقراط کو زہر کا پیالہ دیا جا رہا ہے اور تاجدارِ مشہدِ مقدس کو زہر آلود انگور بھیجے جا رہے ہیں —— ایک میدان میں کبوتر کے پر بھی ہیں۔ جس کو شک ہو وہ آکر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ کہیں عباس علمدار کے دستِ بریدہ ہیں۔ کہیں علی اکبر کا تنِ بے سر ہے۔ کہیں حبیب ابن مظاہر کا سر بے تن ہے۔ یہ میدانِ کرب و میدانِ بلا ہے۔ یعنی کربلا ہے۔

گلی میں یہ سامان فدائیوں کی یہ شان اور کوٹھے والا دیکھتا ہے مگر دیکھتا نہیں۔ بے نیاز ہے۔ دیکھتا نہیں مگر باغ باغ ہوا جاتا ہے۔ اسی دن تو اس نے آگ کو حکم دیا تھا کہ مٹی کو سجدہ کر! مٹی کا وزن آگ سے زیادہ ہے۔ مگر مٹی کہیں اترا نہ جائے غرور نہ کر بیٹھے۔ اس لئے سہ

"بھری ہوگی سب سے نظر دیکھ لینا!"

غزل

[illegible]ہ میں دل میں کرم فرمائیں آپ
آئیں آپ - اے بندہ پرور آئیں آپ

حالِ دل میرا اگر سن پائیں آپ
بے بُلائے آپ دوڑے آئیں آپ

ہمکو کیا۔ غیروں کے آگے جائیں آپ
پائے نظارہ کی ٹھوکر کھائیں آپ

یہ سکھاتی ہے اُن آنکھوں کو حیا
شرم بھی آئے تو شرما جائیں آپ

خط کے آنے پر خط آیا آپ کا
اسکے معنی کیا۔ ذرا بتلائیں آپ

زندگی بھر تو جلایا ہے مجھے!
شمع مرقد بھی جلانے آئیں آپ

آرزو بھی اپنی نکلے دم کے ساتھ
نزع میں دم بھر اگر ہو جائیں آپ

وصل قسمت میں نہیں ہے۔ کیا کریں
آپ کھو جائیں اگر مل جائیں آپ

ہوگئے یکتا لطافت کے سبب
آئینہ میں عکس کیونکر پائیں آپ

ہائے رے گردن جھکانا آپ کا
اک ذرا پھر اس طرح شرمائیں آپ

دفن میں تجکو تردد ہو اگر!
تیرے کشتے شرم سے گڑ جائیں آپ

وجد میں آکر لحد ہلنے لگے
اپنے پاؤں سے اگر ٹھکرائیں آپ

بلبلیں گائیں گی یہ غزلیں صفیر
شعر ایسے اچھے کہتے جائیں آپ

جائیں آپ اب جائیں آپ اب جائیں آپ
چار غیروں میں نہ یوں فرمائیں آپ

گور میں رکھوا لیں تو گھر جائیں آپ
بیٹھ کے لاشہ مرا اُٹھوائیں آپ

شاعروں سے لڑتی ہیں آنکھیں بہت
دیکھئے ایسا نہ ہو بندھ جائیں آپ

آنکھ سے میرا مکانِ دل ہے خوب
اب تو اس کوٹھے سے نیچے آئیں آپ

زرد ہوں۔ لیکن گھرا ہوں عشق میں
خوب اس سونے کو میرے تائیں آپ

ڈرئیے جذبے سے مرے۔ کیا دور ہے
بے طلب گھر میرے دوڑے آئیں آپ

حضرتِ دل کیا مجھے بھاری ہے جان؟
خنجرِ ابرو کی چوٹیں کھائیں آپ

میں تمہیں دیکھوں۔ وہ دیکھے غیر کو
اب تو اپنی آنکھ سے شرمائیں آپ

کب سے آنکھیں ڈھونڈتی ہیں اے حضور
پھر چکے خوب۔ اپنے گھر میں آئیں آپ

تم سے چھٹ کر دل بہت کرتا ہے تنگ
اسکو بھی ساتھ اپنے لیتے جائیں آپ

دیکھتا ہوں دیکھتا ہوں سامنے
اچھا اچھا کچھ چھپاتے جائیں آپ

بسمل اُٹھ اُٹھ کر لپٹتے ہیں حضور
عید قرباں دیکھتے تو جائیں آپ

گل تو بلبل کو ملے۔ قمری کو سرو
یا الٰہی مجھکو بھی مل جائیں آپ

غیر مجھ سے لڑ رہا ہے دیر سے
اور آکر ہاں میں ہاں ملوائیں آپ

منہ چھپایا خال کے بوسوں پہ بھی
کوئیلوں پر مُہر اب دلوائیں آپ

آپ دیکھیں جو دکھاتے ہیں مجھے
آپ سمجھیں مجکو جو سمجھائیں آپ

شعر میں ان بحروں کے موتی صفیر
جوہری بازار میں لے جائیں آپ

ہجر آیا۔ وصل جاناں الغیاث!
تیرہ شب ہے۔ ماہ تاباں الغیاث!

دل لئے کب سے کھڑا ہوں ہاتھ میں
الغیاث اے تیر مژگاں الغیاث!

ہم سے مفلس چاہتے ہیں انقلاب
الغیاث اے چرخ گرداں الغیاث!

رات فرقت کی نہیں کٹتی ہے۔ آہ
الغیاث اے مہر رخشاں الغیاث!

اُن کے در سے اب اٹھاتے ہیں رقیب
الغیاث اے کوئے جاناں الغیاث!

زلف شبگوں نے کیا عالم تباہ
الغیاث اے روئے تاباں الغیاث!

بھر گیا ہے دل میں جاناں کے غبار
الغیاث اے ابر مژگاں الغیاث!

قابلِ امداد ہے اب تو صفیر
الغیاث اے شاہِ مرداں الغیاث!

میرے آگے غیر سے اس طرح یارانے کی بات
واقعی ہے اے ستمگر یہ تو مرجانے کی بات

واقعی ہے اے محبت آگ ہو جانے کی بات
کیوں نکالی اُن کے گھر میں پھیرے ڈالنے کی بات

جب کہا حیرت ہو۔ میں تم پر فدا۔ تم غیر پر
ہنسکے بولے۔ لیجئے اپنے دل کے آجانے کی بات

میرے منہ سے اور شکوہ آپ کا - اچھی کہی　　کیا خیال آیا یہ ہو صاحب کے فرمانے کی بات
ایک بھی منہ سے نہ پھوٹا - ہو گئے پتھر یہ بُت　　زاہد! تمکو سناؤں کیا میں بتخانے کی بات
شب کو ایسا ارتباط - اور صبح ایسی احتیاط　　اے صنم سچ ہے کہ ہو یہ دل میں آجانے کی بات

اے صفیر اس سوزِ غم سے کون عاشق بچ سکے؟
جل بجھا کل رات - دیکھی تم نے پروانے کی بات!

شمع و پروانہ کا ذکرِ خیر آہی گیا تو غازی پور اور الہ آباد کا ایک فسانہ بھی سن لیجئے۔ مولوی عبدالصمد صمد غازی پوری نے ۱۲۹۱ھ میں صفیر بلگرامی کو مدعو کیا۔ صفیر بلگرامی غازیپور پہونچے اور للّن نے انکا آنا سنا تو ملنے کے لئے آئی۔ انکو معلوم تھا کہ للّن ملک الموت ہے اور سید کاظم علی مضطر الہ آباد میں موت کی راہ دیکھ رہے ہیں - چنانچہ للّن سامنے آئی تو دیکھتے ہی صفیر بلگرامی نے پوچھا:-

"کیا ہوئی عاشقِ مضطر کی یاد؟" اسکا جواب للّن کی زبان اور صفیر بلگرامی کے قلم سے سنئے

سن کے آنکھوں کو پھرایا اُس نے　　عجب انداز دکھایا اُس نے　　بنے اُس بت کے لب شکر خند　　کیا یہ کہتے ہو - خدا کی سوگند
جلوۂ طورِ صفا کی سوگند　　جذبۂ اہلِ وفا کی سوگند　　اپنی شرم اور حیا کی سوگند　　انکی مہر اور وفا کی سوگند
شوخ چشموں کے غضب کی سوگند　　پیار کی نظروں کے ڈھب کی سوگند　　حسنِ بے پردہ کی ضو کی سوگند　　شمعِ رخسار کی لَو کی سوگند
بسملِ تیغِ نظر کی سوگند!　　زخمِ کاری کی جگہ کی سوگند　　غمزۂ شوخ روش کی سوگند　　نظرِ نیم خلش کی سوگند

اپنے مژگاں کی خلش کی سوگند　　دلِ مضطر کی تپش کی سوگند

گرم جوشوں کی محبت کی قسم　　سرد مہروں کی عداوت کی قسم　　سستیٔ عہدِ حسیناں کی قسم　　حسرتِ گوشہ گزیناں کی قسم
شعلۂ شمعِ فروزاں کی قسم　　عشقِ پروانۂ سوزاں کی قسم　　سینہ کاویٔ نظارہ کی قسم　　دلِ جانبازِ دو پارہ کی قسم
عشق کی بے خطری کی قسم　　حسن کی نیچی نگاہوں کی قسم　　خونچکاں نالۂ بلبل کی قسم　　خونفشانیٔ رگِ گل کی قسم
اپنے انجانِ تغافل کی قسم　　اُن کے سامانِ تحمل کی قسم　　اپنے گیسوئے دل آرا کی قسم　　اُسی آشفتہ و شیدا کی قسم

کہ مرے دل کا وہی عالم ہے!　　جانِ بسمل کا وہی عالم ہے

رات دن آنکھوں میں ہے دھیان انکا　　دھیان بھولا نہ کوئی آن انکا　　وہ نہ خط بھیجیں - نہ بھیجیں پیغام　　دور افتادوں سے پوچھے ہے کیا کام
زندگی اپنی کٹے تو کیونکر؟　　مرتے اپنی بھلا ہو کیونکر؟　　طعن و تشنیع کہاں تک سنئے　　کبتک اس راہ میں تنکے چنئے؟
سامنے ہے وہ دل آرا ہر دم　　دھیان میں رہتی ہوں شاد و خرم　　کہکے یہ بوسہ زن لب ہوئی وہ　　دفعتاً اسکا ہوا حال تباہ
کھولدی اُسنے کھچوری چوٹی　　سانپ کی طرح زمیں پر لوٹی　　ہاتھ مل مل کے چھڑائی مہندی　　ایڑیاں گھس کے اڑائی مہندی

دستبوسی جو گریباں نے کی
پائے بوسی سرِ داماں نے کی
تا گریباں جو وہ داماں پہونچا
تا بہ دل چاک گریباں پہونچا

مجکو وحشت ہوئی اس حالت پر
ہوگیا دیکھ کے اُسکو مضطر
دوستانہ اُسے سمجھانے لگا
اتنے میں غش بھی اُسے آنے لگا

اُسکی ایسی ہوئی حالت تغییر
کر بہ صاف وہ غم کی تصویر
میں نے منگوا کے سواری اُسدم
بھیجا گھر اُس کے بصد رنج و الم

ایسے بیمار سنبھلتے ہیں کہیں؟
بے موئے گھر سے نکلتے ہیں کہیں؟
میں نے مضطر کو روانہ کیا خط
اطلاع اُسکی مناسب تھی فقط

بعد دو سال کے معلوم ہوا
کہ وہ سامانِ ہی معدوم ہوا
کھا گئی اُسکو تمنا دل کی
جانِ مضطر ہوئی کشتہ دل کی

جان اُسکی ہدفِ غم جو ہوئی
اُسی آزار میں گھل گھل کے موئی
مرغ جاں اُسکا فلک سیر ہوا
لیجئے — خاتمہ بالخیر ہوا

مجھ پہ تھا حقِ محبت جو صفیر
حال میں نے کیا اُس کا تحریر
یادگار اُس کے ہیں یہ چند اشعار
بخشئے اب اُسکو خدائے غفار!

غزل

اوڑھ کے دُشنا افعیٔ زلفِ دوسر کا کھیل ہے
وحشیوں کو روکنا تیری نظر کا کھیل ہے

خونِ دل کا کھیل ہے اور اشکِ تر کا کھیل ہے
عشق کے بازار میں لعل و گہر کا کھیل ہے

کاسۂ سر ہاتھ میں لیکر چلا منصور کیا
یہ تو ادنیٰ عاشقِ آشفتہ سر کا کھیل ہے

طبعِ معنی یاب بھی درکار ہے اسکو صفیر
شاعری میں کیا فقط علم و ہنر کا کھیل ہے

مرزا غلام حیدر مجروح عظیم آبادی نے ایک قطعہ میں شاگردانِ صفیر بلگرامی کی فہرست دی ہے ۔ اس فہرست مورخہ ۱۲۹۳ھ میں اُنہیں شاگردوں کو جگہ ملی تھی جن پر صفیر بلگرامی نے برسوں محنت کی تھی ۔ ۲۹ شعر میں ۱۶ یہ ہیں ؎

میر فرزند احمد آنکہ صفیر
ہست مشہور عالم ایجاد
بلگرام اصل و آرہ مسکنِ او
سالہا منزلش عظیم آباد

طوطیٔ خوش نوائے گلشنِ نظم
بلبلِ نغمہ سنج گلبن داد
ہم ز پرِ بانگی فرزینہ کشا
ہم ز قید خرد ہست آزاد

نامور در جہاں تلامذہ اش
بہرہ ور صاحبانِ استعداد
مایہ دار از فیوض و شاگرد
ہم ز تعلیم اوست شاد و استاد

فیض یاب از صفیر با تمکیں
محو احمد امیر سلطان شاد
مخلص و شورش اکبر و اصغر
ہاشم و محسن خجستہ نہاد

حیات و عنقا ہما امیر اخلاص
ہم شمیم و کلیم طبع رشاد
حسن اکبر حقیر ورد ظہیر
ہم گرامی ضیائے مہر سداد

محو اکرام قیصر و جواد
ہم سلیم و زریر صاحب داد
احسن و جوش و حیرت و فیاض
ہم طبیب و متین نیک نہاد

آں صغیر و مسطیر تمکین شور
آں عنایت کبیر ہم فرہاد
جاہ یحییٰ غلام لائق نیز
احدی و نجم و ہم ایجاد

قاصر و باقر و ثریا مہر
دانش و ہم ذکی و الٰہی زاد
آں نہال و جمیل و محزون نیز
باز مدح لائق الارشاد

ضلع شاہ آباد میں جو لوگ شاگرد ہوئے اُن سے قطع نظر کرکے باقی اور شاگردوں کا مختصر حال یہ ہے :۔

سخن خواجہ سید محمد فخرالدین حسین خاں خلف خواجہ محمد جلال الدین عرف حضرت صاحب خلف خواجہ فقیر صاحب چشتی مودودی سجادہ نشین مقام لکھنؤ۔ سال غدر میں یہ اپنے عم نامدار مرزا محمد ابراہیم کے ساتھ آرہ آئے۔ عمر تقریبًا پندرہ برس۔ مرزا صاحب موصوف نے انکو حضرت صفیر بلگرامی سے ملایا۔ اسی زمانہ میں انکو ایک فسانہ لکھنے کا شوق ہوا۔ مگر سکّہ رائج الوقت فسانۂ عجائب تھا جس کی شاعرانہ خصوصیات کا برتنا اور قیود و قوانین سے عہدہ برآ ہونا بچوں اور نو مشقوں کا کام نہیں تھا انہیں مجبوریوں سے جناب خواجہ فخرالدین حسین خاں نے نظم و نثر میں صفیر بلگرامی کی شاگردی اختیار کی کیونکہ اس صوبہ میں اُسوقت صفیر بلگرامی کی جگہ پرستارانِ اُردو کی صفِ اول میں تھی بہرکیف خواجہ صاحب نے استاد سے سخن تخلص پایا۔ معمول یہ ہوا کہ جناب سخن اپنے فسانہ کا ایک یا دو ورق لکھ کر روزانہ استاد کی خدمت میں حاضر ہوتے اور جس روز خود نہ آسکتے سپاہیوں پیادہ کے ہاتھ اوراق بھیج دیتے۔ سال بھر کی محنت میں وہ فسانہ ختم ہوا یعنی ۱۲۷۵ھ میں چنانچہ تاریخی نام سروش سخن ہوا۔ اس کے دو برس کے بعد خواجہ صاحب نے وکالت کا امتحان دیا۔ اور آرہ میں وکالت شروع کی۔ پھر منصف اور صدر اعلیٰ ہوئے۔

سروش سخن کا مسودہ صفیر بلگرامی نے اپنے استاد حضرت غالب دہلوی کے پاس اس عریضہ کے ساتھ بھیجا تھا :۔

"....... ملازمت کے وقت میں نے خواجہ فخرالدین صاحب سخن جن کا دادیہال لکھنؤ اور نانیہال دہلی میں ہے اور غدر کے سال میں بعمر چاردہ یا پانزدہ سالگی آرہ میں تشریف لائے۔ اور جناب محمد ابراہیم صاحب خلف مرزا محمد صدیق صاحب کی صاحبزادی سے منسوب ہوئے، اور مجھ سے تلمذ کیا، اور قصہ مسمّٰی بہ سروش سخن جسکو اُنکی رائے سے درست کرنے کا اتفاق ہوا، سب حال آپ سے بیان کیا تھا۔ چونکہ اُس قصہ کو چھپنا چاہئے اور لکھنؤ بھیجنا منظور نہیں، اس کے سوا حضور سے بڑھکر کون ہے، اس لئے وہ قصہ بھیجتا ہوں۔ حضور اُسکو میری تصنیف سمجھ کر بہ نظر تامل ملاحظہ فرمائیں کہ بڑا مقالہ ہے اور طبیعت اُن کی سخن کی اچھی ہے۔ چنانچہ آج ہی ایک غزل میرے پاس پٹنہ میں اصلاح کو آئی ہے۔ اُس کا ایک شعر میرے دل میں کُھب گیا۔ وہ یہ ہے ؎

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

اس خط کا جواب حضرت غالب نے یہ دیا :۔

"مولوی سید فرزند احمد ... ... اب میں پیر ہفتاد سالہ کی دعا پہونچے۔ آج میں نے بیٹھے بیٹھے حساب کیا کہ یہ ستّرواں برس مجھے جاتا ہے۔ ہائے ہائے ؎

ستّر برس کے ستر ہوئے شمار برس بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

نامہ محبت افزا کو دیکھ کر آنکھوں میں نور دل میں سرور آیا۔ اور قصہ سروش سخن اس کے دوسرے دن پہونچا۔۔۔
۔۔۔۔۔ قصہ دیکھا۔ آپ کی جوہر طبع کی لمعانی اور نیر فکر کی درخشانی بہت جگہ پر پسند آئی۔ اگرچہ وہ قصہ تو بچوں کے سلانے کی کہانی ہے مگر محنت کی گئی ہے۔ ہاں اگر فسانہ عجائب کا مقابلہ کیا ہے تو کیا کہوں کہ کیا کہا ہے۔ ابھی دیکھتا ہوں۔ آئندہ اس کی کیفیت سے اطلاع دی جائے گی۔ ۔۔۔ ۔۔۔۔ جا بجا لا چار لکھا ہے۔۔۔۔۔ لا کا لگانا کاتب کی جہالت ہے۔ ۔۔۔۔۔۔۔ ہائے خدا کی مار کاتبان ... پر۔ میرا دیوان اور پنج آہنگ اور مہر نیمروز ستیاناس کرکے چھوڑ دیا۔ ۔۔۔۔۔ لو۔ بس اب میں نواب ضیاء الدین خاں سے باتیں کر رہا ہوں۔ تمھارے خط کے جواب نے اتنی دیر تک انکو چپکا بٹھا رکھا۔ اور وہ بھی تم کو سلام اشتیاق آمیز پہونچاتے ہیں۔ ۔۔۔۔۔۔"

حضرت غالب کے شعر کا جواب صفیر بلگرامی نے یہ بھیجا ؎

سنا صفیر یہ کہتے ہیں حضرت غالب ۔۔۔ بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس
مگر یہ بندے سے اعداد غین کی ہے دعا ۔۔۔ خدا کرے مرا غالب جئے ہزار برس

جناب غالب کے خط کا ایک جملہ تشریح طلب ہے۔ یعنی —"اگر فسانہ عجائب کا مقابلہ کیا ہے تو کیا کہوں کہ کیا کہا ہے۔" اس کی حقیقت یہ ہے کہ مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی نے فسانہ عجائب میں اہل دہلی کو بہت کچھ نامزا کہا تھا۔ سروش سخن میں اس کا بھی جواب دیا گیا :—

فسانۂ عجائب	سروش سخن
"جو گفتگو لکھنؤ میں کو بکو ہے، کسی نے کبھی سنی ہو سنائے۔ لکھی دیکھی ہو دکھائے۔ عہد دولت بابر شاہی سے تا سلطنت اکبر ثانی کہ مثل مشہور ہے نہ چولھے آگ نہ گھڑے میں پانی۔ دہلی کی آبادی ویرانی تھی۔ ۔۔۔۔۔ یہ لطافت اور فصاحت اور بلاغت کبھی نہ تھی۔ نہ اب تک وہاں ہے۔ ۔۔۔۔ عیش و نشاط کی طرف (نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کی) طبیعت جو آئی تو ایک ایک کنجڑن ادنی اعلیٰ ہفت ہزاری بنائی۔ محمد شاہ (بادشاہ دہلی)	اور جو اس قصہ کو ملاحظہ کرے وہ یہ نہ سمجھے کہ فسانہ عجائب کا جواب لکھا ہے۔ ۔۔۔۔۔ کہاں فسانہ عجائب کہاں سروش سخن۔ مگس کو ہما کے ساتھ کیا ہمسری؟ ذرہ کو سُہا سے کیا برابری؟ جو لف و نشر مرتب سمجھے وہ البتہ ہمارا مطلب سمجھے۔ ۔۔۔۔ حق تو یہ ہے کہ جو اردوئے معلیٰ کی زبان نہیں جانتا۔ تذکیر و تانیث نہیں پہچانتا۔ جو شاہجہان آباد میں نہیں رہا ہے۔ جس نے دربار شاہی نہیں دیکھا ہے۔ وہ فسانہ کیا لکھے ہے اردو جن کی زبان

کی گور تھرّائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اہیں پر لعن طعن! ایسا بھی آدمی بے پیر نہ ہو ۔ بقول حضرت نسیم دہلوی

نسیم دہلوی ہم موجدِ بابِ فصاحت ہیں　　کوئی اردو کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں

نمونۂ کلام سخن دہلوی اصلاحی حضرت صفیر بلگرامی سے

(۱) کوئی بلا سے چیر کے پہلو نکال لے　　یارو! جو دل یہی ہے تو اک روز ہم نہیں

(۲) یہ مجبوری تمہاری ہاں میں ہاں ہم بھی ملاتے ہیں　　نہیں کہنے کی جو باتیں ہیں وہ ناچار کہتے ہیں

کیا پامال ٹھوکر سے ۔ جلایا جنبشِ لب سے　　اُسے رفتار کہتے ہیں ۔ اسے گفتار کہتے ہیں

جنوں! یوں تو بہت تنکے پڑے رہتے ہیں صحرا میں　　چبھے جو پاؤں میں کانٹا اُسکو خار کہتے ہیں

احمد سید احمد حسین رضوی ۔ عرف کلّو میاں ۔ خلف سید رضا حسین ۔ رئیس عظیم آباد ۔ کوچہ چالال ۔ ۱۲۹۲ھ ہجری میں شاگرد ہوئے ۔ نمونۂ کلام :۔

بغل میں بیٹھ کر ظالم وفائے غیر کی باتیں!　　دبے جاتے ہیں ہم تو تیری تقریروں کے پہلو سے

سلطان نواب سید تجمل حسین خاں ۔ عرف سلطان میرزا ۔ خلف نواب بہادر سید ولایت علی خاں ۔ رئیس اعظم عظیم آباد ۔ یہ صاحب دیوان ہیں ۔ مثنوی دردِ دل بھی انکی یادگار ہے ۔ باب اول در بیان سن میں تفصیل موجود ہے ۔

جناب سلطان نے ایک غزل (سکندر دیکھ کر ۔ چادر دیکھ کر) صفیر بلگرامی کو اصلاح کے لئے بھیجی تھی ۔ اس غزل میں ایک مصرع لگا کر مقطع کا خود کیا ہے ہم نے سلطان اپنے قاتل کو پسند　　جس طرح تلوار کو لیتے ہیں جوہر دیکھ کر

اس مقطع کی داد دینے والے سب مرمٹے ۔ باقیات الصالحات میں صرف تین بزرگ اسوقت عظیم آباد کی لاج رکھے ہوئے ہیں ۔ سید فضل حق آزاد ۔ میر عنایت حسین امداد اور ڈاکٹر سید مبارک حسین مبارک ۔ جس کو سمجھنا ہو کہ سلطان کے مصرع ثانی کو صفیر بلگرامی کے مصرع اول نے کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے وہ ان باقیات الصالحات کے پاس جائے اور سمجھے ۔

امیر سید محمد نواب ۔ خلف نواب حاجی سید محمد تقی خاں رئیس مظفرپور ۔ نمونۂ کلام سے

سر مرا جبکہ کٹ چکا ہوگا　　کیا ہی قاتل اچھل پڑا ہوگا!

اکرام سید اکرام الدین ۔ داؤد نگر ضلع گیا ۔ نمونۂ کلام سے

فرہاد و قیس دیکھتے دیوانگی مری کو　　سوتے ہیں اپنے منہ کو چھپائے کفن میں آج!

احسن ناظر علی احسن ۔ شیخ محلہ ۔ علی گنج سیوان ۔ نمونۂ کلام سے

کوچہ میں کیوں ہجوم ہیں اربابِ دید کے　　اے ماہ تو تمہیں تو نہیں چاند عید کے

جوشؔ شاہ خلیل الدین احمد عرف شاہ خلیل ۔ خلف شاہ محمد اصغر ۔ منیر شریف ضلع پٹنہ ۔
ان کو خواجہ سخن دہلوی بابو مہدی بخش تسلیم عظیم آبادی کا شاگرد لکھتے ہیں اور جناب ناسخ انکو اپنا شاگرد بتاتے ہیں ۔ سخن کی روایت میں کلام ہے ۔ ناسخ کا بیان صحیح ہے کیونکہ ناسخ کچھ دنوں کے لئے مونگیر میں تھے ۔ اُن کے جانے کے بعد مونگیر ہی میں جناب جوش حضرت صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے اور اپنا فارسی اور اردو کلام اصلاح کے لئے پیش کیا ۔
جناب جوش اپنے ایک مکتوب میں صفیر بلگرامی کو لکھتے ہیں :—

" . . . . . اور ایک بات خیال آئی ہے ۔ وہ یہ کہ جوش تخلص بوجہ اس کے کہ بہت لوگوں کے اور اچھے اچھے شعرائے مغربی کے ہوگئے ہیں اب ترک کرنا مدِ نظر ہوگیا ہے ۔ اسلئے رمز اور عقل اوّلاً و ثانیاً (. . . . ؟) پسند آئے ہیں ۔ کیونکہ آفتاب کے سامنے ذرہ کی تابش کہیں ہوسکتی ہے ؟ اگر یہ التماس میری حضور میں پسند آئے تو رمز تخلص تحریر فرمادیں گے (یعنی اُن دیوانوں میں جو اصلاح کے لئے صفیر بلگرامی کے پاس آئے تھے) ۔
در رسید اس کی ارسال فرمادیں گے کہ شب نہیں پہونچنے کا نہیں رہے ۔ زیادہ تسلیمات ۔
—— فقیر زادہ خلیل الدین احمد منیری ۔ خاندان برباد کردہ مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری علیہ الرحمۃ "

نمونۂ کلام ؎
اے ناخدائے کشتیٔ عمرِ روانِ ما		خوش بستہٴ ز تارِ نفس بادبانِ ما
سایہ کی طرح در پہ تو رہنے دے پائمال		مانا کہ پاسباں کے برابر نہیں ہوں میں

حیرتؔ منشی احمد حسین عرف میاں جان ۔ خلف منشی مرحمت حسین ۔ ساکن حسین گنج کھجوہ ۔ پہلے یہ شہرت عظیم آبادی کے شاگرد تھے ۔ پھر آرہ میں صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے ۔ نمونۂ کلام ؎
اشارہ اُس کماں ابرو کا یہ ہے		ترا سینہ مرے تیروں کا گھر ہے !

تمکینؔ میر عبدالحکیم قنوجی ۔ ساکن محلہ کشمیری کوٹھی ۔ عظیم آباد ۔ نمونۂ کلام ؎
نہیں سبقت کرو تمکیں اگر وہ آ نہیں سکتے		یہی کہتی ہے اب رہ رہ کے یادِ رفتگاں ہم سے

غلامؔ غلام نبی خاں ۔ ساکن باقر گنج عظیم آباد ۔ نمونۂ کلام ؎
ندی ہے ہر قطرہ مری چشم پر آب کی		پھبتی ہے میرے دیدوں پہ چشم حباب کی
خدا جانے کس عالم میں انھوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ پوری ہوکر رہی یعنی وہ غرقِ دریا ہوئے ۔

طبیبؔ ڈاکٹر حبیب اللہ تخلص طبیب ۔ بعد غدر بریلی سے آرہ آئے ۔ اور وہیں مکان بنوایا ۔ نمونۂ کلام ؎
مرنے کے بعد دی نہ جگہ کوئے یار میں		گردونِ دوں نے کیا مری مٹی خراب کی

فیاض فیاض حسین ۔ برادر خورد ڈاکٹر حبیب اللہ ۔ نمونہ کلام ہے

جب کیا میں تو رہا درہم و برہم نقشہ ۔ جب وہ آیا تو بگاڑے ہوئے تیور آیا

متین سید محمد باقر ۔ خلف میر زین العابدین ۔ ساکن چھپرہ ۔

اصدقی میر جان علی شاگرد مولوی نثار علی وکیل عدالت باقر گنج بانکی پور ۔ یہ حضرت شاہ قیام الدین اصدق کے مرید تھے اور اسی رعایت سے اصدقی تخلص کیا ۔ خواجہ فخر الدین سخن دہلوی بھی حضرت اصدق کے مرید تھے ۔ چنانچہ سروش سخن میں ایک قصیدہ کے دو شعر ہیں ہے

ستونِ کعبۂ اسلام ۔ عرشِ اعظم علم ۔ گل بہشت کمالات ۔ خضرِ راہِ صفا

وہ کون حضرتِ شاہ جہاں قیام اصدق ۔ کہ جس کے زیرکفِ پا ہے جنت الماوا

میر جان علی اصدقی وہی ہیں جنھوں نے مرزا دبیر کی رباعی کے ایک مصرع پر اعتراض کیا تھا ۔ اور صفیر بلگرامی نے سودا کی سند پیش کی تھی ۔ اصدقی نے ہار مان لی اور کچھ عرصہ کے بعد صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے ۔ پھر اپنے دو بھانجوں کو شاگردی کے لئے پیش کیا ۔ میر رفعت حسین بڑے بھانجے نے کبیر اور میر کفایت حسین چھوٹے بھانجے نے صغیر تخلص پایا ۔ نمونہ کلام اصدقی ہے

ہم رکھتے ہیں دونوں عکس و آئینہ کی کیفیت ۔ رخِ روشن وہاں اُسکا ۔ دلِ روشن یہاں اپنا

کبیر میر رفعت حسین ہمشیرزادہ جناب اصدقی ۔ نمونہ کلام ہے

عشق نے تیرے مجھے دیوانہ ایسا کر دیا ۔ راز دل میں جو مرے تھا سب ہویدا ہوگیا

صغیر میر کفایت حسین ہمشیرزادہ جناب اصدقی ۔ نمونہ کلام ہے

جھوٹے وعدوں پہ اُسے جانے دیا ہم نے صغیر ۔ کیا کیا ہم نے ۔ نہوں گے کہیں ناداں ہم سے

شور داروغہ عبد الرحمٰن ۔ ساکن باقر گنج عظیم آباد ۔ یہ مونگیر میں صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے ۔ نمونۂ کلام ہے

ہوئی ہے قاصدِ جاناں سے اب تو مایوسی ۔ سوائے پیک اجل کس کا انتظار کریں

حکیم محمد اسمعیل خاں خلف جناب محمد بخش خاں وکیل بانکی پور و برادر خورد فخر ہندوستان مولوی خدا بخش خاں صاحب ۔ یہ مقام ہلسہ ضلع پٹنہ میں سب رجسٹرار تھے ۔ نمونۂ کلام ہے

ہمتاب آفتاب ہے اُس یار کا مزاج ۔ صورت تو نور کی ہے ۔ مگر نار کا مزاج

باقر سید باقر حسین رئیس مظفر پور ۔ بڈھن ۔ پورہ ۔ یہ ۱۲۸۷ھ ہجری میں بمقام مظفر پور شاگرد ہوئے ۔ نمونۂ کلام ہے

دو آنکھوں میں عین لطف اور لکھا ۔ اک بینی کو لام ہے مکرر لکھا

مناسب یہیں روشناس حیدر، باقر　　چہروں پہ علی علی برابر لکھا

قاصر لالہ جگت بہاری لال۔ دیوان سرکار میر رضا حسین۔ کوچہ چوالال عظیم آباد۔ نمونۂ کلام ؎

پوشاک سرخ پہنی ہے، مہندی لگائی ہے　　قاصر کے قتل کے ہوئے ساماں نئے نئے

محزوں سید محمد حسین معروف محمد و صاحب۔ رئیس حاجی گنج۔ سب رجسٹرار۔ نمونۂ کلام ؎

بہت نزدیک ہے ملک عدم۔ اے طالب منزل　　بیک دم چل کے پہونچے ہیں جو اُس بستی میں بستے ہیں

مدّاح حکیم نوازش حسین مظفر پوری۔ نمونہ کلام ؎

میں لے کے داغ غم ابن بوتراب چلا　　اندھیرے گھر میں مرے ساتھ آفتاب چلا

نہال سید شاہ نہال حسن۔ وطن مولا نگر ضلع مونگیر۔ مسکن بخشی محلہ عظیم آباد۔ پہلے یہ حکیم مولانا عبدالحمید صاحب پریشاں عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ ۱۳۲۸ھ ہجری میں صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔ نمونۂ کلام ؎

آپ تلوار تولتے ہی رہے　　نگہ ناز کام کر بھی گئی!

حکیم مولانا عبدالحمید عظیم آبادی کے نام پر قلم واسطی بلگرامی کو رک جانا چاہیے تھا۔ کیونکہ انکا اور اُن کے گھرانہ کا علم و فضل تقدس داستان عظیم آباد کا ایک ضروری باب ہے۔ مختصر یہ کہ خاندان صادق پور کا رویّہ اسلام کے ساتھ وہی رہا ہے جو مجنوں کا لیلیٰ کے ساتھ تھا۔ یعنی ؎

ہم تری راہ میں مٹ جائیں گے سوچا یہ ہی　　دردمندانِ محبت کا طریقہ ہے یہی

چنانچہ مولانا عبدالحمید کے پدر گرامی قدر مولانا احمد اللہ صاحب نے ۱۲۸۱ھ ہجری میں آپ دریائے گنگ کے بدلے آب دریائے شور قبول فرمایا۔ اور دنیا نے دیکھ لیا کہ ؎

شرابِ وفا ہم نے پی ہے صفیر　　یہ دیکھتے نہ اب عمر بھر جائیں گے

ہیرے کا ٹکڑا بھی ہیرا ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ حکیم مولانا عبدالحمید بھی یگانۂ روزگار نہ ہوتے۔ موروثی جائدادیں ضبط ہو گئیں۔ کتب خانہ لٹ گیا۔ گھر تباہ ہو گیا۔ مگر علم و فضل کا دریا خشک نہ ہوا۔ البتہ دریا پہلے صادق پور میں بہتا تھا۔ اب خواجہ کلاں محلہ میں بہنے لگا۔ ذرا اس "تلاطم" اور "تباہی" اور "خانہ ویرانی" اور "شکستہ پائی" اور پریشانی کی حد ملاحظہ ہو کہ مولانا عبدالحمید کا تخلص تک پریشاں ہو گیا ؎

پریشانی ہماری کاکلِ محبوب جانے ہے　　پریشاں کی پریشانی پریشاں خوب جانے ہے

چاند چودھویں کا ہو یا پہلی کا۔ یہ بھی چاند۔ وہ بھی چاند۔ مولانا عبدالحمید مرحوم کے نواسہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد عظیم (پی۔ ایچ۔ ڈی)

آج بھی مسند نشینِ مسند علم و فضل ہیں۔ بقول حضرت صفیر بلگرامی ؎

کسی صورت نہیں اٹھ جاتا ہے نقصان رندوں کا ... کہ شیشہ ٹوٹ جاتا ہے تو پھر پیمانہ ہوتا ہے!

مطہر

شاہ سید مناظر حسین۔ خلف شاہ سید بخشش حسین۔ رئیس حاجی گنج۔ عظیم آباد۔

(۱) شہر عظیم آباد میں یہ پہلے شخص ہیں جو آرہ جاکر صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔

(۲) جناب ہجرتی عظیم آبادی کے ہاں مشاعرے شروع ہوئے تو صفیر بلگرامی کو شرکت کے لئے آرہ سے یہی لائے تھے۔

(۳) صفیر بلگرامی کا دیوان اول (صفیر بلبل) انہیں کی فرمائش سے طبع ہوا۔

(۴) میر علی محمد شاد عظیم آبادی انہیں کے ہمراہ صفیر بلگرامی کی خدمت میں شاگردی کے لئے حاضر ہوئے تھے۔

(۵) یہ وفاداری میں فرد تھے۔ بے وفائی کے دشمن تھے۔

نمونہ کلام

لایا ہے ان بتوں کے محلے میں مجکو دل تو ... مذہب میں جن کے خون مسلماں حلال ہے!

فرہاد

نواب سید تہور علی خاں کے صاحبزادے سید تفضل علی خاں۔ ان کے دو صاحبزادے سید علی نقی خاں عرف سید محسن اور سید اظہار حسین خاں عرف سید عباس مرزا۔

سید محسن کے دو صاحبزادے۔ میر جعفر حسین فرہاد اور میر فیروز حسین۔ سید عباس مرزا کے دو صاحبزادے سید علی محمد شاد۔ سید امیر حسین ایجاد اور ایک صاحبزادی سید النساء بیگم۔

سید النساء بیگم کی شادی میر فیروز حسین سے ہوئی۔ ان کے تین صاحبزادے نواب سید نصیر حسین خاں خیال۔ نواب سید صادق حسین خاں نہال۔ نواب سید عابد حسین خاں کمال۔

سید محسن اور سید عباس مرزا حضرت صفیر بلگرامی کے خاص قدردانوں میں تھے۔ ۱۲۸۱ھ ہجری کا واقعہ ہے کہ سید محسن کے بڑے صاحبزادے میر جعفر حسین فرہاد اور سید عباس مرزا کے دونوں صاحبزادے سید علی محمد شاد اور سید امیر حسن ایجاد صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔

شاد

سید علی محمد شاد کی شاگردی کا واقعہ نواب سید تجمل حسین خاں عرف سید سلطان میرزا۔ یعنی سلطان عظیم آبادی اپنی تالیف مرقع فیض میں اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

"شاد۔ سید علی محمد خلف جهین جناب میر عباس صاحب مرحوم۔ رئیس حاجی گنج پٹنہ۔ یہ مولف تذکرہ کے بہت بڑے دوست لڑکپن کے ہیں۔ اکثر شب و روز کی صحبت رہا کرتی تھی۔ ۱۲۸۰ھ ہجری میں جناب سید محمد حسین خاں عرف چھوٹے صاحب ہجرتی نے جب مرزا علی صاحب کے امام باڑہ میں مشاعرہ شروع کیا اس وقت میر علی محمد صاحب

کو شاعری کا شوق شروع ہوا۔ اور جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد مدظلہ کے شاگرد ہوئے۔ اور شاد تخلص مقرر کیا۔

وہ مشاعرہ کوئی چھ سات مہینے تک رہا اوس کے بعد محرم وغیرہ کے سبب سے موقوف ہوا۔ اوسی مشاعرہ میں حضرت صفیر بلگرامی مدظلہ بھی بہ تحریک جناب شاہ حفاظت حسین صاحب عطیہ آرہ سے تشریف لائے کہ شاہ صاحب انہیں دنوں آرہ میں جاکر حضرت کے شاگرد ہو چکے تھے اور عطیہ تخلص پا چکے تھے۔ المختصر جب سنہ ۱۲۸۱ ہجری شروع ہوا تو بعد اربعین جناب سید حامد حسین صاحب نکہت نے کشمیری کوٹھی میں مشاعرہ بخاطر حضرت صفیر مقرر فرمایا کہ جناب ممدوح بھی انہیں کے مکان میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ اور دیوان صفیر بلبل چھپ چکا تھا۔ چنانچہ اوس میں ایک تاریخ یہ تکا محمد صاحب شاد کی بہ شاگردی فریاد موجود ہے۔ غرض دوسرے مشاعرہ کی طرح میں میر علی محمد صاحب شاد بمعیت شاہ حفاظت حسین صاحب عطیہ جن کو میر حامد حسین صاحب نکہت کے مکان میں تشریف لائے۔ اور باستبداد تمام جناب صفیر کے شاگرد ہوئے۔ اور سنہ ۱۲۸۰ ہجری تک یکا قلم برابر تعلیم پائی۔ اور دور و نزدیک یعنی بذریعہ خطوط و ملاقات فیض پایا کئے۔ اور عین مشاعرہ میں اصلاح لیا کئے۔ اور شاعر کامل ہو گئے۔

اور پہلے پہل بندۂ سلطان کو بھی انھوں نے آمادہ کیا۔ اور اُن کی شاگردی سے دو چار روز بعد انہیں کے مکان میں مجھے حضرت صفیر کی شاگردی کا اتفاق ہوا۔"

اس تحریر کو دیکھئے اور نواب بہادر سید ولایت علی خاں رئیس عظیم آباد کے ہاں کی تقریب کو یاد کیجئے۔ اُس تقریب میں دو لڑکوں کا مونڈھے سے کھیلنا یاد کیجئے۔ ایک نو وارد کا احباب کو اشعار سنانا یاد کیجئے۔ اُس روز س۔ش۔ ص کا قضا و قدر کے جال میں آجانا یاد کیجئے۔ اور پھر نو برس کے بعد س اور ش کا ایک ہی ہفتہ کے اندر ص کی خدمت میں شاگردی کے لئے حاضر ہونا دیکھئے بقول حضرت امیر مینائی ؎

کیوں وہ صیاد کسی صید پہ توسن ڈالے ۔۔۔ خود بخود صید چلے آتے ہیں گردن ڈالے

میر حامد حسین نکہت عظیم آبادی۔ عرف میرن صاحب کے ہاں مہینہ میں دوبار مشاعرہ ہوتا تھا۔ غزلیں شگوفۂ نکہت میں چھپتی تھیں۔ یہ گلدستہ عظیم المطابع واقع کشمیری کوٹھی عظیم آباد سے نکلتا تھا۔ ۷۰ برس پہلے کا ایک اشتہار ملاحظہ ہو ؎

شہر میں پھر بہار آئی ہے ۔۔۔ تازہ تازہ شگوفے لائی ہے
یعنی پھر یاں مشاعرہ ٹھہرا ۔۔۔ خوش زبانی کا پھر مزا ٹھہرا
پندرہ دن پہ جلسہ ہوتا ہے ۔۔۔ باغ و بستاں کا رنگ کھوتا ہے

باقی جلسہ با مروّت ہیں — میر حامد حسین نکہت ہیں
مغتنم ہے بہت عظیم آباد — اسکو رکھے مرا کریم آباد
اس طرح جب مشاعرہ ٹھہرا — دوستوں کا یہ مشورہ ٹھہرا
ہے مزا جو مشاعرہ چھپ جائے — خوش زبانوں کا تذکرہ چھپ جائے
از الف تا بہ یائی تحتانی — ایک مجموعہ ہوگا لاثانی
ہو گئی جب ردیف کی ترتیب — پھر تو دیوان ہے عجیب و غریب
ڈھنگ شہرت کا یہ نرالا ہے — بے تردد کلام چھپتا ہے
بے مشقت ہے مشق کی صورت — کھل رہا ہے شگوفۂ نکہت

اس اشتہار میں ۴۰ شعر ہیں۔ صرف ۱۱ شعر یہاں لکھے گئے۔ یہ وہی یادگار گلدستہ ہے جس سے جناب شاد کی شاگردی کا آغاز ہوتا ہے اور یہ وہی نکہت عظیم آبادی ہیں جن کے مکان میں جناب شاد اپنی غزل لے کر شاہ حفاظت حسین مطیر کے ساتھ صفیر بلگرامی کی خدمت میں اصلاح کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ اس یادگار مشاعرہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

مطیر عظیم آبادی شاگرد صفیر بلگرامی	شاد عظیم آبادی شاگرد صفیر بلگرامی
پھیلا ہوا جو اُن کی نگاہوں کا جال ہے اب میرے مرغِ رنگ کو اڑنا محال ہے	اس شش جہت میں جو ہے اُسے انتقال ہے حقا کہ تیری ذات صنم بے زوال ہے
ہم کارزارِ عشق میں ثابت قدم رہے رستم ہمارے منھ پہ چڑھے کیا مجال ہے	جو کام ان کی زلفِ گرہ گیر سے ہوا صیاد تیرا جال کرے۔ کیا مجال ہے
لایا ہے اُن بتوں کے محلّے میں مجھکو دل مذہب میں جن کے خونِ مسلماں حلال ہے	اللہ رے بہار کہ پھولا ہے لالہ زار گلشن میں جس درخت کو دیکھو نہال ہے
محشر ہو اے مطیر اگر میں برس پڑوں پھر ارض کی نشست نہ گردوں کی چال ہے	اے شاد کس طرح سے کروں عرضِ مدعا نا آشنا ابھی صنم خورد سال ہے

اس زمین میں صفیر بلگرامی کے چند شعر یہ ہیں ؎

تیرا ہمارے دھیان سے جانا محال ہے — تو اے پری اسیرِ طلسمِ خیال ہے

خان بہادر میر علی محمد شاد عظیم آبادی - سید علی خان مرحوم خلف جناب شاد

SPECIAL PRESS CAL

تیری مثال نوعِ بشر میں محال ہے — آئینہ خانہ تیرا جہانِ مثال ہے
اس سے اُلجھ گئی کبھی اُس سے الجھ گئی — تیغِ نگاہِ یار کی کچھ طرفہ چال ہے
ہنسنے میں اُسکے سیکڑوں باتیں نکلتی ہیں — موجِ تبسم اوس کی زبانِ سوال ہے
نامہ نہیں، پیام نہیں، پوچھنا نہیں — کیونکر کہوں کہ آپکو میرا خیال ہے
ہوتا ہو مجکو رنج تو ہوتے ہیں آپ خوش — دیوار قہقہہ مری گردِ ملال ہے

آ ہو ہے تو۔ تو کیا ہو؟ چھلاوا ہے تو۔ تو کیا؟
غافل! صفیر پاس کنندِ خیال ہے

جناب شاد نے صفیر بلگرامی کی شاگردی اختیار کی تو مرثیہ کہنے کا بھی شوق ہوا۔ حضرت علی اکبر علیہ السّلام کی شان میں اکاون بند کا ایک مرثیہ کہہ کر شاد نے صفیر بلگرامی کی خدمت میں اصلاح کے لئے پیش کیا مرثیہ نامربوط تھا۔ اوستاد نے جابجا قطع و برید کی ۔ رفو کیا اور اپنی طرف سے اکتالیس بند کا پیوند لگاکر مرثیہ کو درست کیا یہ بانوے بند کا مرثیہ شاد کا سب سے پہلا مرثیہ ہے ۔ اور یہ تبرک آج ستر برس سے آرہ میں ہے ۔ آرہ میں کیوں ہے اس کی وجہ حضرت صفیر بلگرامی سے سنئے :۔

".. .. .. .. میں نے اکتالیس بند اور ملاکر' ربط دیکر' بانوے بند کا مرثیہ اپنے ہاتھ سے صاف کر دیا۔ اور اوس پر اونھوں نے (شاد نے) چند رباعیاں پھر اپنے ہاتھ سے لکھیں اوس پر بھی میں نے اصلاح دی۔ آخر محرم میں معہ اوس مرثیہ کے اونکو (شاد کو) جناب میرزا دبیر صاحب کے پاس لے گیا۔ جناب محسن صاحب مرحوم (انھیں سید محسن کے پوتے نواب سید نصیر حسین خاں خیال مرحوم ہیں) اُن کے ہمراہ بھی تھے ۔ مرزا صاحب کے پاس اُسوقت کوئی پچاس آدمی بیٹھے تھے (ان پچاس آدمیوں میں میر بادشاہ علی بقا لکھنوی خلف میر وزیر علی صبا لکھنوی بھی تھے) جناب محسن صاحب نے فرمایا یہ میرا بھتیجا ہے ۔ اور اس نے مرثیہ کہا ہے حضور کے پاس اصلاح کو لایا ہے ۔ مرزا صاحب نے فرمایا آپ کس کے شاگرد ہیں ۔ جناب شاد نے کہا میر صفیر صاحب کے اور میری طرف اشارہ کیا ۔ مرزا صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے دیکھ لیا ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں ۔ اور میرا ہی لکھا ہوا ہے ۔ اُسوقت میرزا صاحب نے دو ایک بندوں پر اصلاح دی ۔ اور پھر رکھ لیا آخر وہ مرثیہ مرزا صاحب کے ساتھ چلا گیا ۔ اور دوسرے یا تیسرے برس وہ مرثیہ اصلاح دیکر مرزا صاحب نے لاکر جناب شاد کو دیا ۔ انھوں نے مجھے دکھایا ۔ میں نے اُن سے لے لیا اور وہ بجنسہ معہ مسودہ جناب شاد اور اُس پر جناب مرزا صاحب کی اصلاح میرے پاس موجود ہے "

یہ مسودہ آج انمول ہے ۔ اسکو کُل کا کُل بھی نہیں پا سکتا ۔ کیونکہ وہ شنیدہ ہے اور یہ دیدہ ہے ۔ شاد عظیم آبادی کی تحریر ۔ صفیر بلگرامی

میرزا دبیر لکھنوی کی مروت اور بلند نظری نے یہ گوارا نہ کیا کہ عظیم آباد کا پلہ لکھنو کے مقابلہ میں سبک ہو۔ اس لئے بادشاہِ ملکِ معانی نے اصلاح یہ فرمائی ہے

یارب یہ باغ نظم ترا بے خزاں رہے اک رنگ پر بصورتِ باغِ جناں رہے

اس پہونچے ہوئے فقیر کی دعا کا اثر دیکھیے کہ آج شاد کی پھلواڑی میں بہارِ بے خزاں کا دور دورہ ہے!

شاگردی کے زمانہ میں جناب شاد کو کن کن منزلوں سے گذرنا ہوا تھا اس کی تفصیل کے لئے دفتر چاہیئے اس دفتر کا ایک پرزہ یہ ہے

کلام شاد عظیم آبادی	اصلاح صفیر بلگرامی
(۱) گریباں سیکڑوں پھٹتے ہیں۔ دیوانوں کا دخل ہے	گریباں سیکڑوں پھٹتے ہیں۔ دیوانوں کی پھر چل ہے
خدا کے فضل سے کیا ان دنوں آباد جنگل ہے	ذرا دیکھ اے جنوں۔ کیا ان دنوں آباد جنگل ہے
ہماری آنکھ سے وہ شمع خوبی جب سے اوجھل ہے	عجب اندھیر ہے۔ وہ شمع خوبی جب سے اوجھل ہے
تو اپنے خانۂ تاریک میں آہوں کی مشعل ہے	مرے تاریک گھر میں نالۂ سوزاں کی مشعل ہے
کہیں سر وجد میں ساکن۔ کہیں لاشے اوچھلتے ہیں	کہیں سر وجد میں جنباں۔ کہیں لاشے اوچھلتے ہیں
ترے آنے سے او سفاک بزمِ حال مقتل ہے	ترے آنے سے او سفاک بزمِ حال مقتل ہے
دکھاتا ہے ٹپک کر قطرۂ مے آب موتی کی	دکھاتا ہے ٹپک کر قطرۂ مے آب موتی کی
صدف مینا ہے۔ ساغر ساقیا نیساں کا بادل ہے	صدف ساغر ہے۔ مینا ساقیا نیساں کا بادل ہے
(۲) نہ ہوئے عاشقوں میں نام تک اسکا کبھی روشن	نہ ہوتا عاشقوں میں نام تک میرا کبھی روشن
بجھادی شمع تک کافر نے آکر میرے مدفن پر	بجھا دی شمع بھی کافر نے آکر میرے مدفن پر
نزاکت نے نہ یارا قتل کا میرے دیا اُن کو	نزاکت نے۔ چاہا مجکو اُن کے ہاتھ کا کشتہ
کہ خطِ تیغ پڑ کر رہ گیا بس میری گردن پر	کہ خط تیغ پڑ کر رہ گیا بس میری گردن پر
چمن میں جب تلک ملتے رہے مستی دہ ہونٹوں میں	وہ جب تک باغ میں ملتے رہے مستی کو دانتوں میں
میں کیا کیا چشمکیں کرتا رہا نسریں و سوسن پر	میں کیا کیا چشمکیں کرتا رہا نسریں و سوسن پر
(۳) پہلو سے چھوٹ کے ہجر میں دل مبتلا نہ ہو	پہلو سے چھوٹ کے ہجر میں دل مبتلا نہ ہو
جنگل سے اے جنوں کوئی وحشی جدا نہ ہو	نکہت میں اے جنوں کوئی گھر سے جدا نہ ہو

کلام شاد عظیم آبادی

لاش اپنی ہم نے کہہ کے پھرائی ہے کو بکو
ملنے کا تیرے غیر کو تا حوصلہ نہ ہو

چاہا تو تھا کہ فیصلۂ جسم و جاں کرے
ہجراں کا کیا گناہ جو میری قضا نہ ہو

نازک ہے دل۔ مزاج کو احساں نہیں پسند
شرمندۂ قبول ہماری دعا نہ ہو

زیبا نہیں ہے رشک دو روزہ نشاط پہ
اپنی خوشی سے تنگ ہماری قبا نہ ہو

رہنے دو تا بمرگ تصور اُس آنکھ کا
آنکھوں سے میری ساغر و مینا جدا نہ ہو

مانا کہ شعر گوئی سے میری ہے سب کو لطف
اے شاد کیا کروں جو طبیعت بجا نہ ہو

(۴)

گئی ہرگز نہ بوئے میرزا یا نہ مرے سر سے
گدائی بھی اگر عالم میں کی تو کاسۂ سر سے

حرارت ہوئیگی جس دم سوا گرمیٔ محشر سے
چھپا لونگا میں جسم زار اپنا دامن تر سے

جو وہ زلف سیاہ فتنہ ساماں رام ہو جائے
تو بھر دوں یا الٰہی طاق مسجد مشک و عنبر سے

مثال عاشق شیدا جو ہر دم اسکا طالب ہے
ملا کیا لطف اس غم کو ہماری جان مضطر سے

برافت میں صفا میں روشنی میں۔ ایک پاتا ہوں
کرونگا استعارہ دل کا رخسار منور سے

اصلاح صفیر بلگرامی

لاش اپنی ہم نے کہہ کے پھرائی ہے کو بکو
ملنے کا تجھ سے غیر کو تا حوصلہ نہ ہو

چاہا تو تھا کہ فیصلۂ جسم و جاں کریں
وحشت کا کیا گناہ جو اپنی قضا نہ ہو

اپنے دل غیور کو احساں نہیں پسند
شرمندۂ قبول ہماری دعا نہ ہو

زیبا نہیں ہے ناز دو روزہ نشاط پر
اپنی خوشی سے تنگ بدن میں قبا نہ ہو

{ "یہ شعر کچھ نہیں"

مانا کہ شعر گوئی سے میری ہے سب کو لطف
کیوں شاد کیا کروں جو طبیعت بجا نہ ہو

گئی ہرگز نہ بوئے میرزا یا نہ مرے سر سے
گدائی بھی اگر عالم میں کی تو کاسۂ زر سے

حرارت جبکہ بھڑکے گی سوا خورشید محشر سے
چھپا لونگا میں جسم زار اپنا دامن تر سے

جو وہ زلف سیاہ فتنہ ساماں ہاتھ آجائے
بھرونگا یا الٰہی طاق مسجد مشک و عنبر سے

بسان عاشق شیدا جو ہر دم گرد ہے اسکے
ملا کیا لطف ہے غم کو ہماری جان مضطر سے

صفائی میں جلا میں روشنی میں ایک پاتا ہوں
بجا ہے استعارہ دل کا رخسار منور سے

شبِ فرقت جب آئی۔ خونِ دل اپنا پیا آکر
نہیں چھاں پھرا ہوگا۔ خلیل اللہ کے گھر سے
دمِ رحلت خبر ہے کس مسیحا دم کے آنے کی
کئی باری اجل پھر پھر گئی آ آ کے بستر سے

(۵) مخمس بر غزل خواجہ وزیر لکھنوی

کون سی ساعتِ بدمتی ہو یہاں آکے پھنسے
پائے وحشت زدہ بڑھ بڑھ کے مژہ نے چومے
حضرتِ خضر کچھ آگاہ ہیں ان باتوں سے
مدتِ قیدِ اسیرانِ کہن کیا کہئے
گل کے سو بار گرے تختۂ زنداں سر پر

حلقۂ گیسوئے پیچیدہ نہیں۔ زنداں ہیں
یہ بھی انسان۔ کرو غور نہیں حیواں ہیں
چھوٹنے کی نہیں صورت۔ تو عجب حیراں ہیں
دلِ عشاق بہت گیسوؤں میں نالاں ہیں
کردو آزاد کہ ہے شورِ اسیراں سر پر

مژۂ وحشتِ دل دشت میں چکھا ہم نے
اے جنوں رتبۂ عالی ترا دیکھا ہم نے
کرکے صحرا میں گذر لطف اوٹھایا ہم نے
دامنِ دشت میں جب پھاڑ کے پھینکا ہم نے
چوم کر قیس نے رکھا وہ گریباں سر پر

شاد سے پوچھئے کیفیتِ حالِ دلگیر
ضعف بڑھتا گیا جب سے ہوئے الفت کے اسیر
حال کیا کہئے اب آپ سے اپنا تقریر

شبِ فرقت جب آئی۔ خونِ دل کا کردیا حاضر
نہیں چھاں پھرا ہوگا خلیل اللہ کے گھر سے
دمِ رحلت خبر ہے کس مسیحا دم کے آنے کی
کئی باری اجل پھر پھر گئی آکر مرے سر سے

. . . .

جائے رقت ہے۔ اسیری کے محن کیا کہئے
ہڈیاں رہ گئی ہیں۔ حالِ بدن کیا کہئے
جس کی تحقیق نہ ہو کچھ وہ سخن کیا کہئے
مدتِ قیدِ اسیرانِ کہن کیا کہئے
گل کے سو بار گرے تختۂ زنداں سر پر

بے وفا! دونوں ہیں گیسو ترے یا زنداں ہیں
ان کے حلقوں میں ہیں دل۔ یا کہ مہ کنعاں ہیں
سالہا سال سے بیچارے بلا گرداں ہیں
دلِ عشاق بہت گیسوؤں میں نالاں ہیں
کردو آزاد کہ ہے شورِ اسیراں سر پر

جب کیا وادیٔ وحشت کا ارادہ ہم نے
جسم سے رختِ تعلق کو اوتارا ہم نے
جا کے لی سلطنتِ وادی و صحرا ہم نے
دامنِ دشت میں جب پھاڑ کے پھینکا ہم نے
چوم کر قیس نے رکھا وہ گریباں سر پر

قابلِ رحم ہے اب شاد کا حالِ دلگیر
ضعف بڑھتا گیا جب سے ہوئے الفت کے اسیر
حال کیا کہئے اب آپ سے اپنا تقریر

ناتوانی نے خمیدہ یہ کیا مجکو وزیر	ناتوانی نے خمیدہ یہ کیا مجکو وزیر
زیر پا چاک گریباں ہے۔ تو داماں سر پر	زیر پا چاک گریباں ہے۔ تو داماں سر پہ

ان اصلاحوں کا سلسلہ کامل سات برس تک جاری رہا۔ ۱۲۸۱ھ سے ۱۲۸۷ھ تک۔ اس زمانہ میں صفیر بلگرامی کا قیام زیادہ تر عظیم آباد کشمیری کوٹھی میں تھا۔ اس وجہ سے جناب شاد کو فیض حاصل کرنے میں بہت سہولت ہوئی۔ خود حضرت صفیر بلگرامی کے الفاظ یہ ہیں:۔

"۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔ (ہجر نی عظیم آبادی کے ہاں جو مشاعرہ ہوا تھا اُس میں) جناب میر علی محمد صاحب شاد کا حال معلوم ہوا کہ پانچ چار مہینے سے شعر کہتے ہیں۔ اور جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد سے اصلاح لیتے ہیں اتنے میں گذری کا مشاعرہ برخواست ہوا۔ اور اب میری خاطر سے کشمیری کوٹھی میں بنا یہ نکہت کی طرف سے ہونے لگا۔ ۔۔۔ ۔۔ اوسی مشاعرہ کی دوسری طرح میں (زمین ملال ہے خیال ہے) ۔۔۔۔۔ غزل کہہ کر جناب شاد میرے پاس عصلاح کے لئے لائے۔ اور شاگرد ہونے آئے ۔۔ ۔۔ ۔۔ میں تو جانتا تھا کہ وہ جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد کے شاگرد ہیں۔ مجکو تامل ہوا۔ اور استفسار کیا کہ اسکا سبب کیا ہے؟ فرمایا وہ کلکتہ جاتے ہیں اور میں آپ کے سوا کسی دوسرے کو قابل اصلاح دینے کے نہیں پاتا ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ آخر میں نے بعد اصرار کے قبول کیا اور چند رئیسان کشمیری کوٹھی کے سامنے اُن کی غزل پر اصلاح دی اور ہر اصلاح پر وجہ اصلاح کی بھی لکھ دی۔ اوس دن سے جناب شاد اصلاح لینے لگے۔ اور میں بھی روزانہ چار گھڑی دن رہتے حاجی گنج جاتا اور نو دس بجے شب کو سواری پر وہاں سے آتا۔ اور یہی حال برسوں رہا۔ اس مدت میں بیسیوں مشاعرے ہوئے اور جناب شاد کو شوق بڑھتا گیا اور میں نے بھی اپنی کم مائگی پر جو کچھ جانتا تھا بتانے میں دریغ نہیں کیا۔ اور اُنکی طبیعت کہ مایل بہ پستی تھی، اُسکو طریقہ بتا بتا کر بلند کر دیا اور اپنے ڈھنگ اور اپنے خاندان کی وضع پر لایا۔۔۔۔"

اس بیان کی تصدیق خود جناب شاد کا قلم اس طرح کرتا ہے

مخمس ۱

دروغ گو نہیں کچھ شاد جو زباں پھیرے — جہاں میں کہنے کو شاعر ہیں یوں تو بہتیرے
جو مجھ سے پوچھ تو یہ ہے گماں میں میرے — صفیر لطف ہے ملتا کلام میں تیرے
زبان خوب ہے تیری۔ بیاں بہت اچھا

مخمس ۲

کر لیا ہے شاد کو زلف معنا میں نے اسیر — فی الحقیقت آپ اس فن میں نہیں رکھتے نظیر
اب نئی طرحوں میں پڑھیئے شعرہائے دلپذیر — یہ زمیں تفریح کی تھی۔ بس کریں آپ اے صفیر
ہو چکے اس میں بہت اشعار۔ رہنے دیجئے

زمانۂ شاگردی میں جناب شاد نے اپنے اوستاد صفیر بلگرامی کو جو خطوط بھیجے اُن میں سے چند یہ ہیں :-

مکتوب اوّل

بلبلِ شاخسار حدیقہ جادو بیانی جناب اوستادی میر فرزند احمد صاحب مدظلہ العالی۔ بعد تسلیم عرضہ رسا است بخیریت بودہ صحت وری مزاج اقدس می خواہد۔ از چندے احوال صحت وری معلوم ندارم۔ خداوند کریم ذات عالی را از جمیع بلیّات محفوظ دارد۔ بمنہ وکرمہ۔

دریں مشاعرہ سوائے بندہ و شاہ حفاظت حسین صاحب و سید کاظم حسین صاحب کسے نبود۔ جناب خود تشریف نداشتند تا بدیگراں چہ رسد؟ بنائے جلسہ را لاحاصل دانستہ موقوف ساختم و باوجود وعدہ جناب میر حامد حسین صاحب نیز تشریف نیاوردند۔ برائے تفریح طبع دریں روز ہا میخواہم کہ بخدمت شریف حاضر شوم۔ اطلاعاً عرض ساخت۔ زیادہ حد ادب۔

کمترین علی محمد عفی عنہ

مکتوب دوم

بلبلیکہ صفیر منقار گہر بارش لب طوطیان بند بند د۔ دام ظلہ۔ تلمیذ حلقہ بگوش علی محمد عفی عنہ تسلیم و نیاز می رساند۔ روزیکہ جناب والا رونق افروز خانہ ام بودند بجسب تذکرہ دو چہار بند مختلف از مراثی جناب مرزا دبیر صاحب خواندہ بودند۔ پس منجملہ آں اگر تمامی مرثیہ ایں جا باشد بعنایتش ممنون تواں فرمود۔ والّا دو چار بند کہ یاد باشد نوشتہ عنایت فرمایند۔ بخدمت جناب میر حامد حسین صاحب نکہت سلام می رسانم۔ فقط

علی محمد شاد

مکتوب سوم

ہادی۔ سرگروہ معرکہ آرایانِ سخن اوستادی۔ شبستانِ فصاحت را شمع انجمن دام عنایتہ۔ شاد چوں دلِ خود در اضطراب ہدیہ سلام و تحیات تسلیمات رسانیدہ عرضہ دہ اینکہ عرصہ ہوا کہ آپکی خیریت سے آگاہ نہیں۔ ترسیل عنایت نامہ ضرور ہے کہ اس سے باعثِ زور و قوتِ شاگرد نیاز مند متصور ہے۔

ان دنوں عجیب واقعہ' طرفہ ماجرا' برپا ہے۔ ہرچند پہلے مولوی محمد احسن صاحب شاعر گرد میر محبوب شیر شاگرد انکے ہم سے مباحثہ میں الزام اوٹھا چکے ہیں' اب پھر وہی تقریب پیش آئی۔ ایک آشنا کے مکان پر بندہ گیا تھا۔ وہاں ایک سادی کتاب رکھی تھی۔ اوس میں کچھ اشعار مولوی صاحب کے لکھے تھے۔ اوما ایک رنڈی ہے۔ مسمّٰی جیا۔ ردیف غزل اوسی کے نام سے تھی۔ بندہ نے وہیں ایک غزل اوسی قافیہ ردیف میں کہہ کے لکھ دی۔ جب مولوی صاحب کے ملاحظہ میں آئی تب دونوں نے ایک مطلع اور دو شعر اوس کتاب میں لکھ کر جو عبارت کہ ہم آگے لکھیں گے لکھ دی۔ جب بندہ نے وہ دیکھا خدا کے فضل سے وہیں جواب اوسکا لکھا اور پھر مولوی صاحب نے اوسکو دیکھ کے جواب لکھا۔ بندہ نے پھر اوسکا جواب لکھا۔ جب سے پھر اوسکا جواب مرحمت نہ ہوا۔ اس شہر میں ایک دھوم ہوئی کہ جناب شاعر گر صاحب سپر انداختہ ہوئے اور الزام کھایا۔

چونکہ اطلاع اس کی آپکی جناب میں حقیر کو ضرور تھی اس واسطے التماس کیا۔ فقط کمترین علی محمد شاد

مکرر آنکہ جو کچھ امان علی خاں صاحب پدر یکتا سے اتفاق ہوا بالمشافہ انشاء اللہ۔

نقل عبارت مولوی صاحب

جس شخص کو دعوی شاعری ہو اس میں شعر کہے تب حقیقتِ امر کھلے۔

بس کہ دارم بسوزِ عشقت تن	جگر میں داغوں کا ایک گلشن	۱
مَتَاعُ رُوحِیْ فِدَاکَ اُنْظُر	ٹک تو پیارے ہمارا کلین	
ثنائے حسنت چہ بر نگارد	تمہارے غمزوں کا کشتہ احسن	۲
لَخَجِلَ الشَّمْسُ وَالْکَوَاکِبُ	تمہارے مکھ کی دمک سے سرجن	

اور یہ مطلع ہے کہ جس پر ہکو دعوی ہے کہ ورائے قافیہ جُبّا وتبّا کوئی نہیں کہہ سکتا۔

کل جو ہم نے طرفِ سینۂ جُبّا دیکھا صفحۂ احسن میں بس نور کا تبّا دیکھا

راقم محمد احسن عفی عنہ

الجواب:— تیغ آبدار زبان سوال اول کے جواب میں رطب اللسان ہے

بگو دلا۔ چیست حالتِ تو	بتا تو اے عقل و دیں کے دشمن	۳
فَجَاءَ مَنْ فِی الْخَیَالِ الْآنَ	جو بیٹھا بیٹھا کرے ہے سن سن	
چناں زدحشت بتنگ گشتم	کہ روز کرتا ہوں چاک دامن	۴
کَلَنْتُ کَالْقَیْسِ یَا حَبِیْبِیْ	پڑے جو بپتا تو لاج کیسن	
وصالِ تو بہر دردِ فرقت	دوا ہے اسے حورِ عیسوی فن	۵
لِعِلَّتِیْ لَا شِفَاءَ فقط	لگاؤ بو ماتھ پر جو چندن	

۱ برہ کی سلگن سے جگر داغ داغ ہے۔ داغوں کی پھلواڑی ہے۔ اے پیارے! ہماری جان تجھ پر فدا ہو! اس تڑپن کو ایک نظر دیکھ تو لے!

۲ تیری اداؤں کا مارا احسن تیرے حسن کی تعریف کرے تو کیا کرے؟ جب تیرے مکھڑے کی دمک سے سورج اور سورج بنی تک شرمائے جا رہی ہیں

۳ اے دل! اے عقل اور دین کے دشمن! تیرا حال کیا ہے؟ تجکو اس وقت کس کی یاد آ گئی جو تو بیٹھا ہوا یوں سن سن کر رہا ہے؟

۴ وحشت کا اب یہ زور ہے کہ دامن ہر روز پھٹتا ہی رہتا ہے۔ اے بیلی! تیرا دیوانہ کہتا ہے کہ بپتا کا مارا لاج کرے تو کہاں تک کرے؟

۵ جدائی کا درد وصل سے جاتا ہے۔ ماتھے پر چندن لگانے سے نہیں جاتا۔ بید جی مہاراج! اب آپ ہی بتلائیں کہ آپ کا روگی اچھا ہو تو کیونکر ہو؟

شدہ است عالم چناں ز وحشت — کہ ہوئے جس کے بیاں سے اولجھن
فَفِی فِرَاقِ الْحَبِیْبِ سِرْتُ — ایت جیسے پھرے ہے بَنْ بَنْ [1]

منم چہ گویم کہ کس طرح ہے — تمہاری آفت کی چشم پُرفن
یَکُوْنُ سَیْفًا لِقَلْبِ مَحْزُوْن — غضب کریں ہیں تمہار چتون [2]

شدہ است تاریک و تار ازحد — مری نظر میں جہانِ روشن
رَاَیْتُ فِی اللَّیْلِ یَا اِلٰھِی — یہ ہم نے سپنے میں کہنہ کا درشن [3]

دلم شکستہ چو جام شیشہ — خبر ہے او عاشقوں کے دشمن
مِنَ الْحِجَارِ الْفِرَاقِ اُنْظُرْ — یہ تم نے پھوڑیو ہمارا باسَن [4]

گہے چو آمد بزیر پایش — ز اتفاقات میرا مدفن
فَقَالَ مِنَ الرَّحِمِ قُمْ بِاِذْنِیْ — موئے ہو تم شاد کہنہ کے کارن [5]

اب جواب سوال ثانی کا بیان ہے۔ بہت عجب ہے۔ اور مقام فکر و تعجب کہ کس دانائے بے بدل' اور کس جادو نگار شیوا زبان نے یہ مطلع 'مثل مطلع خورشید' آسمانِ کاغذ پر جلوہ گر کیا ہے' اور کس ناظم دور اندیش' انشا کیش نے اس عبارت کو لکھ دیا ہے۔ اول مشبہ بہ واحد کا اوس مقام پر استعمال ضرور ہے۔ اور اگر مشبہ جمع ہے تو مشبہ بہ جمع لانا ایسے مقام پر دستور ہے۔ لیکن یہ مطلع عاشقانِ بے سرو پا کی طرح' دونوں سے مہجور ہے۔ اگر یہ مطلع پھر درست کر کے لکھیں تو ہم اس پر توجہ کریں۔

اور ایک دو قافیے نادر اگر تلاش سے ہاتھ آئیں تو باعث فخر و مباہات نہیں۔ اکثر کم گو بھی نکال لیتے ہیں۔ کچھ بات نہیں۔ یہ امر اتفاقیہ دلیل شاعری نہیں۔ برہانِ ماہری نہیں۔ وہ بھی ٹھیک نظر نہیں آتا۔ کیونکہ لفظ جتّا ساتھ الف مقصورہ کے علم ہے۔ اور قبتا ہائی مختفی کے ساتھ ضم ہے۔ ہر چند صحت قافیہ آشکارا ہے۔ پر طبع رسا کو کب گوارا ہے ع ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

---

[1] جنوں کا اب یہ عالم ہے کہ اس کے بیان تک سے الجھن ہوتی ہے۔ جس طرح بیراگی بن بن مارا پھرتا ہے اسی طرح اپنے پیارے کی جدائی میں ہمکو بھی کہیں چین نہیں
[2] اے پیارے! تجھکو کوئی کس طرح سمجھائے کہ تیری جادو بھری آنکھ کیسی قہر ہے اس بیچارے دل کو دیکھ۔ اور اپنی تلوار کو دیکھ۔ اللہ رے تیری چتونوں کا غضب
[3] اے اللہ! یہ ہم نے رات سپنے میں کس کا درشن کیا ہے کہ اسوقت دن دوپہر ہے مگر آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو رہی ہے!
[4] اے چاہنے والوں کے دشمن! تو نے تو ہمارا باسن ہی پھوڑ دیا۔ دیکھ لے کہ جدائی کے پتھرے دل کا شیشہ چور چور ہے یا نہیں!
[5] ایک دن اتفاقیہ اوس کے پاؤں کے نیچے ہمارا مدفن آ گیا تو ہم اوس کو آہی گیا۔ کہنے لگا کہ قم باذنی! اب اٹھ جا۔ اور ہاں اے شاد تو نے کس کے کارن اپنی جان گنوائی ہے؟

پردے میں گفتگو کب خوب ہے - اپنے نزدیک معیوب ہے - گیسوئے مشکبار سخن کو طول ہو - کسی صحبت میں اسکا چرچا معقول ہو ؎ ہمچو مرداں سر میداں آئید درپس پردہ زباں نکشائید

مطلع کا جواب پائیں - کچھ حظ اٹھائیں -

کتبہ خادم الشعرا سید علی محمد شاد عفی عنہ

مکرر یہ ہے کہ ایک غزل بندہ نے کہی ہے - طالب جواب ہے ؎

یاد آتی کیوں اسیری میں ترے بالے کی گونج
توڑتی ہے سقف زنداں کو مرے نالے کی گونج

میکدہ میں قلقل مینا سے شور صور ہے
حشر برپا کر رہی ہے آج متوالے کی گونج

ابتدائے حسن میں کب تھی تمہیں اتنی تمیز
یاد ہے کہتے تھے اکثر کھولدو بالے کی گونج

دسترس ہو کاش ہکو بھی کبھی اے آسماں!
وصل میں وہ سم سے کھلوایا کریں بالے کی گونج

زلف جاناں کے تصور میں ہو رمئے دشت میں
میرے نالوں سے کہیں دب دب گئی بالے کی گونج

کیا ات بالا کسی محبوب کا سمجھا ہے شاد
غور کرکے دیکھنا ہے چاند کے ہالے کی گونج

جواب از طرف محمد احسن :-

یہ چند سطریں کسی کی لکھی ہوئی نظر سے گذریں - کیفیت استعداد کاتب ہویدا ہے - اگر سوال قابل جواب ہوتا دیا جاتا - قابل خطاب نہ جان کر احتراز کیا - مگر بامرار عنایت فرمائے حاضر الوقت دو تین بیت بجواب ہر دو ایراد معترض لکھ دئے جاتے ہیں -

فردوسی :- چو بکشاد آں طرۂ مشکناب شب آمد بپا بوسی آفتاب

مولانا جامی علیہ الرحمہ :- چو فرق آراست آں پاکیزہ گوہر کشیدہ بر محک گویا خط زر

تلق :- ما ما سلطان عالم سے ہمارا ہو گیا پرتو خورشید سے ذرہ ستارا ہو گیا

العاقل تکفیہ الاشارہ - اگر خرد است ہمیں قدر بس است -

محمد احسن

جواب الجواب :- یاقوم انی لکم من الناصحین - واہ واہ - سبحان اللہ - کاتب کا لکھا دیکھا - یہ جو تحریر ہے کہ سوال قابل جواب نہیں - یہ وہی مثل ہے کہ ناچ نہ جانوں آنگن ٹیڑھا - اور جو اشعار اساتذہ کے لکھے ہیں وہی ہے کہ ؎

پسر نوح گفتہ است سعدی در زلیخا الایا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا

وہ اشعار جواب نہیں - جواب دہندہ کامیاب نہیں - جو اصل قاعدہ ہے وہی مطلع میں رہ گیا ہے - اس پر جائے گفتگو کیا ہے -

گر عارفوں کی بول چال ہے۔ اسکا سمجھنا محال ہے۔ فقط عبدالمذنب سید علی محمد شاد

نقل لفافہ مہری ڈاکخانہ پٹنہ و آرہ

بعونہ تعالیٰ بقصبہ آرہ ضلع شاہ آباد۔ بہ پھاٹک صاحبانِ بلگرام ——— بعالی ملاحظہ

بلبل شاخسار خوش بیانی جناب اوستادی سید فرزند احمد صاحب قبلہ المتخلص بصفیر دام ظلہ۔——

مشرف باد۔ از عظیم آباد۔ علی محمد شاد۔ بیرنگ

جناب شاد کا اپنے اوستاد صفیر بلگرامی کے نام یہ بیرنگ خط پڑھیئے۔ اور پھر نواب سید محمد خاں رند لکھنوی کا یہ مقطع پڑھیئے ؎

چل کے اب عرض کرو حضرتِ آتش سے رند معرکہ آپ کا یہ طفلِ دبستاں جیتا

جناب شاد کے اس پرلطف خط میں چند باتیں تفصیل طلب ہیں:—

(۱) عظیم آباد میں ایک مرتبہ ڈھول پٹ گیا کہ صفی پور ضلع ہردوئی سے ایک اوستاد ایسا آیا ہوا ہے جو آٹھ دن میں شاگرد کو خاقانی اور سعدی اور فردوسی بنا دیتا ہے۔ یہ غوغا ہوا تو پچھم سے پورب سے دکھن سے اوتر سے جو آتا ہے وہ سید محبوب شیر مولت عظیم آبادی کے مکان کا پتہ پوچھتا ہے کیونکہ یہ عجیب و غریب اوستاد اوسی مکان میں جلوہ فرما تھا۔ اس جادو گھر میں ایک نوشق بھی جاتا ہے تو دو دن کے بعد حافظ اور جامی کے لباس میں نکلتا تھا۔ سید محبوب شیر اور دیگر شاگردوں سے پوچھا گیا کہ آخر معمہ کیا ہے تو جواب ملا کہ اوستاد کا حکم ہے کہ یہ راز فاش نہ ہو۔ تب ایک جاسوس بھیجا گیا۔ یعنی عبدالحکیم تمکین قنوجی۔ اس جاسوس نے شاگردی اختیار کی اور دو دن کے بعد راز فاش کیا کہ ——— اوستاد کے پاس دو کتابیں ہیں۔ ایک میں مترادف الفاظ ہیں۔ دوسری میں مترادف فقرات۔ جس شاعر کی غزل کے موافق کہنا ہوا وہ کتاب سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ الفاظ کی تبدیلی کر کے مصرع موزوں ہو جاتا ہے پہلے تو کتاب سکھنے کی حاجت ہوتی ہے۔ پھر مبتدی اُس کے الفاظ و فقرات مترادف کو یاد کر لیتا ہے۔ اور غزل پر غزل کہہ دیتا ہے۔

یہ اوستاد وہی اوستاد ہے جسکو جناب شاد نے اس خط میں مولوی محمد احسن شاعر گر لکھا ہے۔ شاعر گر سے مراد یہی واقعات ہیں۔ اور عجیب اتفاق کہ تمکین قنوجی جنھوں نے احسن کا راز فاش کیا۔ اور شاد عظیم آبادی جنھوں نے احسن کو شکست دی، دونوں صفیر بلگرامی کے شاگرد تھے۔ احسن کو بدگمانی ہوئی کہ پس پردہ صفیر بلگرامی ہیں۔ حالانکہ جناب شاد کا یہ خط شاہد ہے کہ عظیم آباد میں جسوقت یہ معرکہ ہو رہا تھا صفیر بلگرامی اسوقت آرہ میں تھے۔

احسن کا قیام سید محبوب شیر صولت عظیم آبادی کے ہاں تین چار برس رہا۔ گر تمکین و شاد کا بخار انھوں نے صفیر بلگرامی سے نکالا۔ اور باوجود ہموطنی کے (صفی پور موطن بلگرام کے پاس ہے) ان سے ملاقات نہ کی۔ صفیر بلگرامی نے ایک مرتبہ رقعہ لکھا:

بھیجا جس میں کسی کا یہ شعر بھی تھا ؎

تعجب کی جگہ ہے۔ ہم تم اک بستی میں بستے ہیں | اور اُس پر یہ غضب ہے دیکھنے کو بھی ترستے ہیں

اسکا جواب احسن نے دیا کہ خوش شاق ہو وہ خود آئے ۔الغرض احسن تین چار برس رہکر اور سید محبوب شیر صولت کو صاحب دیوان بنا کر غازی پور چلے گئے وہاں محمد تقی کوکب جونپوری حکیم محمد اسحاق حاذق لکھنوی وغیرہ احسن کے شاگرد ہوئے۔
اب عظیم آباد کا واقعہ سنئے کہ سید محبوب شیر نے اپنا دیوان میر قاسم شیر کے ہاتھ مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی کی خدمت میں بھیجا۔ اور تقریظ لکھنے کی استدعا کی ۔ مولانا حسرت نے یہ لکھ کر ٹال دیا :-

"وصف کلام فصاحت التیام سامی کہ مالا مال نازک خیالی ہاست چہ گویم کہ می ترسم کہ تحسین ناشناس موجب شکستِ قدرِ آں گوہر شاہوار نگردد"

یعنی آپ کے کلام کی تعریف ہم کریں تو کیونکر کریں؟ ڈر یہ ہے کہ تحسین ناشناس اُسکو بے قدر کرے گی۔ تقریظ آپ کسی سخن شناس سے لکھوایئے۔ بہرکیف سید محبوب شیر نے ۱۲۸۵ھ میں رحلت کی۔ چار برس کے بعد مرحوم کے خلف سید علی شیر کمنت نے یہ دیوان چشمۂ علم پٹنہ میں طبع کرایا۔

آج نہ احسن ہیں، نہ سید محبوب شیر ہیں۔ نہ شاد عظیم آبادی ہیں۔ مگر اُس ہنگامہ کی یاد شاد کے مقطع سے آج تک تازہ ہے ؎

کیا اسے بالا کسی محبوب کا سمجھا ہے شاد | غور کرکے دیکھتا ہے چاند کے ہالے کی گونج

مصرع اول میں "محبوب" کا اشارہ جناب احسن کے محبوب یعنی سید محبوب شیر کی طرف ہے۔
(۲) جس زمانہ میں احسن کا دور دورہ تھا اُس زمانہ میں زلیخائے مصری کی دو بہنیں نجا اور جُبا سارے عظیم آباد کو پالے ہوئی تھیں۔ نجا کی نشانی باندی۔ باندی کی نشانی سعیدہ۔ مگر جُبا کی نشانی پوچھئے تو شاد و احسن کا یہی معرکہ ؎

صنم چہ گویم کہ کس طرح ہے | تمھاری آفت کی چشم پُرفن
یکون سیفاً لقلب مجروح | غضب کریں ہیں تہارچتون

شاد نے جن آنکھوں کی دوہائی دی ہے وہ آنکھیں ایک باکمال عورت کی تھیں۔ جُبا کی فارسی دانی اور لاوقی قابلیت سے لوگوں کا ناطقہ بند تھا۔ ایک مرتبہ کشمیری کوٹھی میں مخصوص فارسی قصائد کے لئے مشاعرہ تھا۔ فارسی گو اساتذہ کا مجمع تھا اور صدر میں جُبا تھی۔ شعرا اپنے اپنے قصائد سنا رہے تھے۔ اتنے میں ایک ممتاز رئیس وادیب نے

حضرت سید فرزند احمد ۔ صفیر بلگرامی۔

SPECIAL PRESS, CAL

اپنا قصیدہ شروع کیا تو جُبّا بول اٹھی :۔

"میں اسکا قصیدہ سن کے کیا کرونگی ؟"

رئیس و ادیب بیچارہ پانی پانی ہو گیا۔ مجمع انگشت بدنداں تھا۔ مگر جبّا کے سامنے کوئی دم نہ مار سکا۔

(۴) جناب شاد کے اس خط میں ایک جملہ ہے :۔ "جو کچھ امان علی خاں صاحب پدرِ یکتا سے اتفاق ہوا بالمشافہ انشاء اللہ" اس سے مراد مرزا قتیل کے شاگرد مرزا امان علی خاں غالب لکھنوی ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ اردو میں قصہ امیر حمزہ انہیں کی تالیف ہے۔ انکا قیام دیوان محلہ عظیم آباد میں تھا۔ غالب لکھنوی کے بیٹے مرزا نوروز علی خاں یکتا عظیم آبادی وہی ہیں جن کی یکتائی عبدالغفور خاں نساخ کو نہ بھائی۔ نساخ کا نشتر ملاحظہ ہو :۔

"ان میں (یکتا میں) ایک بڑا عیب ہے کہ دوسرے شاعروں کے شعر کو اپنے نام سے پڑھتے ہیں"

مگر ناظر وزیر علی عبرتی کے ایسا مستند ادیب و چشم دید گواہ کہتا ہے :۔

"چشم بد دور تماشے دارد رنگیں تراز دہنِ گل۔ و نکرے دارد آتشیں تراز نغمۂ بلبل ...... نظم آبدار می نگارد۔ و نثر ثریا نثار می طرازد۔ ایزد تعالیٰ نہالِ خیالش را ہمہ بہار دارا و ......"

باب سوم در بیان ص

حضرت غالب کے مطبوعہ خطوط میں چودھری عبدالغفور کے نام جو خطوط ہیں روئے سخن اُنکا دراصل حضرت صاحب عالم صاحب بلگرامی سجادہ نشین مارہرہ ضلع ایٹہ کی طرف ہے۔ چنانچہ ایک خط میں حضرت غالب فرماتے ہیں :۔

"تحقیق کہ اب روئے سخن جناب فیض نساب جامع مدارج جمع الجمع، بزم وحدت کی فروزندہ شمع، مستغرق مشاہدۂ شاہد ذات حضرت عالم صاحب قدسی صفات کی طرف ہے ......"

ایک دوسرے خط میں فرماتے ہیں :۔

"جناب چودھری صاحب! آؤ۔ ہم تم حضرت عالم کے پاس چلیں۔ اور اپنی آنکھیں اُن کے کفِ پائے مبارک سے ملیں۔

میں سلام کرونگا۔ تم معروض ہو تا کہ غالب یہ ہے! اہلِ دہلی میں آپ کے دیدار کا طالب یہی ہے! میں نے عزم قدمبوسی کیا۔ پیرو مرشد نے مجھے گلے لگایا۔

فرماتے ہیں۔ غالب! تو اچھا ہے؟ ۔ عرض کرتا ہوں کہ الحمد للہ! حضرت کا مزاج مقدس کیسا ہے؟

ارشاد ہوا کہ مولوی سید برکات حسن تیری بہت تعریف کرتے رہتے ہیں۔

جناب! یہ انکی خوبیاں ہیں۔ میں ایسا نہیں ہوں جیسا وہ کہتے ہیں۔ کاش وہ میری رنجوری کا حال کہتے ضعف قویٰ و اضمحلال کہتے۔ تاکہ میں اُن کے کلام کی تصدیق کرتا۔ اُنکی غمخواری اور دردمندی کا دم بھرتا ہوں

درکشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن　　　اینکہ من نمی میرم ہم ز ناتوانی ہاست

حضرت نے میری گرفتاری کا نیا رنگ نکالا۔ بوستان خیال کے دیکھنے کا دانہ ڈالا۔ مجھ میں نئی خفت پرواز کہاں کہ بلا سے اگر پھنس جاؤں، دام پر گر کے دانہ زمین پر سے اُٹھاؤں۔ حضرت! سچ تو یوں ہے کہ غمہائے روزگار نے مجکو گھیر لیا ہے۔ سانس نہیں لے سکتا۔ اتنا تنگ کردیا ہے.......

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید　　　ناامیدی اُس کی دیکھا چاہئے

یہ خط دہلی سے مارہرہ گیا تھا۔ مگر اسکو تعلق آرہ سے ہے۔ آرہ میں حضرت صاحب عالم صاحب کے نواسہ اور حضرت غالب کے شاگرد صفیر بلگرامی نے بوستانِ خیال کی اٹھارہ جلدوں کا ترجمہ فارسی سے اُردو میں کیا اور دو جلدیں شائع ہوئیں تو غالب نے مبارکباد دی:۔

فور نظر۔ لخت جگر۔ زبدہ اولادِ پیغمبر۔ مولوی سید فرزند احمد زاد مجدہ۔ اس درویش گوشہ نشیں کی دعا قبول فرمائیں۔ بوستانِ خیال کے ترجمہ کا عزم اور دو جلدوں کا منطبع ہو جانا مبارک۔ حضرت! یہ آپ کا احسان عظیم ہے مجھ پر خصوصًا۔ اور بالغ نظرانِ ہند پر عمومًا۔　　　غالب ۱۲ ذیقعد ۱۲۸۱ھ

اسی بوستانِ خیال اُردو کی اور جلدیں صفیر بلگرامی کے نانا حضرت صاحب عالم سجادہ نشین مارہرہ نے غالب کو دیکھنے کے لئے بھیجیں تو چودھری عبد الغفور کے خط میں وہ جواب آیا جو اوپر لکھا گیا۔

صفیر بلگرامی کے بارے میں جوہر شناس کیا کہتے تھے اور کیا کہتے ہیں اسکا بیان قصیدہ زلف لیلیٰ ہے۔ اس قصیدہ کا چہرہ یہ ہے:۔

مفتی سید محمد عباس شوستری:۔　جہاں است آلنگ خوش شہر یور　　انوشہ بنوشہ فروزندہ ہور

بھادوں کی جھڑی ہے۔ ہریالی ہے۔ جبھی تو سونے جہاراج تک ایک کنیا کے پھیرے میں آ گئے!

آلنگ ۔۔۔۔ سبزہ زار

شہریور ۔۔۔ بھادوں کا مہینہ

انوشہ ۔۔۔۔ شادان و خنداں

بقیہ صفحہ ۲۱۹ پر

پیشم شتاباں بیا موبدا	بخشنی چہ خوانی برائے خدا

اے اگنی دیوتا کی آنکھوں کی تارے! تیری پوتھی جائے چولھے بھاڑ میں۔ ہمارے پاس آتا کیوں نہیں؟

چہ از بر سرائی لنگ ہائے ژند	ببین و بخواں نامۂ دل پسند

ہم پوچھتے ہیں کہ وہاں بیٹھا ہوا کیا الاپ رہا ہے؟ تیری پوتھی میں آخر رکھا کیا ہے؟ دیکھنا ہو تو ادھر آ۔ پڑھنا ہو تو ادھر آ۔

کہ فرزند احمد ہمایوں منش	گرامی نژاد و خجستہ روش

فرزند احمد کو دیکھ۔ جس کا سبھاؤ اچھا جس کی پیڑھی اونچی۔ جس کی چال ڈھال اچھی۔

بنشست است زیبا تر از گلستاں	بگو تا دلت شاد گردد از آں

پھلواڑی میں وہ پھول کہاں جو اس کے پاس ہیں؟ آکر دیکھ لے۔ جھولی بھر لے۔

کہ فرزند احمد دبیر کبیر	جواں است و خوش فکر و بلبل صفیر

فرزند احمد قلم کا دھنی ہے۔ جگت گرو ہے۔ جوان ہے۔ کبیشر ہے۔ بلبل ہے۔ صفیر ہے!

میرزا دبیر لکھنوی (۱) "خطیب منابر فصاحت و نکتہ دانی۔ عندلیب حدائق بلاغت و رنگین بیانی سلمک اللہ تعالیٰ"

(۲) "نمک خوانِ سخن، محک امتحانِ طرز معحن، فصاحت سرایہ، بلاغت پیرایہ، سید فرزند احمد صاحب۔ متخلص بہ صفیر زاد قدرہ۔ بادۂ تمنا در جام و زلالِ مدعا ہموارہ بکام باد!"

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۸ کا۔ خوشہ ——— گیہوں کے کھیت میں ایک کنواری لڑکی ہے۔ داہنا ہاتھ گندمی رنگ۔ ہاتھ میں مٹھی بھر گیہوں کی بالیاں۔ ایسی پیاسی کہ پاؤں رکھتی کہیں ہے اور پڑتا کہیں ہے۔ سر پچھم اوتر۔ پاؤں پورب دکھن!

اہلِ نجوم نے آسمان کو بارہ حصوں (بروج) میں تقسیم کیا ہے۔ ان بارہ برجوں میں چھٹے برج کا نام ایران میں سنبلہ رکھا گیا۔ سنبلہ یعنی خوشۂ گندم۔ ہندوستان میں کنیا رکھا گیا۔ کنیا کنواری لڑکی۔

اس مصرع میں خوشہ سے مراد برج سنبلہ یعنی کنیا ہے اس لئے اندر شہ بخوشہ فروزندہ ہور کا مطلب یہ ہوا کہ آفتاب برج سنبلہ میں ہے۔ یعنی سورج مہاراج ایک کنیا کے پھیرے میں آگئے۔

هور ——— آفتاب

موبد ——— جس طرح ہندوؤں میں پنڈت اسی طرح پارسیوں میں موبد

بخشنی ——— پارسیوں کی کتاب وظائف

لنگ ——— سورہ

ژند ——— صحیفۂ زردشت

مرزا محمد باقر صحبت شیرازی

از قصیدہ در مدح حضرت صفیر بلگرامی

هزار مرتبه گر مدح حضرت تو سرایم — یک از هزار نگویم چه منجلی وچه مبهم
هم آسمانِ جلالی۔ہم آفتاب جمالی — هم آسمانِ کمالی۔جلیل قدر و معظم
جناب سید فرزند احمدی و صفیری — همی ز زمرهٔ ساداتِ بلگرام مفخم
گرم ببلطف بخوانی۔ ورم بقهر برانی — سر اندرم بکمند تو است۔ وحکم تو محکم
بپائے حمت و فضل از قدم کنی سوئے صحبت — رسد بزخم درونش زخاک پائے تو مرہم

مرزا حاتم علی مہر لکھنوی :—

نه تنها عشق از دیدار خیزد — بسا کیں دولت از گفتار خیزد

الحمد للہ علی احسانہ کہ از صریر خامہ صفیرے بگوش خورد۔ و دلم از دست برد ؎

بدیں مژدہ گر جاں فشانم رواست — کہ ایں مژدہ آسائش جانِ ماست

کرمت نامہ دی کہ یکم اگست بود بایک جلد علی بند وحسین بند برائے بندہ، ودونا برائے برادر عزیزم میرزا عنایت علی ماہ سلمہ اللہ، و نور چشم آغا سخاوت علی ضیا اسسٹنٹ کلکٹر وڈپوٹی مجسٹریٹ ایں ضلع ایٹہ اعلی اللہ درجاتہم معہ یک جلد سفر صفیر و یک جلد تذکرہ تلامذہ بلند فکر خیر اللہ کر بسبیل ڈاک رسید۔ وایں خمسہ چوں خمسۂ نظامی بر حواسِ خمسہ ام نظام تازہ بخشید۔ ماشاء اللہ ہر تصنیف شریف لطفے دارد کہ دل شیدائے سخن می خارد ؎

بنامہ آں دوست کو دوستاں را — غذائے دل و راحتِ جاں در سند

هجوز از عالی دودمان و والا شان اعز اعزا میر بادشاہ علی صاحب بقا مہر میرزا سلامت علی صاحب دبیر مغفور خلف الصدق جناب میر وزیر صاحب مبرور، محامد و مدیح جناب بیشتر از بیشتر می شنفت۔ اکنوں از کلام بلاغت نظام بہ اذاں و دیا فہم کہ عزیزم میگفت۔ تعالی شانہ سلامت داشتہ باشد۔ بحق محمد وآل محمد۔ میخواہم کہ گاہ گاہ بخاطر مبارک رسیدہ باشم۔ ذرد چہرہ۔ مہر عفی عنہ

حضرت امیر مینائی :—

بلبلِ شیراز و طوطی ہند کے ہمصفیر سلامت۔ سلام مسنون اخلاص و سپاس مشحون۔ سفر سے پلٹ کر بیماریوں اور بیماروں کی پرستاریوں نے مجھ سے جی بھر کے اُن آسائشوں کا عوض لیا جو میں نے ملاقات احباب سے سفر میں پائی تھیں۔ وہ سرگذشت لکھوں تو خط مرثیہ ہو جائے۔ مرنکتے ہی عزیز چل بسے۔ خدا مغفرت فرمائے۔

اس اجمالی اطلاع سے مقصود یہ ہے کہ آپ اپنے فقیر، نام کے امیر، کو یہ نہ سمجھیں کہ وطن پہونچکر آپ کی مہربانیوں اور قدردانیوں کی لذت بھول گیا۔ نہیں نہیں۔ سب اوسے یاد ہے۔

امیر اللغات کے اصول سے متعلق ایک کاپی بھیج کر آپ کے دل و دماغ سے جواب باصواب کی آرزو ہے۔ زیادہ حاجت

تصدیع نہیں۔

امیر احمد عفی عنہ

اجی حضرت! جلوۂ خضر کی دوسری جلد چھپنے میں کیا دیر ہے؟ ضرور لکھئے کہ کب تک مشتاقوں کو تڑپائے گا۔ فقط
والسلام بالاکرام۔ ۹ دسمبر ۱۸۹۸ء

اس خط میں جس سفر کا حوالہ ہے اُس سے مراد عظیم آباد ہے۔ ۱۳۰۵ھ میں حضرت امیر مینائی اپنے شاگرد مہدی حسن خاں شاداب رئیس رسول پور ضلع مظفر پور کے طلبیدہ عظیم آباد تشریف لائے۔ اور ریاض و کوثر کے ساتھ لال کوٹھی میں ٹھہرے۔

اُردو کا سب سے پہلا لغت سید اوحدالدین بلگرامی نے اور اُسی زمانہ میں میر علی اوسط رشک لکھنوی نے لکھا۔ رشک کا لغت غیر مطبوع رہا۔ اس کے تقریباً ۲۶ برس کے بعد حضرت امیر مینائی کا یہ خط صفیر بلگرامی کو آیا۔ آرہ سے اسکا جواب ۲۲ دسمبر کو چالیس صفحوں میں گیا۔ خط کیا ہے کہ دریائے تحقیق موجیں مار رہا ہے۔ صفیر بلگرامی کا جواب پانے کے چار سال بعد حضرت امیر مینائی نے امیر اللغات کا پہلا حصہ شائع کیا۔

جلوۂ خضر جس کے بارے میں امیر مینائی لکھتے ہیں کہ مشتاقوں کو کب تک تڑپائے گا، صفیر بلگرامی کی وہ بلند پایہ تالیف ہے جس پر صوبۂ بہار ناز کر سکتا ہے چنانچہ ڈاکٹر بیلی۔ پروفیسر لندن یونیورسٹی۔ اپنی کتاب ہسٹری آف اردو لٹریچر (تاریخ ادب اردو) مطبوعہ ۱۹۳۲ء صفحہ ۹۲ میں تحریر فرماتے ہیں:—

SAFIR BILGRAMI-.....HE LIVED A LARGE PART OF HIS LIFE IN ARA AND WROTE MUCH VERSE, PRINCIPALLY LOVE LYRICS. HIS PUBLISHED BOOKS INCLUDE AN ANTHOLOGY, SALAVAT-I-KHIZR, AND VOLUMES OF LYRICS CALLED — SAFIR-I-BULBUL AND KHUMKHANA-E-SAFIR. HE WROTE A NOVEL, RUH AFZA, WHICH WAS NOT PUBLISHED. PERHAPS HIS MOST IMPORTANT WORK WAS JALVA-E-KHIZR, A HISTORY OF URDU LITERATURE, WHICH HE WROTE WITH A VIEW TO CORRECTING WHAT HE CONSIDERED THE MIS-STATEMENTS OF AZAD'S AB-I-HAYAT

"A HISTORY OF URDU LITERATURE" By Dr. T. G. BAILEY, M

صفیر بلگرامی ۔۔۔۔ زندگی کا زیادہ حصہ انکا آرہ میں گذرا۔ نظم میں انکا کلام بہت کچھ ہے۔ بالخصوص غزلیات۔ انکی مطبوعہ کتابوں میں صلوات خضر بیاض اشعار اور صفیر بلبل و خمخانۂ صفیر دو دیوان غزلیات بھی ہیں۔ ایک ناول روح افزا بھی لکھا تھا جو طبع نہیں ہوا۔ مگر انکی اہم ترین تالیف جلوۂ خضر ہے۔ یہ تاریخ ادب اردو کی اور مؤلف کے خیال میں آزاد کی آبحیات میں جو غلط بیانیاں تھیں انہیں کی تصحیح کے لئے یہ کتاب لکھی گئی۔

شوق نیموی (۱) جناب فیض مآب سخنور نامی گرامی حضرت سید فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی مدفیضکم۔ محمد ظہیر احسن شوق نیموی عظیم آبادی شاگرد حضرت تسلیم لکھنوی بعد تسلیم و بندگی کے التماس کرتا ہے کہ جلال لکھنوی نے ایک رسالہ کارآمد شعرا وتذکیر میں لکھا ہے۔ ایک روز فخراً کہنے لگے کہ اس رسالہ کا موجد میں ہوں۔ اُس پر حضرت اوستاد نے فرمایا کہ سبحان اللہ صفیر بلگرامی اس قسم کا رسالہ پہلے لکھ چکے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تب جلال کچھ طعن کی باتیں کہنے لگے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چند روز ہوئے کہ میں حضرت اوستاد کی خدمت میں رامپور گیا تھا۔ اسکا ذکر آیا۔ میں نے کہا کہ معلوم ہوا کہ اصل رسالہ چھپ گیا۔ انھوں نے فرمایا کہ اگر وہ مل سکے ، تو ایک جلد بھیج دینا کہ جلال کو دکھاؤں۔ اس سبب سے التماس ہے کہ اب آپکے پاس کوئی نسخہ رشحات کا موجود ہے یا نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

(۲) سخنور نامی گرامی۔ جانشین بحش مایۂ شیریں کلامی۔ جناب سید فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی ظللکم اللہ السامی۔ خاکپائے ارباب ذوق محمد ظہیر احسن شوق بعد تسلیم و بندگی کے التماس کرتا ہے کہ آپ کا نامہ نامی ورود ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپنے درباب رشحات جو کچھ تحریر فرمایا ہے سب بجا درست ہے۔ میرے ایک عم زاد برادر کے پاس وہ رسالہ ہے۔ میں نے اس کی خوب سیر کی ہے۔ فی الحقیقت آپ اس کے موجد ہیں۔ رشحات اور کارآمد شعرا میں آسمان وزمین کا فرق ہے۔ جلال کا دعوےٰ محض بے بنیاد ہے۔ حضرت تسلیم کے پاس تسہیل تانیث وتذکیر تھی۔ میں نے عند التذکرہ اُن سے کہا کہ جس طرح اس میں متقدمین و متاخرین کے اختلاف بیان کئے گئے ہیں اسی طرح اصل میں بھی ہر اک کی مثالیں بھی اس قسم کی موجود ہیں کہ جن کی بنا قوافی وردیف پر ہے۔ اُس میں اغلاط کاتب کے گمان کو بھی گنجائش نہیں، اور کارآمد شعرا میں اسکا التزام نہیں ہے۔ یہ سنکر جناب ممدوح نے آپ کی جانفشانی کی کمال داد دی اور بہت مداح رہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہرچند آپ ایسے لائق لوگ کی خدمت میں اپنا کلام بے نظام مورد کلام بھیجنا سراسر گستاخی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گر دو غزلیں جو فی الحال کہی ہیں ارسال کرتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ اگر خدا نے چاہا تو اپکے مرتبہ جب وطن کو جاؤنگا تو آرہ ہوتے جاؤنگا۔ ملاقات کی کمال آرزو ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

از شہر لکھنؤ۔ کشمیری محلہ۔ متصل چاہ حیدر بیگ خاں

رشحات صفیر تانیث وتذکیر کی تحقیق میں صفیر بلگرامی کی ایک دوسری بلند پایہ تالیف ہے۔ اس پایہ کی کتاب اب تک ہندوستان میں نہیں لکھی گئی۔ حضرت جلال لکھنوی کو دعویٰ تھا کہ وہ اس کے موجد ہیں۔ حضرت تسلیم لکھنوی اور شوق نیموی نے صفیر بلگرامی کی کتاب اسی دعویٰ کو رد کرنے کے لئے منگائی تھی۔

رشحات صفیر کے بارے میں حضرت غالب کا فیصلہ ملاحظہ ہو:۔

حضرت غالب:۔ سیدی سندی، نور بصر لخت جگر، قرۃ العین اسد۔ مولوی سید فرزند احمد کے طول عمر و دوام

دولت وبقائے اقبال کی دعا مانگتا ہوں جنکو مبدء فیاض سے اس رسالہ کے لکھنے کی توفیق عطا ہوئی ہے ۔۔۔۔ سید صاحب دانا اور دقیقہ رس اور منصف ہیں ۔۔۔۔۔۔ قوتِ علم اور حسنِ فہم اور لطفِ طبع سے وہ منضبط ضوابط جمع ہو پہنچائے ہیں مجھے دل سے پسند آئے ہیں ۔ دعا یہ ہے اور یقین بھی یہی ہے کہ یہ رسالہ صفحۂ دہر پر یادگار اور ہمیشہ منظور انظار اولوالابصار رہے گا ۔۔۔۔۔۔
مولف صاحب جو کامیاب اپنے ذہن رسا سے ہیں ، رئیس جلیل القدر آرہ ۔ اور حضرت فلک رفعت مولوی صاحب عالم صاحب مارہروی کے نواسے ہیں ۔ سید واسطی بلگرامی ہیں جہاں کے سادات علم و فضل میں نامی اور قدر و منزلت میں گرامی ہیں ۔ ان حضرت کا مادح گویا اپنا ثنا خواں ہے ۔ جیسا کہ مولوی معنوی رومی علیہ الرحمہ کا بیان ہے ؎

مادحِ خورشید مداحِ خود است | کہ مرا دو چشم سر نا مرمد است

داد کا طالب غالب

ایک اور خط میں حضرت غالب فرماتے ہیں :۔

بعلاقۂ مہر و محبت نور چشم و سرور دل ۔ اور برعایت سیادت مخدوم و مطاع ۔ مولوی سید فرزند احمد ۔۔ ۔۔۔ اشعار گہر بار دیکھ کر دل بہت خوش ہوا ۔ سب اچھے ہیں ۔ مگر جو میرے دل میں اتر گئے ہیں وہ تم کو لکھتا ہوں ؎

ہائے وہ لب ہلا کے رہ جانا | ابھی کچھ بات کر نہیں آتی
ورق ہیں جوششِ مضمونِ گریہ سے بادل | بسانِ ژالہ ہے ہر نقطہ کتاب میں آب
کبھی ہوں گرم ۔ کبھی سرد ، حسبِ موقع وقت | صفیر آگ میں ہوں آگ اور آب میں آب

عارفانہ اور موحدانہ مضمون ۔ اور بالغانہ الفاظ ؎

تم سلامت رہو قیامت تک | صحت و لطفِ طبع روز افزوں

نجات کا طالب غالب ۔ شنبہ ۲۵ ذیقعدہ ۱۲۸۱ھ

نواب سید رضا علی خاں عظیم آبادی نبیرۂ جعفر حسن خاں فیض شاگرد مصحفی علیہ الرحمہ :۔

خوشا اے رضا ایں کلامے کہ از وے | بدل ہست قوت و بجاں ہست قوت
بود از تصانیفِ سحبانِ دوراں | بلیغ الکلام و کلام البلاغت
گرامی دل و بلگرامی توطن | صفیر سخن سنج عالی طبیعت
بریں خانِ یغماچہ یاراں چہ اعدا | بیابند و گیرند صد گونہ لذت

جناب راز عظیم آبادی ۔ سید عزیز الدین احد بلخی راز عظیم آبادی مولف تاریخ شعرائے بہار لکھتے ہیں :۔

ادبِ اُردو کی تاریخ میں صفیر بلگرامی بھی ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ نظم میں غالباً آٹھ دیوان کے قریب ان کے کلام مرتب ہو گئے تھے جیسا کہ خود فرماتے ہیں ؂

مشق تیری یہ بیالیس برس کی ہے صفیر
آٹھواں فضلِ الٰہی سے ہے دیواں میرا

نثر میں تالیف و تصنیف کی تعداد نظم سے بھی زیادہ ہے۔ فہرست تصانیف حسبِ ذیل ہے :-

جناب رازؔ عظیم آبادی کی فہرست نامکمل ہے کیونکہ اس میں صرف بیس کتابوں کا حوالہ ہے۔ حالانکہ ۱۲۹۴ھ تک نظم میں ۵، اور نثر میں ۱۷۴ تک بیں تصنیف و تالیف ہو چکی تھیں۔ اور ان ایک سو چوہتر کتابوں میں تین کتابیں، مجموعۂ فیض صفیر۔ گلبنِ موزوں۔ اور بوستانِ خیال اُردو بہتر جلدوں میں تھیں۔

نواب خیال عظیم آبادی

مکتوب نواب سید نصیر حسین خاں خیال عظیم آبادی بنام سید وصی احمد بلگرامی

پرنسپ اسٹریٹ کلکتہ۔ ۲۴ جولائی ۱۹۱۵ء

عزیز محترم۔ میں مرثیہ گویانِ ہند کا ایک تذکرہ مرتب کرنے کی فکر و کوشش کر رہا ہوں۔ چونکہ جناب غفران مآب مولوی سید فرزند احمد صاحب مغفور نے بھی مرثیے کہے تھے اس لحاظ سے اُن مرحوم کا ذکر خیر بھی اس تذکرے میں ضرور واجب ہے۔ میں نے کوشش کی مگر اُن جناب کا کوئی مرثیہ مجھے اب تک نہیں مل سکا آپ کا پتہ بھی معلوم نہ تھا جو قبل آپکو لکھ سکتا۔ کسی طرح آپکا نشان حاصل کرکے آج اس طرف متوجہ کر سکا ہوں۔ فرمائش ہے کہ اس کام میں خاطر خواہ میری مدد کیجئے اور آپکے ذریعہ سے اگر پرانے مراثی کہیں مل سکیں تو اُن کے حاصل کرنے کی فکر کیجئے اور اپنے دادا صاحب (صفیر بلگرامی) مرحوم کے مراثی میں سے دو ایک بھی مل سکیں تو مجھے فوراً بھیجئے ...... جو تعلقات اُن مرحوم کو ہم لوگوں کے ساتھ رہے ہیں اُسکا اقتضا یہ ہے کہ میرے قلم سے اُن کے صحیح و ضروری حالات نکلیں۔ واقعی حیف کی جا ہوگی اگر یہ تذکرہ اُن جناب کے اُن ذکروں سے خالی رہ جائے جن کا درج ہونا ضروری و لازمی ہو۔ اور مجھے تو ایسا قلق ہوگا کہ اپنی باقی کل محنت کو رائگاں سمجھونگا۔ ...... مرحوم نے ایک تذکرہ بھی تالیف کیا تھا جس کا نام ہے جلوۂ خضر۔ مجھے اس کی بیحد ضرورت ہے کسی طرح اسکو بھی فراہم کر کے مجھے بھیجئے۔ ایک فرنچ گارسن دی تاسی تذکرہ نویس خبر دیتا ہے کہ مرحوم نے ۱۸۶۸ء میں گلبن منظوم اور خلاصۂ فیض صفیر دو تالیفیں پٹنہ سے شائع کیں۔ یہ دونوں کتابیں بھی کسی طرح مل جائیں تو معلومات میں اضافہ ہو سکتا ......"

اس خط میں ایک جملہ غور طلب ہے :- "جو تعلقات اُن مرحوم کو ہم لوگوں کے ساتھ رہے ہیں اُسکا اقتضا یہ ہے ...... واقعی حیف کی جا ہوگی اگر یہ تذکرہ اُن جناب کے اُن ذکروں سے خالی رہ جائے جنکا درج ہونا ضروری و لازمی ہو۔"

یہ تعلقات کیا تھے؟ ــــ جواب یہ ہے کہ نواب خیال کے حقیقی چچا میر جعفر حسین فرہاد، اور حقیقی ماموں سید علی محمد شاد و سید امیر حسن ایجاد کو صفیر بلگرامی کی شاگردی کا (ایک زمانہ میں) فخر حاصل تھا۔

خواجہ عشرت لکھنوی — خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی تذکرۂ آبِ بقا میں فرماتے ہیں :-

" زبان کی خدمت کرنے والوں کے نام دنیا کے صفحات سے بہت جلد مٹ رہے ہیں۔ انھیں میں ایک سید فرزند احمد صفیر بلگرامی ہیں جن کی خدمات کو بھلا دینا بڑا ستم ہے۔ میر صاحب نے ابتدائی سن سے اُردو زبان کی خدمت کی اور بہت سی کتابیں تصنیف کرکے خود چھپوائیں اور پورب (یعنی صوبۂ بہار) میں زبان کی خدمت کا شوق پیدا کیا۔ . . . صفیر نے آرہ کا رہنا کم کیا۔ پٹنہ میں قیام کیا۔ یہاں شعر و سخن کا بہت چرچا تھا۔ اور لوگ قدردانِ سخن تھے۔ یہاں رہ کر تیس مثنویاں اور پانچ قصے اُردو میں لکھے۔ ایک کتاب نسخاتِ صفیر تذکیر و تانیث میں تالیف کی۔ ایک تذکرہ جلوۂ خضر لکھا . . . . پٹنہ میں اُن کے بہت سے شاگرد ہوئے . . . . . صفیر نے نثاری کی طرف رخ کیا تو سب سے پہلے بوستانِ خیال کی اٹھارہ جلدوں کو فارسی سے اُردو میں لانا چاہا۔ کچھ جلدیں ترجمہ کیں۔ دو جلدیں اپنے ہاتھ سے کاپی لکھ کر اپنے مطبع میں چھپوایا۔ دوسرا دیوان خمخانۂ صفیر مطبع کارنامہ لکھنؤ میں چھپا۔ . . . . . . صفیر بہت پُرگو تھے۔ پیامِ یار میں انکی غزلیں برابر چھپتی رہیں . . . . آب کوئی صفیر جیسا زبان کی خدمت کرنے والا آرہ میں نہیں ہے جس کے دم سے شاعری کا چرچا رہے . . . . صفیر مرحوم اگلی وضع کے آدمی تھے۔ چوگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے۔ دراز قد تھے۔ کسی قدر ہکلاتے تھے۔ شعر پڑھنے کا بھی انداز اچھا تھا۔ کلام عاشقانہ ہوتا تھا۔ اور بندش چست . . . . . . ایسا شخص جس کی تمام عمر اردو کی خدمت میں صرف ہوئی ہو۔ اُسکا اکثر کلام غیر مطبوع پڑا رہے نہایت افسوس کی بات ہے۔ امید ہے کہ اُن کے تلامذہ توجہ کریں گے "

یہاں تک تو دوسروں کا بیان ہوا۔ اب خود صفیر بلگرامی کا بیان اپنے بارے میں یہ ہے :-

" ہیچمدان۔ ہیچمیرز۔ مقلدِ گذشتگان۔ معتقدِ فصحائے زمان۔ حدِ غرور سے منزلوں دور۔ شاگردِ خاندانِ ناسخ مغفور۔ فیضیابِ خدمتِ شیخ امان علی سحر و برق و بحر۔ کوچہ گردِ شہر بشہر۔ زلّہ ربائے خوانِ فیضِ غالب و دبیر۔ رکشناس برنا و پیر۔ شعرا کا دوست غمخوارِ یار۔ باوجود ہیچدانی مشہور دیار و امصار۔ کشتۂ تیغِ ستمِ تلامذہ۔ موردِ مراحمِ اساتذہ۔

بندۂ حقیر سید فرزند احمد صفیر بلگرامی مقیم قصبہ آرہ ضلع شاہ آباد "

اسد بیان میں مرثیہ کا ایک ٹکڑا بھی ہے یعنی " کشتۂ تیغِ ستمِ تلامذہ "! شاگرد اپنے اوستاد کو ستم کی تیغ سے کیوں ذبح کرتا ہے اُسکو پوچھنا چاہیے افضل الدین خاقانی سے جس نے ابوالعلا سے بغاوت کی۔ اور نثر لطیف سے جس نے نسائی سے بغاوت کی۔ اور نساطی سے جس نے کمال خجند سے بغاوت کی۔ اور مومن دہلوی سے جس نے شاہ نصیر دہلوی سے بغاوت کی اور سکندر شاہ جہانپوری سے جس نے مومن دہلوی سے بغاوت کی۔

(۱) خاقانی کو ابوالعلا نے لکھایا پڑھایا۔ بنایا سکھایا جب کسی قابل ہوا تو اُسکو ہاتھ پکڑ کے خاقانِ کبیر منوچہر شروان شاہ کے دربار میں لے گیا۔ اور خاقان کی رعایت سے خاقانی تخلص بخشا۔ ان احسانوں کا صلہ خاقانی نے یہ دیا کہ ابوالعلا کی ہجو کہی

اور کہا کہ تو ہوتا کون ہے جو ہمارا اُستاد بنے؟ ؎ مرا دل پیر تعلیم است و من طفلِ زبان دانش! پھر کہا کہ ؎

از لکدِ حادثاتِ سخت شکستہ ولم شد — بست خیالم کہ ہست ایں خلل از ابوالعلا

آخر ابوالعلا کو کہنا پڑا ؎ خاقانیا! اگرچہ سخن نیک دانیا — یک نکتہ گویمت بشنو رایگانیا

ہجو کسے مکن کہ زتو بہ بود بہ سن — شاید ترا پدر بود و تو ندانیا

(۲) اسی طرح شریف نے اپنے اُستاد لسانی سے بغاوت کی تو اُس کے دیوان پر اعتراض کئے اور سہوا اللسان نام کتاب لکھی۔ ان اعتراضوں کا جواب حیدری شاگرد لسانی نے لسان الغیب میں دیا۔

(۳) اسی طرح بساطی شاگرد کمال خجند نے شوخ چشمی کی ؎

غزلہائے بساطی را کمال از خود مداں کہتہ — کہ پروردست چوں خواجہ بآبِ دیدہ سلمانش

کمال خجند نے جواب دیا ؎ اے خواجہ تو عمرِ خود فروختی — زحتِ تو دریں دکاں گنجند

(۴) اسی طرح حکیم مومن خاں دہلوی نے اپنے اُستاد شاہ نصیر دہلوی سے بغاوت کی تو شاہ نصیر نے کہا ؎

کماں وتیر لمط ربط تھا مجھے اُس سے — جب اُس نے آپ کو کھینچا میں گوشہ گیر ہوا۔

(۵) اسی طرح سکندر خاں سکندر شاہجہانپوری نے اپنے اُستاد مومن خاں سے بغاوت کی۔ قصہ یہ تھا کہ سکندر اپنی غزل اصلاح کے لئے لایا۔ اُس غزل میں ایک شعر تھا ؎

دم لینے میں ہے مجکو تو آئینہ کا لحاظ — اور یار یہ سمجھتے ہیں ۔مجھ میں ہے دم نہیں

مومن نے کہا یہ شعر بے معنی ہے۔ قابلِ اصلاح نہیں۔ سکندر نے کہا کہ آئینہ میلا ہو جانے کا خوف تھا۔ اس لحاظ سے ہم نے دم سادھ لیا۔ دیکھنے والوں نے سمجھا کہ اس میں دم ہی نہیں۔ مومن نے کہا کہ آئینہ کا لایا جانا خود بتا رہا ہے کہ اسوقت عالم کیا ہے۔ پھر دم سادھنا کیسا؟ سکندر کو آئینہ پر ناز تھا۔ حجت کرنے لگا۔ بات بڑھی۔ آخر سکندر نے مومن سے کہا کہ آپکو اُستاد کس نے بنایا؟ اصلاح کو پوچھئے تو بات اتنی ہے کہ ہم آپ کا کلام دیکھتے تھے۔ آپ ہمارا کلام دیکھتے تھے۔ اس میں اُستادی اور شاگردی کیسی؟

علامہ تفتازانی اپنے شاگردوں سے اسقدر نالاں تھے کہ پاؤں میں ایک مرتبہ کانٹا گڑ گیا تو علامہ نے آبدیدہ ہو کر پوچھا — اے کانٹے! سچ سچ بتا۔ کیا تو نے بھی ہم سے کچھ سیکھا تھا؟ پھر حضرت صفیر بلگرامی نے اپنے کو کشتۂ تیغِ ستم تلامذہ کہا تو کون سی انوکھی بات کہی؟ بقول مولف آبحیات:-

"شعراءمیں اپنے لئے خود پسندی اور دوسرے کے لئے ناتواں بینی ایک ایسی عادت ہے کہ اگر اسے قدرتی عیب کہیں تو کچھ مبالغہ نہیں۔ بلکہ شاگردوں کو اُستادوں سے دست و گریباں ہوتے دیکھا تو اکثر اہی قوم (شاعری) ہیں"

اس اجمال کی تفصیل حسب ذیل ہے :—

۱۲۵۵ھ جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد عظیم آبادی پٹنہ سے مرشد آباد گئے۔ قیام تین سال۔

۱۲۵۸ھ جناب فریاد مرشد آباد سے کلکتہ گئے۔ قیام بیس سال۔

۱۲۶۲ھ ولادت میر علی محمد شاد عظیم آبادی۔ اسی سال صفیر بلگرامی نے شاعری شروع کی۔

۱۲۷۶ھ حضرت فریاد صرف چار ماہ کے لئے کلکتہ سے پٹنہ آئے۔ پھر کلکتہ واپس گئے۔ قیام تین سال۔

حیات فریاد صفحہ ۱۱۶-۱۱۷ میں جناب شاد فرماتے ہیں :—

"اڑتیس سال اپنی عمر گراں بہا کے حضرت (فریاد) نے مرشد آباد و کلکتہ میں بسر کئے۔ منجملہ جس کے پینتیس سال کلکتہ میں صرف ہوئے۔ اس طویل مدت میں حضرت تین دفعہ عظیم آباد آئے۔ تیسری دفعہ تو اخیر دفعہ تھی۔ اور اس کے قبل دو دفعہ تشریف لائے۔ ایک دفعہ تو ۱۸۵۵ء میں غدر کے دو سال قبل جبکہ راقم کی عمر چودہ پندرہ سال کی تھی۔ اور چار ماہ صرف عظیم آباد میں قیام فرمایا۔ راقم اس زمانہ میں شرح مسلم پڑھتا تھا۔ ایک روز ناظر وزیر علی عبرتی مرحوم کے ہاں سے مشاعرہ کی طرح ؎ "جب سے اُس ابرو نے پیدا تیغ عالمگیر کی" آئی اسوقت تک راقم نے کبھی ایک شعر غزل کا نہیں کہا تھا۔ . . . . . حضرت (فریاد) نے والد سے ارشاد فرمایا کہ طرح میں چند شعر اس لڑکے کو کہنے دو . . . . . (میں نے) گیارہ شعر کہہ کر حاضر کئے . . . . . یہی بنیاد راقم کی شاعری اور حضرت (فریاد) کے زمرۂ تلامیذ میں داخل ہونے کی شرفیابی کی ہے۔"

تاریخ لکھنے میں جناب شاد سے سہو ہوا ہے۔ کیونکہ ۱۸۵۵ء میں آپکی عمر دس سال کی تھی۔ نہ کہ چودہ پندرہ سال کی۔ اور شاعری انھوں نے نہ تو دس سال کی عمر میں شروع کی نہ چودہ پندرہ سال کی عمر میں۔ جناب شاد کے دست و قلم کی تحریر مورخہ اپریل ۱۹۲۶ء ہمارے پاس موجود ہے جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں :— "سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں شاعری و تصنیف کا شوق ہوا"۔ اس تحریر کے آٹھ ماہ بعد شاعری کی شمع خموش ہوگئی۔ الغرض حضرت فریاد کلکتہ سے چار ماہ کے لئے جب پٹنہ آئے تھے اسوقت تک جناب شاد نے شاعری شروع نہیں کی تھی۔

۱۲۷۹ھ حضرت فریاد دوسری دفعہ کلکتہ سے پٹنہ آئے۔ اس سال جناب شاد نے شاعری شروع کی۔ اور اٹھارہویں برس پہلی غزل کہی۔

۱۲۸۰ھ صفیر بلگرامی کا پہلا دیوان ۱۲۷۳ھ میں مرتب ہوا تھا۔ سال ترتیب ؎ "جمع شد مایۂ حیات صفیر"۔ اسوقت جناب شاد کو بارہواں سال تھا۔ اس کے سات برس بعد ۱۲۸۰ھ میں دیوان صفیر بلبل پٹنہ سے شائع ہوا تو جناب شاد کو انیسواں سال تھا اور انھوں نے تاریخ طبع دیوان کہی

چو ایں دیوانِ رنگین طبع گردید — پُر از معنی و الفاظ خوش اسلوب
بجستم سالِ طبعش شاد از طبع — شدہ شیریں سخن تاریخ مرغوب

۱۲۸۱ھ حضرت فریاد عظیم آباد سے کلکتہ گئے۔ وہاں قیام گیارہ سال رہا۔
اسی سال جناب شاد اپنی غزل لے کر شاہ حفاظت حسین صاحب مظہر رئیس حاجی گنج کے ساتھ میر حامد حسین نکہت عظیم آبادی کے مکان پر صفیر بلگرامی کی خدمت میں شاگردی کے لئے حاضر ہوئے۔ اور انکی درخواست قبول کی گئی۔
۱۲۸۱ھ سے ۱۲۸۷ھ مسلسل سات برس تک جناب شاد نے صفیر بلگرامی سے اصلاح لی۔
۱۲۸۷ھ صفیر بلگرامی عظیم آباد سے مظفر پور تشریف لے گئے۔ وہاں قیام تین سال رہا۔
۱۲۸۸ھ صفیر بلگرامی کو اوستادی راس نہیں آئی۔ جناب شاد نے شاگردی سے انحراف کیا اور اس انحراف کے بعد حضرت فریاد سے ملنے کے لئے کلکتہ گئے۔ کلکتہ میں صرف دو ماہ قیام رہا۔
۱۲۹۰ھ صفیر بلگرامی مظفر پور سے عظیم آباد واپس آئے۔ آئے تو کیا دیکھا؟ اسکا حال خود صفیر بلگرامی کے قلم سے سنئے:۔
".... غرض ۱۲۸۷ھ ہجری تک جناب شاد کو مجھ سے برابر تلمذ رہا.... آخر میں طبیعت اونکی منحرف ہوئی۔ اور میری شان میں کچھ فرمانے لگے۔ اگرچہ واقف کاروں کی روک ٹوک سے کبھی کبھی خاموشی بھی اختیار کرتے تھے۔ مگر نا واقفوں میں اپنی تعلی کی لیتے تھے۔ میں تین برس کے بعد مظفر پور سے آیا۔ جناب شاد کا رنگ ہی اور پایا۔ مگر میرے سامنے کچھ نہیں کہتے تھے۔ میں نے بھی کچھ نہ چھیڑا۔ آخر کشمیری کوٹھی میں اونھیں کی فرمایش سے مشاعرہ شروع ہوا۔ یہ پہلی دفعہ ہے کہ اونھوں نے مشاعرہ کی غزل میرے ہوتے بے اصلاحی پڑھی۔ خدا کے کارخانے! غیر طرح میں جناب بحر لکھنوی کے دو چار شعر پڑھ گئے۔ شعرا نے گرفت کی۔ اور یہ غلغلہ تمام پٹنہ میں پھیلا۔ دوسرے مشاعرہ میں اسی زمین میں ایک غزل کہہ کر لائے۔ اوس پر بھی اعتراض ہوئے۔ مومن خاں کی رباعیاں۔ سحر کے قصیدے کے اشعار پکڑے گئے۔ آخر مشاعرہ کا آنا چھوڑ دیا۔
دو چار مشاعروں کے بعد ایک دن مشاعرہ کے وقت میرے پاس آئے۔ میں ہمراہ جناب نکہت کھانا کھاتا تھا۔ مجھ سے فرمایا کہ آج صبح سے لوگ مجھے دق کرتے ہیں کہ تم نے صفیر سے اصلاح لینے سے انکار کیا۔ اور میں کہتا ہوں کہ میں انکار کب کرتا ہوں۔ اس لئے آپ کے پاس بھی آیا ہوں کہ مجھے انکار نہیں ہے۔ میں بیشک آپکا شاگرد ہوں۔ میں نے کہا "میر علی محمد صاحب! میں بھی سنتا تھا۔ مگر جب آپ کہتے ہیں تو خیر میرا شک نکل گیا۔ بولے اگر فرمایئے تو میں اس مضمون کی رباعی کہہ کر مشاعرہ میں پڑھ دوں۔ میں نے کہا اس کی ضرورت کیا ہے۔ غرض یہ باتیں کرکے چلے گئے۔ اس کی شہادت جناب نکہت نے اپنے دستخط میں دی ہے۔ اور میں نے بھی اس کی یاد جناب شاد کو نبیقہ خبت وثیقہ میں دلائی ہے۔ غرض یہ کہ جناب شاد مشاعرے میں نہ گئے۔

اب اونھوں نے مشاعرہ میں آنا چھوڑا۔ مگر میں اوسیطرح اکثر ملاقات کو جایا کرتا۔ وہ اپنی غزلیں پڑھتے تھے۔ سن لیتا تھا۔ کبھی کبھی کچھ بول بھی دیتا تھا۔ طبیعت تیز تھی۔ اچھا کہنے لگے۔ ۱۲۹۱ھ میں انھوں نے مثنوی نالۂ شاد تصنیف فرمائی۔ اوس پر شعرائے عظیم آباد نے اعتراض کئے۔ مگر جناب شاد کو مجھ پر گمان ہوا۔ ایک دن مجھے چھیڑکر پوچھا۔ میں نے انکار کیا۔ اور کہا بھلا میر علی محمد صاحب! میں آپ پر اعتراض کرونگا؟ یہ البتہ کہتا ہوں کہ جناب شاد میرے شاگرد ہیں۔ یہ سنکر بولے اب میرا دل صاف ہوا۔ لوگوں نے مجھے ناحق بدظن کیا تھا۔ غرض پھر وہ باتیں رفع ہوئیں"

۱۲۹۱ھ اور اب جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد بھی کلکتہ سے پٹنہ تشریف لائے۔ پھر جناب شاد کو وہی سوجھی۔ اور اب برملا کہتے پھرے۔ مشاعرہ میں تو خود نہیں آتے تھے مگر چند شاگرد درست کئے۔ اور میرے پڑھنے میں خلل ڈالنا شروع کیا۔ آخر میں آدمی ہوں۔ یہ ادا ناپسند ہوئی۔ البتہ اشعار مشتمل بر نصائح میں نے پڑھے۔ اور محمد ہاشم (عزیز و شاگرد صفیر بلگرامی و مہتمم مطبع نورالانوار آرہ) نے کہا کہ ایک مجموعہ اسناد شاگردان کا درست کریں اور اسکا نام نشانِ فیض رکھا۔ اس میں جمیع شاگردوں کے اسناد دستخطی اور کلامِ اصلاحی موجود ہیں۔ اور واقفکارانِ شاگردیٔ جناب شاد کے سامنے پیش کیا کہ حقّا اور ایمانًا جو کچھ جانتے ہوں لکھ دیں۔ چنانچہ بیک جلسہ چودہ حضرات نے دستخط بلا اکراہ بے تامل بدون میری لجاجت اور سماجت کے اپنے دستِ مبارک سے فرمایئے۔ اور جو کچھ جانتے تھے تحریر کیا۔

یہ خبر جناب شاد کو پہونچی۔ اکثر اہلِ دستخط کے پاس جاکر فرمایا کہ میں آپ لوگوں کا ہم وطن ہوں۔ آپنے دستخط کیوں کئے؟ انھوں نے فرمایا کہ ایمان کے باب میں کسی کا پاس نہیں کیا جاتا۔ جو ہم جانتے تھے لکھ دیا۔ جب وضعوں نے دیکھا کہ اب تو دستخط ہوگئے۔ پھر کشمیری کوٹھی میں آکر جناب نکہت کے سامنے میری شاگردی کا اقرار کیا جس کو جناب نکہت نے اپنے دستخط میں تحریر کیا ہے:۔

۱۲۹۳ھ (۱) العبد سید حامد حسین نکہت۔ باللہ العظیم کہ میر علی محمد صاحب شاد دو بروئے من اصلاحے چند از میر صفیر صاحب گرفتہ مند۔ انکار ازاں انحراف از ایمان است۔ و اقرار زبانی بعد انکار ہم دو دفعہ در غریب خانہ کردہ اند۔ یکبار کہ ہمراہ شاہ حفاظت حسین صاحب وقت شب در مشاعرہ کشمیری کوٹھی تشریف آوردہ بودند۔ و بار دگر وقتیکہ میر فرزند احمد صاحب صفیر را استادی خود دریں شہر شایع کردند، خود نزد حقیر آمدہ گفتند کہ ایں چنیں اصلاح از ناظر جبرتی مرحوم نیز گرفتہ ام۔ پس ازیں چہ حاصل کردم؟ مگر میدانم کہ اصلاح دادن صفیر سلمہ اللہ القدیر مثل اصلاحِ ناظر صاحب مرحوم نیست کہ از خطوط کہ نوشتۂ ایشان است ظاہر است فقط فاعل بقلم نکہت۔

(۲) ہمارے علم میں میر علی محمد صاحب شاد شاگرد میر فرزند احمد صاحب کے ہیں۔ آغا مرزا عفی عنہ

(۳) العبد علی مرزا عفی عنہ۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دو بار اصلاح لیتے دیکھا ہے۔ اور یہ بھی یقینی کہہ سکتے ہیں کہ اکثر اصلاح لی ہو بقلم خاص اور بھی واضح ہو کہ چند رقعات اور غزلیں اور مرثیہ جو دستخط خاص جناب میر علی محمد صاحب شاد کے ہیں۔ ہم بقسم کہہ سکتے ہیں کہ

یہ سب اون کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے! اور اصلاح بھی جناب میر فرزند احمد صاحب صفیرؔ کے ہاتھ کی ہے۔ فقط

اور یہ بھی یاد بہت اچھی طرح ہے کہ جسوقت یہ مرثیہ' جو اس کتاب میں موجود ہے' جناب میر علی محمد صاحب' ہمراہ جناب میر فرزند احمد صاحب کے' واسطے اصلاح پاس جناب مرزا دبیر صاحب مرحوم کے لے گئے تھے۔ ہم بھی حضور میں جناب مرزا دبیر صاحب کے حاضر تھے۔ فقط

(۴) ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ سید علی محمد صاحب شادؔ نے ہمارے مکان میں بروز مشاعرہ اکثر اصلاح لی ہے۔ اور ہمکو اوسوقت شوقِ غزل گوئی کا نہیں تھا۔ فقط۔ محمد عسکری خاں عرف حسن نواب صاحب عفی عنہ'

اور جسوقت اس مرثیہ کو جناب مرزا دبیر صاحب کے حضور میں واسطے اصلاح کے سید علی محمد صاحب کو' ساتھ میر فرزند احمد صاحب لے گئے تھے' ہم بھی موجود تھے۔ بلکہ میر بادشاہ علی صاحب بقاؔ نے ہم سے پوچھا کہ یہ مرثیہ میر علی محمد صاحب نے کہا ہے یا میر فرزند احمد نے کہدیا ہے؟ ہم نے جواب دیا کہ نہیں میر علی محمد صاحب نے کہا ہے۔ مگر شاید میر فرزند احمد صاحب نے دیکھا ہو تو عجب نہیں۔ فقط"

(۵) فی الحقیقت ہم واقف ہیں۔ اکثر غزل دکھاتے ہوئے بچشم خود دیکھا۔ بلکہ اصلاح' اور غیر اصلاح' قبل اصلاح' اکثر غزلیں میر علی محمد صاحب کی دیکھنے میں آئیں۔ اور اکثر رقعہ بنام میر فرزند احمد صاحب صفیرؔ تحریر میر علی محمد صاحب دیکھے۔ اور ہم حرف بھی پہچانتے ہیں۔ چنانچہ مرثیہ کی تمام و کمال کیفیت سے ہم خوب واقف ہیں۔ بقلم خاص سید محمد حسن خاں عرف مجھلے صاحب ——— فطنتؔ"

واضح ہو کہ نواب سید محمد حسن خاں فطنتؔ اور نواب سید محمد حسین خاں ہجرتیؔ دونوں ناظر وزیر علی عبرتیؔ کے شاگرد تھے۔ ہجرتیؔ وہی ہیں جن کے ہاں امتحان موجِ مے کا معرکہ ہوا تھا۔ اور فطنتؔ وہ ہیں جن کے صاحبزادے نواب سید محمد رضا خاں عرف ننّا صاحب موجؔ عظیم آبادی جناب شادؔ کے شاگرد تھے۔

(۶) "ہم نے اپنی آنکھوں سے اصلاح دیتے بھی دیکھا۔ اور خوب واقف ہیں۔ اور جلسہ مشاعرہ میں بھی غزل دکھاتے ہوئے میر علی محمد صاحب شادؔ میر فرزند احمد صفیرؔ سے اپنی آنکھوں سے خاص مشاعرہ میں دیکھا ہے۔ اکثر سید محمد حسین خاں عرف چھوٹے صاحب تخلص بہ ہجرتیؔ۔
اور اون کے رقعہ وغیرہ بھی لکھے اور مرثیہ وغیرہ بھی اصلاح دیا ہوا دیکھا ہے۔ بقلم خاص سید محمد حسین خاں رضوی عرف چھوٹے صاحب تخلص بہ ہجرتیؔ۔"

(۷) " میر علی محمد صاحب اور ہم ایک ہی ہفتہ میں جناب اوستادی میر فرزند احمد صاحب قبلہ و کعبہ کے شاگرد ہوئے۔ اور اکثر ہم اور وہ ساتھ اصلاح لیا کئے۔ پانچ سات برس برابر یہی کیفیت رہی۔ سید محمد حسین خاں۔ عرف سید سلطان میرزا۔ بقلم خاص"

(۸) میں نے اپنی آنکھوں سے اصلاح دیتے حاجی گنج کے مشاعرہ میں دیکھا ہے۔ اور خطوط بھی اون کے لکھے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ بقلم خاص سید علی اصغر عفی عنہ۔ عرف سید وزیر نواب صاحب عفی عنہ"

واضح ہو کہ انھیں سید وزیر نواب کے صاحبزادے سید مرتضیٰ نواب مفتونؔ عظیم آبادی جناب شادؔ کے شاگرد تھے۔

(۹) ہم نے اپنی آنکھوں سے اصلاح دیتے دیکھا ہے۔ اور رقعہ بھی اُنکا دیکھا ہے کہ اوس میں لفظ اوستادی لکھتے ہیں اور لفظ تلمیذ حلقہ بگوش علی محمد بھی لکھے ہیں۔ سید مظفر حسین خاں عرف سید نصیر نواب عفی عنہٗ"

(۱۰) ہم خوب جانتے ہیں کہ ابتدائے مشاعرات کشمیری کوٹھی ۱۲۸۱ھ ہجری تا مشاعرہ حاجی گنج بمکان میر علی محمد صاحب شاؔد کہ جس میں مولوی وحید صاحب الہ آبادی بھی شریک تھے اُس وقت تک میر علی محمد صاحب میر فرزند احمد صاحب سے اصلاح لیتے تھے۔ اور شاگردی میر فرزند احمد صاحب کی اپنا فخر جانتے تھے۔ جب میر فرزند احمد صاحب مظفر پور تشریف لے گئے اور تین برس تک وہاں بذریعہ چھاپہ خانہ کتب کے وہیں تشریف فرما رہے اسی عرصہ میں میر علی محمد صاحب نے اونکی شاگردی سے انکار کیا۔ العبد سید عبد الحکیم

واضح ہو کہ یہ وہی عبد الحکیم تمکین قنوجی ہیں جو معرکۂ شاد و احسن کے زمانہ میں سید محبوب شبر کے ہاں جاسوس بنا کر بھیجے گئے تھے۔

(۱۱) "العبد یوسف حسین ماہر لکھنوی۔ خوب می دانم کہ جناب میر علی محمد صاحب شاد شاگرد میر صفیر صاحب ہستند۔ چنانچہ در ۱۲۸۲ھ ہجری کہ فقیر شریک صحبت مشاعرہ جناب میر حامد حسین صاحب نکہت شد موصی الیہ را اقرار شاگردی جناب میر موصوف کی ینبغی بود۔ تا زمانہ ۱۲۸۴ھ ہجری کہ با میر عطا حسین صاحب و میر علی حسن صاحب نزاع گل رو داد فقط"

واضح ہو کہ مرزا یوسف حسین ماہر لکھنوی کے تین صاحبزادے مرزا الیاس حسین۔ مرزا ممتاز حسین نہر اور مرزا محمد حسین۔ بڑے نے انتقال کیا۔ دوسرے اور تیسرے بقید حیات ہیں۔

حضرت صفیر بلگرامی فرماتے ہیں: "جناب شاد نے دیکھا کہ اب تو میری شاگردی ثابت ہوئی تو ۱۲۹۳ھ میں اور لوگوں کو اوبھارا۔ ۔ ۔ ۔" یہ اشارہ خواجہ فخر الدین حسین سخن دہلوی کی طرف ہے۔ وہی خواجہ سخن جو آمدہ میں ۱۲۷۵ھ میں صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے تھے۔ اور جن کی تصنیف سروش سخن اوستاد نے بعد اصلاح حضرت غالب کی خدمت میں بھیجی تھی۔

خواجہ سخن کی دوسری شادی عظیم آباد میں میر نجف علی وکیل کی صاحبزادی سے ہوئی۔ میر نجف علی کے چھوٹے بھائی میر سید علی حضرت فریاد عظیم آبادی کے داماد تھے۔ اور خود میر نجف علی حضرت فریاد کے شاگرد تھے۔ اور جناب شاد و حضرت فریاد میں صرف شاگردی و اوستادی ہی کا رشتہ نہیں تھا بلکہ عزیزداری بھی تھی۔ چنانچہ جناب شاد کی دادی حضرت فریاد سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ اور حضرت فریاد انکو باجی صاحبہ کہتے تھے۔ ان تعلقات کی وجہ سے شاد و سخن میں یکجہتی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ جناب سخن نے جناب شاد کا ساتھ دیا۔ اور اس طرح ساتھ دیا کہ خود بھی شاگردی سے انکار کیا۔

بقول صفیر بلگرامی ؎

گھر کیا دل میں جو انکے تیر نے
وہ لگے میرا کلیجا چیرنے !

۱۲۹۵ھ جناب شاد کی تردید میں نواب سید تجمل حسین خاں سلطان عظیم آبادی نے مرقع فیض یعنی تذکرۂ شاگردان صفیر بلگرامی لکھا۔ اس سے شاد و سخن کی شاگردی ثابت ہوتی تھی۔ جناب سخن نے تنبیہہ صفیر بلگرامی لکھی اور ایک فرضی شخص سردار مرزا کے نام سے شائع کی۔ یہ کتاب عین ۱۰ ذی الحجہ کو مطبع محمدی پٹنہ سے نکلی اور نمازیوں میں تقسیم ہوئی۔ الغرض عید قربان اسی طرح منائی گئی۔
یہ کتاب کسی طرح بھی جناب خواجہ فخرالدین سخن کے شایانِ شان نہ تھی۔ تفصیل اس کی مناسب نہیں۔ کیونکہ ؎
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ۔ انھیں کچھ نہ کہو ـــــــــ مگر اس انحراف و ہجوگوئی سے جناب شاد و سخن کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ یہ کتاب عظیم آباد سے لکھنؤ پہونچی تو لکھنؤ سے جناب شوق نیموی نے صفیر بلگرامی کو لکھا:۔

"۔۔۔ تنبیہہ وغیرہ جو آپ کے مخالفین نے لکھی ہے اُسکا کچھ جواب آپ نے تحریر کیا یا از راہِ حلم و تحمل سکوت فرمایا۔ اس سے ضرور اطلاع دیجئے گا۔۔۔"

ایک کشتۂ تیغ ستم تلامذہ کے دل سے دھواں کس طرح اُٹھتا ہے اور قلم سے خون کس طرح ٹپکتا ہے، یہ دیکھنا ہو تو مکتوب صفیر بلگرامی بنام شاد عظیم آبادی دیکھئے:۔

عزیز سابق و شفیق حال جناب میر علی محمد صاحب شاد سلمہ اللہ تعالیٰ۔

از صفیر عفی اللہ القدیر بعد سلام مسنون واضح باد۔ نامۂ لیاقت آما۔۔۔۔۔ ورود نمود۔ و تعجب بر تعجبا فزود ؎

می شنیدم کہ جانِ جانانی
چوں بدیدم ہزار چندانی

تا اینکہ دیدم کہ انکارِ شاگردی من از جانب آنصاحب کرا صغا شدہ زبانی دگراں بود۔ حالانکہ نوبنوک قلم آورد ندچہ گفتہ آید؟ مگر زمانۂ تعلیم یاد کنم۔ و ہم خطوط آں ہنگام ڈاک و غیر ڈاک با ایں دو خطوط کہ حالیا بمن رسیدہ اند پیش خود نہم۔ و خون گریم۔ بر بربادی محنت و مشقت خود۔ و سیلے زخم بر سرِ صورت نمود۔

دارم آئے زہرہ نائی خویش — نوحہ بر خویش و بینوائی خویش
گردش روزگار خویشتنم — حیرت کار و بار خویشتنم
با من ایں خشم و کیں دریغ دریغ! — من چناں تا چنیں دریغ دریغ!
ور بگویند ماجرائے رفت — از تو در گفتگو خطائے رفت
مہربانا، خدائے را انصاف! — تا نخست از کہ بود رسمِ خلاف؟
نمک اندر سبوئے کہ فگند؟ — بچمن رستخیز وئے کہ فگند؟
ـــــــ زلف گفتار را کہ درہم کرد؟ — بزم اشعار را کہ برہم کرد؟ ـــــــ

مطلب یہ کہ اب تک ہم دوسروں سے سنا کرتے تھے کہ آپکو شاگردی سے انکار ہے۔ آپ کی تحریر نے آج یہ پردہ بھی اُٹھا دیا۔ کل کی بات ہے کہ آپ ہم سے تعلیم پاتے تھے۔ ایک طرف ہمارے سامنے آپ کے شاگردانہ خطوط ہیں۔ اور دوسری طرف حال کے وہ خطوط ہیں جن میں شاگردی سے انکار ہے۔ اب آنکھ خون نہ برسائے تو کیا کرے۔ اور ہاتھ ماتم نہ کرے تو کیا کرے؟ اللہ رے انقلاب

زمانہ! آپ اپنے کو دیکھئے ہمکو دیکھئے - اور یہ کینہ پروری دیکھئے - دریغ! دریغ!

یہ خط بہت بڑا ہے - اس کے چند ٹکڑے یہ ہیں :—

درمیانِ من وخود خدائے حق پسند را حاضر دانستہ' و ایمان را ذریعۂ نجات شمردہ' دریک یک حالت سابق نیک نگرند کہ وقتے کہ در ۱۲۸۱ ہجری مشاعرہ در کشمیری کوٹھی از طرف میرن صاحب می شد' آں صاحب ہمراہ شاہ حفاظت حسین صاحب غزلِ خود مخصوص نزدِ من برائے اصلاح نیاوردند؟ و بندہ بآں صاحب را چرا گذاشتند؟ جوابش شنیدم کہ شاہ صاحب رہگرائے کلکتہ می شوند - باز نہ گفتم دریں پٹنہ دگراں ہستند - تخصیصِ من چیست؟ جواب دادند اعتقادِ من درباب تو از ہمہ بیشتر است - باز نہ گفتم کہ اگر چنیں است بسم اللہ! مگر یاد دارند کہ اگر احیاناً بعد ازیں کسے از من فاضل تر از لکھنؤ یا دہلی بیاید از من نخواہند برگشت - جوابِ نقص وعیب کلامِ شما ذمّہ من است - من جواب خواہم داد - آں صاحب اقرار کردند - وہماں وقت بر غزل ملال ہے - وصال ہے کہ در شگوفۂ نکہت مندرج است اصلاح دادم۔"

واز آں روز آمد و رفتِ روزانہ بخانۂ آں صاحب واز پاسے از روز باقی وتا دہ ساعتِ شب' یا بیش وکم از آں نزد آں صاحب ماندن برخود متحتم کردم - و از طرفِ آں صاحب روزانہ سواری برائے رفتنِ من تا کشمیری کوٹھی می یافتم.... بامن ایں سلوک بود تا دو سہ سال برابر - چوں بفضل خدا تعلیم یافتند' بندہ ہم آمد و رفت ہر روزہ کم کرد - وبعد دو چار روز جاری نمود ۔"

آپ کو واسطہ ہے اُس خدا کا جو حاضر و ناظر ہے - اور اُس ایمان کا جو ذریعۂ نجات ہے کہ سابق کی کل باتوں کو اچھی طرح یاد کیجئے ۱۲۸۱ ہجری میں جب کشمیری کوٹھی میں میرن صاحب کی طرف سے مشاعرے شروع ہوئے تو کیا آپ شاہ حفاظت حسین صاحب کے ساتھ مخصوص ہمارے پاس اپنی غزل اصلاح کے لئے نہیں لائے تھے؟ اور کیا ہم نے تکرار آپ سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ آپ تو شاہ الفت حسین صاحب کے شاگرد ہیں - پھر اُنکو کیوں چھوڑ دیا؟ آپنے جواب دیا کہ شاہ صاحب کلکتہ جا رہے ہیں - تب کیا ہم نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ پٹنہ میں اور لوگ بھی موجود ہیں - یہ ہماری ہی تخصیص کیوں ہے؟ آپنے جواب دیا کہ یہ تو اپنی اپنی پسند ہے - آپ سے بڑھ کر کسی کو نہیں سمجھتے - تب ہم نے کیا نہیں کہا تھا کہ اگر ایسا ہے تو بسم اللہ - مگر یہ یاد رکھئے کہ لکھنؤ یا دہلی سے اگر کل کوئی شخص ہم سے فاضل تر آ گیا تو آپ کو ہم سے انحراف نہیں کرنا ہوگا - باقی رہا آپکے کلام کا نقص - تو یہ بوجھ ہماری گردن پر رہا - ہم اسکا جواب دے لیں گے - آپ نے یہ شرط قبول کی - اور تب ہم نے اُسیوقت آپ کی غزل پر اصلاح دی - یہ غزل ملال ہے - وصال ہے - شگوفۂ نکہت میں موجود ہے - .. ..

اور اُس روز سے ہمارا معمول ہوا کہ روزانہ سہ پہر کو آپکے گھر جایا کرتے - اور تقریباً دس بجے شب تک ٹھہرا کرتے - اور پھر آپ ہی کی سواری پر کشمیری کوٹھی واپس آیا کرتے .. .. .. دو تین برس تک یہی معمول تھا - جب خدا کے فضل سے آپ تعلیم پا گئے تو ہم نے بھی اپنا جانا کم کر دیا - اور اب دو چار روز پر جانے لگے -

"افسوس کہ والد ماجد و عم نامدار آں صاحب رخت بجناں کشیدند۔ خدا شاں زا در جوار خود جا دادہ باشد۔ اگر می بودند ہرگز از شہادت انکار نمی کردند۔ و ایں وقت ہم می دانم کہ جناب میر جعفر حسین صاحب و جناب میر امیر حسن صاحب و جناب شاہ حفاظت حسین صاحب و دیگر صاحبان حاجی گنج کہ در آں وقت بہ کاشانۂ آں صاحب با جناب محسن صاحب مرحوم صحبت گرم می داشتند زنہار در دروغ نخواہند گفت۔ چنانکہ صاحبان کشمیری کوٹھی و گذری وغیرہ از شہادت دادن بدست خود و نوشتن پہلو تہی نکردند۔ ... ...

حالا ایں قصہ بطول انجامید۔ می تواہم کہ فیصلۂ ما و آں صاحب بر ہمیں شود کہ قرآن پیش نہادہ روبروئے عمائد انصاف کیش و جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد آں خطوط را ملاحظہ فرمایند۔ و قسمیہ گویند کہ از من نیست۔ من قبول بدارم و ازاں وقت باز دعویٔ استادی نکنم۔

حالا نامہ را بردعا ختم می کنم و از دل می گویم کہ خداوندا حق را بر زبان جاری کن"۔

افسوس اسکا ہے کہ آپکے والد ماجد اور عم نامدار جنت کو سدھارے۔ خدا اُن لوگوں کو اپنے جوار میں جگہ دے۔ آج وہ لوگ زندہ ہوتے تو ضرور ہماری تصدیق کرتے۔ اور یقین ہے کہ میر جعفر حسین اور میر امیر حسن اور شاہ حفاظت حسین اور حاجی گنج کے اور لوگوں سے جو آپکے گھر میں محسن صاحب مرحوم سے ملنے آتے تھے' پوچھا جائے تو وہ لوگ ہرگز جھوٹ نہیں بولیں گے جس طرح صاحبانِ گذری و کشمیری کوٹھی نے اپنے دست و قلم سے تحریری شہادت دینے سے دریغ نہ فرمایا (واضح ہو کہ سید امیر حسن ایجاد جناب شاد کے چھوٹے بھائی۔ اور میر جعفر حسین اُن کے چچیرے بھائی تھے۔

یہ قصہ بہت طول ہو گیا ہے۔ اب تصفیہ یوں ہی ہو سکتا ہے کہ قرآن سامنے رکھا جائے۔ اور خود جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد اور دیگر عمائدین معتبر کے سامنے آپ حلف لیں کہ یہ خطوط آپکے لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ اگر آپنے قسم کھا لی تو ہم فوراً مان لیں گے اور پھر کبھی یہ دعویٰ نہیں کریں گے کہ آپ ہمارے شاگرد ہیں (واضح ہو کہ ان خطوط سے مراد وہ خطوط ہیں جو شاگردی کے زمانہ میں جناب شاد نے صفیر بلگرامی کو بھیجے تھے۔ اور جن میں اوستادی اور تلمیذ حلقہ بگوش علی محمد' تحریر فرمایا تھا۔

اب اس خط کو ہم ختم کرتے ہیں اور دل سے دعا مانگتے ہیں کہ خدایا! تو شاد کی زبان پر حق کو جاری فرما۔

۱۲۹۶ھ جناب شاد نے اس خط کا یہ جواب دیا کہ اغلاط صفیر نام ایک رسالہ ترتیب دیا۔ اس رسالہ کی حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں مولوی عبدالغفور خاں نساخ نے میر انیس و مرزا دبیر کے کلام پر اعتراض کر کے انتخاب نقص نام ایک رسالہ شائع کیا تھا۔ نساخ کی اس جرأت پر اساتذہ برہم تھے اور ہندوستان میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اس آگ سے جناب شاد نے فائدہ یہ اوٹھایا کہ شعرائے لکھنؤ و کلکتہ و رامپور کو لکھ بھیجا کہ نساخ پر اعتراض کئے جائیں تو آپ لوگ دستخط کریں گے؟ وہاں سے

جواب آیا کہ ضرور۔ اندھا چاہے دو آنکھیں! ۔جب یہ طے پا گیا تو جناب شاد نے عظیم آباد سے کھچڑی پکا کر بھیجی۔ یعنی دس بیس شعر نساخ کے۔ باقی صفیر بلگرامی کے نتیجہ یہ ہوا کہ نساخ کے دھوکہ میں صفیر بلگرامی کی گردن ماری گئی۔ یہی مجموعۂ اغلاطِ صفیر جناب شاد نے اپنے شاگرد سید رحیم جان رحیم عظیم آبادی کی طرف سے شائع کیا۔

ادھر یہ ہو رہا تھا اور اُدھر شاہ حفاظت حسین صاحب مطیر عظیم آبادی چشم دید گواہوں سے دستخط لے رہے تھے کہ شاد شاگرد صفیر بلگرامی ہیں۔ چند گواہوں کے نام یہ ہیں:— محمد وجیہہ الحق۔ امیر الحسن عرف الفت حسین داناپوری۔ الیاس حسین۔ امداد حسین۔ شیخ فرزند علی۔ شیخ نقی جان۔ سید الطاف حسین۔ سید شفاعت حسین ساکنان حاجی گنج————

اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ جناب شاد و جناب مطیر میں بول چال بند ہو گئی۔ آخر نواب محمد علی خاں نے صلح کرا دی۔ اس صلح کی خبر آرہ پہونچی تو صفیر بلگرامی نے جناب شاد کو یہ خط بھیجا۔

اعز الاحبا جناب سید علی محمد صاحب شاد زاد لطفہ۔ تسلیم۔ تحریر احباب سے مجھے معلوم ہوا کہ آپ سے اور جناب شاہ حفاظت حسین صاحب مطیر سے جو اتفاقیہ ناچاقی ہو گئی تھی وہ بسعی و فہمائش جناب نواب مولوی محمد علی صاحب مدظلہ برطرف ہوئی۔ الحمدللہ و المنۃ۔ بخدا میرا جی بہت خوش ہوا۔ ... ... میں نے اس صلح کا قطعہ تاریخ کہا ہے۔ وہ آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ وہو ہذا ؎

فتاد صلح میانِ دو مومنِ خوشخو !	زہائے مردیٔ و سعیٔ امیرانِ امیر
فگند طرحِ ولا با علی محمد شاد	بمہر شاہ حفاظت حسین کہ ہست مطیر
بگوش خورد چو ایں مژدۂ مسرت زای	چو گل شگفتہ شد از انبساط قلب صفیر
خیال مصرعِ تاریخ داشتم در دل	سرود ہاتفِ غیبی "خلوصِ شاد و مطیر"

۱۲۹۶ھ

کاش اسی طرح میرے آپکے بھی صلح ہو جائے تو میں حافظ کا یہ شعر پڑھوں ؎

شکر للہ کہ میانِ من و او صلح فتاد | حوریاں رقص کناں ساغرِ شکرانہ زدند

مگر یہ صلح بہت دشوار معلوم ہوتی ہے۔ خیر ؎ بیدل نیم ہنوز۔ ببینم چہ می شود! ... ..."

۱۲۹۷ھ شیخپورہ ضلع مونگیر سے جناب شاد کے چھوٹے بھائی سید امیر حسن ایجاد نے صفیر بلگرامی کو خط بھیجا کہ بات بڑھ رہی ہے اب صلح ہو جانا چاہیئے۔ صفیر بلگرامی نے اسکا مفصل جواب دیا۔ چند سطریں یہ ہیں:—

سید زمن مولوی امیر حسن ایجاد سلمہ اللہ تعالیٰ۔ ... ... آپ کا خط مورخہ چہارم محرم ڈاک سے ملا پایا۔ اسکو دیکھ کر دل بھر آیا۔ جو کچھ آپ نے لکھا ہے سب سچ ہے۔ اور جو کچھ خیال کیا ہے سب راست ہے۔ افسوس! میں خود ان باتوں سے

نادم ہوتا ہوں۔ اور پانی پانی ہوا جاتا ہوں۔ بھائی! میں تو بہت رُکتا ہوں۔ اور سنبھلتا ہوں۔ مگر کیا کروں؟ بعض باتیں اُدھر سے ایسی ہو جاتی ہیں کہ ناچار جواب دینا پڑتا ہے۔ خدا اسکا علیم ہے کہ میں نے باوجودیکہ برسوں بہت کچھ سنا۔ اور بے اعتنائی اپنی آنکھوں بھی دیکھی مگر دم بخود رہا۔ کیونکہ مجھ سے تو کوئی نہیں بولتا تھا۔ کیا ضرور کہ میں دخل بیجا کرتا۔ اگر وہ (شاد) اپنی تعریف کرتے تھے تو میرے خوش ہونے کا مقام تھا۔ اگر وہ میری توہین کرتے تھے "شنیدہ را اعتبارے چنداں نیست۔" سمجھ کر ناشنیدہ کر دیتا تھا۔ ... ۔ آخر کہاں تک؟ میرا منصب جو میرے نزدیک کیا بہتوں کے نزدیک بلکہ خدائے عادل کے نزدیک ہے۔ آخر مجھے غیرت میں لایا۔ اور روز روز کی ناشنیدنی سے جی گھبرایا۔ یعنی جب یہ سنا کہ ادھر انکار صاف ہے تو میں نے اپنی پرانی ردیوں کو دیکھا بھالا۔ اور جو کچھ زمانۂ شاگردی کا بند دھا بند ھایا رہ گیا تھا نکالا۔ اور اوسکا ایک مجموعہ درست کرکے شاہدین سے اُس پر دستخط لکھوایا۔ پھر بھی انکو (شاد کو) خیال نہ ہوا۔ ایک بے تہذیب سے مل کر میری تہجین میں کوشش فرمائی ... ... معاذ اللہ مجھے اون ملاعین سے مثال دی جن کے مقابلہ میں اُن کے اور میرے آباء طاہرین نے صبر کیا تھا ... ... جناب میر امیر حسن صاحب! حسبۃً للہ فرمائیے کہ ان سب باتوں کا جواب میری طرف سے کیا ہوا؟ ۔ خاموشی! ... ... آپ اگر صفائی چاہتے ہیں تو مجھے محال معلوم ہوتی ہے کیونکہ میرا دعویٰ اسی قدر ہے کہ وہ (شاد) بقسم اقرار کر دیں کہ میں صفیر کا شاگرد ہوں ... ... جب تک شاہ صاحب (فریاد) کلکتہ سے نہ آئے تھے اُسوقت تک بخدا میرے سوا وہ کسی کو نہیں دکھاتے تھے ... ... اس بات پر فیصلہ اگر ہو اور وہ بھی علی رؤس الاشہاد ہو (کیونکہ یہ قصہ دور دور تک پہونچ گیا ہے اُن لوگوں کو بھی اس سے آگاہ ہونا ضرور ہے) تو میں حاضر ہوں۔ ورنہ رسوا ہو کر چپکے سے فیصلہ کر لینا غیرت قبول نہیں کرتی ... ..."

۱۲۹۸ھ رحلت حضرت شاہ الفت حسین صاحب فریاد عظیم آبادی۔ مصرع تاریخ ہے "شاہ الفت حسین صد جہاں"

حیاتِ فریاد ص ۱۸۹ میں مصرع تاریخ رحلت "شاہ الفت حسین فردوسی" صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ۷ عدد زائد ہیں۔

۱۳۰۷ھ رحلت حضرتِ سید فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی۔ نعش عظیم آباد سے خشکی راستہ آرہ آئی اور محلہ میر گنج میں پیوند خاک ہوئی۔ بتاریخ ۲۲ رمضان المبارک وقت شب ہے

لے شاد تم تو روتے تھے نکہت کے واسطے ... ایلو اعدم کو آج سدھارے صفیر بھی!

یہ وہی نکہت ہیں جن کے گھر میں جناب شاد حضرت صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے تھے۔ اور یہ وہی نکہت ہیں جنھوں نے تصدیق کی تھی کہ "العبد سید حامد حسین نکہت۔ باللہ العظیم کہ میر علی محمد صاحب شاد روبروئی من اصلاحے چند از میر صفیر گرفتہ اند۔ انکار ازاں انحراف از ایمان است ... ..."

۱۳۲۹ھ اس سال بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ہم حضرت شاد عظیم آبادی کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے۔ حضرت نے پوچھا

آپ کون ؟ ہم نے کہا کہ ننگِ اسلاف سید وصی احمد بلگرامی۔ حضرت نے پوچھا اسلاف کون ؟ ہم نے کہا کہ جدی مرحوم و مغفور حضرت صفیر بلگرامی۔ حضرت کی آنکھوں نے کہا ؎ اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری !

حضرت کی زبان نے کیا کہا اس کے بیان کا یہ موقع نہیں۔ مگر حضرت کے قلم نے کیا کہا اسکا مختصر بیان یہ ہے :۔

مکتوباتِ شاد عظیم آبادی بنام سید وصی احمد بلگرامی

(۱)

چشم وجانِ شاد۔ آپ کا خط مورخہ ۲۵ جولائی مجکو ابھی ملا۔ میں خود بھاگلپور اب تک نہیں جاسکا۔ حالت یہ ہے کہ مجکو پہلے بخار آیا۔ پھر اسہال و اختلاجِ قلب میں حد سے زیادہ پریشان رہا۔ آپ جانتے ہیں کہ چراغ سحری کے لئے اندک جھونکا ہوا کا کافی ہوتا ہے اور یہاں تو اس دفعہ سخت سخت جھونکے تھے۔ برابر یہی یقین رہا کہ آج کا دن میری رخصت کا ہے۔ مگر خیر۔ چونکہ اجل موعود میں فقط ذرا سی کسر رہ گیا۔ اور سچ یوں ہے کہ اس بچنے کی چنداں خوشی نہیں ہے۔ زمانہ کے رنگ کو دیکھ کر ایسا کبیدہ خاطر ہو رہا ہوں کہ اب زندگی کو دل نہیں چاہتا جتنے خاندان پرانے اور باوقار تھے سب مٹ گئے۔ اُن میں اگر کوئی ہونہار نوجوان بھی باقی رہ گیا ہے تو وہ بزرگوں کے نام ونشان و ملکیت کو اور بھی خاک میں ملائے جاتا ہے۔ ہر چند زمانہ خلاف دستور یہ کام نہیں کرتا۔ لیکن کیا کروں ؟ دل کو گوارا نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے ایسے ایسے خاندان والے ابھر رہے ہیں جن کے باپ دادا تک کو شریف کہتے ہوئے تامل ہوتا تھا۔ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۔ میرے پیارے ! بخدائے لم یزل میں ان مسرت بھری خبروں کو سنکر اسقدر خوش ہوا ہوں کہ بیان سے باہر ہے۔ قرآن میں ہے۔ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ یہ آیت سورہ قصص کے آخر یا وسط میں ہے۔ ٹھیک اس کے مصداق آپ ہوئے۔ فالحمد للہ علیٰ ذلک۔ ثم الحمد للہ۔ یہ سید سیحے میاں صاحب شفیقی سید اولاد حیدر سلمہ کے کون تھے (ہیں)۔ ان تعلقات کو ضرور لکھ بھیجئے۔

ایک نہایت ضروری اور واجب التعمیل بات یہ ہے کہ آپ پاس میرا وہ مرثیہ موجود ہے جو میرے قلم کا لکھا ہوا اور مرزا دبیر مرحوم کی اُس پر اصلاح ہے۔ مجکو قسم ہے اپنے آبا ر کرام کی کہ اگر آپ اسکو مجھے دو تین دنوں کے لئے دیں تو میں محض ایک نظر اسکو دیکھ کر فوراً واپس کر دونگا۔ بٹیا ! میں اسکو یا اور کسی ایسی چیز کو اب اپنے پاس رکھ کر کیا کرونگا۔ تم سے زیادہ اُس کا مستحق کون ہے ؟ تم خوب جانتے ہو کہ سید سلمہ جیسی قابل ہیں۔ شاگردوں بھی کوئی ایسا نہیں ہے۔ تم کو خدا نے محض اپنے تفضل سے ہر طرح کی قابلیت دی۔ الحمد للہ۔ پھر میں تم سے اگر کسی چیز کو عزیز کروں تو ہزار لعنت مجھ پر۔ دیکھو ! اگر تم نے بواپسی ڈاک نہ بھیجا تو عذر کو بہانہ سمجھ کر سخت رنج ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ ماشاء اللہ ڈپوٹی کلکٹری کے کام سے آپ کو فرصت کہاں۔ مگر میں پھر کیا کروں ؟ کیونکہ بخدا آپ سے زیادہ میری ناچیز تصانیف کا خبر گیر کون ہے ؟ اور اگر ہو بھی تو یہ دلسوزی۔ محبت۔ قابلیت کس میں ہے ؟ میری کتاب فکر بلیغ

کا مسودہ جوں کا توں پڑا سڑ رہا ہے۔ اگر یہ کتاب مرتب وشائع نہ ہوئی تو کچھ نہ ہوا۔ اسی پر دار و مدار میری تمام تصانیف کے چھپنے کا ہے۔ مگر ہنوز یہ کتاب حسب خواہ مرتب تک نہیں ہوئی ہے۔ آپ سے یہ استدعا ہے کہ آپ پاس تھوڑا تھوڑا مسودہ لکھ لکھ بھیجتا رہوں۔ اور آپ اپنے قلم سے میرے حسب خواہ صاف کرتے رہئے۔ اور مجکو بھیجتے بھی جائیے۔

آخر کتاب میں آپ اپنے حسب خواہ وہ سب باتیں بھی پائیں گے جس کا ایما آپنے اس خط میں کیا ہے۔ مرحوم میر قوت علی صاحب سے اس بارے میں میں کہہ بھی چکا تھا کہ اب میرا دل ہر طرح کے غش سے پاک صاف ہے۔ یہ کتاب اگر میری زندگی میں آپ کی محنت اور توجہ سے چھپ گئی تو شائد اس سے بڑھ کر میری خوشی کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے ۔۔ ۔۔ ۔۔ انشاء اللہ غزلوں کی ترتیب کا بار بھی آپ ہی پر دونگا۔ خدا کرے میری یہ سب تمنائیں پوری ہو جائیں۔

اگر زندہ رہا تو آئندہ دوشنبہ سہ شنبہ کو بھاگلپور کا قصد ہے۔ وہاں سے آکر یا نود میں آرہ آجاؤنگا یا ایک دن کیلئے آپکو زحمت دونگا۔ لیکن آپ بلا کسی انتظار کے اول تو وہ مرثیہ بھیج دیجئے تاکہ میں قبل اپنے جانے کے دیکھ کر واپس کر دوں۔ دوسرے میری کل باتوں کا مفصل جواب دیجئے ۔۔ ۔۔ ۔۔ ہماری تمنا یہی ہے کہ تمکو خداوند کریم عمر طبیعی کو پہونچائے۔ دونوں بھائی پھلو پھولو۔ ہر طرح کی ترقی کرو۔ الہی آمین۔ ثم آمین۔ سید تسلیم کہتے ہیں۔ تمہارا بڈھا دعا گو۔ السید علی محمد شاد۔ از پٹنہ سٹی ۱۶ اگست ۱۸ء

اس اعزاز نامہ میں چند باتیں تشریح طلب ہیں:۔

(۱) شاگردوں میں بھی ایسا کوئی نہیں ہے"۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ حضرت شاد کے ایک شاگرد نے اُن کے گھر میں آگ لگادی۔ آگ لگانے سے مطلب یہ ہے کہ اور شاگردوں کو استاد کی نظروں سے گرادیا۔ اس فتنہ پرداز میں اتنی بھی صلاحیت نہ تھی کہ میر عنایت حسین امداد عظیم آبادی اور سید علی حیدر رشید عظیم آبادی کی حد کو پہچان سکتا۔ یا پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی۔ سید شاہ ولی الرحمٰن ولی ڈپٹی کلکٹر۔ سید شاہ خلیل الرحمٰن وفا عظیم آبادی وغیرہ کا کلام سمجھ سکتا۔ مگر اس کی عیاریوں نے کسی کو اُبھرنے نہ دیا۔ یہ شخص ضعیف استاد کے سر میں تیل ملتا۔ اُنکے پاؤں دابتا اور باور کراتا کہ اور جتنے شاگرد ہیں سب آپکے دشمن ہیں۔ یہ دروغ مجسم اسی غلامی کے ذریعہ بادشاہت کرتا تھا۔ یعنی کہنہ مشقوں کو ذلیل کرنے کے لئے خود حضرت شاد کی غزلیں مشاعروں میں اپنے نام سے پڑھتا تھا۔ مگر بقول حضرت امیر مینائیؒ ؎

ستارے مرے دیکھے بھالے ہوئے ہیں
یہ سب گیند اُنکے اچھالے ہوئے ہیں

حیات فریاد صـ ۱۴۳ میں حضرت شاد فرماتے ہیں:۔ "فی زمانہ جو حرکات تلامذہ کے اپنے استادوں کے ساتھ ہیں کیا بیان کئے جائیں ؎

دل ہمہ داغ داغ شد
پنبہ کجا کجا نہم؟

انشاء اللہ اگر موقع ملا تو اس بیان کو تفصیل وار کسی جگہ لکھ جاؤنگا تاکہ ناظرین کو حیرت و عبرت ہو" ——— اس فتنہ پرداز شاگرد کے ایک سو ستر ہاتھ تھے۔ ان میں دو ہاتھوں کا کرشمہ یہ تھا کہ ایک ہاتھ سے حضرت شاد کو اُن کے اور شاگردوں سے لڑادیا۔ اور دوسرے ہاتھ سے شعرائے عظیم آباد و آرہ کو خود حضرت شاد سے لڑادیا۔ یہ جنگ برسوں

رہی ۔ نومبر اور دسمبر ۱۹۲۳ء میں میدانِ جنگ کا نقشہ کیا تھا ملاحظہ ہو: —

۶۸۶

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

مشاعرہ کا منشا یہ ہے کہ سخنگو اپنے کلام سنا کر محنت کی داد پائے اور حاضرین کو غیر جانبداری کا یقین آئے۔ سارے سخن گو بلائے جائیں۔ سب کا کلام سنا جائے۔ اور سب کی محنت کی داد دیجائے خود نمائی آئی۔ پھر مشاعرہ مشاعرہ نہ رہا۔ انھیں باتوں کو ملحوظ رکھ کر ایک صحبت مشاعرہ بتاریخ ۱۰ نومبر بوقت ۱۰ بجے شب بمقام بخشی محلہ پٹنہ قرار پائی ہے۔ امید کہ آپ بتاریخ و وقت معینہ پر تشریف لاکر ملتمسین کو رہین منت فرمائیں گے

مصرع طرح: — ہر بزم سے اس بزم کا انداز جدا ہے

قافیہ: — جدا ۔ فدا ۔ حنا ۔ خدا وغیرہ

ردیف: — ہے

الملتمسین

نظیر حسن شائق ۔ ابوالقاسم وارثی مذکور ۔ نجم الدین نجم ۔ رضی الدین حسن دہلوی خواجہ ۔ عین الہدیٰ ثمر ۔ عزیز الدین بلخی راز

۷۸۶

الحمد للہ کہ مشاعرہ کا حقیقی منشا عملی طور پر پچھلے مشاعرہ میں جو نہایت حسن و خوبی کیسا تھ انجام پایا۔ کل حضرات نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ شہر کے تمام اہل کمال اور ماہرین فن اور سخن سنج شریک بزم ہوئے۔ خلوص اور غیر جانبداری کے اعتبار سے یہ جلسہ جسقدر کامیاب ہوا اُس کے متعلق بس یہی عرض کر دینا کافی ہوگا کہ شہر کے ہر حلقہ کے سخن گو بلا استثنا شریک تھے اور کسی کو الحمد للہ کوئی وجہ شکایت پیدا نہ ہوئی۔ ہاں بعض مخالفین نے اُس بزم کو مفسدانہ جلسہ اور تو تو میں میں کے لفظ سے تعبیر کرنے میں تامل نہ کیا۔ اور ایک نئی جولانگاہ کی طرح ڈالی۔ لہذا ایسے لوگوں کے ناموں کو ترک فہرست کر کے عام دعوت دیجاتی ہے کہ کل حضرات جنکو شعر و سخن سے دلچسپی ہے بتاریخ ۸ دسمبر ۱۹۲۳ء روز شنبہ بوقت دس بجے شب بمکان مولوی سید عزیز الدین بلخی صاحب بخشی محلہ پٹنہ سٹی تشریف لاکر شریک بزم ہوں اور ملتمسین کو مرہون منت فرمائیں۔

مصرع طرح: "بزم اغیار میں جانے کی ضرورت کیا ہے"

قافیہ: ضرورت ۔ محبت ۔ وغیرہ ۔ ردیف: — ہے

الملتمسین ۔ عین الہدیٰ ثمر ۔ سید حسن سید ۔ نظیر حسین شائق

یہ مشاعرے بخشی محلہ عظیم آباد میں ہوئے تھے مصرع طرح کا روئے سخن حضرت شاد کی طرف تھا۔ ع ہر بزم سے اس بزم کا انداز جدا ہے ۔ یعنی بزم شاد میں صرف شاد و شاگردانِ شاد کو داد ملتی ہے ۔ اور خود نمائی کا تماشہ ہوتا ہے ۔ بزم اغیار میں جانے کی ضرورت کیا ہے یعنی بزم شاد میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ملتمسین کی فہرست میں دو نام خاص طور سے قابل توجہ ہیں ۔ اول نظیر حسین شائق شاگرد حضرت شاد ۔ اور دوم عین الہدیٰ ثمر شاگرد مولانا بدر آروی ۔ اب دیکھیے کہ زمانہ حضرت صفیر بلگرامی کا انتقام حضرت شاد سے کس طرح لیتا ہے ۔ شاد نے ۱۲۸۷ھ ہجری میں صفیر بلگرامی سے انحراف کیا تھا ۔ اب پچپن برس کے بعد خود حضرت شاد کا شاگرد شائق عظیم آبادی اُن سے ٹوٹ کر ملتا کس سے ہے شاگردِ شاگردِ صفیر بلگرامی یعنی حافظ سید عین الہدیٰ ثمر آروی سے ۔ بہر کیف ان دونوں مشاعروں کے رقعے ہم کو بکسر ضلع شاہ آباد میں ملے ۔ مشاعرہ میں ہم خود شریک نہ ہو سکے ۔ مگر ایک غزل بھیج دی جس میں یہ دو شعر بھی تھے ؎

جو داد کے قابل نہیں اسکو بھی ملی داد! "ہر بزم سے اس بزم کا انداز جدا ہے"
فانی متعصب نہیں جو شاد سے روٹھے شاگردِ صفیر آج تو تاج الشعرا ہے

مشاعرے میں ہمارے یہ دو شعر پڑھے گئے تو ایک شخص حضرت شاد کے پاس دوڑا گیا۔ اور کہا کہ دیکھئے صفیر بلگرامی کے پوتے نے اس مقطع میں پھر آپ کی شاگردی کا فسانہ چھیڑ دیا۔ مگر اس غریب کو یہ خبر نہیں تھی کہ اس سے پہلے ہی ہم حضرت شاد کو براہ راست لکھ چکے تھے کہ اب آپکو غور فرمانا چاہیئے کہ انحراف کا وجہ اپنی گردن پہلے جانا آپ کے لئے مناسب ہو یا نہیں۔ اسی سوال کا جواب حضرت شاد نے ہمکو دیا تھا کہ :۔

"آخر کتاب (فکر بلیغ) میں آپ اپنے حسب بخواہ وہ سب باتیں بھی پائینگے جس کا ایما آپنے اس خط میں کیا ہے۔ مرحوم میر قوت علی صاحب سے اس بارے میں میں کہہ بھی چکا تھا کہ اب میرا دل ہر طرح کے غش سے پاک صاف ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس جملہ میں میر قوت علی صاحب سے مراد حضرت میرامامی بلگرامی کے خلف میر قوت علی شورش بلگرامی شاگرد صفیر بلگرامی ہیں۔ مرزا اوج لکھنوی (خلف میرزا دبیر) اور حضرت شاد انکا بہت احترام کرتے تھے۔ انھیں سے حضرت شاد نے اقرار کیا تھا کہ صفیر بلگرامی کی شاگردی سے ہمارا انحراف دراصل عالم شباب کا ایک شعبدہ تھا۔ یہی مطلب ہے اس فقرہ کا کہ اب میرا دل ہر طرح کے غش (یعنی کدورت وخیانت) سے پاک صاف ہے۔

حضرت شاد کا یہ خط ہمکو ۱۹۱۸ء میں آیا تھا۔ اس کے آٹھ سال بعد ہم ایک مرتبہ حضرت شاد کی زیارت کے لئے انکے دردولت پر حاضر ہوئے تو حضرت نے اپنے صاحبزادے سید حسن خاں سے فرمایا کہ مطبوعہ اوراق جو اس کمرے میں رکھے ہیں ذرا وصی احمد کو دکھلا دو۔ وہ اوراق آئے تو ہم نے دیکھا کہ ایک قطعہ میں حضرت شاد نے اپنے استادوں کو یاد کیا ہے اور اس فہرست میں صفیر بلگرامی بھی ہیں۔ مگر ایک بیت کے مصرع ثانی میں مطبوعہ الفاظ یہ ہیں :۔ " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صفیر او ستاد فن بود"

اس فقرہ کا پڑھنا تھا کہ ہمکو حضرت ناسخ کا مصرع یاد آگیا جو خط دہ لکھتا ہے۔ یہ لکھے نہیں دیتے ہیں رقیب! یعنی حضرت شاد نے صفیر بلگرامی کی شاگردی کا اقرار کرنا چاہا بھی تو نقیبوں نے یہ ذلت گوارا نہ کی۔ اور ایک نقطہ سے اپنا کام نکال لیا۔ ہم نے حضرت شاد سے کہا کہ ذرا ان الفاظ کو ملاحظہ فرمایا جائے۔ حضرت نے چشمہ طلب فرمایا اور اس بیت کو پڑھ کر فرمایا کہ یہ غلط ہے۔ الفاظ یہ تھے۔ "صفیر استاد من بود" ہم نے کہا کہ اپنے دست مبارک سے تصحیح فرمادی جائے۔ تب حضرت نے قلم دوات منگا کر حاشیہ پر یہ ثبت فرمایا :۔

"ایں جا فن نیست۔ من است۔ السید علی محمد شاد"

حضرت شاد سے یہ دستاویز لیکر ہم اسیوقت بانکی پور گئے۔ اور بھائی صاحب مدظلہ العالی حاجی سید عنایت احمد صاحب بلگرامی ڈپٹی کلکٹر سے کہا کہ لیجئے حضرت شاد نے قرض بے باق کردیا۔ بھائی صاحب مدظلہ العالی نے فرمایا کہ اس دستاویز کو خدا بخش خاں صاحب کے کتبخانہ میں رہنا چاہیئے۔ ہم نے کہا کہ ضرور۔ چنانچہ دوسرے دن حضرت شاد کا وہ نوشتہ جناب مولوی ولی الدین خدا بخش خاں سکریٹری اورینٹل لائبریری بانکی پور کو سپرد کردیا گیا۔

(۲) "آپ پاس میرا وہ مرثیہ موجود ہے جو میرے قلم کا لکھا ہوا اور مرزا دبیر مرحوم کی پیر اصلاح ہے" یہ مرثیہ وہی ہے جسکی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔ حضرت شاد کا یہ سب سے پہلا مرثیہ ہے۔ اور اسپر صفیر بلگرامی اور مرزا دبیر کی اصلاحیں ہیں۔ حضرت شاد کو اسکی زیارت ستر برس کے بعد نصیب ہوئی یعنی یہ خط الکریم مرثیہ لئے ہوئے پٹنہ گئے اور حضرت شاد کو سپرد کر آئے۔ پھر چند ماہ کے بعد دوبارہ پٹنہ گئے اور مرثیہ لے آئے۔ یہ تبرک ہمارے پاس اب تک محفوظ ہے۔

(۲)

برخوردار نور چشم فضل مآب سلمکم اللہ تعالیٰ۔

آپ کے تشریف لے جانے کے بعد مجھکو زیر ناف سخت درد پیدا ہو گیا۔ رات تڑپ کر کٹی۔ تھوڑی دیر سے کچھ افاقہ ہے۔ جس میموریل کا میں نے آپ سے ذکر کیا ہے اُسکا ایک انگریزی مسودہ اور کچھ مضمون اس پر زیادہ کیا ہے۔ اُردو میں وہ مضمون جاتا ہے۔ پوری امید ہے کہ آپ ان مضامین کو اپنے طور پر انگریزی میں لکھ دیجئے۔ اور صاف کر کے اس دوشنبہ کے قبل میرے پاس روانہ کر دیجئے۔ دوشنبہ کے دن کمشنر صاحب کو جا کر چھپوانے کا ارادہ ہے۔ اور اگر آپ کی عنایت ہوگی تو انشاء اللہ ۱۵ نومبر کو داخل کیا جائے گا۔۔ ۔۔ ۔۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر و اقبال میں ترقی عطا کرے۔ آمین!　　رقیمۃ الدعا السید علی محمد شاد　　۱۷ نومبر ۱۸ء　پٹنہ

(۳)

برخوردار نور چشم۔ بہتر از جان۔ طال عمرہ و اقبالہ۔

دعائے ترقی درجات کے واضح خدمت ہو۔ آپ جس دن سے مجھکو دیکھ کر گئے ہیں میں سخت ضعیف و ناتواں ہو گیا ہوں۔ ظاہرا کام مگر تپاک قلب اور تبخیر نے ایسا پریشان کر دیا ہے کہ چار سطریں غور کر کے لکھنا محال ہے۔

وقت گذرا جاتا ہے۔ اگر میں جلد مر گیا اور غالباً وہ وقت قریب ہے تو ان ننھے بچوں کا کوئی کفیل نظر نہیں آتا۔ آخر دل مضطرب ہو گیا کہ بغیر ترتیب دئے اور صاف کئے میموریل کے نوٹوں کو آپ کی خدمت میں بھیجنا پڑا۔ میرے عزیزوں اور شاگردوں کی تعداد ہزاروں سے زیادہ ہے۔ مگر آج ایک بھی مددگار نظر نہیں آتا۔ خدا آپ کو ترقی عمر و اقبال دے محض آپ پر ہر قسم کا بھروسہ ہے میں نے جب جب جس جس قدر نوٹ کئے ہیں سب کو بھیج دیتا ہوں۔ سب کو ملاحظہ کر کے مسودہ جلد درست فرمائیے اولڈہم صاحب کل چلے جائیں گے۔ اس سے زیادہ آپ سے کیا گذارش کروں۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ اب آپ خود سمجھ لیجئے۔ مجھ بوڑھے بیمار کو تکلیف نہ دیجئے۔ خدا تعالیٰ تم کو سلامت رکھے۔　　دعاگو السید علی محمد شاد　　۴ جنوری ۱۹ء

(۴)

برخوردار سعادت اطوار۔ والا دودمان سلمکم اللہ تعالیٰ

بعد سلام شوق و ترقی عمر و اقبال واضح خدمت ہو۔ چند روز ہوئے کہ میرے غمخوار۔ دل نواز۔ شفیق بے ریا۔ مولوی بدر صاحب

نے مشاعرہ کا اشتہار میرے پاس بھجوایا۔ اسکو دیکھ کر کیا بتاؤں کہ میری کیا حالت ہوئی۔ آٹھ مہینے کامل گذر گئے کہ اس عارضۂ قدیمہ یعنی وحشت و اختلاج قلب نے میری کیسی حالت بنا دی۔ اور اور باتیں ایک طرف۔ لکھنا پڑھنا۔ دروازہ سے باہر نکلنا۔ سب چھوٹ گیا۔ علاوہ اس کے میں مدتوں سے ترکِ مشاعرہ کر چکا۔ نہ میں قابلِ مشاعرہ رہا۔ نہ مشاعروں کی حالت ایسی ہے کہ شرفا شریک ہونا گوارا کریں۔ مگر ساتھ اس کے اللہ اکبر آرہ! اور پھر مولوی صاحب سلمہ کا اس محبت سے بلانا۔ اور میرا نہ جانا بھی کچھ کم میرے لئے باعثِ صدمۂ عظیم نہیں ہے۔

آپ ملاحظہ کریں کہ میرے پاس مدتوں سے ایک ٹوٹا پریس پڑا تھا۔ اسکی مرمت کرکے ڈپٹی صاحب کلکٹر سے اجازت مانگی۔ انھوں نے بلا ضمانت اجازت تو دی مگر یہ کہا کہ میں قانون سے مجبور ہوں۔ حسب قاعدہ دو منٹ کے لئے وہ آکر خود ایفیڈیوٹ کر جائیں۔ مگر اس کمبخت عارضہ کے سبب سے میں جا ہی نہ سکا۔

یہاں ایک تاجر بڑے نامی ہیں۔ منت خاں۔ اُن کے بھتیجے جھنگے خاں نے سخت اصرار کرکے چاہا کہ اپنے خرچ سے کل میری تصانیف چھپوائیں اور کوئی دقیقہ اصرار کا اُٹھا نہ رکھا۔ میں نے مجبور ہو کر اقرار بھی کر لیا۔ پہلے انھوں نے یہ خبر نہیں دی تھی کہ کس مطبع میں چھاپیں گے لیکن چونکہ اُن کے بہت روپے آرہ کے مطبع "——" کے ذمہ باقی ہیں وہیں بات چیت طے کر لی تھی۔ جب مجھکو یہ معلوم ہوا۔ ...... تو مجھکو اُس نمک حرام کے مطبع میں چھپوانا گوارا نہ ہوا۔ جھنگے خاں کو تو اپنے روپے وصول کرنے تھے۔ خاموش ہو بیٹھے۔ اور مجھ سے بہت لوگوں نے کہا کہ آپ کو کیوں ایسی کد ہے۔ مجکو یہ بھی گوارا نہ ہو سکا کہ پرانا قصہ لے بیٹھوں۔ صرف یہی جواب دیا کہ وہ نہایت وعدہ خلاف شخص ہے۔ میں نے عہد کر لیا ہے کہ چاہے مفت چھاپے مگر میں وہاں ہرگز نہ چھپواؤنگا۔ یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔

اب پھر مشاعرہ کا ذکر کرتا ہوں۔ چند دن سے میں جیسا ہوں اگر ایسا ہی رہا تو آنکھوں سے حاضر ہونگا۔ اور اگر خدا نا کردہ دل قابو میں نہ رہا تو ریل پر دو گھنٹہ گھٹ کر رہنا ہی ستم ہے۔ ورنہ پٹنہ اور آرہ میرے لئے دونوں برابر ہیں۔

دوسری گذارش یہ ہے کہ بصورت حاضری میرے پڑھنے کے لئے ایک مجلس عزا کا ہونا ضرور ہے۔ پندرہ برس اُدھر اگر میں کسی جگہ مشاعرہ میں گیا ہوں تو پہلے ہی یہی نیت کر لی ہے۔ اگرچہ اب میری حالت ایسی نہیں ہے کہ حسب خواہ مجلس پڑھ سکوں مگر اسکو سعادت اور برکت جانتا ہوں اور یہ کل امور جب ہی باعثِ دلچسپی ہونگے جب آپ آرہ میں تشریف رکھتے ہونگے۔ ابھی تک میں نے مولوی بدر صاحب کو خط تک نہیں لکھا ہے آپ کا خط پانے کے بعد البتہ جواب لکھونگا۔ زیادہ السلام۔ دعاگوئی شما السید علی محمد شاد۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۲۰ء پٹنہ سٹی

اس خط میں دو فقرے تشریح چاہتے ہیں گو تشریح کا موقع نہیں:—

(۱) "اللہ اکبر آرہ"! اس فقرہ پر مولانا جامی علیہ الرحمہ کا ایک شعر بے اختیار یاد آگیا ؎

مرا کشتی و تکبیرے نگفتی
چہ سنگیں دل کسی۔ اللہ اکبر!

تو نے ہمکو ذبح کیا اور تکبیر تک نہ کہی۔ تو بھی کتنا سنگدل ہے۔ اللہ اکبر!

(۲) "مجکو اُس نمک حرام کے مطبع میں چھپوانا گوارا نہ ہوا" نمک حرامی ایک شخص نے دراصل حضرت صفیر بلگرامی کے ساتھ کی تھی۔ اس لئے شاگرد کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ جس نے اوستاد کے ساتھ نمک حرامی کی اُس کے مطبع میں اپنا کلام طبع کرائے۔

(۵)

جان و دلِ شاد بقربان شما۔ ایک ہفتہ سے زیادہ ہوا کہ آپکا گرامی نامہ باعث قوت دل مسرت منزل ہوا تھا۔ کتابوں کی نسبت کیا عرض کروں۔ ایک ہفتہ سے یہی ہو رہا ہے کہ کل چاروں کا ایک ایک جزو طیار ہو جائے گا۔ مگر کوئی نہ کوئی بکھیڑا نکل آتا ہے۔ شاید اب تو اتوار تک طیار ہو کر آپ پاس روانہ ہو جائے۔ ۔ ۔ ۔ بھائی! اس عمر اور دفتر کن اور ضعف نے مجکو مار ڈالا ہے۔ اسپر مسودہ دیکھنا۔ کاپی دیکھنا۔ پروف دیکھنا۔ اور پھر مختلف مضامین پر نظر رکھنا۔ خدا اہل علم و فن میں عزت رکھ لے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ تعالیٰ آپکو خوش رکھے اور درجۂ اعلیٰ پر پہونچائے کہ دیکھ کر اور بھی دل خوش ہو۔ میں تو اسوقت بھی فخر کرتا ہوں۔ اور دل چاہتا ہے کہ تمھارے پاؤں کی خاک اپنی آنکھوں سے لگایا کروں۔ تمھارا خاکسار السید علی محمد شاد ۳۰ دسمبر ۱۹۲۰ء

اس خط میں چار کتابوں سے مراد ریاض عمر۔ چشم بصیرت۔ فکر بلیغ۔ اور آئینۂ انقلاب ہیں ——— ریاض عمر دیوانِ غزلیات۔ چشم بصیرت کلیات مولود و مراثی۔ فکر بلیغ تذکرۂ مرثیہ گویاں۔ آئینۂ انقلاب تاریخ صوبۂ بہار۔ اشتہار کی سرخی یہ تھی ؎

آزما تو یوں بھی دس گرتے ہوئے بازار کو
شاد بیچو توڑ کر ان موتیوں کے ہار کو

موتیوں کے ہار توڑ کر اس طرح بکے کہ ایک ایک جزو چاروں کتابوں کے بیک وقت شائع ہوئے۔ افسوس کہ حضرت شاد کی مجبوریوں اور زمانہ کی ناقدری نے یہ سلسلہ بھی موقوف کر دیا۔ ورنہ ریاضِ عمر کا سرنامہ بالکل بجا و درست تھا۔ سرنامہ یہ تھا ؎

تن دیدہ اند از من و جانم ندیدہ اند | نامم شنیدہ اند و نشانم ندیدہ اند
آنہا کہ آورند مرا در نظر حقیر | بر آستانِ میکدہ شانم ندیدہ اند
آناں کہ سرکشند ز نخوت بر آسماں | بیچارگاں بکوئے مغانم ندیدہ اند

حضرت شاد کا دیوان جو شائع ہوا ہے وہ بالکل ناقص ہے۔ یہی حال فکر بلیغ کے اُس حصہ کا ہے جو رحلتِ حضرت شاد کے بعد شائع ہوا۔ مجروح کبوتر کو دیکھنا ہو تو ان دونوں کتابوں کو دیکھئے۔

(۶)

نور چشم سراپا قابلیت۔ سراپا احسان۔ مولوی سید وصی احمد صاحب طال عمرہ و اقبالہ۔ بعد سلام شوق و دعائے مخلصانہ ترقیات التماس یہ ہے کہ ہرچند آپکو تکلیف دیتے ہوئے سخت حجاب آتا ہے۔ مگر الغرض مجنون۔ کیا کروں؟

حالت یہ ہے کہ اس دفعہ حسب ایمائے سر فخر الدین صاحب ایک میموریل میں نے پھر گورنمنٹ میں دیا تھا۔ کمشنر نیا تھا۔ اُس نے مرے

بیان کی تحقیقات کی۔ کلکٹر نے سٹی مجسٹریٹ کے پاس بھیج دیا۔ سٹی مجسٹریٹ نے نہایت حسب خواہ رپورٹ کیا۔ مگر اتنا لکھ دیا کہ سات سو سالانہ جمعبندی کا ایک گاؤں بھی ہے جس کی آمدنی بسبب دفعہ ۱۴۴۔ اور آسامیوں کے جھگڑے نے چار برس سے بند اور قرض سودی اس پر پانچ ہزار ہے۔ کلکٹر نے یہ رپورٹ دیکھا (ازبسکہ شد بد النفس مشہور ہے) برخلاف لکھا۔ مگر پھر کمشنر نے اپنی رپورٹ میں سفارش لکھ دی۔ سر فخر الدین نے شاید اس انگریزی ممبر سے جو ایسے کاغذات دیکھتا ہے سفارش بھی کی۔ مگر اس کلکٹر نے بقول اُن کے کچھ زبانی جا کر ایسا کہا کہ ناکامیابی ہوئی۔

جو تحقیقاتی رپورٹ کے اور کاغذوں کی نقل آپ کی خدمت میں جا رہی ہے۔ زیادہ افسوس یہ ہے کہ اگر کوئی صورت لڑکوں کے لئے وظیفہ کی نہ نکلی تو اُن کی تعلیم دشوار ہے۔ سر فخر الدین نے کہا کہ اس دفعہ صرف لڑکوں کی تعلیم میں معقول مدد ملنے کی استدعا کیجئے چونکہ اسکول ایجوکیشن سے تعلق ہے شاید حکم آخر کے لئے میرے پاس آئیگا۔ میں نے پوچھا کہ ایسا موریل کس سے لکھوایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ یاد آتا ہے کہ مولوی سید وصی احمد صاحب سے آپنے ایک موریل لکھوایا تھا۔ وہ سب سے بہتر تھا۔ انھیں سے لکھوائیے۔

میں نے اس پیری و نابینائی میں کئی مسوّدے کئے۔ پھر استخارہ کیا۔ تو واجب یہی آتا ہے کہ آپ لکھیے۔ اور ضرور لکھیے۔ اور پھر ٹیپ کروا کر ہر طرح مرتب کر کے جلد بھیج دیجئے۔ سر فخر الدین اوائل مئی میں رانچی چلے جائیں گے۔ سپردم تو مایۂ خویش را۔

مجکو معلوم نہیں کہ یہ موریل بھی کمشنر کے ذریعہ سے جائیگا یا اور کسی کے۔ بہرحال یہ کام آخر عمر کا جلد کر دیجئے۔ دست بستہ گذارش ہے کہ جلد مرتب کر دیجئے۔ اگر ضرورت لڑکوں کے نام کی ہو تو ذیل میں لکھتا ہوں:-

سید سلطان احمد خاں۔ عمر ۹ سال۔ جارج ام۔ ای۔ اسکول میں ساتویں کلاس میں پڑھتا ہے۔

سید تقی احمد خاں۔ عمر ساڑھے سات .. ..

دعاگو السید علی محمد شاد۔ پٹنہ سٹی۔ ۲۳ اپریل ۲۶ء

اس خط میں سر فخر الدین کی زبانی جس موریل کا حوالہ ہے اُس میں ہم نے حضرت شاد کی طرف سے لکھا تھا کہ گورنمنٹ سال میں لاکھوں روپئے آثار قدیمہ پر صرف کرتی ہے۔ کیا غضب ہے کہ گورنمنٹ نے آثار قدیمہ کی فہرست میں اب تک شاد عظیم آبادی کا نام درج نہیں کیا۔ یہ موریل پہونچا تو گورنمنٹ آف انڈیا نے ایک ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ حضرت شاد کے لئے عطا فرمایا۔ یہ وظیفہ نو سال تک جاری رہا۔ جنوری ۱۹۲۷ء میں موقوف ہوا جب حضرت شاد نے رحلت فرمائی اور شمع شاعری ہمیشہ کے لئے خموش ہوگئی۔

سکھی! سنیو میری کہانی — میں تو بھئی ہوں بڑا دیوانی

ھمدردی

SPECIAL PRESS, CAL

غزل
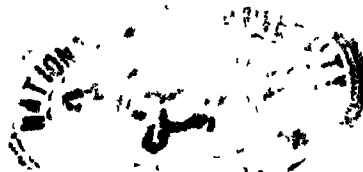
(جناب ڈاکٹر مبارک حسین مبارک عظیم آبادی)

چتون جو قہر کی ہے تو تیور جلال کے
مطلب یہ ہے کہ رکھدے کلیجہ نکال کے

واعظ سے بحث بادہ و پیمانہ کیا کروں
کچھ لوگ رہ گئے ہیں پرانے خیال کے

سو فائدے نکلیں وصل کی تو اس سے فائدہ؛
کہتے ہیں وہ کہ ہم نہیں قائل ہیں فال کے

حکمت تو دیکھئے یہ حکومت تو دیکھئے
دل کا سوال ہوتا ہے آنکھیں نکال کے

خالی نہیں ہے لطف سے سننے بھی تو سہی
پہلو ہیں تو بہ تو مرے اظہار حال کے

سو داغ جن کے لائے ہیں زیر مزار ہم
احساں جتاتے ہیں وہ وہ پھول ڈال کے

پھر ڈھونڈتا ہے دل خلش خار آرزو
پچھتا رہا ہوں دل سے یہ کانٹا نکال کے

قبلے سے ابر جھوم کے اُٹھے خدا کرے
زاہد یہ انتظار ہے ساغر میں ڈھال کے

یہ غمکدہ ہے اس میں مبارک خوشی کہاں
غم کو خوشی بنا کوئی پہلو نکال کے

"جھولا"

از حضرت رسا ہمدانی۔ گیاوی ٹربیل ایم۔ اے (گولڈ میڈلسٹ) ایڈووکیٹ

بہار ہے مرے گھر ایکے سال جھولے پر
نہال میں ہوں کہ ہے نونہال جھولے پر
مزے کی نیند میں ہے میرا لال جھولے پر

ادا بھی شکل بھی دلکش ہے بھولے بھالے کی
بلائیں زلف بھی لیتی ہے سونے والے کی
مزے کی نیند میں ہے میرا لال جھولے پر

حسین گال جو دونوں ہیں ماہ پارے ہیں
چمک رہے ہیں بناگوش دو ستارے ہیں
مزے کی نیند میں ہے میرا لال جھولے پر

لبوں پہ ہے جو تبسم کی اک جھلک دیکھو
فدا ہے حسن اسے سر سے پاؤں تک دیکھو
مزے کی نیند میں ہے میرا لال جھولے پر

خوشی کی ہے نہ خوشی غم کا ہے نہ غم اسکو
لگاؤں کیوں نہ کلیجے سے دمبدم اسکو
مزے کی نیند میں ہے میرا لال جھولے پر

دکھائی دی ہے جھلک صبح زندگانی کی
ابھی ہوا نہ لگی موسم جوانی کی
مزے کی نیند میں ہے میرا لال جھولے پر

نہ ہے مصیبت و راحت کی کچھ خبر اسکو
کہیں لگے نہ زمانے کی بد نظر اسکو
مزے کی نیند میں ہے میرا لال جھولے پر

کام!

("۔ افسانے کا مضمون آنکھ بند کر کے سوچنے سے نہیں آنکھ کھول کر دیکھنے سے ملتا ہے"۔)

"سب سے بڑا افسانہ نویس خدا ہے" ۔ اکثر یہ خیال میرے دماغ میں اسوقت پیدا ہوتا ہے جب میں ہنگامۂ ہست و بود کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھتا ہوں۔ زندگی نام ہے ایک افسانۂ مسلسل کا، واقعات و سانحات اپنی اپنی جگہ پر "مختصر افسانے" ہیں، یہ انسانی آبادیاں بدعتِ کردار کے محیر العقول کارنامے ہیں اور یہ لالہ و گل، برق و طوفان، صبح و شام، شبِ تیرہ و روزِ روشن ماحول و فضائے بعید کے رنگ برنگ سامان۔

(۱)

تبسم، ایک دلدوز انوکھا سا تبسم، پر درد، ملتجی، مایوس، مسترحم، آج بھی میرے افق تصور میں اسیطرح برق سامان ہے جس طرح جیٹھ کی ایک گرم شام کو ہمراہ ہوا تھا، ایک ایسا تبسم جس میں لب و دنداں کے علاوہ چشم و نگاہ بھی برابر کے شریک تھے۔

وہ ایک مزدور تھا، عمر رسیدہ مزدور۔ اس کے خزاں رسیدہ اعضاء سے بھی اس کی بہارِ صحت کا پتہ چلتا تھا۔ عضلات گرچہ ڈھیلے ڈھیلے تھے پر اب بھی اُن میں مچھلیاں بنی ہوئی تھیں، مضبوط شانے جن پر گھٹھوں کے نشانات تھے۔ استوار گردن جس میں ڈور کی طرح موٹی موٹی رگیں ابھری ہوئی تھیں، شکن آلودہ پیشانی، بھدی بھدی، ہتھیلیاں اور تلوے گذشتہ سخت محنت و مشقت کا افسانہ دھرا رہی تھیں۔ مگر اس کے سراپا پر ایک غم انگیز اضمحلال طاری تھا، وہ ماضی کے آباد شہروں کے کھنڈر کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ اس کے گرد ڈور لپٹی ہوئی تھی، ایک ہاتھ میں ڈور کا ایک میلا، گرہ پر گرہ پڑا ہوا، ربود سا گچھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ ایک موٹا سا لٹھ کاندھے پر اٹھائے ہوئے تھا۔ اسکا سارا جسم عریاں تھا، صرف کمر میں ایک میلی سی پھٹی ہوئی لنگوٹی تھی۔

جیٹھ کی تپتی ہوئی سہ پہر لو کی شعلہ فشانیوں سے نجات حاصل کر کے شام میں تبدیل ہو رہی تھی، پر اب بھی ہوا کی گرم گرم لپٹیں آ رہی تھیں، زمین تپ رہی تھی اور ہنوز دھوپ پر نظریں نہ جمتی تھیں۔ میں قصبے سے باہر آم کے باغ کے

کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ آیا۔ ڈرتا ہوا، سہما ہوا، وہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ، تاڑتا ہوا۔ بیچارگی و محتاجی کی ایک چلتی پھرتی مورت، افسردگی و مایوسی کی زندہ تصویر ...... وہ میرے نزدیک آگیا۔ آتے ہی خمیدہ ہو کر اس نے مجھے سلام کیا۔ اور وہی اندوہناک تبسم۔ اس کی متبسم آنکھوں سے اُس کی مجروح روح اس کا پر داغ دل جھلک رہا تھا۔ اس کے ظاہری تبسم کا منبع ایک، المناک روحانی ابتسام تھا۔ آج تک میں نے کسی کے دل کو اتنا آشکارہ نہ دیکھا تھا، کسی کی روح کو اتنے فاش طور پر عریاں نہ پایا تھا۔ وہ اس وقت آرزوئے متشکل تھا "جذبات مجسم" "امید و بیم" کی ایک مرئی تعبیر۔ وہ سراپا اظہار تھا۔ وہ سر بسر اپنے دلِ ریش کی تفسیر محسوس تھا۔ وہ اکھڑی ہوئی آواز میں بولا "مجبور ...... کام ... ؟" اس کے لہجے میں ایک مایوسی تھی پر اس کے اندر کام کے تلاش کی انتہائی خواہش اور کوئی کام مل جانے کی شدید تمنا پوشیدہ تھی۔ ربودگی و ماندگی اُس کے بشرے سے ظاہر ہو رہی تھی ...... وہ پھر بولا "سرکار! بہت تکلیف ہے ... کوئی کام! ...... بہت تکلیف ہے ــ مالک ...... دو تین بچے ہے مجبور ... کوئی کام ... مل جاتا ... ہے ... سرکار ... کوئی کام ؟" اس کی آواز میں ایک ارتعاش تھا "ایں ... سرکار ... ہے کوئی کا ... کام" ؟ اس کے بے پناہ تبسم سے بھی یہی آواز نکل رہی تھی اور زیادہ، بہت زیادہ موثر انداز سے۔ وہ تھکا ہوا تھا، پاؤں ٹخنوں تک گرد سے اَٹے ہوئے، پریشان سر کے بال بے ترتیب گچھوں کی صورت میں پسینے اور گرد میں چپکے ہوئے اور چہرہ اُداس، پژمردہ و مضمحل تھا۔ اس شدید گرمی کے موسم میں وہ دن بھر کام تلاش کرتا رہا تھا اور ناکام وہ ہمہ تن التجا تھا اور میں خاموش ...... وہ مضطرب ہو کر پھر بولا "مجبور! کوئی کام ..... ہے ؟" اس کے اندازِ تکلم میں مایوسی کا پہلو نمایاں تر ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے دریافت کیا "تم کیا کرتے ہو ؟" اسنے بیتابی سے جواب دیا "سرکار جو کام کا حکم ہو۔ کام ملجاتا تو پیٹ پالنے کا سہارا ہو جاتا ...... بچہ سب بھوکا ہے۔ کوئی کام نہیں ملتا۔ ایک مہینہ ہوا ہر جگہ گھوم آگیا ... آپ کے پاس ہے کوئی کام ؟" وہ سراپا استفہام تھا اس کی تمام کائناتِ امید صرف اسی سوال کے اثباتی جواب پر منحصر تھی۔ وہ بے بسی سے میرے قریب تر آگیا اور پھر وہی دردآگیں و درد خیز تبسم! ــ میں اس قصبے میں محض تبدیل آب و ہوا کے لئے آیا تھا۔ اس غریب مزدور کے لئے میرے پاس کوئی کام نہ تھا۔ میں نے کہا "بھائی میرے پاس کوئی کام نہیں" جیسے کسی ملزم کو فیصلے کے تکلیف دہ انتظار کے بعد پھانسی کا حکم سنایا جائے، جیسے کسی پر بجلی گری ہو، غریب، بیکار، تھکا ہوا، کمزور، بھوکا، بوڑھا مزدور کمر کو پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سر بزانو، خاموش، بے آس۔ وہ حسب معمول تمام قصبے کی خاک چھان چکا تھا۔ ہر جگہ

اُس کی آس ٹوٹی تھی۔ پر آہ یہ اُمید ــ سینکڑوں آرزوؤں کے مزار پر پیدا ہونے والا لالہ، یہ داغ ہزاروں ناکامیوں کے اُفقِ تیرہ پر چمکنے والا تنہا ستارہ ــ اُس کے دل میں ایک آخری بار پھر پیدا ہوئی اور وہ قصبے کے باہر نکل آیا۔ تمام گرد و پیش کی رہ گردی کے بعد وہ اس باغ کی طرف امیدوار آیا تھا اور یہاں قسمت نے اُسے پھر ایک چرکا دیا۔ ــ ــ غریب، گرسنہ، ناامید مزدور!! دل تو میرا بھی دکھ رہا تھا پر اس وقت میں مسافر اُسے کیا کام دیتا۔ میں نے ہمدردانہ انداز میں اُس سے پوچھا "کیوں جی! گاؤں بھر میں تمھیں کوئی کام نہ ملا۔ یہ تو بڑا سا گاؤں ہے؟" مزدور نے سر اٹھایا اور بولا "بابوجی! میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ کوئی مجھے کام نہیں دیتا۔ دو مہینے سے بیکار ہوں۔ پہلے لالہ جی کے یہاں باغ کا مالی تھا۔ زمانے تک اُنکی خدمت کرتا رہا۔ اب سارے باغ کا کام، وہ کہتے ہیں مجھ سے نہیں نبٹتا۔ سرکار! میں تو جہاں تک ہوتا تھا، دن بھر کام پر لگا رہتا تھا۔ لالہ جی کہتے ہیں کہ ان کا کھرچ بڑھ گیا ہے۔ دو تین مالی اور رکھنا پڑا انکو.... ایک دن مجھے انھوں نے کام سے ہٹا دیا۔ اور اُس دن سے مجبور بیکار ہوں۔ سب کہتے ہیں بوڑھے سے کیا کام ہوگا۔ کوئی مجھے کام نہیں دیتا ــ" یک بیک جیسے بجھتی ہوئی شمع بھڑک اٹھے، جیسے سوکھی ہوئی پہاڑی ندی میں طوفان آجائے بوڑھا مزدور کھڑا ہو گیا۔ اپنی لٹھ اُس نے زور سے پکڑ لی اور ایک معصوم وقار کے ساتھ گویا ہوا۔ "حجور میں سب کام کر سکتا ہوں، دن دن بھر دھوپ میں کھرپی چلا سکتا ہوں ...... دوپہر کو کیاری میں پانی ٹپا سکتا ہوں ...... اور اب حجور جو کام بھی ملے کر سکتا ہوں۔ یہ ہے میری بہنگی دو من بوجھا اٹھا لونگا سرکار ...... لوگ کاہے کہتے ہیں کہ میں کام نہیں کر سکتا۔ یہی جرا جلدی نہ ہوگی۔ پھرتی تو جوانی کے ساتھ گئی ......" مزدور نے ایک آہِ سرد کھینچی ... "اس سے کیا سرکار؟ کام تو جرور کرونگا ......" مزدور کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور طرفہ یہ کہ وہ پھر مسکرا رہا تھا ... وہی قاتل تبسم! لجاجت آمیز، مایوس، پژمردہ، درد آگیں! ــ میرا دل پگھلا جا رہا تھا ...... میں نے جیب سے نکال کر ایک اکنی اس کی طرف بڑھائی ...... بوڑھے، بھوکے، مزدور نے اُسے آرزو مند مگر بے حرص نظروں سے دیکھا اور بولا "سرکار کوئی کام نہیں ہے؟ حجور مجھے کہیں کوئی کام دلوا دیجئے ...... مالک ...... کام!" میں نے کہا "بھائی میں مسافر ہوں۔ میرے پاس کوئی کام نہیں۔ اِسے لے لو ......" مزدور خاموش بیٹھا رہا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ لفظ "کام" نکل رہا تھا، اُس کی روح اس سوال کو غیر مسموع طور پر دہرا رہی تھی ...... آہ ایک بیکار مزدور! میں نے بصد اصرار اُسے پیسے دئے ...... اُس نے لے لئے، مگر خوشی، ندامت اور حسرت سے ملی ہوئی ایک کیفیت کے ساتھ آخر تو یہ خیرات تھا، مزدور کی قوتِ بازو کا وقار اِسے کب گوارا کرتا پر وہ اور اُس کے بے کس بچے بھوکے تھے ...... اور اُسے کام نہ ملتا تھا ...... وہ اٹھا اور ایک اندازِ منت پذیری کے ساتھ رخصت ہونے لگا ...... اُس نے سلام کیا اُسی

مجروح، رقت انگیز، حسرتناک، پُر اثر تبسم کے ساتھ اور چلا گیا ناکام!

(۲)

اس واقعہ کے بعد میں اُس بوڑھے مفلوک الحال مزدور سے اکثر ملا۔ دنیا نے اُسے چھوڑ دیا تھا مگر تبسم پُر اسرار تبسم نے اسکا ساتھ نہ چھوڑا تھا۔ کبھی وہ کاندھے پر کدال لیے نظر آتا، کبھی کوئی ربو ٹوکری اور کبھی ٹوٹی پھوٹی ڈور۔ وہ جب ملتا یہی کہتا سنائی دیتا" سرکار کوئی کام؟" وہی المناک تبسم، وہی لجاجت، وہی سوال، وہی بیہودگی۔ وہی تباہی کی حد تک خاکساری۔ مگر ہاں زمانہ اُس بیکار مزدور میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کر رہا تھا۔ اُس کی امیدیں مردہ ہو چکی تھیں اور اسکا خوف بھی مر چکا تھا۔ وہ محض اضطرار اور عادت کے طور اپنا سوال دہراتا جاتا تھا"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کام؟" کام ۔ ۔ ۔ ۔ ؟" اُسے اس کی کوئی فکر نہ باقی رہی تھی کہ اسکا سوال مردود ہوگا یا مقبول، وہ اب اپنے بیم و رجا کا ایک چلتا پھرتا مزار تھا اور بس۔ اب اسکا تبسم ایک بے معنی التجا کا مظہر تھا، زار و نزار، شکستہ، موت کی حد تک مجروح، دل کی گذشتہ حسرتوں، مرحوم ارمانوں ناکام آرزوؤں پر ایک "طنز ناکام"!! وہ اپنی بربادی کا ایک اشتہار تھا، دنیا کی بے دردی کا ایک اعلان۔ مزدور، بوڑھا، گرسنہ، بیکار مزدور روز بروز بھیانک حد تک دبلا ہوتا جا رہا تھا، گردن پر جھریاں پڑ گئی تھیں، پسلیوں کی ہڈیاں کسی مکروہ بھوت کی انگلیاں معلوم ہوتی تھیں جو اپنے شکنجے میں کسی بدقسمت شکار کو دبائے ہوئے ہوں۔ اُسکا پیٹ دن بدن دھنستا جا رہا تھا، کسی دھنسی ہوئی قبر کی طرح، سر چندلا ہوا جاتا تھا اور بے رونق کسی بنجر کی کھوپڑی کی مانند، آنکھیں حلقے میں تھیں اور تبسم کے وقت لب و دنداں اس انداز سے کھلتے تھے، جیسے ممی کی ہوئی لاش کے لب و دنداں کھلے ہوئے ہوں۔ جتنی زیادہ بدقسمت مزدور کی حالت زبوں، پُر اثر اور عبرتناک ہوتی جاتی تھی، دنیا اُس سے اسی انداز سے اور روگرداں ہو رہی تھی۔

سب سے زیادہ المناک تبدیلی جو گرسنگی، بیکاری و محتاجی کے ہاتھوں زمانے نے اُس بوڑھے مزدور کی حالت میں کی تھی وہ وقار کا فقدان تھا۔ پہلے وہ خیرات لینے میں جھجکتا تھا اور اُسے مجبوراً قبول کرتے وقت اسکا دل مجروح ہوتا تھا اور اب وہ ہر دادو دہش پر بھوکے کتے کی طرح ٹوٹتا تھا اور خیرات لینے کے وقت اُس کے انداز میں ضرور ممنونانہ پہلو سے زیادہ حریصانہ عنوان پایا جاتا تھا ——— یہ مزدور کی روح کے پُر الم انجام کی تکمیل تھی!!

اب بھی وہ" کا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ م! ۔۔۔ کا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ م" رٹتا جاتا تھا مگر زیر لب، بے ربط، نحیف، بے اثر لہجے میں، جیسے کسی دوسرے عالم سے کوئی بھولی بسری روح اہلِ دنیا کو ایک مبہم سا پیغام پہنچانے کی سعی لاحاصل کر رہی ہو اور اب اس کے مخصوص تبسم سے ایک یاس یا، مردہ، بے حس، بے روح انفعالیت ٹپکتی تھی۔

(طبعزاد)

اختر اورینوی

لمعاتِ اختر

از جناب مولانا سید عبدالماجد صاحب اختر پروفیسر گورنمنٹ کالج مظفرپور

اب نگاہیں منکرِ تحسینِ امکاں ہوگئیں
عشق کی نادانیاں آخر کو عرفاں ہوگئیں

تھیں وجوبِ ذات کی عالم میں جو گلکاریاں
مرحبا! وہ رونقِ گلزارِ امکاں ہوگئیں

شکلِ دانہ خاک میں مل کر اُگے ہم بعد مرگ
خوبیاں پنہاں تھیں جو مر کر نمایاں ہوگئیں

فرطِ غیرت سے پتنگے کیوں نہ اپنی جان دیں
جب شعاعیں شمع کی محفل میں عریاں ہوگئیں

تاب سے جنکی منور پردہ ہائے چشم تھے
صورتیں وہ آج کن پردوں میں پنہاں ہوگئیں

ایک احساں رہ گیا سر پر تمھاری تیغ کا!
ورنہ جو کچھ مشکلیں تھیں آج آساں ہوگئیں

بن گئیں راہیں نکلنے کی جو سینہ چھد گیا
حسرتیں مرہونِ منت ہائے پیکاں ہوگئیں

آگ میں جلنا پتنگوں کا قیامت ڈھا گیا
انجمن میں شمع کی آنکھیں بھی گریاں ہوگئیں

مل گئیں مٹی میں کلیاں گلشنِ ہستی کی آہ
کر کے آنکھوں میں جگہ اختر وہ پنہاں ہوگئیں

خدا بخش خاں بہادر

(سی. آئی. ای)

(از جناب مولانا حاجی معین الدین ندوی گیلانی پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی پٹنہ)

اگر بقائے انسان و نام حیات دوام ہے تو اس لحاظ سے خدا بخش خاں بہادر سی. آئی. ای، بانی کتب خانہ مشرقی کو زندگی جاوید حاصل ہے، دنیائے علم و ادب اپنے اس محسن کو کبھی فراموش نہیں کرے گی۔ اور وطن اپنے اس سپوت فرزند کو ہمیشہ سرمایۂ صد افتخار تصور کرے گا۔ وہ علم و ادب کے عاشق تھے اس عشق نے ان کا نام ہمیشہ کے لئے صفحۂ دہر پر آپ زر سے ثبت کر دیا ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق   ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

خدا بخش خاں مرحوم کا ایثار، ان کی قومی محبت، ان کی دینی غیرت اور سب سے زیادہ ان کی علمی و ادبی خدمات اس قابل ہیں کہ افراد قوم کے سامنے انہیں بار بار پیش کیا جائے اور ان کے مخلصانہ اور بے ریا طرز زندگی کو نمونۂ عمل بنانے کی ترغیب دی جائے۔

ان کے معاصرین میں نواب سر سید مرحوم اور نواب محسن الملک مرحوم کو غیر معمولی شہرت حاصل ہے لیکن درحقیقت ہمارے اس بہاری قائد اعظم نے فیاضی اور ایثار کا جو نمونہ پیش کیا ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے، اگر ایک طرف انہوں نے اپنی قوم کو بام عروج تک پہونچانے کے لئے دماغی و جسمانی مشقت برداشت کی، قومی فلاح و بہبود کے ذکر میں شب بیداری کو اپنا شیوہ بنایا اور تحریر و تقریر سے قوم خفتہ کو جگانے کی کوشش کی تو دوسری طرف انہوں نے اپنی ساری کائنات اور اپنی تمام عمر کا اندوختہ "کتب خانۂ مشرقی" کی صورت میں وقف عالم کر دیا اور اس طرح انہوں نے اہل و عیال کے حقوق کو قومی ضرورت کے مقابلہ میں پس پشت ڈال دیا،

ایک بڑے فرنچ فلسفی کا مقولہ ہے "میں اپنی ذات سے زیادہ اپنے خاندان کو، خاندان سے زیادہ وطن کو اور وطن سے زیادہ انسانیت کو محبوب رکھتا ہوں" خدا بخش خاں مرحوم کی زندگی درحقیقت اس مقولہ کی عملی تشریح ہے، ان کی زندگی میں خوش حالی و تنعم کے دور بھی گذرے ہیں، پھر فلاکت و افلاس کے خوفناک دن بھی آئے ہیں مگر تم دیکھو گے کہ اس بلند حوصلہ انسان نے نیکی و نفع رسانی خلائق کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا ؎

بایں رواق زبرجد نوشتہ اند بزر   کہ جز نکوئی اہل کرم نخواہد ماند

خاندان

خدا بخش خاں مرحوم نسبی تفاخر کو پسند نہیں کرتے تھے مگر یہ واقعہ ہے کہ ان کا خاندان علمی و ادبی ذوق کے لئے ہمیشہ

خان بہادر خدا بخش خاں - مرحوم وکیل سی - آئی - ای - بانی اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ۔

SPECIAL PRESS CAL

ممتاز رہا ہے، ان کے والد محمد بخش اپنے زمانہ کے ایک ممتاز وکیل تھے، قلمی کتابوں کے جمع کرنے کا غیر معمولی ذوق رکھتے تھے، فارسی زبان میں کافی دستگاہ حاصل تھی، عربی سے بھی ناآشنا نہ تھے، انہوں نے اپنے خاندانی حالات کے متعلق ایک "بیاض" لکھی ہے، اس بیاض کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ مشرقی میں موجود ہے، اسمیں وہ اپنا نسب نامہ اس طرح درج فرماتے ہیں۔

"نسب نامۂ بندہ محمد بخش خاں این است کہ بندہ ولد جناب علی بخش مرحوم ابن شیخ رمضان علی ابن شیخ محمد باقر ابن قاضی شیخ ہبۃ اللہ مرحوم مغفور صدیقی نسباً و دہلی وطناً از دہلی آمدہ اولا بمقام او کھی ضلع سارن متیم شدند الخ"

اس نسب نامہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا بخش خاں مرحوم کے مورث اعلیٰ قاضی شیخ ہبۃ اللہ نسباً صدیقی تھے اور دہلی سے ترک وطن کرکے سب سے پہلے صوبۂ بہار تشریف لائے اور مقام او کھی ضلع سارن میں متیم ہوئے، سر جدو ناتھ سرکار اپنی انگریزی تصنیف "اسٹڈیز ان مغل انڈیا" میں لکھتے ہیں کہ یہ قاضی ہبۃ اللہ وہی ہیں جو سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے حکم سے علمائے کرام کے ساتھ فتاوی عالمگیری کی تدوین پر مامور ہوئے تھے مگر مسٹر صلاح الدین مرحوم اپنی انگریزی تالیف "My Father: His Life and Reminiscences" میں بجا طور پر اس خیال کی تردید فرماتے ہیں، تاریخی حیثیت سے اس کے متعلق کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔

ولادت اور تعلیم و تربیت

خدا بخش خاں مرحوم ۲ راگست ۱۸۴۲ء میں بمقام چھپرہ تولد پذیر ہوئے، پیدائش کے تھوڑے ہی دنوں بعد ان کا خاندان بانکی پور منتقل ہوگیا، یہاں والد بزرگوار کی نگرانی میں ان کی تعلیم و تربیت شروع ہوئی، عام دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر ۱۸۵۴ء میں مسٹر ٹراورس کے مشورہ سے جو اسوقت پٹنہ میں ڈسٹرکٹ جج کے عہدہ پر فائز تھے پٹنہ ہائی اسکول میں داخل کئے گئے، ۱۸۵۹ء میں جبکہ غدر کی ہنگامہ خیزی نے پٹنہ ہائی اسکول کو صفحۂ ہستی سے معدوم کر دیا تو ہمارا یہ جوان ہمت طالب العلم تکمیل تعلیم کے خیال سے راہی کلکتہ ہوا، یہ وہ زمانہ تھا کہ اسوقت کلکتہ اور پٹنہ کے درمیان ریلوے کا سلسلہ قائم نہیں ہوا تھا، موجودہ وسائل سفر کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھے، غرض مصائب و گرانباری مصارف کے لحاظ سے اسوقت تک "سفر صورت سقر دارد" کا مقولہ بالکل صحیح تھا لیکن خدا بخش خاں مرحوم کے دلمیں قدرت نے تحصیل علم کا غیر معمولی جذبہ ودیعت کیا تھا، شوق کامل نے رہبری کی اور عزم راسخ نے بالآخر انہیں کلکتہ پہونچایا۔ وہاں نواب امیر علی خاں نے حرم علم کے اس حاجی کو شفقت و محبت کے ساتھ اپنے گھر میں جگہ دی، اور سہ سالہ سعی پیہم کے بعد ۱۸۶۱ء میں انہوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس کی سند حاصل کی، دل کا تقاضا تھا کہ وادی علم کی رہ نوردی ابھی منقطع نہ ہو کر کلکتہ کی ناموافق آب و ہوا نے آگے بڑھنے کی اجازت نہ دی، بانکی پور واپس آئے اور وکالت کی سند حاصل کرنے کے لئے لا کلاس کی شرکت اختیار کی لیکن ایک آزادی

ہد وبے فکری کا زمانہ تمام ہو چکا تھا، شفیق باپ کے قوائے دماغی و عملی مضمحل ہونے لگے اور رفتہ رفتہ تندرستی ایسی خراب ہوئی کہ بالآخر پیشۂ وکالت سے معذور ہو گئے، چونکہ آمدنی کا اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا اسلئے بوڑھے باپ کی بیکاری سے پورے خاندان کی کفالت کا بارگراں نوجوان خدا بخش کے سر پر آ پڑا۔ اب ایک طرف لا کلاس کی حاضری تھی اور دوسری طرف سارے کنبہ کی پرورش کے لئے روپیہ کمانے کی فکر، ہمارے اس اولوالعزم نوجوان نے غیر معمولی تندہی، قابلِ تقلید ثبات و استقلال اور صبر آزما تحمل کے ساتھ کشمکشِ حیات کی اس پہلی وادی کو طے کرنا شروع کیا، اسی زمانہ میں انہوں نے نائب منصفی کے لئے درخواست دی مگر ناکام رہے پھر ڈسٹرکٹ جج کی پیشکاری کے لئے امیدوار ہوئے، اسمیں کامیابی ہوئی مگر ڈسٹرکٹ جج مسٹر لٹور سے ناچاقی ہو جانے کے باعث اسے چھوڑنا پڑا، اس کے بعد ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول کا عہدہ ملا مگر بہت جلدی اس سے بھی دست بردار ہونا پڑا، غرض ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۸ء تک گرداب مصیبت میں گرفتار رہے، ہر طرف سے ناکامی و نامرادی کا نرغہ تھا مگر آلام و مصائب حوصلہ شکنی کی بجائے ازدیادِ ہمت کا باعث ثابت ہوئے، وہ عرصۂ حیات کے تمام شدائد و عوائق کا مقابلہ کرتے ہوئے مردانہ وار آگے بڑھتے رہے، وہ اپنی خوشحالی کے زمانہ میں جب کبھی اس دورِ مصیبت کو، اسی عہدِ حرماں نصیبی کو، اور اس دماغی ہیجان کے زمانہ کو یاد کرتے تو آنکھیں پرنم ہو جاتیں، بہرکیف یہ مصیبت کے دن ختم ہونے والے تھے ختم ہو گئے۔

وکالت

۱۸۶۸ء میں انہوں نے وکالت شروع کی، اس پیشۂ وکالت سے ان کے صحیفۂ حیات میں دفعتہً خوش قسمتی کا ایک نیا اور درخشاں باب کھل گیا، صرف دو سال کی قلیل مدت میں وہ پٹنہ کے نامی وکلا میں شمار کئے جانے لگے، ان کی یہ کامیابی غیر متوقع نہ تھی، ان کے والد محمد بخش پٹنہ بار کے نامی و گرامی وکلا میں تھے، صالح فرزند کو لائق باپ کی پوری اہلیت و ذہانت وراثت میں ملی تھی، ایک کامیاب وکیل کے لئے جن اوصاف کی ضرورت تھی انمیں وہ تقریباً سب کے سب بدرجہ اتم موجود تھے، غیر معمولی ذہانت، حاضر جوابی کے مخصوص ملکہ، عدیم النظیر قوت حافظہ، گرفت واقعات کی عجیب و غریب قدرت اور بے مثل قوت بحث نے بالآخر انہیں آسمان وکالت کا مہر درخشاں ثابت کیا، خوش قسمتی ان پر مسکرائی، زر و جواہر کا بادل امنڈ پڑا اور عیش و تنعم کی بادبہاری سے وہ جسقدر لذت اندوز ہو سکے لذت اندوز ہوئے، اس دورِ اقبال میں ملک و قوم کی خدمت کا بھی کافی موقع ہاتھ آیا، ۱۸۷۷ء میں انہوں نے اسکول کمیٹی کے سلسلہ میں جو خدمت انجام دی اسکے صلہ میں حکومت کی طرف سے ایک اعزازی صداقت نامہ عطا ہوا، پھر جب لارڈ رپن نے لوکل سلف گورنمنٹ باڈیز کی بنیاد ڈالی تو پٹنہ میونسپلٹی اور پٹنہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے وہ پہلے چیرمین مقرر ہوئے اسکے بعد ۱۸۸۰ء میں پٹنہ کے سرکاری وکیل بنائے گئے اور اسی سال خان بہادر کے خطاب سے مشرف ہوئے، ۱۸۹۱ء میں خود انہوں نے کتب خانہ مشرقی کی بنیاد ڈالی، قومی خدمات کے سلسلہ میں انشاء اللہ اس کتب خانہ کا تفصیلی تذکرہ آئیگا۔

حیدرآباد کی ملازمت

۱۸۹۵ء میں نظام حیدرآباد نے تین سال کے لئے انہیں اپنی ریاست میں چیف جسٹس کا عہدہ عطا کیا، دوران قیام حیدرآباد میں انہوں نے اپنے کتب خانہ کے لئے مخطوطات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ فراہم کیا۔

علالت

۱۸۹۸ء میں حیدرآباد سے واپس آکر انہوں نے پھر وکالت شروع کی مگر فالج کے ایک ناگہانی حملہ نے ازکار رفتہ بنا دیا۔ ب اقبال کے بعد ادبار و فلاکت نے پھر اپنی منحوس صورت دیکھائی مگر قومی و ملکی خدمات کے صلہ میں حکومت ہند نے دستگیری کے لئے ہاتھ بڑھایا ۱۹۰۳ء میں سی۔ آئی۔ ای کا معزز خطاب ملا اور مبلغ دوسو روپیہ ماہانہ مشاہرہ پر کتب خانہ کی نظامت تفویض ہوئی، بزادائے قرض کے لئے مبلغ آٹھ ہزار روپیہ کا یکمشت عطیہ مرحمت ہوا۔

علمی مشغلہ

پیشہ وکالت کی غیر معمولی مصروفیت کے باوجود علمی مشاغل سے کبھی غافل نہیں رہے، کچہری سے آتے ہی کھانا کھاتے در تھوڑی استراحت کے بعد اپنے کتب خانہ میں عزلت نشیں ہو جاتے اور کتب بینی، مضمون نویسی یا ذی علم احباب سے علمی و مذہبی مباحث پر گفتگو کرنے میں اپنا وقت صرف فرماتے، انہیں فارسی زبان میں غیر معمولی دستگاہ حاصل تھی، عربی میں بھی گونہ استعداد رکھتے تھے خصوصًا اشعار اس کثرت سے یاد تھے کہ وہ عربی و فارسی اشعار گھنٹوں زبانی پڑھ سکتے تھے، فارسی میں دیوان حافظ اور مثنوی مولانا روم سے غیر معمولی شغف تھا، انہیں وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے اور مذہبی پابندی کے ساتھ روزانہ تلاوت فرماتے تھے، عام ہندوستانی فارسی دانوں کے برخلاف انہیں فارسی تحریر پر بھی کافی قدرت حاصل تھی، بے تکان لکھتے اور ایسی لکھتے کہ اسمیں اہل زبان کی شان نظر آتی۔ ان کی مشہور آفاق فارسی تصنیف "محبوب الالباب" کے بعض حصے اس دعویٰ کی تائید میں پیش کئے جاسکتے ہیں، یہ درحقیقت کتب خانہ مشرقی کے عربی و فارسی مخطوطات کی ایک تفصیلی فہرست ہے، اسمیں مصنفین کے حالات دئے گئے ہیں اور ان کی تصنیفات پر عالمانہ انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے، خدا بخش مرحوم کو اپنی اس تصنیف پر بے انتہا ناز تھا، پہلی جلد تقریبًا پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے اور چھپ کر شائع ہو گئی ہے۔ افسوس ہے کہ وہ اس کا بقیہ حصہ مکمل نہ فرما سکے، اس محبوب الالباب کے علاوہ انہوں نے لارڈ بیکن کے مضامین کا انگریزی سے فارسی میں ترجمہ کیا ہے، پروفیسر براؤن سے مکاتبت و مراسلت بھی فارسی ہی میں ہوا کرتی تھی۔

اگر وہ ایک طرف عربی و فارسی کے ذی استعداد عالم تھے تو دوسری طرف انگریزی ادب سے بھی ناآشنا نہ تھے۔ انگریزی شعرا میں سب سے زیادہ بیرن (Byron) کو پسند کرتے تھے مگر شیلے (Shelley) کے سحر آگیں تغزل، کیٹس (Keats)

کے اعلیٰ تخیل، ورڈسورتھ (Wordsworth) کی شیریں کلامی اور نکتہ سنجی، ٹینیسن (Tennyson) کی دلپسند بندش اور سوئنبرن (Swinburne) کی فلسفہ آمیز جادو طرازی سے بے خبر نہ تھے، متاخر الذکر کو وہ زور کلام میں قاآنی سے تشبیہ دیا کرتے تھے، گبن (Gibbon) کو وہ صرف پسند ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اس سے گونہ محبت رکھتے تھے، اس نے عروج اسلام کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے وہ انہیں زبانی یاد تھی، انجمن اسلامیہ پٹنہ، کے خطبۂ صدارت میں اس کے متعلق انہوں نے ایک مرتبہ اس طرح اپنا خیال ظاہر فرمایا تھا۔

"گبن نے آیات کریمہ کے ترجمہ کو پڑھ کر یہ عبارت اپنی تاریخ میں لکھی ہے جسکا ترجمہ یہ ہے:۔ رسول کی سنے پرستش (اصنام) اشخاص اور سیارہ کو اس معقول دلیل پر ممتنع کر دیا کہ جسکو عروج ہے اسکو زوال بھی ہے، جس شخص کے لئے طلوع ہے اوس کے لئے غروب بھی ضروری ہے، ہر متولد کے لئے موت ساتھ لگی ہوتی ہے اور ہر انقلاب پذیر چیز کا مادہ انحطاط و فنا توام ہے"، اس کے بعد وہ یہ لکھتا ہے کہ مذہب اسلام وہ مذہب ہے کہ جسکو ایک موحد فلسفی بے تکلف قبول کر سکتا ہے"۔

مل (Mill) کی خود نوشتہ سرگذشت، گوئٹے (Goethe) کی صداقت و شاعری اور بینو نیوٹو سلینی (Benevenuto Cellini) کی آٹو بیا گرفی کو انہوں نے مسٹر صلاح الدین مرحوم سے تمام و کمال پڑھوا کر سنا تھا، انہیں مشاہیر کے حالات و سوانح سے غیر معمولی دلچسپی تھی، سر جدو ناتھ سرکار لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ان سے مختلف علمی، ادبی اور تاریخی مسائل پر بہت دیر تک گفتگو رہی، کثرت معلومات کے لحاظ سے انہیں ایسا معلوم ہوا کہ گویا ان کے سامنے ایک بحر ناپیدا کنار موجزن ہے۔

سیاسی خیالات

سیاسی حیثیت سے وہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کو نعمت غیر مترقبہ تصور فرماتے تھے، انہیں یقین تھا، کہ اہل ملک اسوقت تک حکومت خود اختیاری کے لائق نہیں ہوئے ہیں، ایسی حالت میں اگر برطانوی حکومت کا خاتمہ ہوا تو فرقہ وارانہ منافرت، طبقۂ عوام کی جہالت اور جنگجو اقوام کی حریصانہ جنگلی شعلہ جوالہ بن کر ملک کے امن و امان کو خاک سیاہ کر دیگی، ان کا یہ دلی عقیدہ تھا کہ ملک کو نام نہاد سیاسی رہنمائی سے زیادہ اخلاقی و معاشرتی اصلاح کی ضرورت ہے، انہیں یقین تھا کہ "سوراج" اور "بائیکاٹ" کی تلقین کرنے والے ملک کو نقصان پہونچا رہے ہیں، ان کی اس معاندانہ روش سے حکمراں طبقہ ناراض ہوگا اور اسطرح ملک کی رفتار ترقی سست ہو جائیگی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ صف در صف خوش بیان مقررین کی آتش بیانی ملک کو اسقدر فائدہ نہیں پہونچا سکتی جسقدر وہ حکومت وقت کی ہمدردانہ توجہ سے

مستفید ہوسکتا ہے، وہ انگریزوں کی فرض شناسی، بردباری، ضبط نفس، استقلال اور دوسرے عمدہ صفات کی دل سے قدر کرتے تھے، انہیں برطانوی عدل و انصاف پر بہت زیادہ بھروسہ تھا، مطالبۂ حقوق کے لئے آئینی طرز احتجاج کو پسند کرتے تھے، انہیں اُمید تھی کہ اگر بعنوان شائستہ حکومت کو اصلاح کی طرف توجہ دلائی جائے تو وہ ضرور خیال کریگی، انہیں یقین تھا کہ ملک میں برطانوی حکومت کے خلاف کچھ بہت زیادہ ناراضی موجود نہیں ہے، بم کے واقعات اور بنگال کی مخفی انارکیکل سوسائٹی کو چند نوجوانوں کی شوریدہ سری اور تلاطم دماغی تصور فرماتے تھے لیکن انہیں خوف تھا کہ اگر حکومت اور رعایا کے درمیان غلط فہمی کا سلسلہ زیادہ عرصہ تک جاری رہا تو پھر اسکا ازالہ دشوار ہوگا۔ جنگ روس و جاپان کے واقعات کو وہ نہایت ہی دلچسپی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے لیکن انہیں اس سے اختلاف تھا کہ جاپان کی کامیابی ہندوستانی نوجوانوں کے خیالات پر کچھ بہت زیادہ اثر انداز ہوئی ہے، وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانی جذبۂ حریت و تمرد برطانوی طرز حکومت کا نتیجہ ہے، اس نے خود ہی اس ملک میں یورپین تہذیب و تمدن کی تخم ریزی کی ہے، جمہوریت پسندی اس تمدن کا جزو لاینفک ہے، اس بنا پر ضروری ہے کہ دائرۂ تعلیم کی توسیع کے ساتھ حقوق و اختیارات کے تفویض میں بھی فراخدلی کا ثبوت دیا جائے۔

مذہبی عقائد

خدابخش خاں مرحوم ایک راسخ العقیدہ اور پابند شریعت مسلمان تھے، نماز پنجگانہ کبھی فوت نہیں ہوئی، نماز صبح کے بعد خود بھی معمولاً تھوڑی دیر تلاوت قرآن فرماتے اور بچوں کو بھی ہمیشہ تلاوت قرآن کی تاکید کرتے، ان کے دل میں قرآن پاک کی جو غیر معمولی عظمت و وقعت تھی اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ جب صلاح الدین مرحوم بغرض تحصیل علم راہی انگلینڈ ہوئے تو شفیق باپ کے گرانقدر تحائف میں کلام مجید کا ایک نفیس نسخہ بھی تھا، اس کے ایک ورق پر حسب ذیل عبارت انہوں نے اپنے ہاتھ سے تحریر فرمائی تھی :-

"بروز روانگی ولایت بغرض تلاوت فرزند عزیز مذبور بخشیدم۔ خداوند تعالیٰ ببرکت این مصحف شریف فرزند مذکور را در امن خود نگاه دارد و بسلامتی ایمان فائز المرام بایں حقیر ملحق سازد۔ حررہ خدابخش عفی عنہ المرقوم تاریخ ۱۴ اپریل ۱۸۹۳ء"

ایک سچے مومن کی طرح ان کا دل ہمیشہ خوف خدا سے لرزاں و ترساں رہتا اور وہ اکثر انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ حسب ذیل رباعی وردِ زبان رکھتے ؎

ای مطلع آفتاب ذات احدی — صبح ازلی چراغ شام ابدی
کس نیست بجز تو دستگیرے ما — یا ختم رسل خذ بیدی خذ بیدی

رسول اور آل رسول کی محبت سے ان کا خانۂ دل معمور تھا، نعتیہ غزلیں نہایت کثرت سے یاد تھیں، اور انہیں اکثر عالم وجد میں پڑھتے اور کیف بیخودی سے لذت اندوز ہوتے مگر اس سلسلہ میں جو بدعات اختراع کی گئی ہیں ان سے قطعاً متنفر تھے، عظیم آباد کے محرم کو اپنی عظمت وشوکت کے لحاظ سے غیر معمولی شہرت حاصل ہے، دسویں محرم کو شہر میں اطراف واکناف سے تماشہ بینوں کی تعداد کثیر مجتمع ہو جاتی ہے مگر خدابخش خاں مرحوم نے کبھی اپنے بچوں کو محرم جلوس کے دیکھنے کی اجازت نہ دی، ان کا خیال تھا کہ تاریخ اسلام کے اس سب سے بڑے روح فرسا واقعہ کو یوم جشن بنانا اور اس کا سوانگ نکالنا نہ صرف حماقت بلکہ بہت بڑی بے ادبی اور گستاخی ہے، وہ روز عموماً تلاوت قرآن اور دوسری مذہبی کتابوں کے پڑھنے میں مشغول رہتے، انہیں زیارت حرمین کا بڑا اشتیاق تھا مگر افسوس ہے کہ ان کا یہ شوق پورا نہ ہو سکا۔

خدمت اسلام کا جذبہ

مستشرقین یورپ کی طرف سے اسلام اور تاریخ اسلام پر جو معاندانہ حملے ہوتے رہتے ہیں ان سے خدابخش خاں مرحوم کو نہایت تکلیف پہونچتی تھی، وہ فرمایا کرتے تھے کہ یورپین اہل قلم مشرقی ممالک اور مشرقی اقوام کے دینی جذبات اور مختلف المقام اطوار وخصائل کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے، مغرب میں مذہب جزو معاشرت ہے لیکن مشرق میں جزو حیات ہے، ایک مشرقی کے دل ودماغ پر مذہب کو جو اقتدار حاصل ہے ایک مغربی اس کے سمجھنے سے قاصر ہے، مشرقی خیالات، مشرقی روایات اور مشرقی جذبات مغرب کی روانی خیالات سے بالکل جداگانہ ہیں، چنانچہ اسلام اور بانی اسلام کے متعلق یورپین مصنفین سے محض اس بنا پر غلطی ہوئی ہے کہ وہ مشرقی خیالات وجذبات کے سمجھنے سے عاجز رہے ہیں، مشرق تو مغرب سے بہت دور ہے، حقیقت یہ ہے کہ خود مغربی اقوام کے لئے بھی باہم ایک دوسرے کے قومی خصائل کا سمجھنا دشوار ہے چنانچہ بیجہاٹ (Bagehot) کہتا ہے:۔

> "قومی خصلت ایک نہایت ہی غامض اور دقیق چیز ہے، ایسے لوگوں کے سامنے جنہیں تمہاری زبان کے سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے، جن کی مجلس میں تم اپنے آپ کو اجنبی تصور کرتے ہو اور جن کے متعلق تمہارا خیال ہے کہ وہ تمہاری باتوں کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے تم اس کی صحیح نمائش سے قاصر ہو"

غلطی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ تاریخ اسلام کے مطالعہ میں اپنے ذاتی افکار وخیالات کو دخل انداز کیا جاتا ہے اور پھر اس پر توہمات باطلہ کی ایک عمارت کھڑی کر لی جاتی ہے، یہ کسقدر افسوسناک امر ہے کہ وان کریمر (von Kremer) جیسا لائق مصنف عربوں کے قبول اسلام کی وجہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ دور اول کے جنگجو اسلام نے انہیں بیشمار مال غنیمت کی امید

دلائی تھی، اسپلاح ڈاکٹر گولڈ زیہر (Goldziher) جیسا فاضل اہل قلم محض اس بنا پر کہ بائبل اور اسلامی روایات میں جا بجا توافق پایا جاتا ہے یہ رائے قائم کی ہے کہ اسلام میں جسقدر اچھی باتیں ہیں وہ تمام تر نصرانیت سے ماخوذ ہیں۔ لیکن اسے یاد نہیں رہا کہ عرب میں جس قسم کی نصرانیت پھیلی ہوئی تھی اسکی حالت نہایت زبون سی چنانچہ ڈیونٹش (Deutsch) کہتا ہے:۔

"اس زمانہ میں یہ ایک عام طریقہ ہو گیا ہے کہ اسلام میں جس قسم کی کوئی خوبی بھی نظر آئے اسکو عیسائیت کی طرف منسوب کر دیا جائے لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ نظریہ ایماندارانہ تحقیق پر مبنی نہیں ہے کیونکہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں عرب کی عیسائیت نہایت ہی ناگفتہ بہ حالت میں تھی"

مذکورہ بالا وجوہ و اسباب کی بنا پر خدا بخش خاں مرحوم کی یہ دلی خواہش تھی کہ یورپین مصنفین کی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے چنانچہ جب مسٹر صلاح الدین مرحوم بغرض تکمیل تعلیم راہی انگلینڈ ہوئے تو دیندار باپ کی سب سے بڑی فرمائش یہ تھی کہ وہ جرمن اور فرینچ پڑھ کر اسلامی نقطۂ نگاہ سے اسلام کی ایک مکمل تاریخ مرتب کریں۔

مذہبی رواداری

اگرچہ خدا بخش خاں مرحوم اسلام کے ایک سچے فدائی تھے اور اسکو مذاہب عالم میں سب سے بہتر اور مکمل خیال فرماتے تھے تاہم انہیں اس سے اختلاف تھا کہ جنت صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے، یہ ان کے تصور سے باہر تھا کہ خدائے پاک جو عدل ورحم کے اوصاف سے متصف ہے محض اسلئے بنی نوع انسان کے ایک بڑے حصہ کو واصل جہنم کریگا کہ اس نے اسکی پرستش کیلئے اسلام کے مقررہ طرز عبادت سے انحراف کیا، وہ معتقد تھے کہ نیکی اور عبادت الٰہی خواہ کسی رنگ روپ میں ہو کبھی ضائع نہیں جائیگی اس سلسلہ میں وہ اکثر سنائی، درد اور غالب کے حسب ذیل اشعار بطور استدلال پڑھا کرتے ؎

سخن کز بہر دین گوئی چہ عبرانی چہ سریانی
مکان کز بہر حق جوئی چہ جابلقا چہ جابلسا

شیخ کعبہ ہو کے پہونچا ہم کنشت دل میں ہیں
درد منزل ایک تھی تک راہ ہی کا پھیر تھا

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

مذہبی مباحث میں نہایت ہی بردباری سے کام لیتے تھے، ۱۸۹۴ء میں جب مسٹر صلاح الدین مرحوم تعطیل گرما بسر کرنے کے لئے انگلینڈ سے ہندوستان آئے تو ان سے اکثر مذہبی گفتگو رہتی، یورپ کے ملحدانہ ماحول نے نوجوان فرزند کے خیالات

میں بڑی تبدیلی پیدا کر دی تھی، دیندار باپ کو اس سے تکلیف ضرور پہونچی مگر چین برجبیں ہونے کی بجائے انہیں ہدایت کی کہ انگریزی میں سر ولیم میور کی "لائف آف محمد" کو ئیلے کی "لائف آف محمد" اور ڈاڈ کی "بذاہا، کرائسٹ اینڈ محمد" اور عربی میں ابن ہشام کی سیرت، قاضی عیاض کی کتاب الشفا، الملا، الاربلی کی وسیلۃ المتعبدین اور ابن قیم کی زاد المعاد پڑھ کر اپنے خیالات کی اصلاح کریں۔

اس مذہبی رواداری کا اثر یہ تھا کہ غیر مسلم احباب سے ان کے تعلقات نہایت ہی مخلصانہ تھے، خصوصاً ہندؤں کی طرف میلان طبع بہت زیادہ تھا، وہ کہا کرتے تھے کہ ان کے جسم میں برہمنی خون کی آمیزش ہے، واقعہ یہ ہے کہ ان کے والد محمد بخش مرحوم کو بچپن میں ایک برہمنی عورت نے دودھ پلایا تھا، چنانچہ اس مادر مرضعہ کے جذبات مذہبی کا احترام ملحوظ رکھنے کے لئے محمد بخش مرحوم اور ان کے لائق فرزند خدابخش مرحوم گائے کے گوشت سے ہمیشہ محترز رہے۔

خدابخش خاں مرحوم نے اپنی ہر دلعزیزی سے فرقہ وارانہ منافشات مذہبی کے دور کرنے میں بارہا قیمتی مدد پہونچائی، خصوصاً ۱۸۹۳ء میں فسادات گاؤکشی کے سلسلہ میں ایسی گرانقدر خدمت انجام دی کہ بنگالہ اور بہار کے لفٹنٹ گورنر سرانٹونی مکڈانل نے انہیں شکریہ کا ایک مخصوص خط لکھا۔

قومی خدمات

عظیم آباد کے مسلم رہنماؤں میں خدابخش خاں مرحوم، قاضی رضا حسین مرحوم اور مولوی محمد حسن مرحوم کو امتیازی حیثیت حاصل تھی، ان تینوں میں باہم غیر معمولی اخلاص تھا، کم سے کم ہفتہ میں دو مرتبہ وہ ضرور باہم مجتمع ہوتے اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے متعلق تبادلۂ خیالات کرتے، یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمان انگریزی تعلیم سے متنفر تھے اور علمائے اسلام مسلمانوں کو اس سے باز رکھنے کے لئے انتہائی کوشش صرف کر رہے تھے، ان تینوں بزرگوں نے نہ صرف تندہی و جانفشانی کے ساتھ اس مخالفانہ سعی پیہم کا مقابلہ کیا بلکہ غریب مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کو اپنے خرچ سے تعلیم دلا کر شادکام و فائز المرام بنایا۔

تاسیس کتب خانۂ مشرقی

قومی خدمات کے سلسلہ میں کتب خانۂ مشرقی کی تاسیس خدابخش خاں مرحوم کا سب سے زیادہ اہم بالشان کارنامہ ہے یہ پہلے گذر چکا ہے کہ ان کا خاندان علمی و ادبی ذوق کے لئے ہمیشہ ممتاز رہا ہے، ان کے والد محمد بخش مرحوم قلمی کتابوں کے جمع کرنے کا غیر معمولی ذوق رکھتے تھے، انہوں نے حالت نزع میں اپنے لائق فرزند خدابخش خاں مرحوم کو وصیت کی کہ اگر زمانہ موقع دے تو خاندانی کتب خانہ کو ترقی دیکر رفاہ عام کے لئے وقف کر دیا جائے، سعادتمند فرزند نے بطیب خاطر و بکمال گرمجوشی مرنے والے باپ کی یہ آخری وصیت قبول کی، اسوقت قلمی کتابوں کی مجموعی تعداد پندرہ سو تھی، ان میں سے بارہ سو خود محمد بخش مرحوم کی محصولہ تھیں اور تین سو

انہیں وراثت میں ملی تھیں، خدا بخش مرحوم نے اسکو ترقی دیکر پانچ ہزار تک پہونچایا، ۱۸۹۱ء میں جبکہ مخطوطات کی مجموعی تعداد صرف تین ہزار تھیں سر الفریڈ کرانٹ (Sir Alfred Croft) کی ماتحتی میں ایک ماہر مخطوطات نے اسکی قیمت کا تخمینہ ڈہائی لاکھ روپیہ کیا تھا۔ مخطوطات کے علاوہ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی مطبوعات کا ایک معتدبہ ذخیرہ بھی فراہم کیا گیا، مطبوعات کی قیمت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ صرف انگریزی کتابوں کی مجموعی لاگت تقریباً ایک لاکھ روپیہ ہے، پھر اس گراں بہا سرمایہ کیلئے اسی ہزار روپیہ میں ایک شاندار عمارت بنوائی گئی اور ۱۸۹۱ء میں ۲۹ اکتوبر کو پورا کتب خانہ مع زمین و عمارت ایک وقف نامہ کی روسے حکومت وقت کی سرپرستی میں قوم و ملک کے حوالہ کردیا گیا، بانی کتب خانہ کی بے نفسی دیکھو کہ انہیں کتب خانہ کے نام کے ساتھ اپنے نام کی آمیزش بھی پسند نہ آئی، انہوں نے اس کا نام "اورینٹل پبلک لائبریری" رکھا مگر پبلک نے ان کے اس زاہدانہ انکسار کو قبول نہیں کیا، ان کے والدین نے انہیں عطیہ الٰہی تصور کرکے خدا بخش کے نام سے موسوم کیا تھا، اہل ہند اس کتب خانہ کو خداوندی بخشش سمجھکر "خدا بخش لائبریری" کہتی ہے، ہندوستان میں اسکو اسی نام سے شہرت ہے اور وہ ہمیشہ اسی نام سے مشہور رہیگا۔

بانی کتب خانہ کا غیر معمولی انہماک

اور

تائید غیبی کی بشارت

خدا بخش خاں مرحوم کو اس کتب خانہ میں جو غیر معمولی انہماک تھا اس کے اندازہ کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی ساری کائنات اور تمام عمر کی کمائی اس میں صرف کردی، واقعہ یہ ہے کہ انہیں غیر معمولی دھن تھی، انتہائی محویت تھی اور ایک ایسی وارفتگی تھی جو آخری لمحہ حیات تک قائم رہی، سفر ہو یا حضر، خلوت ہو یا جلوت، عالم خواب ہو یا عالم بیداری وہ ہر وقت اور ہمیشہ کتب خانہ کے افکار میں غلطاں و پیچاں رہتے، رات کو خواب بھی دیکھتے تو کتب خانہ ہی سامنے ہوتا، ۱۸۷۶ء میں جبکہ والد کی وفات کے بعد انہوں نے کتابوں کے جمع کرنے کا کام شروع کیا تو پہلے قلمی کتابیں نہایت ہی مختصر تعداد میں دستیاب ہوئی تھیں، ایک مرتبہ شب کے وقت انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے ہیں اور فرمارہے ہیں "اگر تم قلمی کتابوں کے متلاشی ہو تو ہمارے ساتھ آؤ"، وہ ان کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں اور ایک نہایت ہی شاندار عمارت کے پھاٹک پر پہونچکر رک جاتے ہیں، ان کے رہنما اندر داخل ہوتے ہیں اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آکر انہیں ایک نہایت ہی وسیع دالان میں لے جاتے ہیں، وسط دالان میں ایک

نقاب پوش بزرگ تشریف فرما ہیں اور چاروں طرف ان کے احباب کا مجمع ہے، ان کے رہنما نقاب پوش سے بکمال ادب عرض کرتے ہیں "حضرت! یہ شخص قلمی کتابوں کے لئے آیا ہے" حکم ہوتا ہے "کتابیں دیدی جائیں" فرط انبساط میں آنکھیں کھل جاتی ہیں، اب نہ وہ عظیم الشان عمارت ہے، نہ وہ نقاب پوش بزرگ ہیں اور نہ وہ مجمع احباب ہے مگر اس خواب کے بعد ہی اطراف واکناف عالم سے مخطوطات کا سیلاب عظیم اُمنڈا آتا ہے اور پٹنہ کی سرزمین جواہر گرانمایہ سے مالامال ہو جاتی ہے، خدا بخش خاں مرحوم کا خیال تھا کہ وہ نقاب پوش بزرگ خود حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور مجمع احباب میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے۔

کتب خانہ کی موجودہ عمارت مکمل و مرتب ہو جانے کے بعد وہ پھر ایک مرتبہ خواب میں دیکھتے ہیں کہ کتب خانہ کے سامنے سڑک پر ایک جم غفیر مجتمع ہے، گھر سے نکل کر کتب خانہ کے دروازہ پر آتے ہیں، لوگ انہیں دیکھکر تعجب سے کہتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے کتب خانہ کا معائنہ فرمارہے ہیں اور تم یہاں کھڑے ہو!" وہ بسرعت تمام مخطوطات کے کمرہ میں داخل ہو کر دیکھتے ہیں کہ آپ تشریف لے جاچکے ہیں مگر حدیث کی دو قلمی کتابیں میز پر کھلی پڑی ہیں۔ محرومی زیارت پر دفور تاسف سے آنکھیں کھل جاتی ہیں، اب نہ وہ مخطوطات کا کمرہ ہے اور نہ سڑک پر لوگوں کا ہجوم ہے، اس خواب کے بعد خدا بخش خاں مرحوم حدیث کی ان دونوں کتابوں کو نہایت عزیز رکھتے تھے، خیال تھا کہ شاید حضرت نے انہیں ملاحظہ فرمایا ہے، چنانچہ ان پر انہوں نے اپنے ہاتھ سے یہ لکھدیا ہے کہ انہیں کبھی اور کسی حالت میں کتب خانہ سے باہر جانے نہ دیا جائے گو اس ممانعت کی کوئی وجہ نہیں لکھی ہے۔

خدا بخش خاں مرحوم کو کتب خانہ سے غیر معمولی محبت تھی، ان کی عمر کا زیادہ حصہ کتب خانہ کی چار دیواری اور کتابوں کی رفاقت میں بسر ہوا، انہیں ہر کتاب کا علیہ، اسکی قیمت اور اسکی جگہ زبانی یاد تھی، وفات سے صرف دو دن پہلے جبکہ مرض نہایت ہی اشتداد پر تھا اور حواس خمسہ جواب دے رہے تھے انہوں نے صحیح طور پر یہ بتا دیا کہ سنن ابی داؤد کا قلمی نسخہ فلاں الماری کے فلاں خانہ میں فلاں کتاب کے بعد ہے۔

ہندوستان کے اسلامی کتب خانے

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ شاہان مغلیہ کو علم و ادب کی سرپرستی میں بغداد، قاہرہ اور قرطبہ کے حکمرانوں کی طرح عظمت وشہرت حاصل نہیں ہے تاہم یہ واقعہ ہے کہ جب ان کی بربریت کا دور ختم ہوا اور چنگیز خاں کی اولاد حلقہ بگوش اسلام ہوئی تو انہوں نے علما کی ہمت افزائی میں نہایت ہی نمایاں حصہ لیا، نصیر الدین طوسی، قطب الدین شیرازی، سعد الدین تفتازانی اور دوسرے بہت سے علما سی مغلیہ دور حکومت میں آسمان علم پر مہر درخشاں ہو کر چمکے اور مغل بادشاہوں کی فیاضیوں سے مالامال ہوئے ہندوستان کی مغلیہ سلطنت بھی علم و ہنر کی سرپرستی میں ہمیشہ پیش پیش رہی، بانی سلطنت ظہیر الدین بابر ترکی اور فارسی میں یدطولیٰ رکھتا تھا۔

اس کے ترکی دیوان کا ایک نایاب نسخہ نواب رامپور کے کتب خانہ میں موجود ہے، ہمایون بھی اپنی پریشانیوں کے باوجود علماء کی قدرافزائی میں کوتاہ دست نہ تھا، اکبر نے اگرچہ خود تعلیم نہیں پائی تھی تاہم اگر اسکی علم پروری دیکھنا ہو تو آئین اکبری کے آخری ابواب پڑھو، جہانگیر اپنے تزک میں لکھتا ہے کہ اس نے یوسف وزلیخا کا ایک نسخہ بیس ہزار روپیہ میں خرید ا تھا، صرف اسی ایک واقعہ سے تم اسکی علمی قدردانی کا اندازہ کرو، کتب خانہ مشرقی نیز ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں ایسی متعدد کتابیں موجود ہیں جن پر شاہ جہاں نے چودہ سال کی عمر میں دستخط کئے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بدو طفولیت سے بادہ علم میں سرشار تھا، اورنگ زیب خود ذی علم تھا اور علماء کو محبوب رکھتا تھا، اسکے رقعات میں علمی قدردانی کی متعدد شہادتیں موجود ہیں، غرض شاہان مغلیہ کی نوازش وکرم گستری سے دہلی علم وہنر کا مرکز بن گئی تھی، دہلی کے شہنشاہی کتب خانہ میں خطاطی ومصوری کے بہترین نمونے تیار کئے گئے، اور چونکہ اندنوں وسط ایشیا، ایران اور عرب میں طوائف الملوکی اور خونریز لڑائیوں کا غیر مختتم سلسلہ قائم تھا اسلئے وہاں کے علمی خزانے بھی دہلی منتقل ہوگئے پھر دکن میں قطبشاہی اور عادل شاہی حکومتیں نیست ونابود ہوئیں تو وہاں کے کتب خانے بھی دہلی کے شہنشاہی کتب خانہ سے ملحق ہوگئے، امراء واہالیان منصب کے کتب خانے بھی اکثر ضبط ہوکر شہنشاہی کتب خانہ سے ضم ہوجاتے تھے، چنانچہ دربار اکبری کے ملک الشعراء فیضی نے وفات پائی تو ان کی ۴۳۰۰ کتابیں شہنشاہی کتب خانہ میں منتقل ہوگئیں، خلاصہ یہ ہے کہ دہلی کا شہنشاہی کتب خانہ اپنی عظمت وندرت کے لحاظ سے عدیم النظیر تھا، اٹھارہویں صدی میں نوابان اودھ نے بھی قدردانی کا ہاتھ بڑھایا اور لکھنؤ کے کتب خانہ کو اچھی خاصی شہرت حاصل ہوئی، ریزیڈنٹ کی ایما سے مشہور جرمن مستشرق مسٹر اسپرنگر نے اس کتب خانہ کے اردو اور فارسی مخطوطات کی ایک ضخیم فہرست مرتب کی تھی، ان دونوں کتب خانوں کے علاوہ اطراف واکناف ملک میں اور بھی بہت سے کتب خانے موجود تھے مگر لکھنؤ اور دہلی کی تباہی اور غدر کی ہنگامہ آرائیوں میں مسلمانوں کے تمام قابل ذکر علمی خزانے غارتگروں کے دست تطاول سے تباہ وبرباد ہوگئے۔

کتابیں کسطرح جمع ہوئیں

غدر کے موقع پر نواب رامپور نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اسلئے لوٹ کا ایک معتدبہ حصہ انہیں دستیاب ہوا، انہوں نے انگریزی فوج میں اعلان کردیا تھا کہ جو سپاہی کتابیں لاکر دیگا اسے ہر قلمی نسخہ کے معاوضہ میں ایک روپیہ ملیگا، خدابخش خاں مرحوم نے قلمی کتابوں کے جمع کرنے کا کام بہت بعد کو شروع کیا پھر بھی ان میں اور نواب رامپور میں ایک عرصہ تک رقابت جاری رہی مگر بالآخر پٹنہ کے ایک قلیل البضاعت وکیل کا ذوق علم والی رامپور کی دولت وامارت پر غالب آیا، انہوں نے ایک عرب متجسس کتب محمد مکی کو اٹھارہ سال تک پچاس روپیہ ماہانہ مشاہرہ پر ملازم رکھا، اس نے عرب، شام، مصر اور ایران کی خاک چھان ڈالی اور عربی کی نادر ترین قلمی کتابیں لاکر ڈھیر کردیں، ہندوستان میں بھی ان کی فیاضی نے قلمی کتب فروشوں کو جوق در جوق

ان کی طرف مائل کردیا، وہ ہر کتب فروش کو جو پٹنہ آتا خواہ اس سے کچھ لیتے یا نہ لیتے دو چند ریلوے کرایہ دیا کرتے تھے، اسطرح ان کی شہرت تمام ہندوستان میں پھیلی اور ملک کے جس حصہ میں بھی کوئی قلمی نسخہ فروخت ہونے والا ہوتا وہ سب سے پہلے ان کے پاس لایا جاتا۔

عجیب و غریب اتفاقات

ایک مرتبہ کتب خانہ مشرقی کے ایک سابق جلد ساز نے نقب زنی کرکے کتب خانہ کی چند نادر ترین قلمی کتابیں چرائیں اور انہیں لاہور لے جاکر ایک کتب فروش کے حوالہ کیا، موخرالذکر نے نادانستگی میں یہ خیال کرکے کہ خدابخش خاں سے زیادہ ایسی کتابوں کا قدرداں اور کون ہے انہیں ان کے پاس بغرض فروخت پیش کیا، اسطرح چور کو سزا ملی اور حق بحقدار رسید کا مفہوم پورا ہوا۔

خدائی انصاف کا دوسرا حیرت انگیز واقعہ سنو، ایک مرتبہ پٹنہ کے ڈسٹرکٹ جج مسٹر جے بی ایلیٹ نے محمد بخش مرحوم سے قصائد کمال الدین اسمٰعیل اصفہانی کا ایک قلمی نسخہ مستعار لیا، صاحب بہادر کو کتاب بہت پسند آئی اور اسکو واپس دینے کی بجائے ایک بڑی رقم بطور قیمت دینے لگے، محمد بخش نے نہایت ہی ناگواری کے ساتھ اس تجویز سے انکار کیا مگر کرتے تو کیا کرتے، صبر کرکے خاموش ہو رہے، مسٹر ایلیٹ مخطوطات کے جمع کرنے کا غیر معمولی ذوق رکھتے تھے، انہوں نے بوڈلین لائبریری میں بہت سی کتابیں دی ہیں۔ جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہوکر پٹنہ سے جانے لگے تو انہوں نے اپنی منتخب کتابوں کو ساتھ لے جانے کے لئے ایک صندوق میں بند کیا اور بقیہ کتابوں کو ایک دوسرے صندوق میں بند کراکے ہدایت کی کہ انہیں اسیطرح سربمہر نیلام کردیا جائے مگر نوکروں کی غلطی یا خدا کی قدرت سے ردی کتابوں کا صندوق صاحب کے ساتھ چلا جاتا ہے اور منتخب کتابوں کا صندوق کوڑیوں کے مول نیلام ہو جاتا ہے، محمد بخش مرحوم اسے خریدتے ہیں اور اسمیں قصائد کمال الدین کے علاوہ اور بہت سے نادر و نایاب جواہر گرانمایہ پاتے ہیں، چنانچہ "مجالس خمسہ" کا وہ نسخہ جس پر شاہجہاں کے دستخط ہیں اسی میں ملتا ہے، خوشی سے باچھیں کھل جاتی ہیں اور فوراً ازراہ تشکر سربسجود ہو جاتے ہیں، دوسری طرف صاحب بہادر جب انگلینڈ پہونچکر کتابوں کا صندوق کھولتے ہیں تو فرط غم سے دم بخود ہو جاتے ہیں۔

ایک دن خدابخش خاں مرحوم حیدرآباد میں ہائیکورٹ سے واپس آرہے تھے، مخطوطات کے تجسس میں ان کی نگاہیں والہانہ انداز کے ساتھ دکانوں پر ادھر ادھر پڑ رہی تھیں، ایک دکان پر بوسیدہ قلمی کتابوں کا ایک انبار نظر آیا، فوراً گاڑی رکواکر اتر پڑے، اس کوڑے کو اولٹ پلٹ کرکے دیکھا اور دکاندار سے قیمت دریافت کی، اس نے کہا "حضور! اگر کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو کوڑا سمجھکر اسکو تین روپے میں دیدیتا مگر جب حضور کو اس سے دلچسپی ہے تو اسمیں یقیناً

کوئی اچھی چیز ہوگی، اب میں بیس روپے قیمت لوں گا" پورا انبار خرید کر ساتھ لے آئے، اسمیں چند نہایت ہی نادر و نایاب کتابیں نکلیں، بعد کو صرف ایک کتاب کے لئے نظام حیدر آباد کی طرف سے چار سو روپے پیش کئے گئے مگر انہوں نے دینے سے انکار کیا۔

قومی نقطۂ نظر سے کتب خانہ کی اہمیت

یورپین سیّاحوں کی یہ ایک مخصوص اور نہایت ہی پسندیدہ عادت ہے کہ وہ جہاں کہیں جاتے ہیں اپنے قومی میوزیم اور کتب خانوں کیلئے نادر مخطوطات، دلربا تصاویر اور دوسرے قیمتی تحائف فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ اس طرح سے بوڈلین لائبریری، برٹش میوزیم، انڈیا آفس لائبریری اور یورپ کے دوسرے قومی اداروں میں نوادر کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔

اٹھارہویں صدی میں جبکہ ایک طرف انگریز مدبرین اور انگریز سپاہی ہندوستان کو اپنے دائرہ اقتدار میں لانے کی کوشش کر رہے تھے تو دوسری طرف کرکپٹرک (Kirkpatric) گلیڈوین (Gladwin) فٹزپیٹرک (Fitzpatric)، جوناتھن اسکاٹ (Jonathan Scott) اور دوسرے بہت سے یورپین فاضل یہاں عربی و فارسی مخطوطات کے شکار میں مصروف تھے، ان کی کوششوں سے نوادر کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہندوستان سے یورپ منتقل ہو گیا، ہمارے غیر مستطیع تشنہ کامان علم کے لئے یہ نہایت دشوار ہے کہ وہ یورپ جا کر اپنی پیاس بجھائیں، اس بنا پر خدا بخش خاں مرحوم کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے کتب خانہ مشرقی کی تاسیس سے بڑی حد تک ہماری ایک ضرورت رفع کر دی ہے، صرف یہی نہیں بلکہ ہمارا جو سرمایہ یورپ پہنچ چکا تھا ان کی کوششوں سے اسکا ایک مختصر حصہ پھر ہندوستان واپس آگیا، چنانچہ اس کتب خانہ میں ڈی ساسی (De Sacy)، سرگور اوسلے (Sir Goreousley)، مسٹر بلاخمین (Mr. Blochmann) وغیرہم کے مملوکہ مخطوطات کی ایک کافی تعداد موجود ہے، بعض کتابوں پر فرانس کے ایک کتب خانہ کے طبلق چسپاں ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بانی کتب خانہ کا دست تعاول صرف برطانیہ عظمیٰ تک محدود نہ تھا۔

اطراف و اکناف ملک میں اب تک عربی و فارسی مخطوطات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے مگر وہ یا تو رفتہ رفتہ یورپ کے کتب خانوں میں منتقل ہو رہے ہیں یا اہل ملک کی بدمذاقی اور بے توجہی سے کیڑوں کی نذر ہوتے جاتے ہیں، خدا بخش مرحوم کی بڑی خواہش یہ تھی کہ بخیال استحفاظ و بغرض افادۂ عام اس قسم کے تمام مخطوطات کتب خانۂ مشرقی کو دیدئے جائیں، چنانچہ ان کی درخواست پر نواب ولایت علی خاں، مولوی سید عبدالمجید رئیس صدر گلی پٹنہ، سید صفدر نواب اور بعض دوسرے رؤسائے ملک کے کتب خانے منتقل ہو چکے ہیں، اسیطرح دیوان حافظ کا وہ بیش بہا نسخہ جسکو ہمایوں اور جہانگیر نے مختلف مواقع پر فال کھولنے کے لئے استعمال کیا تھا مولوی سبحان اللہ صاحب رئیس گورکھپور کا عطیہ ہے، ضرورت ہے کہ بانی کتب خانہ کی اس خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کیلئے

بیش از بیش توجہ صرف کیجائے اور ملک کے منتشر علمی سرمایہ کو پٹنہ کے مرکزی کتب خانہ میں منتقل کرکے باہر جانے سے یا کیڑوں کی نذر ہونے سے بچایا جائے۔

حکومت کی فیاضانہ سرپرستی

۱۸۸۸ء میں خدا بخش مرحوم نے ازراہ دور اندیشی کتب خانہ کو گورنمنٹ کی سرپرستی اور نگرانی میں دینے کے لئے سلسلہ جنبانی شروع کی، پٹنہ کے اوپیم ایجنٹ مسٹر کیمبل (Mr. C. ...) سے ان کے تعلقات نہایت دوستانہ تھے، ان کی تحریک پر اسی سال یا شائد دوسرے سال سر چارلس لائل نے کتب خانہ کا معائنہ فرمایا، سر چارلس عربی و فارسی کے زبردست عالم تھے، کتب خانہ کے بیش بہا نوادر نے ان کی آنکھیں کھول دیں، انہوں نے نہایت موثر الفاظ میں حکومت بنگال کو اس کتب خانہ کی سرپرستی قبول کرنے کی ترغیب دی، چنانچہ سر چارلس ایلیٹ نے سرپرستی قبول کرکے ۱۸۹۱ء میں ملک کے لئے کتب خانہ کا باضابطہ افتتاح فرمایا، پھر ۱۸۹۳ء میں سر انٹونی میکڈانل نے ملاحظہ فرماکر غیر معمولی خوشنودی کا اظہار فرمایا، اس کے بعد ۱۹۰۳ء میں مدرسہ عالیہ کے لائق انگریز پرنسپل سر ایڈورڈ ڈینسن راسی کی تحریک پر ہندوستان کے نامی دگرامی وائسرائے لارڈ کرزن نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے اسکو منتخر کیا، جسوقت وہ کتب خانہ میں داخل ہوئے تو یہ شعر ورد زبان تھا ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

اس معائنہ کی یادگار میں "لارڈ کرزن ریڈنگ ہال" کی تعمیر عمل میں آئی، پٹنہ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر کنگ کو اس کتب خانہ سے غیر معمولی دلچسپی تھی انھوں نے اسکو ترقی دینے کے لئے ایک اسکیم مرتب کی تھی مگر افسوس ہے کہ ان کے تبادلہ کے ساتھ ہی اس اسکیم کا خاتمہ ہوگیا۔

لائبریری فنڈ کے نام سے کتب خانہ کی اپنی مستقل آمدنی حسب تفصیل ذیل ہے:۔

(۱) آمدنی موضع کوسما موقوفہ میر ابو صالح مرحوم رئیس گیا	۳۰۰ روپیہ
(۲) نظام حیدرآباد کا سالانہ عطیہ	۶۰۰ روپیہ
(۳) امپیریل بنک کے حصوں کا منافع	۹۰۰ روپیہ
	۱۸۰۰ روپیہ

مصارف کتب خانہ کے لئے اٹھارہ سو روپیہ کی رقم نہایت ناکافی ہے اس بنا پر ازراہ سرپرستی حکومت کے بجٹ میں ہر سال ایک بیش قرار رقم منظور کیجاتی ہے چنانچہ سال رواں کے بجٹ میں تقریباً دس ہزار روپیہ کی منظوری ہے۔

ترتیب وتدوین فہرست

راس صاحب کی تحریک سے ۱۹۰۴ء میں ترتیب وتدوین فہرست کی ابتدا ہوئی، خان بہادر مولوی عبدالمقتدر صاحب فارسی مخطوطات کے لئے اور ڈاکٹر کمال الدین عربی مخطوطات کے لئے مقرر کئے گئے، اول الذکر نے تقریباً چوبیس سال کی مسلسل محنت وجانفشانی کے بعد ۱۹۳۰ء میں فارسی مخطوطات کی فہرست کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا، عربی مخطوطات کی فہرست نگار ڈاکٹر کمال الدین تھوڑے ہی دنوں کے بعد بغرض تکمیل تعلیم راہی انگلینڈ ہوئے، ان کے بعد ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب کا تقرر عمل میں آیا مگر فہرست کی ایک ہی جلد مرتب کرنے پائے تھے کہ وہ بھی پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے عازم یورپ ہوئے، انکے التوا کے بعد ۱۹۱۰ء میں ان کی جگہ مولوی عبدالحمید نے لی مگر مدونین کے تغیر وتبدل سے کام اسقدر پسماندہ ہو چکا تھا کہ صرف ایک آدمی سے عربی مخطوطات کی فہرست مکمل نہیں ہوسکتی تھی اس بنا پر فروری ۱۹۲۴ء میں خاکسار کا تقرر عمل میں آیا، درحقیقت یہی وہ وقت ہے کہ جب سے عربی مخطوطات کی فہرست کا کام پوری تیزی اور تندہی کے ساتھ شروع ہوا، ممکن تھا کہ عربی مخطوطات کی فہرست بھی مکمل ہوکر ارباب علم کے ہاتھوں میں پہونچ گئی ہوتی مگر حکومت کی مالی دشواریوں کے باعث فروری ۱۹۳۲ء میں خاکسار کا عہدہ معرض التوا میں آگیا، خاکسار نے اپنی ہشت سالہ مدت ملازمت میں فہرست کی چھ جلدیں مکمل کیں اور ساتویں کا ایک معتدبہ حصہ ہوچکا تھا کہ اس سے بحسرت واندوہ دستکش ہونا پڑا، چونکہ ہمارے لائق دوست مولوی عبدالحمید ہنوز سرگرم کار ہیں اسلئے اُمید ہے کہ اب بہت جلدی عربی مخطوطات کی فہرست بھی مکمل ہو جائے گی۔

عربی وفارسی مخطوطات کی مذکورہ صدر فہرست جدید طرز پر انگریزی زبان میں مرتب کی گئی ہے، اسے علمی تحقیقات و معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ سمجھنا چاہئے۔ مستشرقین یورپ اسکی تعریف میں رطب اللسان ہیں، یورپ اور امریکہ کے علمی وادبی اخبارات ورسائل نے نہایت ہی وقیع الفاظ میں اس کی مدح سرائی کی ہے اور مغربی مصنفین نے اپنی تصنیفات میں اس کے حوالے دیکر مدونین کی تفتیش وتحقیق کی داد دی ہے مگر افسوس ہے کہ ہندوستان کے ارباب علم اس سے بالکل بے خبر ہیں، اسوقت تک اس فہرست کی پچیس جلدیں چھپ کر شائع ہوچکی ہیں، جو جلدیں لندن میں چھپی ہیں ان کی قیمت فی جلد سولہ روپیہ ہے اور جو جلدیں کلکتہ میں چھپی ہیں وہ دس روپیہ فی جلد کے حساب سے فروخت ہوتی ہیں، انہیں زیادہ تر یورپ اور امریکہ کے اہل علم خریدتے ہیں، ہندوستان میں شاذ ہی اب تک کسی نے خریدا ہوا، اس فہرست کی جلدیں دنیا کے بعض ممتاز افاضل اور بڑے کتب خانوں کو مفت بھی دی جاتی ہیں۔

حکومت نے ہمیشہ بکمال فراخ حوصلگی مدونین فہرست کی عرقریزی وجانفشانی کا معاوضہ ادا کر کے اپنی قدردانی کا ثبوت دیا ہے، مولوی عبدالمقتدر صاحب کو پروونشیل پوسٹ عطا ہوا، پھر سلیکشن گریڈ میں ترقی دیگئی نیز پہلے خاں صاحب

کے خطاب سے سرفراز کئے گئے بھرخان بہادر بنائے گئے، ڈاکٹر کمال الدین اور ڈاکٹر عظیم الدین احمد کو اسٹیٹ اسکالرشپ دیا گیا، مولوی عبدالحمید صاحب کو بھی محکمۂ تعلیم میں ایک مستقل عہدہ ملا، جب خاکسار کا عہدہ معرض تخفیف میں آیا تھا تو بظاہر اس عام نوازش سے استفادہ کی امید باقی نہیں رہی تھی مگر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کی پرنسپلی ملنے کے بعد اس ناچیز کی دیرینہ خدمت بھی بالآخر سعی ناشکور نہیں رہی۔

انگریزی فہرست کے علاوہ عربی و فارسی مخطوطات کی فارسی فہرستیں بھی چار جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، ہر جلد پانچ روپیہ میں لائبریری کے دفتر سے مل سکتی ہے۔

تصاویر کی فہرست اور انگریزی کتابوں کا کیٹلاگ ملازمین کتب خانہ کی مدد سے مولوی ولی الدین خدابخش نے مرتب کیا ہے، عربی فارسی اور اردو مطبوعات کی فہرست بھی ان کے اہتمام سے چھپ رہی ہے۔

کتب خانہ کی موجودہ حالت

جنوری ۱۹۳۴ء کے زلزلے نے صوبہ بہار میں جو قیامت برپا کی اس سے کتب خانہ بھی محفوظ نہیں رہا، اسکی عظیم الشان دو منزلہ عمارت اب صرف ایک منزلہ ہو کر رہ گئی ہے، حکومت نے اسکی مرمت پر دس ہزار روپے صرف کئے ہیں مگر پبلک کے لئے دارالمطالعہ ہنوز بند ہے، اسمیں بالائی منزل کی کتابیں رکھی گئی ہیں، مسٹر صلاح الدین مرحوم کی کتابیں بے ترتیبی کے ساتھ ادھر ادھر پڑی ہیں۔ اب تک ان کے رکھنے کا انتظام نہیں ہوا ہے، کتب خانہ کے سامنے جو وسیع چمن ہے اسمیں ایک مستحکم اور عالیشان عمارت کی تعمیر زیر غور ہے، حکومت نے اس جدید عمارت کے لئے بیس ہزار روپئے کی منظوری دی ہے مگر محکمۂ تعمیرات اس کو ناکافی سمجھتا ہے، ضرورت ہے کہ جہاں تک جلدی ممکن ہو کتب خانہ کی حیثیت اور اس کی آئندہ ضروریات کو ملحوظ رکھکر ایک شاندار عمارت تیار کرا دی جائے تاکہ تشنہ کامان علم اس چشمۂ معارف سے زیادہ دنوں تک محروم نہ رہیں"۔

بانی کتب خانہ کی وفات کے وقت عربی و فارسی مخطوطات کی تعداد پانچ ہزار تھی مگر اب اسمیں معتد بہ اضافہ ہوا ہے، مسٹر صلاح الدین مرحوم کی وصیت کے مطابق ان کی ... ۳۰ کتابیں بھی اس کتب خانہ میں منتقل ہو گئی ہیں اور اسطرح عربی، فارسی، اردو اور انگریزی مطبوعات میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے، سردست تمام مخطوطات و مطبوعات کی مجموعی تعداد تقریباً چوبیس (۲۴) ہزار ہے"۔

شرائط وقف نامہ کے مطابق اس کتب خانہ کی نظامت ہمیشہ خدابخش خاں مرحوم کے خاندان میں متوارث رہیگی چنانچہ سردست مولوی ولی الدین خدابخش، بی۔ اے، بی۔ ال، اس عہدہ پر مامور ہیں، ان کے ماتحت ملازمین میں سید علی رضا صاحب اسسٹنٹ لائبریرین، حاجی محمد نواب صاحب کسٹوڈین، سید عین الحق صاحب کسٹوڈین اور شیخ صاحب دین صاحب کسٹوڈین قدامت عہد

اور حسن قدامت کے لحاظ سے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

چند انمول جواہر پارے

کتب خانہ کی ایک اجمالی سرگذشت کے بعد اب ہم قارئین کرام کو اسکے چند انمول جواہر پاروں سے روشناس کرانا چاہتے ہیں۔

عربی مخطوطات میں قرآن شریف کے نہایت ہی بیش بہا نسخے موجود ہیں، خط کوفی میں ایک حمائل ہے جو غالباً چوتھی صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے۔ اسمیں اعراب کے لئے سُرخ نقطے استعمال کئے گئے ہیں، اسکے بعد بہ لحاظ قدامت تحریر جمال الدین ابو لمجد یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا دیدہ زیب مصحف ہے، کہا جاتا ہے کہ ابن بواب (متوفی ۴۲۳ھ) خط نسخ کا موجد تھا، اس کے بعد یاقوت مستعصمی ہی وہ خطاط تھا جس نے اسکو درجۂ کمال پر پہونچایا، درحقیقت اسکی تحریر فن خطاطی کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے، ابن احمد رازی (متوفی ۱۰۰۲ھ) ہفت اقلیم میں لکھتا ہے کہ ان کے زمانہ میں یاقوت مستعصمی کی تحریر جواہرات کی طرح نادر وگراں قیمت متصور ہوئی تھی، موجودہ مصحف ۶۶۸ھ کا لکھا ہوا ہے، یاقوت مستعصمی نے ۶۹۸ھ میں وفات پائی۔

میر علی تبریزی کے ہاتھ کا ایک مصحف جو ۹۸۲ھ کا لکھا ہوا ہے ایک مرتبہ معین الملک رستم ہند میر منو کے یہاں تین ہزار روپیہ میں ہدیہ ہوا تھا، میر منو اعتماد الدولہ قمرالدین خان کے لڑکے تھے، ۱۱۶۱ھ میں اپنے والد کی جگہ پر لاہور کے گورنر بنائے گئے اور ۱۱۶۷ھ میں راہی دارالبقا ہوئے، اس نسخہ کی سحر مندانہ خطاطی، مطلا جلد اول منقش حواشی اور زراندود بین السطور دیکھکر ازمنہ ماضیہ کی صناعی پر انسان محو حیرت ہوتا ہے۔

عبدالباقی حداد فن خطاطی میں یگانۂ روزگار تھے، شاہجہاں کے عہد میں ہرات سے ہندوستان آئے اور یاقوت رقم کے خطاب سے مشرف ہوئے، تذکرۂ خوشنویسان میں بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے شہزادہ محی الدین (اورنگزیب) کی بارگاہ میں ایک مصحف، ایک سی ورقی قرآن اور صحیفۂ امام زین العابدین کا ایک نسخہ لکھکر پیش کیا تھا، یہ تینوں گراں بہا تحائف آج تک کتب خانہ مشرقی میں محفوظ ہیں، عبدالباقی حداد کے بعد ان کے تلامذہ نے ہندوستان میں فن خطاطی کو منتہائے کمال پر پہونچایا، ان کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے مصاحف اور پنجسورے اس کتب خانہ میں بکثرت موجود ہیں۔

فن تجوید میں ابوعلی الفارسی (متوفی ۳۷۷ھ) کی کتاب الحجہ فی القرآت السبعہ" عدیم الوجود سمجھی جاتی ہے اس کتاب کا ایک ناقص مگر نہایت ہی قدیم نسخہ اس کتب خانہ میں موجود ہے، اسکی قدامت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ امام تاج الدین الکندی (متوفی ۶۱۳ھ) نے اس میں درس دیا ہے اور کتاب کے آخری صفحہ پر اپنے تلامذہ کے لئے اپنے قلم سے سند سماع تحریر فرمائی ہے۔

ابو الطاہر اسمٰعیل السرقسطی (متوفی ۴۵۵ھ) کی "کتاب العنوان" فن قرأت کی نادر و نایاب تصنیف ہے، یہاں اسکا ایک نہایت قدیم نسخہ ۶۳۲ھ کا لکھا ہوا موجود ہے، اس کے کاتب عبد القوی الاناطی (متوفی ۶۴۶ھ) مصر کے علمائے کبار میں تھے، ذہبی نے طبقات القراء میں ان کا حال دیا ہے۔

فن تجوید کے اکثر نسخے نہایت ہی قدیم الخط ہیں چنانچہ ابو حیان اندلسی (متوفی ۷۴۵ھ) کی دو کتابیں عقد اللآلی اور نکت الامالی ان کے ایک شاگرد شہاب الدین احمد الابیاری کے قلم سے ۷۱۶ھ میں لکھی گئی تھیں، موخر الذکر پر مشہور محدث ابراہیم قلقشندی کے ہاتھ کی ایک تحریر بھی ہے، ابسراج ابن القاصح العذری (متوفی ۸۰۱ھ) کی "مصطلح الاشارات" ۸۰۷ھ کی لکھی ہوئی ہے۔

علم الدین سخاوی (متوفی ۶۴۳ھ) کی "الوسیلہ الی کشف العقیلہ" جو ۸۰۷ھ کی لکھی ہوئی ہے ایک عرصہ تک ملا علی قاری (متوفی ۱۰۱۴ھ) کے مصرف میں رہی، اسکے بعد خانخانان عبد الرحیم خاں کے کتب خانہ میں داخل ہوئی، پھر گردش ایام سے وارد عظیم آباد ہوئی۔

روضۃ الطرائف فی رسم المصاحف ابراہیم جعبری (متوفی ۷۳۲ھ) کی نادر و نایاب تصنیف ہے، اس کتب خانہ میں اس کا ایک نہایت ہی قدیم نسخہ یعنی ۷۳۶ھ کا لکھا ہوا موجود ہے، یہ مصنف کی نظر سے گذرا ہے، انہوں نے اس کے کاتب شہاب الدین احمد البعلی کے لئے اپنے قلم سے ایک سند سماع تحریر فرمائی ہے،

تفسیر میں جار اللہ زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) کی مشہور تصنیف الکشاف عن حقائق التنزیل کا ایک نسخہ ہے جو ۸۳۴ھ میں سلطان شاہرخ کے کتب خانہ کے لئے لکھا گیا تھا، گردش زمانہ سے وہ ملک التجار خواجۂ جہان محمود کی ملکیت میں آیا، خواجہ جہان نظام شاہ بہمنی کے وزیر اعظم اور ملا عبد الرحمٰن جامی (متوفی ۸۹۸ھ) کے معاصر تھے، ان دونوں میں باہم مکاتبت و مراسلت کا سلسلہ بھی قائم تھا، ۸۸۶ھ میں محمد شاہ ثانی کے حکم سے خواجۂ جہاں قتل کئے گئے، یہ معلوم نہیں کہ اس واقعہ کے بعد خواجۂ جہاں کا مکتب خانہ کس کے تصرف میں آیا مگر ایک نوٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۰۰۳ھ میں کشاف کا زیر بحث نسخہ ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور کے کتب خانہ میں داخل ہوا، پھر جب بیجاپور مفتوح ہوا تو اورنگ زیب کے حکم سے دہلی کے شہنشاہی کتب خانہ میں منتقل ہوا، نقش و نگار نیز فن خطاطی کے لحاظ سے یہ نسخہ قابل دید ہے۔

المجاز فی القرآن علامہ عز الدین عبد السلام (متوفی ۶۶۰ھ) کی نادر و نایاب تصنیف ہے، موجودہ نسخہ ۶۸۷ھ کا لکھا ہوا ہے، ابسراج ابوبکر محمد بن احمد السمرقندی (متوفی ۵۴۰ھ) کی شرح التاویلات فن تفسیر کی عدیم الوجود کتاب ہے، اس کتب خانہ میں جو نسخہ ہے وہ مصنف کے دوران حیات میں لکھا گیا ہے، انہوں نے اول صفحہ پر اپنے ایک شاگرد ابوبکر کاسانی (متوفی ۵۸۷ھ) کے لئے اپنے ہاتھ سے ایک سند سماع تحریر فرمائی ہے،

جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) کی مشہور تصنیف الاتقان بارہا چھپ چکی ہے مگر اسی کتب خانہ میں جو نسخہ ہے وہ اس حاظ سے قابل قدر ہے کہ وہ مصنف کے شاگرد رشید محمد بن علی الداؤدی (متوفی ۹۴۵ھ) کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہاں الاتقان کا ایک دوسرا نسخہ بھی ہے جو کشمیر میں قوام الدین خاں عالمگیر شاہی کے لئے ۱۰۸۰ھ میں لکھا گیا تھا قوام الدین خاں عباسی ثانی شاہ ایران کے امرائے دربار میں تھے، اورنگ زیب کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے اور سہ ہزاری منصب سے مشرف ہوکر مختلف عہدوں پر سرفراز رہے، انہوں نے ۱۰۹۲ھ میں داعی اجل کو لبیک کیا۔

حدیث میں خطیب بغدادی (متوفی ۴۶۳ھ) کی الکفایہ چھٹی صدی ہجری کی لکھی ہوئی ہے، سلطان صلاح الدین ایوبی کے ولی عہد شاہزادہ ابوالعباس احمد نے اسمیں درس لیا ہے۔

مشکل الحدیث ابوبکر محمد بن حسن بن فورک (متوفی ۴۰۶ھ) کی نادر و نایاب تصنیف ہے۔ موجودہ نسخہ ۶۰۶ھ کا لکھا ہوا ہے۔

مقدمہ ابن الصلاح کا ایک نسخہ ۶۳۷ھ کا لکھا ہوا ہے، خود مصنف نے اسکی تصحیح کی ہے۔

ابوالحسن علی بن احمد المقدسی (متوفی ۶۹۰ھ) کی کتاب المشیخہ عدیم الوجود سمجھی جاتی ہے، اس کتب خانہ میں اسکا ایک نہایت قدیم اور مکمل نسخہ موجود ہے۔

مغلطائی (متوفی ۷۶۲ھ) کی شرح ابن ماجہ مصنف کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، اسیطرح احمد بن علی الحنبلی (متوفی ۸۴۰ھ) کی الاربعین مورخہ ۸۳۷ھ بھی مؤلف کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

ابن حجر عسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ) کی نادر تصنیف النکت الظراف مورخہ ۸۵۷ھ عسقلانی کے شاگرد رشید علامہ ابن فہد مکی (متوفی ۸۵۸ھ) کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

الجامع الصحیح البخاری (متوفی ۲۵۶ھ) کے متعدد نسخے نہایت ہی خوشخط اور گراں قیمت ہیں، ایک نسخہ ۷۹۲ھ کا لکھا ہوا ہے، دوسرا نسخہ بھی آٹھویں صدی کا لکھا ہوا ہے، علامہ موسیٰ بن الحسین البعلی الیونینی (متوفی ۸۴۰ھ) اس کے کاتب ہیں، تیسرا نسخہ ۸۳۷ھ کا لکھا ہوا ہے اور چوتھا نسخہ بنگالہ کے دارالسلطنت "یکدلہ" میں شاہ بنگالہ نصرت الحسینی کے کتب خانہ کے لئے لکھا گیا تھا"

فقہ میں علامہ ابن ابی عصرون (متوفی ۵۸۵ھ) کی مختصر النہایہ ان کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، محی الدین النووی (متوفی ۶۷۶ھ) کی کتاب الروضہ ان کے دوران حیات یعنی ۶۶۹ھ میں لکھی گئی تھی، اسطرح علامہ ابن الرفعہ (متوفی ۷۱۰ھ) کی کفایہ التنبیہ ان کے انتقال سے دو سال پہلے لکھی گئی ہے، انہوں نے خود ہی اسکی تصحیح کی ہے۔

ابن الملقن (متوفی سنہ ۸۰۴ھ) کی نادر و نایاب تصنیف تحفۃ المحتاج کا ایک نسخہ مورخہ سنہ ۷۵۳ھ خود مؤلف کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

عقائد میں مطالع الانظار محمود اصفہانی (متوفی سنہ ۷۴۹ھ) کی نادر و نایاب تصنیف ہے' اس کا موجودہ نسخہ مورخہ سنہ ۷۴۲ھ مؤلف کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔

تصوف میں بشر الحافی (متوفی سنہ ۲۲۷ھ) کی ایک نادر الوجود تصنیف سنہ ۴۸۳ھ کی لکھی ہوئی ہے۔ بہ لحاظ کتابت یہ اس کتب خانہ کا قدیم ترین نسخہ ہے۔

عبدالرحمٰن جامی (متوفی سنہ ۸۹۸ھ) کی شرح فصوص الحکم نہایت ہی مشہور و معروف ہے مگر یہاں جو نسخہ ہے اسکو انہوں نے سنہ ۸۹۶ھ میں اپنے ہاتھ سے لکھا تھا' اسیطرح مواعظ میں علی المتقی (متوفی سنہ ۹۷۵ھ) کی جوامع الکلم ان کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

حکمت میں ابن سینا (متوفی سنہ ۴۲۸ھ) کی کتاب الاشارات کا ایک نسخہ سنہ ۵۲۰ھ کا لکھا ہوا ہے' اسیطرح ہیئت میں نصیر الدین طوسی (متوفی سنہ ۶۷۲ھ) کی معرکۃ الآرا تصنیف نہایۃ الادرک کا ایک نسخہ ہے جو مؤلف کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔

نجوم میں ابو معشر جعفر البلخی (متوفی سنہ ۲۷۲ھ) کی تصنیف المدخل الی احکام النجوم نہایت ہی نادر و نایاب سمجھی جاتی ہے' یہاں اسکا ایک قدیم نسخہ موجود ہے۔

طب میں حسین بن ابراہیم الطبری کی کتاب الحشائش' علی ابن عیسیٰ کی تذکرۃ الکحالین اور زہراوی کی کتاب التصریف کے جو نسخے ہیں ان کو بہ لحاظ ندرت و قدامت غیر معمولی شہرت حاصل ہے' اردو اور انگریزی میں ان پر مستقل مضامین لکھے گئے ہیں۔

تاریخ و سیر میں متعدد کتابیں قابل ذکر ہیں' وسیلۃ المتعبدین اور کتاب الالمام پر "بہارستان" اور "معارف" میں ہم نے مستقل مضامین لکھے ہیں' ابن حزم (متوفی سنہ ۴۵۶ھ) کی نادر و نایاب تصنیف جمہرۃ النسب پر مسٹر صلاح الدین مرحوم نے اپنی انگریزی تصنیف Contributions to the History of Islamic Civilization میں ایک تفصیلی تبصرہ سپرد قلم فرمایا ہے' بقیہ کتابوں میں ابن ابی الدم الحموی (متوفی سنہ ۶۴۲ھ) کی التاریخ الاسلامی' ابو القاسم قشیری (متوفی سنہ ۴۶۰ھ) کی کتاب المعراج' سبط ابن الجوزی (متوفی سنہ ۶۵۴ھ) کی تذکرہ خواص الامہ اور الدمیاطی (متوفی سنہ ۷۰۵ھ) کی المختصر من سیرۃ سید البشر نہایت ہی نادر و نایاب ہیں۔

اگرچہ علامہ احمد القسطلانی (متوفی سنہ ۹۲۳ھ) کی المواہب اللدنیہ بارہا چھپ چکی ہے تاہم یہاں جو نسخہ ہے وہ اس

لحاظ سے قابل قدر ہے کہ مؤلف نے ۹۸ھ میں اسکو اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔

اسماء الرجال میں ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) کے الکاشف کا نسخہ مورخہ ۷۳۲ھ مؤلف کے انتقال سے ۱۶ سال پہلے لکھا گیا ہے۔

صوفیوں کے تذکرہ میں احمد بن سلامہ (متوفی ۷۶۹ھ) کی تصنیف اختیار الرفیق عدیم الوجود متصور ہوتی ہے مگر یہاں اسکا نسخہ ۹۱۳ھ کا لکھا ہوا موجود ہے۔

حنبلی علما کے حالات میں جیسا مکمل ذخیرہ یہاں ہے شائد دنیا کے کسی کتب خانہ میں نہ ہوگا؛
ابن ابی یعلی (متوفی ۵۲۶ھ) کی طبقات الحنابلہ حضرت امام احمد بن حنبل سے شروع ہو کر ۵۱۲ھ تک منتہی ہوتی ہے، اسکا موجودہ نسخہ ۶۳۷ھ کا لکھا ہوا ہے اور علمائے کبار کے مطالعہ میں رہا ہے، اسکے بعد ابن رجب حنبلی (متوفی ۷۹۵ھ) نے اسکا ایک ضمیمہ لکھا ہے جو ۷۵۱ھ میں تمام ہوتا ہے، پھر ابن حمید حنبلی نے السحب الوابلہ علی ضرائح الحنابلہ کے نام سے اس ضمیمہ کا ایک ضمیمہ لکھا ہے جسمیں ۱۲۸۸ھ تک کے علما مذکور ہیں۔

نحو میں شرح الجمل کا ایک نسخہ ۵۷۵ھ کا لکھا ہوا ہے، ایسا ہی ابو علی الفارسی (متوفی ۳۷۷ھ) کی نادر و نایاب تصنیف الایضاح ۵۹۹ھ کی لکھی ہوئی ہے۔

ابن الجنی (متوفی ۳۹۳ھ) کی کتاب اللمع ۶۲۰ھ کی لکھی ہوئی ہے اور العکبری (متوفی ۶۱۶ھ) نے اسکی جو شرح لکھی ہے اسکا نسخہ مورخہ ۶۱۱ھ شارح کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔

تعیتہ الآمال مؤلفہ ابو جعفر احمد (متوفی ۶۹۱ھ) علم نحو کی نادر و نایاب تصنیف ہے یہاں اسکا ایک نسخہ مؤلف کی وفات سے ایک سال پہلے کا لکھا ہوا ہے۔

رضی کی شرح کافیہ کا ایک نسخہ ۸۲۲ھ کا لکھا ہوا ہے، علامہ بدرالدین عینی (متوفی ۸۵۵ھ) اس کے کاتب ہیں۔

لغت میں ابو عبداللہ محمد بن عیسی (متوفی ۶۲۰ھ) کی نادر ترین تصنیف کتاب الصفات ۶۴۸ھ کی لکھی ہوئی ہے
ایسا ہی ابو عبید احمد الھروی (متوفی ۴۰۱ھ) کی الجمع بین الغریبین کا ایک نسخہ ۶۶۷ھ کا لکھا ہوا ہے۔

ضیاء الدین ابن اثیر الجزری (متوفی ۶۳۷ھ) کی تصنیف المثل السائر علم ادب کی نہایت ہی معروف و متداول کتاب ہے مگر یہاں جو نسخہ ہے وہ مصنف کے انتقال سے نو سال پہلے یعنی ۶۲۸ھ کا لکھا ہوا ہے۔

فارسی مخطوطات میں خطاطی اور مصوری کے بہترین نمونے موجود ہیں، اگر چین، وسط ایشیا، ایران اور ہندوستان کی مصوری کو تم بالمقابل دیکھنا چاہتے ہو تو تمہیں یہاں نہایت ہی وافر سامان ملیگا، ان تصاویر نے مسٹر ویل ([illegible])

جیسے نقادِ فن سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے، اگرچہ اس مختصر مضمون میں فنِ مصوری کے لحاظ سے تفصیلی تبصرہ کی گنجائش نہیں ہے، تاہم چند مصور مخطوطات کا ایک اجمالی تذکرہ نامناسب نہ ہوگا۔

"تاریخ خاندان تیموریہ" ایک نادر الوجود تاریخی کتاب ہے، اسمیں صاحبقران امیر تیمور سے لے کر جلال الدین اکبر کی حکومت کے انیسویں سال تک کے حالات مذکور ہیں، مصنف کا نام معلوم نہیں ہے مگر کتاب کے اول صفحہ پر شاہجہاں بادشاہ کی ایک تحریر ہے، اسمیں وہ لکھتا ہے کہ "شاہ بابا" یعنی اکبر کے عہد میں تصنیف ہوئی، اس کتاب میں ۱۷۱ تصویریں ہیں ہر تصویر کے نیچے مصور نے اپنا نام بھی دیا ہے، ابو الفضل نے آئین اکبری میں جن سترہ درباری مصورین کے حالات دئے ہیں انمیں سے تیرہ کے شاہکار اس کتاب میں دیکھے جاسکتے ہیں، ان مصورین میں "بساون" اور "مسکین" خصوصیت کے ساتھ زیادہ چابکدست نظر آتے ہیں، جس صفحہ پر شاہجہاں کے ہاتھ کی تحریر ہے اس کے ایک گوشہ میں وارن ہسٹنگس کے عہد کے مشہور انگریز مؤرخ مسٹر فرانسس گلیڈوین کا نام لکھا ہوا ہے، اسی صفحہ پر ایک اور تحریر ہے جسمیں بیان کیا گیا ہے کہ اس نسخہ کی تیاری میں آٹھ ہزار روپے صرف ہوئے ہیں۔

شاہجہاں بادشاہ کی مشہور و معروف تاریخ بادشاہ نامہ مؤلفہ محمد قزوینی اور محمد صالح کنبو کا مصور نسخہ ۱۹۱۱ء میں دہلی دربار کے موقع پر شہنشاہ جارج پنجم اور ان کی ملکۂ معظمہ کے سامنے ملاحظہ کے لئے پیش کیا گیا تھا، اس سے تم اس کے غیر معمولی حسن و خوبی کا اندازہ کرسکتے ہو۔

شہنشاہ نامہ سلطان محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ کی منظوم تاریخ ہے، اسکا موجودہ مصور نسخہ سلطان محمد ثالث کے لئے مؤلف نے اپنے ہاتھ سے مرتب کیا تھا، کچھ عرصہ تک قسطنطنیہ کے سلطانی کتب خانہ میں رہنے کے بعد وہ شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان پہونچا اور دہلی کے شہنشاہی کتب خانہ میں داخل کیا گیا۔ اس کا پہلا صفحہ مغل شاہزادوں کے دستخط اور مہروں سے بھرا ہوا ہے ان میں سے شاہجہاں کی محبوب ترین لڑکی اور مونس الارواح کی مصنفہ شہزادی جہاں آرا بیگم خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے اس نسخہ کی تصویریں ہندوستانی اور ایرانی طرز کی تصویروں سے بالکل جداگانہ ہیں، انمیں بازنطینی اثر نمایاں ہے۔

شاہنامۂ فردوسی کا ایک نہایت ہی گراں قیمت نسخہ مورخہ ۹۴۲ھ خوشخطی، پُر تکلف نقاشی، زرین جدول اور دیدہ زیب تصاویر کے لحاظ سے بے مثل ہے، کابل اور کشمیر کے گورنر علی مردان خاں نے بوقت باریابی اسکو شاہجہاں کے سامنے بطور نذر پیش کیا تھا، شاہنامہ کے دو اور مصور نسخے بھی قابل دید ہیں۔

جامی کی مشہور و معروف تالیف یوسف و زلیخا کا ایک نسخہ مورخہ ۹۳۰ھ میر علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس کی تیاری میں بیس ہزار روپے صرف ہوئے تھے اور خانخانان عبد الرحیم خاں نے اسکو جہانگیر کے سامنے بطور نذر پیش کیا تھا، اسی کتاب کا ایک دوسرا نسخہ مورخہ ۱۰۱۸ھ مشہور و معروف خطاط میر عماد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس نسخہ کی اعلیٰ خطاطی

بے مثل مصوری اور مطلا و مذہب نقاشی دیکھ کر عقل انسانی متحیر ہوتی ہے۔

مصور مخطوطات کے علاوہ دوسرے قسم کے نوادر بھی بکثرت ہیں، شاہزادہ کامران (متوفی ۹۶۴ھ) کا دیوان عدیم الوجود متصور ہوتا مگر یہاں اس کا ایک نسخہ محمود بن اسحاق شہابی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس کے اول صفحہ پر جہانگیر اور شاہجہاں کی خود نوشتہ تحریریں ہیں۔

دیوان حافظ کا ایک نسخہ ہے جسکو ہمایون بادشاہ اور جہانگیر بادشاہ نے بارہا فال کھولنے کے لئے استعمال کیا ہے اور جابجا حاشیہ پر واقعات تفاؤل کو اپنے ہاتھوں سے قلمبند کیا ہے، کتاب کے اول صفحہ پر سلطان حسین بیقرہ اور دوسرے سلاطین و امرائے کے دستخط ہیں، ہمارے لائق دوست خان بہادر مولوی عبد المقتدر نے اپنی فہرست میں غیر معمولی تحقیق و تفتیش کے ساتھ اسی نسخہ پر ایک مبسوط تبصرہ سپرد قلم فرمایا ہے۔

دیوان حافظ کے اور بھی متعدد نسخے نہایت ہی پاکیزہ اور خوشخط ہیں چنانچہ ایک نسخہ مورخہ ۹۹۱ء ملا میرک کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، دوسرا نسخہ ۱۰۲۳ھ میں سلطان محمد قطب شاہ کے کتب خانہ کے لئے لکھا گیا تھا اور تیسرا نسخہ مطلا مجلد اول؛ زرین عنوان اور پاکیزہ تصاویر سے آراستہ ہے۔

کلیات جامی کی پہلی جلد مؤلف کے اپنے قلم کی لکھی ہوئی ہے، اسکی دوسری جلد سینٹ پٹرسبرگ کے کتب خانہ میں تھی؛ معلوم نہیں کہ جنگ عظیم کے بعد اس کا کیا انجام ہوا۔

اثیر اومانی (متوفی ۵۶۶ھ) کا ایک دیوان نہایت ہی کمیاب ہے، یہاں اس کا ایک مطلا و مذہب نسخہ ۱۰۱۵ھ کا لکھا ہوا موجود ہے، اسی طرح تاریخ ابو الخیر خانی مؤلفہ مسعودی بن عثمان کوہستانی مجمل فصیحی مؤلفہ احمد بن محمد فصیح الخوافی، درج الدرا مؤلفہ امیر جمیل الدین شیرازی، مختار نامہ مؤلفہ سلمان بن احمد، سیرت فیروز شاہی، تذکرۃ السلاطین چغتا، تاریخ طاہری مؤلفہ طاہر محمد نسیانی، آثار الوزرا مؤلفہ سیف الدین حاجی فضلی، خلاصۃ الاشعار مؤلفہ تقی کاشی، عرفات العاشقین مؤلفہ تقی اوحدی، دیوان رکن صائن، دیوان مختاری غزنوی، دیوان قاسم ارسلان، دیوان شرف قزوینی، دیوان مجزی تبریزی، دیوان علی نقی کرہ، دفتر چہارم مکاتبات علامی، جواہر العلوم مؤلفہ محمد فاضل بن علی سمرقندی اور مرآۃ المحققین مؤلفہ محمود شبستری کے نادر و نایاب نسخے بھی اس کتب خانہ میں موجود ہیں۔

داراشکوہ کی مشہور و معروف تالیف سفینۃ الاولیا کا نسخہ اسکے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، جہانگیر نے تزک جہانگیری کے علاوہ ایک کتاب جہانگیر نامہ کے نام سے تالیف کی ہے، اس کے نسخے نہایت ہی کمیاب ہیں، اس کتب خانہ میں اسکا وہ نسخہ ہے جسکو ۱۰۲۰ھ میں خود جہانگیر نے اپنے ایک درباری خطاط سے لکھوا کر قطب شاہ گولکنڈہ کے پاس

بطور تحفہ بھیجا تھا، اورنگ زیب کے عہد میں جب گولکنڈہ مفتوح ہوا تو یہ شہزادہ سلطان محمد کے قبضہ میں آیا چنانچہ اس کے اول صفحہ پر شہزادہ موصوف کے دستخط بھی موجود ہیں، غرض اس کتب خانہ میں نوادر کا اسقدر عظیم الشان ذخیرہ ہے کہ اس مختصر مضمون میں اس کی مفصل تشریح ناممکن ہے، ہمیں امید ہے کہ قارئین کرام اس اجمالی تبصرہ کو "مشتے نمونہ از خروارے" تصور فرمائیں گے۔

قوم کی بے توجہی

ایک مرتبہ ایک یورپین فاضل نے جو کتب خانہ دیکھنے کے لئے آیا تھا دارالمطالعہ کو مطالعہ کنندگان سے خالی دیکھکر خدابخش خاں مرحوم سے کہا تھا " واہ آپ نے کتابوں کا کیسا اچھا مقبرہ تیار کیا ہے! اگر یورپ میں ایسا کتب خانہ ہوتا تو ہر وقت طالبان علم کا ہجوم ہوتا مگر یہاں تو مجھے کوئی نظر نہیں آتا" واقعہ یہ ہے کہ اس یورپین فاضل نے جو آوازہ کسا ہے وہ بالکل صحیح ہے، ہمارے سامنے علوم و معارف کا ایک بحر ذخار موجزن ہے، دور دور سے تشنہ کامان علم آتے ہیں اور اس سے سیراب ہو کر جاتے ہیں مگر ہم تشنہ دہن اپنے لایعنی افکار و مشاغل میں مبتلا ہیں۔ ہم نے اپنے ہشت سالہ مدت ملازمت میں کبھی کسی بہاری کو ریسرچ کی غرض سے اس کتب خانہ میں آتے ہوئے نہیں دیکھا، افسوس!

اخلاق و عادات

خدابخش خاں مرحوم اخلاق کریمانہ سے متمتع تھے، ترفع، خودداری اور جاہ پسندی کے ساتھ بردباری رحمدلی اور سخاوت کی آمیزش نے انہیں نہایت ہی سنجیدہ اور ہر دلعزیز بنا دیا تھا، امرا کے مقابلہ میں خودداری اور غربا کے ساتھ تواضع و انکسار ان کا مخصوص شیوہ تھا، انہوں نے کبھی کسی کو چشم حقارت سے نہیں دیکھا، انہیں ذوق کا یہ شعر بہت پسند تھا اور وہ اسکو اکثر غیر معمولی تاثیر کے ساتھ ورد زبان رکھتے تھے ؎

ہاں ذوق کس کو چشم حقارت سے دیکھئے
سب ہم سے ہیں زیادہ کوئی ہم سے کم نہیں

غریبوں کی اعانت اور مصیبت زدوں کی دستگیری کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے، مسٹر صلاح الدین مرحوم لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ خدابخش خاں مرحوم کے ایک بچپن کے دوست فقر و فاقہ میں مبتلا ہوئے مگر چونکہ طبیعت نہایت غیور واقع ہوئی تھی اسلئے دست سوال پھیلانے میں شرم آئی، کسی معمولی کتاب کا ایک قلمی نسخہ لیکر ان کے پاس حاضر ہوئے اور اپنی ضرورت ظاہر کرکے اسکو خرید لینے کی درخواست کی، خدابخش خاں نے اس نسخہ کو دیکھکر کہا کہ ان کے کتب خانہ میں اس کتاب کے بہترین نسخے موجود ہیں، کتاب انہیں واپس دیدی اور اس کے ساتھ مبلغ ایک سو روپیہ کا نوٹ بھی ان کے ہاتھ میں دیدیا۔

دل آزاری سے وہ نہایت ہی خائف و ہراساں رہتے تھے اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ انسان کے لئے بدترین گناہ یہ ہے کہ کسی مسرت اس کے عزور، اس کی تمکنت یا اس کے کسی فعل سے دوسروں کے جذبات کو صدمہ پہونچے، اس سلسلہ میں وہ جب کبھی اپنے
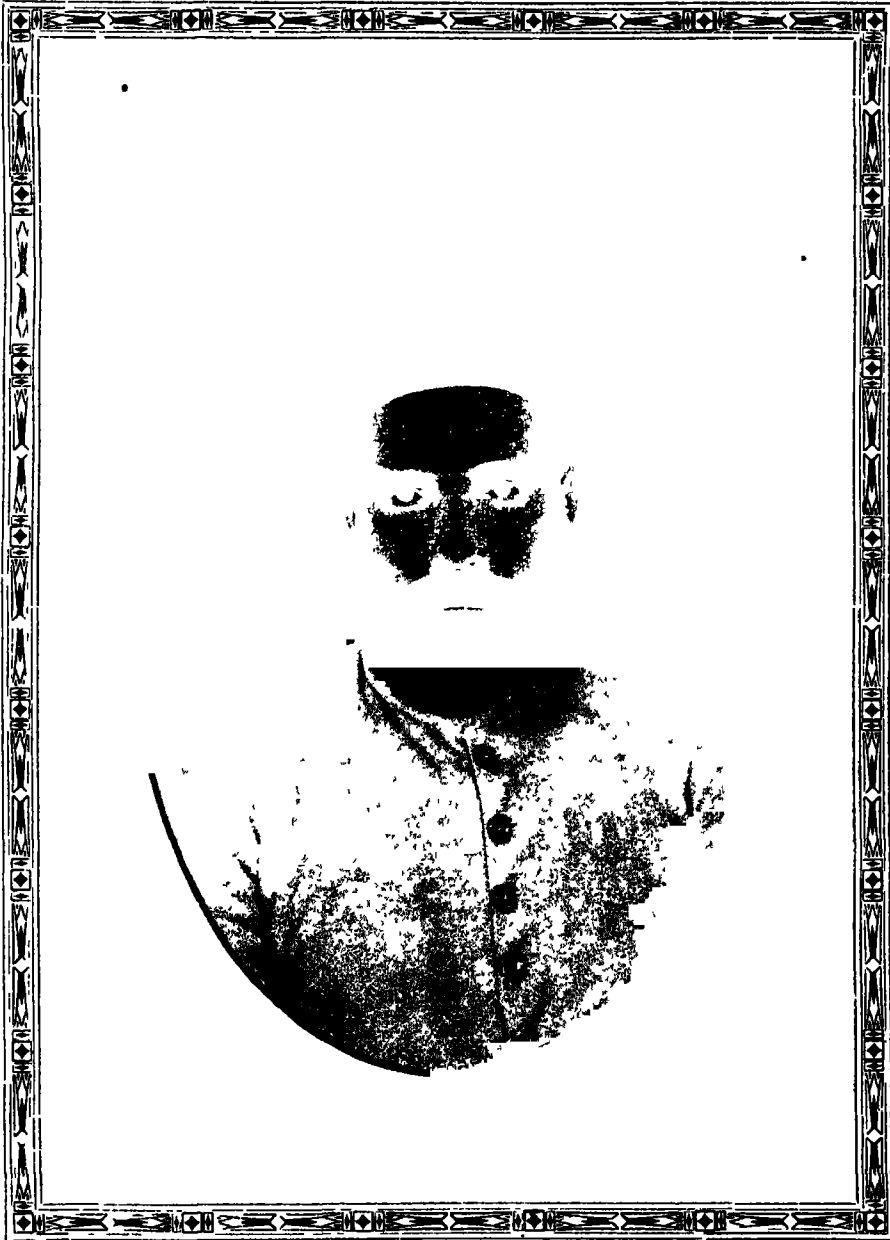
مولنا حاجی معین الدین ندوی پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدا۔

SPECIAL PRESS CAL

بچوں کو نصیحت فرمانے تو عماد، سودا اور راسخ کے حسب ذیل اشعار ان کی زبان پر ہوتے ؎

گر در جہاں دلے ز تو خرم نمی شود
بارِ چناں مکن کہ شود خاطرے حزیں

کعبہ گیا جو ٹوٹ تو کیا جائے غم ہے شیخ
یہ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

جو ہے تعمیر وہ عرش عظیم
سو ہے ٹوٹے ہوئے دل ہی کا مقیم

وفات

۱۹۰۸ء کی تیسری اگست کو ایک بجے شب کے وقت علم و ادب کا عاشق، کتابوں کا شیدائی اور ملک و قوم کا غمگسار خدابخش واصل بحق ہوا، دنیائے دوں میں شور ماتم بپا ہوا، عالم برزخ میں اولیائے عظام، علمائے کرام اور صلحائے ذوی الاحترام کی ارواح مقدسہ نے خوش آمدید کے نعرے بلند کئے، اور رحمت پروردگار نے "یا ایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ" کی صدائے دلنواز کے ساتھ اپنے آغوش میں جگہ دی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کتب خانہ سے انہیں اسقدر محبت تھی کہ مرنے کے بعد بھی اسکی مفارقت گوارہ نہ ہوئی، دار المطالعہ اور کتب خانہ کی دو منزلہ عمارت کے درمیان جو جگہ ہے اسکو انہوں نے اپنی قبر کے لئے پہلے ہی متعین کر دیا تھا چنانچہ حسب وصیت وہ اسی میں مدفون ہوئے۔

عیال و اطفال

خدابخش خاں مرحوم نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں، پہلی بیوی لاولد فوت ہوئیں، دوسری بیوی سے ایک لڑکی اور چار لڑکے تولد پذیر ہوئے، لڑکی نے کمسنی میں داغ فراق دیا، لڑکوں میں مسٹر صلاح الدین ایم۔ اے۔ بی۔ سی۔ ایل (آکسفورڈ) بار ایٹ لا سب سے بڑے تھے، وہ کلکتہ کے فروغ یافتہ بیرسٹروں میں تھے، لا کالج کی پروفیسری اور کلکتہ یونیورسٹی کی لکچرری پر بھی ممتاز رہے، انگریزی کے ادیب کامل تھے، فارسی میں بھی گونہ دسترس حاصل تھا، خصوصاً اشعار بکثرت یاد تھے، ۱۹۳۱ء میں رگزین عالم جاوداں ہوئے۔

دوسرے لڑکے مسٹر شہاب الدین نے بھی انگلینڈ میں تعلیم پائی، وہاں سے واپس آکر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدوں پر سرفراز رہے اور اب پنشن پا رہے ہیں۔

تیسرے لڑکے غیاث الدین نے کمسنی میں داعی اجل کو لبیک کہا، اور چوتھے لڑکے محی الدین اپنے والد کے بعد کتب خانہ کے ناظم مقرر ہوئے مگر صرف دو سال کے بعد راہی جنت ہوئے۔

تیسری بیوی سے کتب خانہ کے موجودہ ناظم مسٹر ولی الدین بی۔ اے۔ بی۔ ایل عالم وجود میں آئے۔

پیام

(جناب محمد عبدالغنی صاحب شمس۔ گرائے پر سرائے)

اے دوست تری سعی پیہم محروم آسایش کیوں ہے   ہستی کی کشاکش سے غافل مشغول نمایش کیوں ہے

اے دوست تو کب تک کھائیگا اعدا کے نشتر سینے پر   اے دوست تو کب تک دیکھیگا اغیار کے پرنخوت تیور

اے حامی دانش بہتر ہے مرجانا ایسے جینے سے   آثار تکدر کے ظاہر ہیں اب تیرے آئینے سے

اے دوست اگر خواہش ہے تجھے دنیا میں زندہ رہنے کی   تو آ میں تجھے اک بات کہوں، گو بات نہیں ہے کہنے کی

تقدیر تو تیرے بس کی نہیں، تدبیر کا تو سودائی بن   اور حسن عمل سے چمکا دے تاریک فضاؤں کے دامن

لے باندھ کمر تبلیغ کی اب اخلاق کا جھنڈا کرکے علم   اور دنیا کے ہر خطے پر لہرا جا کر اپنا پرچم

پھر دیکھوں میں کس طرح نہیں مانتا ہے زمانہ نام ترا   اور صفحہ ہستی پہ باقی رہتا نہیں روشن نام ترا

معلوم نہیں کیوں تجھ پہ طاری سا خواب غفلت ہے

کر چشم بینا وا اپنی، یہ دنیا جائے عبرت ہے

غزل

از جناب سیّد شاہ عبد العزیز صاحب آزاد (گیا)

بدنام کروں مفت میں کیوں نام قضا کا
میں کشتہ ہوں اُس ترکِ ستمگر کی ادا کا

ہر لحظہ تصور ہے تری زلفِ دوتا کا
سودا یہ سمایا ہے مرے سر میں بلا کا

ہے منزل الفت میں کہاں فرق مراتب
بس ایک ہی مسلک ہے یہاں شاہ و گدا کا

اُس زلف گرہگیر سے دل میرا نہ نکلا!
تقدیر میں کچھ پیچ پڑا ایسی بلا کا

غیروں سے تو بیباک ہیں عشاق سے پردہ
انداز نرالا یہ نکالا ہے حیا کا

اک فضل و کرم کا ترے ہے مجکو سہارا
ہے ورنہ مرے سر پہ گراں بار خطا کا

دی مشک ختن سے جو تری زلف کو تشبیہ
اقرار سراسر ہے مجھے اپنی خطا کا

پھر ہوش رہیں گے نہ بجا تیرے بھی ناصح!
اک جلوہ تو دیکھے جو مرے ماہ لقا کا

کیوں نالۂ پرسوز ہے لب پر ترے آزاد
کیا تو بھی بنا تختۂ مشق اہل جفا کا

تِتلی

(از جناب مولوی سید مجتبیٰ حسین صاحب نقوی)

بھائی قاضی صاحب کو باغبانی سے شوق ہے۔ مکان کا صحن ان کی بدولت ایک چھوٹا سا خانہ باغ بن گیا ہے،
موں نے جا بجا پھولوں کے درخت بڑے سلیقہ سے لگا رکھے ہیں۔ فطرت نے بھی ان کی محنتوں کے ساتھ بخل نہ کیا۔ سب پودے
ے گئے، اور بہت جلد دھانی دھانی کونپلوں اور ہری ہری پتیوں سے مالا مال ہو گئے۔ قاضی صاحب ان درختوں کی ایسی
ابی کرتے ہیں جیسے مرغیاں اپنے بچوں کی۔ محلہ کی بکریوں کے پیچھے لاٹھی لے کر دوڑنا ان کے متعلق بچوں کی نوچ کھسوٹ کا انسداد
ن کا کام مجھے بے درد سری کے ایک چھوٹا سا بچہ ہے۔

ان میں سے ایک پودا سب سے زیادہ مغرور ہے۔ سب گرمیوں میں پھولتے ہیں تو اس کی بہار جاڑوں میں آتی ہے
ویا عالم نباتات کا غالب ہے، جو اپنے کو ہر نوع عوام سے ممتاز رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی کیوڑہ کی سی چوڑی چوڑی پتیاں
ہر صبح رات کے اوس سے دھل دھلا کر نکھر اکر اپنی گہری اور سنجیدہ سبزی کو قدرے شوخ بنا دیتی ہیں۔ میں اس نکھری ہوئی
سبزی کا دلدادہ ہوں۔ اکثر دیکھا کرتا ہوں، اور ارادتاً دیکھا کرتا ہوں۔ ہاں تو اس پودے پر بہار آئی، لمبی لمبی چھڑیاں
لیں اور ہر چھڑی میں سرخ زرد پھول لگے۔ یہ پھول بہت ہی نرم ہوتے ہیں، ان کی جھکی جھکی پنکھڑیاں لجائی ہوئی دلہنیں
علوم ہوتی ہیں —— مگر ان کی چوڑی اور نرم پتیوں کے داغ چوٹ کھائے ہوئے دل کی یاد تازہ کرتے رہتے
ہیں۔ "دیکھو جی اس تتلی کو —— ادھر —— اس پھول پر" میں نے ان سے کہا "اس کے ریشمی پروں
پر کس طرح رنگ کی لہریں دوڑ رہی ہیں"۔ "جی ہاں آپ نے ابھی دیکھا ہے میں تو روز اس تتلی کو دیکھا کرتی ہوں، تتلیاں
بہت سی آتی ہیں۔ مگر اس تتلی کو تو گویا میں پہچان گئی ہوں، یہ روز میرے کمرے میں ایک دو بار ہو جایا کرتی ہے ——
تو تم کو اس سے دلچسپی ہو گئی ہے اور اس کو تم سے انس" —— وہ چپ رہیں "اچھا تو میں اس گلاس میں کچھ پھول
اور کچھ پتیاں گلدستے کی صورت میں لگائے دیتا ہوں، اب وہ کمرہ میں آئے گی تو پھول پر بیٹھے گی۔ اور تم کو اس کا کافی
وقع ملے گا کہ اس سے محبت کے پینگ بڑھاؤ" —— وہ چپ تھیں

ہم لوگ کھانا کھا رہے تھے، سلمو علیمن ماما کی زر کی نیکھانے کر کھڑی ہو گئی، اگرچہ دوپہر کا وقت تھا مگر جاڑوں کا موسم تھا، پنکھے کی ضرورت نہ تھی ——— "مگر جب وہ پنکھا جھل رہی ہے تو جھلنے دو، اور ہاں شاید کھانے پر مکھیاں بیٹھیں، ان سب کے علاوہ یہ کہ سلمو کو پنکھا جھلنا سیکھنا چاہیئے" ——— غالباً ان خیالات کے ماتحت انہوں نے اس کو پنکھا جھلنے دیا، ہم لوگ کھاتے رہے، یکایک وہ ریشمی پروں والی تتلی والہانہ رقص کے ساتھ کمرے کے ایک دروازے سے آڑی ترچھی ہو کر اندر آئی، جیسے ہوا کے تھپیڑے نے اس کو ڈھکیل دیا۔ آئی اور سیدھی سلمو کے پنکھے کی زد پر، پنکھے کی حرکت معین تھی اور اس کی بازگشت لازمی، اب وہ تتلی تخت کے پہلو والے بستر کے تکیہ پر بیٹھی ہوئی تھی، اس کے پر کچھ جھکے جھکے سے معلوم ہوتے تھے، "دیکھو جی وہ تمہاری تتلی پنکھے کی چوٹ سے سہم گئی ہے" میں نے تتلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، انہوں نے سلمو کو دیکھا ——— دیکھا نہیں بلکہ گھورا ——— میں نے دیکھا تو غریب سلمو کے دہانے دونوں گوشوں کی طرف سے نیچے جھکتے جا رہے تھے، آنکھیں چھوٹی اور گول ہوتی جاتی تھیں اور نتھنوں کے اوپر سے دہانوں کے دونوں سروں کی سیدھ تک "ہلالی شکنیں" نمودار ہونے لگی تھیں، غالباً اس کیفیت کو لوگ بسورنا کہتے ہیں، میں نے لجاجت آمیز نگاہوں سے ان کے غضب آلود تیور کا مقابلہ "من جانب سلیمہ بنت علیمن" کیا اور کامیابی سے کیا۔ اسی کو لوگ دخل در معقولات کہتے ہیں۔

"اس تتلی کو اگر نرمی سے اٹھا کر گلاس کے پھول پر رکھدیا جائے تو کیا اچھا ہو، پھول ابھی بالکل تازہ ہیں، یقین ہے کہ اس کا رس پی کر تتلی تازہ دم ہو جائے" میں نے اس انداز سے کہا جیسے اس واردات کو سلمو سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ ——— ——— کچھ دیر بعد تتلی اچھی خاصی صحیح سلامت تھی۔

"ٹک ۔ ٹک" ——— میں نے بے خیالی کے ساتھ گردن اٹھائی۔ کمرہ کی دیوار پر بلکہ چھت اور دیوار کے سرحدی زاویہ میں ایک چھپکلی سمٹی بیٹھی تھی۔ بیٹھی تھی ——— بیٹھی رہتی ہے۔ میں ایک طرف کو جھک رہا تھا کہ اپنی چھڑی کو ادھر کونے سے لگا کر کھڑا کر دوں" اس کے بعد ٹوپی اور شیروانی اتار کر ذرا منہ ہاتھ دھوؤنگا، ——— اور پھر ڈٹ کے کھاؤں گا" یہ سب خیالات میرے دماغ میں برقی رفتار کے ساتھ گذر گئے۔ میں تھکا بھی تھا اور بھوکا بھی۔ صبح کا نکلا چکر لگاتے اب دوپہر کے وقت لوٹا تھا۔

"ذرا مجھے چھڑی دیدیجئے" انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیوں کیا کروں گی" ——— "اسی مردار چھپکلی کو ماروں گی" ——— "چھپکلی کو مارو گی! ——— آخر کیوں؟" اس سوال کا انہوں نے

کچھ جواب نہ دیا اور ایک ہونٹھ کو دوسرے پر جمانے کی کوشش کی عرق کے دو چار قطرے ماتھے پر آ گئے۔ ہاتھ کے اشارہ سے مجھے ایک طرف کو بلایا۔ دیوار کے قریب میرے ہاتھ سے چھڑی لے کر اٹھائی۔ سفید دیوار پر ایک ہلکا سا داغ تھا۔ اس کی طرف اشارہ کیا اور پھر مجھے دکھایا ——— مدعا یہ کہ اس کو دیکھئے۔ میں نے دیکھا ——— آدھ انچ کا لمبا ہلکا زرد بلکہ گندھکی داغ دیوار پر تھا۔ غور کرنے پر اس میں رنگ کے چمکتے ہوئے ذرے بھی دکھائی دئے

"اس تتلی اس ننھی سی جان کی تمام کیف پرور رعنائیوں کی اب یہی اتنی سی نشانی اس صفحہ موجودات پر باقی رہ گئی ہے" انہوں نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے سکوت کو توڑا لیکن اس ہنسی کی کوشش نے ایک حسرتناک اور بھیانک تبسم کی صورت اختیار کر لی ——— وہ تبسم جو گریہ کی جگہ پر اس لئے لایا گیا تھا کہ انسانی زندگی کی بیمانہ بیدردیاں جو ہماری عادت بلکہ ہمارے نہاد میں جذب ہو چکی ہیں کہیں اس غیر معمولی احساس درد پر مضحکہ نہ کریں ——— تمدن اور اخلاق کے تبسم انسانوں کی باہمی گفتگو کا لازمی پیش خیمہ قرار دیا ہے۔ ایک تتلی کی موت کو یہ وقعت نہ تو مذہب نے دی نہ تمدن نے کہ دنیائے تہذیب اس پر آنسو گرانے کو برداشت کر سکے' دل رونا چاہتا تھا۔ تہذیب تبسم کی طالب تھی۔ اسی کشمکش کا ایک ہولناک نظارہ تھا جو میرے سامنے کیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ اک ذرا سی چھیڑ میں وہ تبسم ہچکیوں میں مبدل ہو سکتا تھا۔ میں چپ رہا۔

"اس کو کھا لیا ——— چھپکلی نے ——— اسی چھپکلی نے" اب ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ چہرہ تمتما رہا تھا ——— غیض' غضب' جلال اور انتقام۔

ابھی کچھ دیر پہلے میں کمرے میں آ کر میز پونچھنے لگی۔ پھٹ۔ پھٹ۔ پھٹ۔ پھٹ۔ دیوار سے آواز آئی چھپکلی نے تتلی کو پکڑ لیا تھا اور اس کو اچھی طرح مروڑ کر نوالہ بنانے کے لئے دیوار پر منہ مار رہی تھی۔ اب کیا ہو سکتا تھا' اس نازک تتلی کی بساط ہی کیا تھی۔ میرے پہنچتے پہنچتے ہڑپ ہو گئی۔ یہ مردار منہ پر زبان پھیرتی ہوئی بھاگ کر وہاں جا چھپی ہے۔ آج میں اس کو ضرور مار ڈالوں گا۔ ضرور" "تم کو اس کے مارنے سے فائدہ"؟ ——— "اس نے اس تتلی کو کیوں مروڑ لیا؟ ——— اس رقص و طرب کے ہشتی مجسمہ کو کیوں چبا ڈالا؟ ——— جس وقت یہ اس کو بھنبھوڑ رہی تھی میں نے دیکھا کہ اس کے ننھے ننھے نازک پر تھرتھرا رہے تھے۔ اف اس ننھی سی جان پر کیا گزر گئی"۔ "تو تم اس چھپکلی کو مار ہی ڈالو گی؟" میں نے کہا "اسی چھڑی سے" اور بیشک وہ مر جائے گی؟ ۔ مگر کیونکر ——— بل کھا کھا کے تڑپ تڑپ کے ——— آنکھیں اس کی نکل پڑیں گی زبان باہر آ جائیگی"۔ ان کا چہرہ زرد پڑ گیا ——— "کیا تم نے اس پھول کو نہیں دیکھا کہ تتلی اس کے کلیجے میں برچھیاں چبھو چبھو کر اس کا خون حیات چوس رہی تھی ——— تم نے

صرف یہ دیکھا کہ چھپکلی نے معصوم تتلی کو بیدردی سے مروڑ لیا۔ اور ابھی یہ چھپکلی ذرا نیچے اتر آئے اور سیدہ کی بلی کا بچہ مغل جان آنکلے تو دیکھو وہ کیونکر اس کو کھلا کھلا کر مارتا ہے۔ اور اگر سجاد کا کتا ٹلسن زنجیر توڑ کر گھر میں آجائے تو میاں مغل جان گوشت اور خون کے ایک لوتھڑے کی صورت اختیار کرلیں۔ اس غریب۔ مجبور۔ اور پابند فطرت چھپکلی کے ماردینے سے کیا یہ کارخانہ رک رہے گا؟" ——— وہ خاموش ہوگئیں ——— بالکل خاموش ——— میں بھی چپ ہوگیا ——— سکوت تھا ——— کامل سکوت ——— میرے چہرے پر ہوا الگ رہی تھی ——— میری آنکھیں سرخ ہوگئیں ——— تمام رگوں کا خون جوش کھا کر چہرے پر آگیا ——— میں نے اپنے دل اور دماغ کے امنڈتے ہوئے بے پناہ طوفان کو قابو میں لاتے ہوئے غم اور غصہ کی خوفناک سنجیدگی کے ساتھ سکوت کو توڑا۔ "اگر تم سے ہوسکے تو فطرت کے اس نظام کی اینٹ سے اینٹ بجادو ورنہ تماشا دیکھو اور صبر کرو ——— اور تم نے غور کیا ——— ظالم فطرت کی ستم ظریفی کو دیکھا ——— تم ایک ظلم کی تلافی چاہتی ہو ——— کیونکر ——— ——— ایک نئے ظلم سے ———"

انتہائے غم

(ازجناب منظور الحق صاحب بہاری)

نہ مسرور ہیں اور نہ مغموم ہیں ہم
مسرت ہے باقی نہ غم رہ گیا ہے
کسی کو ہمیشہ نظر ڈھونڈتی ہے
نہ حسرت ہے باقی نہ کوئی تمنا
دل زار رہتا ہے کھویا ہوا سا
نہ ہوش و حواس اور نہ باقی جگر ہے
نہ زخم جگر کے مداوا کی خواہش
نہ اپنی خبر ہے نہ دنیا سے واقف
خدا جانے منظور یہ حال کیا ہے

کہیں کیا کہ کیا آہ دل کا ہے عالم
مگر آنکھیں رہتی ہیں ہر وقت پرنم
نظر میں کوئی اب تو رہتا ہے ہر دم
مگر آنکھیں پرنم ہیں مانند شبنم
خوشی اور غم دونوں کرتے ہیں ماتم
نہ سینے میں دل ہے کہ نالہ کریں ہم
کہاں اب میسر دوا اور مرہم
نہ معلوم یارب کہاں کھوگئے ہم
خوشی رہ گئی اور نہ باقی کوئی غم

جنونِ آرزو

از جناب منصور احسن صاحب منصور سلیم پوری

حسرت و ارمان جو مضمر ہے آب و گل میں ہیں — چند نالے بن کے نکلے ہیں ہزاروں دل میں ہیں

حسرتوں کے خون سے رنگیں ہے افسانہ مرا — ہے مئے گلرنگ سے لبریز پیمانہ مرا!

پھر اٹھا ہے اس دلِ وحشی میں طوفانِ جنوں — پھر ہوئی رخصت مری سب طاقتِ صبر و سکوں

سوزِ پنہانی لئے پھرتا ہے مجھکو کو بکو — مثلِ پروانہ چراغِ حسن کی ہے جستجو

مرکزِ امید اپنا منزلِ جانانہ ہے — طور کے جلوے کا شائق پھر دلِ دیوانہ ہے

حسرتِ دیدار کیا ہے: آرزوے بے تاب کی — مد و جزرِ بحر کیا ہے؟ اک کشش مہتاب کی

بے نیازیِ دو عالم ہے کمالِ آرزو
کیفِ استغنائے حسن لازوالِ آرزو

بڑھتی ہیں ہر دم فزوں شوق میں بے تابیاں — جاگ اٹھا ہے جنوں لیتا ہوا انگڑائیاں

روح کو بالیدہ جو کر دے وہ ارماں چاہئے — جس سے بڑھ جائے خلشِ دل کی وہ پیکاں چاہئے

سوزِ سازِ آرزو دراصل ہے لطفِ حیات — نورِ شمعِ عشق سے روشن ہے بزمِ کائنات

زینتِ گلزارِ ہستی ہے یہ شمعِ آرزو — اک نمودِ گل سے قائم ہے جہانِ رنگ و بو

چوٹ کھا کر بربطِ خاموش دیتا ہے صدا — ٹھیس ہی لگنے سے دل والوں کو آتا ہے مزا

ناشناسائے خروشِ دل کوئی ہستی نہیں — نغمۂ حسرت سے خالی نعرۂ مستی نہیں

ہے ضمیرِ لالہ و گل میں امنگوں کی بہار — رنگ دکھلاتا ہے کیا کیا آرزوئے زرنگار

سوزِ نغمہ میں کسی کے ہے شرارِ آرزو — ہے کسی لب پر فغانِ دلفگارِ آرزو

دیکھتا ہے کوئی عکسِ نوبہارِ آرزو — کھینچتا ہے کوئی تصویرِ نگارِ آرزو

آرزو ہی پر فقط ہے عیش کا دار و مدار — ہے شباب آور ضعیفی میں امیدِ خوشگوار

حسن کی شوکت یہی ہے عشق کا شیوہ یہی — جادۂ مجنوں یہی ہے محملِ لیلےٰ یہی

جب "جنونِ آرزو" سے تنگ آجاتا ہوں میں
دل میں ترکِ آرزو کی "آرزو" پاتا ہوں میں

شتاب رائے

گورنر بہار

مولانا سید ابوظفر ندوی ۔ سابق پروفیسر مہاودیالے (کالج) احمد آباد۔ رفیق شبلی اکاڈمی اعظم گڑھ

مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں اُردو کا تیسرا مرکز عظیم آباد (پٹنہ) تھا۔ راجہ رام نرائن ناظم بہار جو موزوں تخلص کرتے تھے اور شیخ علی حزیں کے شاگرد تھے۔ ان کا شمار اس عہد کے اساتذہ میں ہوتا تھا۔ اُردو سے ان کو بیحد دلچسپی تھی۔ اور ادب نوازی میں انہوں نے بڑی شہرت پائی۔ راجہ رام نرائن کے عہد میں اگرچہ بڑے بڑے انقلابات ہوئے، پھر بھی اپنی ہوشمندی کے باعث ۱۱۶۶ھ سے ۱۱۷۴ھ تک عہدہ نظامت پر مامور رہے۔

۱۵ ذوالحجہ ۱۱۷۵ھ میں میر قاسم ناظم صوبہ بنگالہ نے راجہ نوبت رائے کو عظیم آباد کے نظامت کے عہدہ پر سرفراز کیا، اور آخر ۱۱۷۹ھ میں راجہ شتاب رائے اس عہدہ پر مامور کئے گئے۔

نام ونسب شتاب رائے نام، باپ کا نام ہمت سنگھ، قوم کا، کائستھ، اور وطن ان کا دہلی تھا[1]۔ امیرالامراخاں دوراں صمصام الدولہ بہادر کے غلام آقا سلیمان گرجی کے یہاں ایک معمولی تنخواہ پر ملازم تھا[2]۔ تھوڑے دنوں کے بعد اپنے حسن خدمات کے بدولت اپنے آقا کا مدارالمہام ہوگیا۔ اور صمصام الدولہ کے سرکار میں بھی کافی رسوخ حاصل کرلیا۔

صمصام الدولہ کے انتقال پر دہلی میں جب پے درپے انقلابات شروع ہوئے، تو شتاب رائے نے دہلی کا قیام نامناسب سمجھا۔ اور خان دوراں کے صاحبزادے کے توسط سے صوبہ بہار کی دیوانی رہتاس کی قلعہ داری اور ان کی جاگیر کے انتظام کا پروانہ حاصل کرلیا۔

پٹنہ کا سیاسی مطلع اس وقت بہار، بنگالہ، اُڑیسہ کا ناظم انگریزوں کی مدد سے میر جعفر بن چکا تھا۔ اور عظیم آباد کی دیوانی اور نیابت صوبہ راجہ رام نرائن کے سپرد تھی۔ اور صمصام الدولہ کے جاگیر کا انتظام خواجہ محمدی خاں کرتا تھا۔ شتاب رائے نے جو کچھ سرمایہ جمع کیا تھا، اس سے اپنے لائق شان وشوکت کا سامان مہیا کرکے عظیم آباد پہنچا۔ اس وقت میر جعفر عظیم آباد آچکا تھا، شتاب رائے نے عظیم آباد پہنچکر سب سے پہلے راجہ رام نرائن سے ملاقات کی، اور راجہ موصوف کے توسط سے میر جعفر تک رسائی بہم پہنچائی۔

شتاب رائے ایک ہوشیار آدمی تھا، اس نے چند ہی دنوں میں معلوم کرلیا کہ راجہ رام نرائن کسی دوسرے کو اس صوبہ میں دخل دینے نہ دیگا۔

[1] سیرالمتاخرین جلد دوم صفحہ ۷۹۱ نول کشور [2] گنج تاریخ صفحہ ۹۱

اور خواجہ محمد ی خاں سے بستی کے باعث انتظام جاگیر کا کام بھی اس کے سپرد نہ ہوگا، میر جعفر کو دیکھا کہ وہ عیش و عشرت کا بندہ ہے، اس سے کام نہ نکلے گا۔ لہٰذا میر جعفر کے مرشد آباد جاتے وقت کرنل کلف کے ساتھ ہو گیا۔

وہاں پہنچکر کرنل موصوف کے ساتھ ہدیے اور تحفے کے ذریعہ مراسم پیدا کئے، اور کچھ ہی دنوں کے بعد اپنے کو مخلص ثابت کرکے کرنل موصوف کے توسط سے اپنا کام نکال لیا۔

کرنل کلف اور میر جعفر کی مہر سے راجہ رام نرائن کے ساتھ شرکت نظامت کا پروانہ لیکر عظیم آباد واپس آیا۔ تھوڑے دنوں میں اپنے حسن لیاقت سے راجہ رام نرائن کو خوش کرکے ہر کام میں دخیل ہو گیا، اور عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگا۔

اس درمیان میں ایک نیا واقعہ پیش آیا۔ محمد قلی خاں ناظم الہ آباد کو جس کا خرچ آمدنی سے زیادہ تھا۔ بہار و بنگال کی بدانتظامی کا حال سنکر اس کو فتح کرنے کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ شاہ عالم اس کے استدعا پر الہ آباد پہنچا اودھ کے ناظم نواب شجاع الدولہ کو بھی امداد پر آمادہ کیا۔

مصنف سیر المتاخرین غلام حسین کے والد بخشی الملک امیر الدولہ سید ہدایت علی خاں بہادر اسد جنگ اس لشکر میں ممتاز آدمی تھے۔

یہ لشکر جب سرحد بہار میں پہنچا، تو راجہ رام نرائن بہت گھبرایا۔ متعدد خطوط مرشد آباد میں میر جعفر کو امداد کے لئے بھیجے، انگریز افسروں کو بھی اسکی اطلاع دی۔ جب اس کو مایوسی ہوئی تو عظیم آباد کے انگریز افسر سے اس معاملہ میں مشورہ کیا اس نے کہا کہ ہم لوگ تو اپنی کونسل کے زیر حکم ہیں۔ اگر وہاں سے لشکر آیا، تو اس کے ساتھ مل کر جنگ کریں گے۔ ورنہ جہاز پر بیٹھ کر کسی طرف ہٹ جائیں گے، ایسی صورت میں تمہارا رویہ وہ ہونا چاہیئے جو وقت کے لحاظ سے مناسب ہو۔

رام نرائن دہلی کے نام سے مرعوب ہو گیا تھا ایک طرف تو پے در پے میر جعفر کو خط لکھتا رہا اور دوسری طرف شاہ عالم کے پاس اطاعت کا پیغام روانہ کیا۔ شاہ کے وزرا اس چال میں آگئے، اور عظیم آباد تک بلا خدشہ پہنچ گئے۔ کہ مرشد آباد سے امدادی فوج کا حال معلوم کرکے رام نرائن نے اپنا رویہ بدلا۔ اور قلعہ بند ہو کر جنگ شروع کر دی۔ قریب تھا کہ قلعہ فتح ہو جائے۔ کہ اچانک الہ آباد پر شجاع الدولہ کے قبضہ کی خبر اور مرشد آباد سے امدادی فوج کی آمد نے محمد قلی خاں کو بے حد مضطر کر دیا۔ اور باوجود ہر طرح کی فہمائش کے محمد قلی خاں محاصرہ اٹھا کر الہ آباد واپس گیا۔

شتاب رائے نے کمال احتیاط سے اس جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ وہ اپنی فوج اور دولت کو ہر طرح سے ترقی دیتا رہا۔ یہانتک کہ راجہ رام نرائن صاحب شاہ عالم کی فوج سے دوسری بار شکست کھا کر انگریزوں کی کوٹھی میں پناہ گزیں ہوا۔ اور پورنیہ کا ناظم خادم حسین خاں شاہ عالم سے مل کر پٹنہ پر چڑھ آیا۔ تو کپتان نکس نے جو مدافعت کے لئے مقرر کئے گئے تھے، شتاب رائے کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ چنانچہ اپنی فوج کے دو سو سوار و پیادہ اور چار لاکھ روپیہ لے کر میدان جنگ میں جا پہنچا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۱۷۳ھ کا ہے۔

راجہ شتاب رائے کی شجاعت کپتان موصوف نے راجہ شتاب رائے سے مشورہ کرکے غنیم پر شبخون مارنے کا ارادہ کیا۔ لیکن راہ گم ہو جانے کے سبب صبح کے قریب دونوں ناکام واپس آئے۔

سورج نکلنے کے بعد جو جنگ شروع ہوئی، اس میں کپتان موصوف کے ساتھ راجہ نے اس پامردی کے ساتھ جنگ کی، اور غنیم کو شکست دی۔ کہ افسر مذکور بے حد مداح ہوگیا۔ اور اسی دن سے راجہ شتاب رائے کا ستارہ اقبال طلوع ہوا۔

سنہ ۱۱۷۴ھ میں ایک جدید انقلاب رونما ہوا۔ یعنی میر جعفر ناظم بنگالہ کا انتقال کرگیا۔ جس سے تمام انتظامی امور میں سخت بدنظمی پیدا ہوگئی، خود میر جعفر میں اس کی لیاقت نہ تھی، ناچار اپنے داماد میر قاسم کو امور سلطنت میں دخیل کرنا پڑا، دو چار ملاقاتوں میں میر قاسم نے انگریز افسروں کے دلوں پر اپنی لیاقت کا ایسا سکہ بٹھلایا کہ سب اسی کا کلمہ پڑھنے لگے۔ اور یہ طے پایا کہ میر جعفر کی جگہ میر محمد قاسم کو صوبہ کا اعلیٰ حاکم تسلیم کیا جائے

چنانچہ باقاعدہ ان کی تخت نشینی کے بعد میر جعفر کو کلکتہ بھیجدیا گیا۔ اور نواب میر قاسم مرشد آباد میں حکومت کرنے لگا۔ ادھر کامگار خاں زمیندار نے شاہ عالم کو ورغلا کر عظیم آباد پر حملہ کرنے کا مشورہ دیا۔ شاہ عالم بھی آمادہ جنگ ہوکر گیا مان پور پہنچا۔ میجر کرنک گورہ پلٹن کے ساتھ دیسی فوج کو لیکر مقابل ہوئے۔ اور ایک ہی حملہ میں شاہی فوج کو شکست دی۔

انگریزوں نے یہ دیکھ کر کہ احمد شاہ ابدالی دہلی پہنچ گیا ہے اور مرہٹوں کو اس نے ایک ہی دفعہ میں تباہ کردیا، اور شاہ عالم کی استدعا پر ہندوستانی امراء سے اس کو بادشاہ بنانے کی نہ صرف سفارش بلکہ تاکید کرگیا ہے، تو شاہ عالم سے انہوں نے صلح کرلینا زیادہ پسند کیا، راجہ شتاب رائے کو اس غرض سے شاہ عالم کے پاس روانہ کیا۔ راجہ موصوف نے ہر طرح صلح کی ترغیب دی، مگر کامگار خاں کسی طرح راضی نہ ہوا، مجبور ہوکر شتاب رائے ناکام واپس آیا۔

احمد شاہ ابدالی کے حسب خواہش ہندوستانی امراء (حافظ رحمت اللہ، نجیب الدولہ وغیرہ) نے شاہ عالم کو لانے کے لئے شجاع الدولہ کو روانہ کیا۔ شاہ عالم کو جب یہ حال معلوم ہوا، تو انگریزوں سے صلح مناسب سمجھ کر شتاب رائے کو طلب کیا۔ اور ہر دو جانب سے شرائط صلح طے کرکے شتاب رائے جب عظیم آباد واپس آیا، تو اس سے انگریز بہت خوش ہوئے۔ اور شتاب رائے کی عزت و وقعت دوچند ہوگئی۔

انگریزوں کے مشورہ سے جب شاہ عالم پٹنہ پہنچا تو میر قاسم کے لئے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ لیکن انگریزوں کی تسلی و تشفی سے شاہ عالم کے دربار میں حاضر ہوکر نذر دی، شاہ عالم نے بھی خلعت اور سند صوبہ داری عطا کی، شاہ عالم کی واپسی پر میر قاسم راجہ رام نرائن ناظم عظیم آباد سے محاسبہ کی فکر کرنے لگا۔ کیونکہ آج تک اس نے نہ تو حساب فہمی کی۔ اور نہ اس صوبہ میں اس کو دخل دینے دیتا تھا، اس معاملہ میں انگریزی کونسل سے مشورہ لیکر راجہ مذکور اور اس کے تمام متوسلین کو گرفتار کرکے مرشد آباد روانہ کردیا۔ اور راجہ راج بلبھ اس کی جگہ مقرر ہوا۔ اور چونکہ راجہ شتاب رائے اس کا شریک کار تھا، اس لئے اس کے ساتھ بھی سختی برتی گئی۔

راجہ موصوف نے مصلحت وقت دیکھ کر ہر کام سے دست برداری حاصل کی، اور خانہ نشین ہوگیا۔ نواب میر قاسم نے ازراہ دور اندیشی سند دیوانی عظیم آباد، قلعہ داری رہتاس اور جاگیر صمصام الدولہ کے انتظام کا پروانہ اپنے نام بادشاہ سے منگوالیا۔ اور شتاب رائے پر حساب فہمی کے بہانہ سے بڑی سختی شروع کردی۔ مگر چونکہ اس کے تعلقات انگریزوں سے بہت اچھے تھے اور خادم حسین کی جنگ میں اس نے نمایاں کام انجام دیا تھا اسلئے

اس کے متعلق یہ رائے طے پائی کہ اس کو کلکتہ بھیجدیا جائے ۔ اور ممبران کونسل خود تحقیقات کرکے احکام جاری کریں، چنانچہ میجر کرناک کے ساتھ راجہ مذکور کلکتہ پہنچا ۔ اور ممبران نے تفتیش سے بے قصور پاکر بری کردیا ۔ مگر غالباً میر قاسم کی رعایت سے اس کو حکم دیا گیا، کہ میر قاسم کی مملکت سے باہر چلا جائے ۔

راجہ ملک بدر کیا گیا

عظیم آباد واپس آنے پر مسٹر لسٹن کی معیت میں براہ چھپرہ انگریزی فوج کے زیر نگرانی صوبہ اودھ تک پہنچا دیا گیا ۔ شتاب رائے نے شجاع الدولہ کے دربار میں پہنچکر ملازمت اختیار کرلی ۔ اور راجہ بینی بہادر کے ساتھ نائب صوبہ دار رہکر بعافیت زندگی بسر کرنے لگا ۔

میر قاسم جب صوبہ بہار کے انتظام سے فارغ ہوکر مطمئن ہوگیا ۔ تو مونگیر جاتے وقت اس نے راجہ راج بلبھ ناظم عظیم آباد کو اس کی بعض بے اعتدالیوں کے سبب گرفتار کرلیا ۔ اور راجہ نوبت رائے کو اس کی جگہ مقرر کیا ۔ یہ واقعہ ۵ ار ذوالحجہ ۱۱۷۵ھ کا ہے ۔

۲۵ جمادی الثانی ۱۱۷۶ھ میں میر قاسم اور انگریزوں کے درمیان مخالفت شروع ہوگئی ۔ اس لئے میر قاسم خود عظیم آباد پہنچا ۔ اور میر مہدی علی خاں کو نوبت رائے کے بجائے مقرر کرکے نوبت رائے کو اپنے ساتھ مونگیر لے گیا ۔

۱۱۷۶ھ میں میر محمد قاسم صوبہ دار بنگالہ اور انگریزوں کے درمیان عملاً جنگ شروع ہوگئی ، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ متعدد مقامات میں انگریزوں نے شکست دے کر تمام صوبہ پر قبضہ کرلیا ۔ میر قاسم بھاگ کر شجاع الدولہ کے یہاں پناہ گزیں ہوا ، لیکن خود شجاع الدولہ سے وہ مطمئن نہ تھا ۔ اس لئے ضرورت تھی کہ درمیان میں کوئی شخص ایسا ہو جو دونوں سے واقف ہو ۔ راجہ شتاب رائے سے بہتر کون ہوسکتا تھا ؟ راجہ بینی بہادر کے ساتھ جو الہ آباد کا صوبہ دار تھا ، اس کام پر مقرر کیا گیا ۔ پھر شجاع الدولہ کی طرف سے میر جعفر کے پاس بھیجا گیا ۔ شاہی خلعت پیش کیا ، جو شاہ عالم نے وزیر شجاع الدولہ صوبہ دار اودھ کی وساطت سے بھیجا تھا ۔ میر جعفر نے بھی ایک ہزار نذرانہ پیش کیا ۔ مگر ان واقعات سے اصل معاملہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ۔

رمضان ۱۱۷۸ھ میں شجاع الدولہ نے عظیم آباد کا محاصرہ کیا ۔ مگر ناکام رہا ۔ شاہ عالم نے میر غلام حسین مصنف سیر المتاخرین کے ذریعہ شجاع الدولہ کی اطلاع کے بغیر انگریزوں سے صلح کرنی چاہیئے ۔ خط و کتابت باحتیاط کی گئی ۔ تاکہ شجاع الدولہ کے وکیل راجہ شتاب رائے کو معلوم ہو مگر انگریزوں نے دونوں میں نفاق پیدا کرنے کے لئے شتاب رائے کے ایجنٹ سادھو رام مقیم عظیم آباد کو اس معاملہ سے آگاہ کردیا ۔ جس کے باعث یہ معاملہ آگے نہ بڑھ سکا ۔

۱۱۷۸ھ میں میر جعفر بعض ضروری امور کے لئے کلکتہ روانہ ہوگیا ۔ اور عظیم آباد کا ناظم اپنے برادر محمد کاظم کو مقرر کیا ، اور اس کا نائب دھیرج نارائن (برادر راجہ رام نرائن سابق ناظم پٹنہ) کو بنایا گیا ۔

ادھر شجاع الدولہ بکسر میں ناکامیاب ہوکر روہیلوں اور مرہٹوں سے مدد حاصل کرنے چلا گیا ۔ انگریز اپنی تجارت کی بدحالی سے تنگ آکر جلد از جلد صلح کرلینا چاہتے تھے ، اس لئے راجہ شتاب رائے کے ذریعہ راجہ بینی بہادر کو اس پر آمادہ کیا ، مگر راجہ موصوف نے جب شجاع الدولہ کو اس طرف مائل نہ دیکھا ۔ تو اس نے دورخی روش اختیار کی ، ایک طرف اپنے آقا شجاع الدولہ سے ملا رہا ۔ اور دوسری طرف انگریزوں سے بھی اپنی وفاداری جتاتا رہا ۔ یہاں تک کہ

شجاع الدولہ جب اپنی مددگار فوج لے کر آیا تو شتاب رائے نے راجہ موصوف سے کہا۔ کہ صاف صاف اپنی روش سے مطلع کیجیے، تاکہ آپ بدنامی سے بچیں اور ہمارے وقار میں فرق نہ آئے، مگر راجہ موصوف اس کو بھی لیت و لعل میں ٹالتے رہے۔ کہ ایک دن شجاع الدولہ سے جا ملا۔ جس سے راجہ شتاب رائے کی بے انتہا ذلت ہوئی۔

راجہ شتاب رائے نے اپنے مستقبل کا خیال کر کے جرنیل کرنک سے ملاقات کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ اس نے دوران ملاقات میں کہا کہ چونکہ یہ معاملہ میری وساطت سے ہوا تھا، اور کمپنی کو میری وجہ سے نقصان اُٹھانا پڑا، اس لئے کمپنی اس معاملہ میں کچھ بازپرس کرے، تو بلا تکلف میں اپنے آپ کو حوالہ کرنے کو تیار ہوں، کرنیل موصوف نے راجہ کی اس وفاداری کو پسند کر کے ہر طرح تسلّی دی۔ اور معاملہ رفت و گزشت ہو گیا۔

راجہ شتاب رائے کے ذریعہ انگریزوں نے راجہ بنارس کو ہموار کر لیا، اور اس کی رہبری میں قلعہ چنار پر حملہ آور ہوئے، مگر جان و مال کا سخت نقصان اُٹھا کر واپس آنا پڑا، اس درمیان میں مرزا نجف خاں جو ابدالی کا رشتہ دار اور شجاع الدولہ کا ستایا ہوا تھا، انگریزوں کے پاس آکر ملازم ہوا۔ ادھر لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے لئے جب ایک پلٹن بھیجی گئی، تو راجہ شتاب رائے کے مشورہ سے محمد اکبر خاں کو لکھنؤ کی کوتوالی سپرد ہوئی

پھر جرنیل کرنک، شتاب رائے اور مرزا موصوف کوڑا کر الہ آباد پہنچا۔ جو معمولی جنگ کے بعد مفتوح ہو گیا۔ اور قلعہ دار راجہ شتاب رائے کی ضمانت پر قلعہ سے باہر نکل کر عزت کے ساتھ شجاع الدولہ سے جا ملا۔

اب راجہ شتاب رائے، الہ آباد اور اودھ کے صوبوں کا انتظام کرنے میں مشغول ہوا۔ اور چند ہی دنوں میں ہر جگہ اپنا معتبر آدمی مقرر کر کے بڑی خوبی سے تمام صوبہ کی بدانتظامی دور کر دی۔

شجاع الدولہ مرہٹوں اور روہیلوں کی مدد لے کر پھر میدان میں آیا۔ انگریز بھی مقابلہ میں آ جمے جنگ شروع ہو گئی، اور مرہٹوں نے اپنے قدیم طریقہ جنگ گریز پا سے کچھ دنوں انگریزی فوج کو پریشان کر رکھا، چنانچہ ایک دن راجہ شتاب رائے بھی چند مخصوص آدمیوں کے ساتھ ان کے نرغہ میں آ پھنسا۔ اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھا، کہ خود چند زخم اپنے آپ کو لگا کر مُردوں میں سو رہے تاکہ مرہٹوں کی گرفت سے محفوظ ہو جائے، کچھ دیر کے بعد جب انگریزی فوج مدد کے لئے آئی، تو اس کے ساتھ فوج میں واپس آ گیا۔ آخر شجاع الدولہ نے یہاں بھی بُری طرح شکست کھائی۔ اور بڑی ذلت کے ساتھ انگریزوں سے صلح کرنے پر مجبور ہو گیا۔

چونکہ راجہ شتاب رائے کو شجاع الدولہ نے اس وقت عزت سے رکھا تھا۔ جبکہ میر قاسم نے ملک بدر کر دیا تھا۔ اس لئے نہایت ایمانداری اور نمک حلالی سے شجاع الدولہ کے ساتھ عمدہ برتاؤ کیا، اور شرائط صلح جو راجہ شتاب رائے کے ذریعہ طے پائے، وہ راجہ موصوف ہی کی شبیہ کے واقعات کو دیکھتے ہوئے نرم معلوم ہوتے ہیں۔

عظیم آباد کی دیوانی

اس کے بعد راجہ شتاب رائے عظیم آباد اپنے قدیم عہدہ پر واپس آ گیا۔ اس وقت عظیم آباد میں میر جعفر کی طرف سے میر کاظم ناظم پٹنہ، راجہ دھیرج نرائن مدار المہام (دیوان) اور راجہ شتاب رائے شاہی دیوان کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

لارڈ کلیف جب لندن سے کلکتہ پہنچے، اور اپنے عہدہ (کمپنی کی گورنری) کا چارج لیا، تو انہوں نے بادشاہ اور وزیر سے ملاقات کرنا بہت ضروری سمجھا، چنانچہ شتاب رائے کے ذریعہ سے یہ معاملے پایا کہ وزیر شجاع الدولہ فیض آباد سے اور لارڈ موصوف کلکتہ سے شاہ عالم کے پاس الہ آباد میں ملیں۔ مرشد آباد کے نائب ناظم محمد رضا خاں یہ چاہتے تھے، کہ فریقین کے درمیان جو گفتگو ہو، وہ میر کاظم ایرانی ناظم سہسرام کے ذریعہ ہو۔ اور راجہ شتاب رائے کو اس میں کوئی دخل نہ ہو۔ لیکن لارڈ موصوف جب عظیم آباد پہنچے، اور دونوں سے ملاقات کی، تو میر موصوف کے مقابلہ میں راجہ شتاب رائے کو زیادہ پسند کیا۔ اور ساتھ لیتے ہوئے الہ آباد چلے گئے۔ اور افسوس کہ اسی شتاب رائے کی چرب زبانی، اتار، چڑھاؤ اور شجاع الدولہ کی سوء تدبیری سے شاہ عالم نے لارڈ کلیف کے درخواست پر کمپنی کو بنگال، بہار، اور اڑیسہ کی دیوانی عطا کی، جس سے انگریزوں نے اپنی سلطنت کی بنیاد ہندوستان میں قائم کی۔

۱۷۶۹ء میں جب لارڈ کلیف کلکتہ جارہے تھے، تو بعض امور کے سرانجام دہی کے لئے راجہ شتاب رائے بھی ساتھ ساتھ کلکتہ پہنچا۔

علالت یہاں آکر سخت بیمار ہوگیا۔ اور وجع مفاصل کے سبب سے اس کا حرکت کرنا بھی دشوار تھا۔

لارڈ کلیف اور جنرل کارنک نے جو راجہ شتاب رائے کی ذہانت، معاملہ فہمی اور کارگزاری دیکھی تو دونوں نے عظیم آباد کی نظامت کا عہدہ اس کو پیش کیا۔ راجہ موصوف نے از راہ دور اندیشی بعذر علالت اس کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔

لارڈ موصوف نے اپنا ڈاکٹر علاج کے لئے بھیجا، جس نے بڑی توجہ سے اس کا علاج کیا۔ زود اثر دوا کے ذریعہ راجہ بہت جلد صحتیاب ہوگیا۔ راجہ نے دس ہزار روپے ڈاکٹر کو انعام میں دیئے۔

نظامت بہار اور عطائے خطاب اب لارڈ موصوف نے پھر مجبور کرنا شروع کیا۔ ناچار اس عہدہ کو شتاب رائے نے قبول کرلیا، اور دربار شاہی سے "ممتاز الملک مہاراجہ شتاب رائے بہادر منصور جنگ" خطاب پایا۔ پنج ہزاری منصب ملا۔ ۲۵ ہزار خرچ نظامت کے لئے اور پانچ ہزار ذاتی اخراجات کے لئے ماہانہ مقرر ہوا۔ عظیم آباد کی جاگیر بھی اسی کے نام بحال رہی۔[۱]

اب صوبہ بہار کا ملکی انتظام اس طرح قرار پایا، کہ میر کاظم ایک لاکھ روپیہ سالانہ پر پنشن یاب ہوئے۔ اور ان کی جگہ مسٹر مڈلٹن مقرر ہوئے۔ راجہ شتاب رائے اور دھیرج نارائن دونوں مل کر امور نظامت انجام دینے لگے۔ کیونکہ ملکی مصالح کی بنا پر دھیرج نارائن کا اس وقت علیحدہ کرنا قرین مصلحت نہ معلوم ہوا۔

راجہ شتاب رائے نے کو فرصت مرشد آباد ہوکر عظیم آباد پہنچا۔ دھیرج نارائن کو سخت ناگوار ہوا، راجہ موصوف نے اس کو محسوس کرکے دربار داری انجام دینے کے لئے قلعہ شاہی کا انتخاب کیا۔ جیسا کہ دھیرج نارائن سے پہلے معمول تھا۔

دھیرج نارائن بعض انگریزوں سے دوستی کے بھروسے بے حد مغرور ہوگیا تھا، اور بدانتظامی کے باعث لاکھوں روپے خود اور اسکے

---

[۱] سیر المتاخرین جلد دوم ص۔ نول کشور

کارپرداز عین کرگئے تھے، راجہ شتاب رائے یہ دیکھ کر بہت گھبرایا، اس نے خفیہ طور سے ہر طرح پر فہمائش کی، سودمند نہ ہوا۔ جدید شرائط کے ساتھ معتمد ٹھیکہ دار پیش کئے، اور کہا کہ اگر تمہارے قدیم ٹھیکہ داران شرائط کو قبول کرلیں، تو مجھے کوئی عذر نہیں ہے، مگر راجہ مذکور کی یہ تدبیر بھی کارگر ثابت نہ ہوئی اور آخر یہ خبر لارڈ کلف تک پہنچی۔ اس نے تنبیہ کے متعدد خطوط لکھے، اور حکم دیا کہ فوراً بقایا روپے خزانہ میں داخل کرے۔ مگر اس نے اسکی بھی پرواہ نہ کی۔

سنہ ۱۱۸۰ھ میں لارڈ کلف شجاع الدولہ سے ملنے کے لئے چھپرہ جاتے ہوئے عظیم آباد پہنچے، راجہ شتاب رائے اور دھیرج نرائن الگ الگ استقبال کو نکلے۔ لارڈ موصوف نے پیغام دیا کہ جب تک تم بقایا روپیہ سرکاری خزانہ میں داخل نہ کروگے میں تم سے نہ ملوں گا، چنانچہ وہ وہاں سے بہ جبر واپس کیا گیا۔ جس سے اس کی بے انتہا ذلت ہوئی۔

لارڈ موصوف راجہ شتاب رائے سے ملے۔ اور اس کو اپنے ہمراہ چھپرہ لے گئے۔ واپسی کے وقت راجہ نے کہا کہ دھیرج نرائن کے باپ اور بھائی سے میرا دوستانہ تھا۔ اس لئے اس کے ساتھ میں کسی قسم کی سختی نہیں کرسکتا۔ اور جب تک سختی کرکے معاملات کو یکسو نہ کیا جائے گا، انتظام درست نہ ہوگا۔ پس بہتر تدبیر یہ ہے کہ مظفر جنگ نائب صوبہ مرشد آباد کو یہاں بھیجکر حساب فہمی کرالیجئے، لارڈ موصوف نے اس تدبیر کو پسند کیا، اور کلکتہ پہنچکر مظفر جنگ کو عظیم آباد روانہ کیا۔

مظفر جنگ نے عظیم آباد پہنچکر ایک ایک سے حساب فہمی شروع کردی، آخر دھیرج نرائن گرفتار کیا گیا، اور بقایا کے عوض اس کی جاگیر کا انتظام چھین لیا، تاکہ اس کے ضروری اخراجات منہا کرکے بقیہ آمدنی بقایا کی ادائیگی میں محسوب ہوکر داخل خزانہ سرکار ہو۔ اسی دن سے راجہ شتاب رائے عظیم آباد کا تنہا ناظم ہوگیا۔

سنہ ۱۱۸۵ھ میں چیچک اور قحط نے تمام ملک کو ویران کرڈالا، لوگ یا تو مرگئے یا بھاگ گئے، اور اس لئے سرکاری آمدنی میں بعید کمی ہوگئی، مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو تو صرف روپے چاہئیں، خزانہ کی کمی نے گھبراہٹ پیدا کردی، فوراً تحقیقات کے لئے کمیشن مقرر ہوا۔ اور تحقیقات کے بعد معلوم ہوا کہ رعایا اور سرکار کے درمیان جو لوگ واسطہ ہوکر لگان وصول کرتے ہیں، وہی زیادہ خورد برد کرجاتے ہیں۔ اور غلطی سے شتاب رائے کو بھی اسی میں شمار کیا گیا۔

چنانچہ سنہ ۱۱۸۵ھ سے نیا انتظام یہ کیا گیا کہ تینوں صوبوں کو چھ ضلعوں پر تقسیم کرکے ہر ضلع میں ایک ایک انتظامی کمیٹی بنادی گئی جو ہر طرح کی نگرانی کرتی رہتی، عظیم آباد میں جو کمیٹی بنی، اس کا ایک ممبر شتاب رائے بھی تھا۔

محاسبہ سنہ ۱۱۸۶ھ میں لارڈ ہسٹنگ گورنر ہوکر آئے، اور آتے ہی مظفر جنگ اور شتاب رائے کی گرفتاری کا حکم بجرم خیانت جاری کردیا مگر احتیاط اس قدر برتی گئی کہ تا گرفتاری کسی کو اس کے متعلق خبر نہ ہو۔ آخر ماہ صفر سنہ ۱۱۸۶ھ میں شتاب رائے کو یہ حکم سنایا گیا، چونکہ دشمنوں سے زیادہ اس کے ہوخواہ تھے، اور انگریز افسر بھی ہمیشہ خوش رہے، اس لئے شتاب رائے کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی نہ کی گئی۔ اور ایک کشتی پر سوار کرکے کلکتہ روانہ

ہو گئے اور ایک پلٹن حفاظت کے لئے ساتھ کر دی گئی۔ انگریزی فوج عظیم آباد کی سرحد تک ان کی حفاظت کرتی رہی۔ مگر اس کے بعد صوبہ دار (فوجی عہدہ دار) ان کے ساتھ ساتھ کلکتہ تک گیا۔

بیشتر اس کے سنہ ۱۱۸۶ھ میں مسٹر ... نے بحیثیت عظیم آباد میں ایک دربار کر کے امور دیوانی سے راجہ شتاب رائے کی معزولی کا حکم سنایا، اور کونسل کے مشورہ سے ایک انگریز اس کام پر متعین ہوا۔

رہائی

راجہ شتاب رائے تین ماہ تک نظر بند رہا۔ لارڈ ہسٹنگ جب مرشدآباد سے واپس آئے، تو جمادی الثانی سنہ ۱۱۸۶ھ میں راجہ موصوف کو سوال و جواب کے لئے کونسل کے سامنے پیش کیا۔ ایک سال کے بعد راجہ موصوف کو عزت کے ساتھ بری کر دیا گیا۔ کونسل کی ممبری برقرار رکھی گئی، خلعت فاخرہ سے سرفراز ہوئے، ہاتھی اور جواہر انعام میں ملے۔ اور خوشنودگی کا پروانہ بھی عطا کیا گیا۔

اگرچہ شتاب رائے ہر طرح سے بری کر دیا گیا لیکن جو بدعنوانی اس کے ساتھ کی گئی، اس کا بڑا اثر اس کی صحت پر پڑا، اور کچھ کلکتہ کی آب و ہوا نے بھی اسے بے حد مضمحل کر دیا، چنانچہ وہ اسہال کے مرض میں مبتلا ہو گیا، اور جب عظیم آباد پہنچا تو بے حد ناتواں اور کمزور تھا۔

علالت اور وفات

ابتدا میں عظیم آباد کے مشہور طبیب مولوی فیض علی صاحب علاج کرتے رہے، جس سے افاقہ شروع ہو گیا تھا، مگر بعض ناعاقبت اندیش مصاحبوں کے ورغلانے سے دوا ترک کر دی اور پھر کچھ دنوں کے بعد ڈاکٹری علاج شروع کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے متواتر مسہل دے دے کر نہایت کمزور کر ڈالا۔

ربیع الثانی سنہ ۱۱۸۷ھ میں عماد الدولہ لارڈ ہسٹنگ عظیم آباد پہنچے۔ اور چاہا کہ شتاب رائے کو لیکر شجاع الدولہ سے ملنے جائیں، مگر بعذر علالت اس نے جانے سے انکار کر دیا۔

آخر جمادی الثانی سنہ ۱۱۸۷ھ میں راجہ شتاب رائے کا انتقال ہو گیا۔ اور اس کی لاش اہتمام کے ساتھ جلائی گئی، ماتم پرسی کے لئے گورنر کلکتہ سے عظیم آباد آیا۔ اور جو بدسلوکی اس وفادار خادم کے ساتھ کی گئی تھی، اس کی تلافی کے لئے لارڈ موصوف نے اس کے لڑکے کلیان سنگھ کو باپ کی جگہ کونسل کا ممبر مقرر کیا، اور اس کی جاگیر، ذاتی مشاہرہ بحال رکھا۔ اس کی ماں کے لئے کچھ وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ اور کچھ دنوں کے بعد عظیم آباد کی نظامت بھی سپرد کی گئی۔ انتظام الملک ممتاز الدولہ مہاراجہ کلیان سنگھ بہادر تہور جنگ اس کا خطاب ہوا۔

اپنے باپ کے مثل یہ بھی علم دوست تھا، خلاصۃ التواریخ اسی کی تصنیف ہے، جس میں امیر تیمور سے لیکر اپنے زمانہ تک کے حالات اس نے لکھے ہیں۔ اس کی دوسری تصنیف واردات قاسمی ہے۔ جو نظامت بنگالہ کی تاریخ ہے۔[1]

اخلاق حسنہ

راجہ شتاب رائے کی نسبت اس کے ہم عصر میر غلام حسین مصنف سیر المتاخرین کی رائے ہے کہ ہندوستان کے موجودہ رئیسوں میں سب سے بہتر اور ممتاز شخصیت کا مالک ہے اور باوجودیکہ ہمیشہ ملکی انتظام میں زندگی بسر کی، پھر بھی فوجی عہدہ داروں کی طرح کافی دلیر اور بہادر ہے۔

[1] ماخذ نمبر ۲ صفحہ ۱۰

دوسری جگہ لکھتا ہے، کہ حق یہ ہے کہ "راجہ بہت زیادہ اوصاف حمیدہ رکھتا تھا۔ اور اس عہد میں اکثر امرا سے ممتاز تھا، اور اخلاق میں ان پر فضیلت حاصل تھی۔

گو کہ اس کا ملنا جلنا بادشاہ، وزیر، اور بڑے بڑے افسروں سے تھا، لیکن غربا کے ساتھ ہمیشہ انکسار سے پیش آتا۔ زبان کا نہایت شیریں تھا۔ ذہانت کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی شخص اپنا مطلب ادا کرنا چاہتا تو ابتدا ہی میں اس کا مطلب سمجھ جاتا۔ پھر ممکن ہوتا تو اسی وقت پورا کر دیتا۔ ورنہ بڑے معقول طریقہ سے عذر خواہی کرتا۔

وہ صبح سے لیکر دوپہر تک، اور اول شب سے تہائی رات تک ہر قسم کے آدمی سے ملاقات کرتا۔ پھر بھی نہ تو مزاج میں ترشی پیدا ہوتی، نہ خشکی، نہ کبھی فحش کلمہ اس کی زبان سے کسی نے سنا۔ وہ ہر ہنر کا قدر دان تھا۔ اس لئے لوگ بہتر سے بہتر اشیا اس کے پاس لاتے اور زیادہ سے زیادہ قیمت پاتے۔

فیاضی

شیخ شرف الدین محمد نجف اشرف سے اسی سال کی عمر میں بنگالہ پہنچے، ایک سال تک نوابان مرشد آباد کے پاس پڑے رہے۔ مگر کسی نے ان کی طرف توجہ نہ کی، ناچار شجاع الدولہ کے پاس لکھنؤ جانے کے ارادہ سے پٹنہ پہنچے۔ راجہ شتاب رائے کو بھی معلوم ہو گیا۔ وہ تنہا ان سے ملنے چلا گیا۔ اور اس قدر ادب کے ساتھ ملا، کہ شیخ موصوف کو حیرت ہوئی۔ شام کی دعوت قبول کرا کر واپس آیا۔ شام کو شیخ موصوف جب اس کے مکان پر پہنچے۔ تو آپ کو بہترین فرش و مسند پر بٹھایا۔ اور خود ایک گوشہ میں بڑی عاجزی سے بیٹھ کر مؤدبانہ گفتگو کی۔ کھانے کے بعد رخصت کے وقت کمخواب کشمیری دوشالہ وغیرہ قیمتی کپڑوں کے دو خوان نذر کئے، اور خفیہ طور پر ایک ہزار روپیہ بطور مدد خرچ ان کے پاس بھجوا دیا۔ اس اخلاق کو دیکھ کر شیخ ممدوح نے حسرت سے کہا کہ کاش یہ اخلاق آج کل کے مسلمانوں میں بھی ہوتا۔

انتظامی قابلیت

راجہ شتاب رائے میں انتظامی قابلیت اس درجہ مکمل تھی، کہ اس کے دشمن بھی مدح کئے بغیر نہیں رہ سکے، آخر عمر میں راجہ موصوف سے میر غلام حسین کی ان بن ہو گئی تھی، پھر بھی ملکی معاملات کے نسبت اس کی یہ رائے ہے۔

"حق یہ ہے کہ صوبہ اودھ کے بندوبست میں اس نے کمال دکھایا، حالانکہ پچاس برس سے شجاع الدولہ کا خاندان اس پر قبضہ رکھتا تھا، پھر بھی اس قدر بدانتظامی پھیلی تھی کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔"

تحقیقاتی کمیٹی کی طرف سے جب ہشیار جنگ مسٹر جارج پٹنہ پہنچے تو راجہ موصوف کے خلاف بعض لوگوں نے اس کے بہت کان بھرے، چنانچہ بڑی سختی سے کارروائی شروع کی گئی، مگر راجہ چونکہ غیرت مند دل رکھتا تھا، اس لئے اس نے شروع ہی سے ہر چیز کا اس قدر مکمل بندوبست کیا تھا، کہ مسٹر موصوف نے جس قسم کے کاغذ طلب کئے، سب مہیا ملے۔ اور چونکہ راجہ موصوف نہ خود رشوت لیتا تھا نہ دوسروں کو لینے دیتا۔ اور نہ کسی قسم کی خیانت کرتا تھا۔ اس لئے آئینہ کی طرح ہر چیز صاف تھی۔ چنانچہ مسٹر موصوف اس سے بیحد متاثر ہوئے اور بڑے مداح ہو کر واپس گئے۔

جاسوسی کا انتظام

راجہ شتاب رائے نے جاسوسی کا بڑا معقول انتظام کیا تھا۔ دہلی سے لیکر بنگالہ تک اس کے جاسوس پھیلے تھے اور ہر قسم کی خبریں اس کے پاس روزانہ پہنچتی رہتی تھیں۔

چنانچہ ایک، نعمہ دلی کا رائے رایان ناگرمل دیوان شاہی جس کا مرتبہ امرا اور وزرا کے برابر تھا۔ اس کے ایک مصاحب نے "گیا" جاتا کے لئے جاتے وقت ناگرمل سے ایک سفارشی خط شتاب رائے کے نام طلب کیا۔ ناگرمل نے ٹالنے کے لئے کہا کہ تمہاری تو خود ان سے ملاقات ہے، خط کی کیا ضرورت ہے؟

جب اس نے اصرار کیا تو کہا کہ بات یہ ہے کہ میرے خط لیجانے سے تم کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، کیونکہ دلی میں جو ان کی حیثیت تھی، اسکو مد نظر رکھ کر خط میں القاب لکھوں، تو وہ ان کو ناگوار ہوگا۔ اور جس عہدہ پر وہ پہنچ گئے ہیں، اس کے مطابق لکھے، میرا نفس گوارا نہیں کرتا۔

غرض مصاحب راجہ شتاب رائے کے پاس عظیم آباد پہنچ گیا، اس نے بڑی خاطر تواضع کی۔ اور ہر قسم کا آرام پہنچایا۔ چونکہ شتاب رائے کو اس گفتگو کی خبر اپنے وکیل دہلی کے ذریعہ ہو گئی تھی۔ اس لئے اس نے تعجب سے پوچھا۔ کہ کیوں صاحب! باوجود اس قدر محبت اور مروت کے رائے رایان صاحب نے مجھے ایک رقعہ سے بھی سرفراز نہ فرمایا؟ اس نے جواب دیا کہ چونکہ آپ سے میری خود ملاقات تھی، اس لئے ان سے خط لینے کی ضرورت نہیں سمجھی، راجہ نے کہا کہ صاحب! صحیح بات یہ نہیں ہے۔ مصاحب بھی سمجھ گیا۔ اس نے کہا کہ جب آپ کو معلوم ہی ہے۔ تو عیاں راچہ بیان!

شتاب رائے نے اس کا علاج یہ کیا کہ یہ مصاحب جب واپس جانے لگا، تو اسی کے معرفت عطر اور لباس فاخرہ جو خاص طور پر بنگالہ کا تیار کیا ہوا تھا، ہاتھی کے دانت کا پلنگ پایہ، فرنگی گھڑیاں، بلوری شمعدان، آئینہ کلاں کے علاوہ چین و یورپ کے دوسرے نوادر جن کی قیمت دس بارہ ہزار تھی، تحفہ کے طور پر رائے رایان کو بھیجے۔ اور خط میں لکھا کہ آپ کے خط آنے سے چونکہ میری عزت افزائی ہوتی ہے، اس لئے آپ کے اخلاق بزرگانہ سے امیدوار ہوں کہ دو لفظ سے ضرور یاد فرما کر ہمعصروں میں مؤقر فرمائیں گے، رائے رایان اس سلوک سے بڑا شرمندہ ہوا۔ سیر المتاخرین میں ہے"۔

وسلوکے کرد کہ او خود عرق عرق انفعال گردید | اور اس کے ساتھ جو برتاؤ کیا اس سے وہ (رائے رایان) شرم سے پسینہ پسینہ ہو گیا۔

ہمدردی خلائق ۱۱۸۳ھ میں تمام صوبہ بہار اور بنگال میں سخت قحط پڑا، مخلوق پریشان ہو گئی، اس وقت شتاب رائے نے جو طریقہ اختیار کیا، وہ اس قدر پسندیدہ تھا کہ آخر دلندیزی (ڈچوں) اور انگریزوں کو بھی اس پر عمل کرنا پڑا۔ اس وقت بنارس میں غلہ ارزاں تھا۔ شتاب رائے نے اپنی مملوکہ کشتیاں اور دوسری کرایہ کی لے کر بنارس بھیج دیں۔ وہ ہر دس دن پر بنارس سے عظیم آباد غلہ سے بھری ہوئی پہنچا کرتی۔ اور بنارس ہی کے نرخ پر عظیم آباد میں فروخت کیا جاتا، غریبوں کے لئے یہ انتظام تھا کہ ایک باغ میں ان کو جمع کر دیا گیا۔ اور دونوں وقت غلہ کے علاوہ جلانے کے لئے لکڑیاں اور کچھ نقد دوسری ضروریات کے لئے بھی دیا جاتا۔ قحط کا اس قدر معقول انتظام کیا کہ بنگالہ کا نائب ناظم مظفر جنگ بھی نہ کر سکا، اور یہ بندوبست قحط کے آخری لمحہ تک رہا۔

حوصلہ افزائی راجہ شتاب رائے عموماً کاریگروں اور تاجروں کی ہمت افزائی کیا کرتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ اس عہد میں تجارت کو بڑا فروغ ہوا۔ ہر تاجر جو مال لاتا، اس کو حسب خواہش قیمت کے علاوہ معقول انعام بھی دیتا۔ اس کا قاعدہ تھا کہ سال میں ایک دو دفعہ تمام یورپین افسروں اور شہر کے امرا کو تازہ میوے بھیجا کرتا تھا۔ جو خراسان اور ایران سے آتے، راجہ نے یہ خیال کر کے عوام تک یہ میوے نہیں پہنچتے، یہ انتظام کیا کہ میوہ فروشوں

کو یہ حکم دیا کہ میوے منگوا کر بازار میں فروخت کریں۔ اس کے لئے معقول طریقہ سے ان میوہ فروشوں کی مدد کرتا۔ اور آخر میں جو میوہ فروخت ہونے سے رہ جاتا، وہ خود خرید لیتا۔ تاکہ ان کو نقصان نہ پہنچے۔

مروت

راجہ شتاب رائے میں حد درجہ کی مروت تھی اور عام طور پر سب کے ساتھ یکساں اس کا استعمال کرتا تھا۔ چونکہ راجہ موصوف کا وطن شاہ جہان آباد دہلی تھا۔ اس لئے جو شخص بھی وہاں سے آتا تھا، عام اس سے کہ اس کی شناسائی پہلے سے ہو یا نہ ہو۔ اس کی بڑی خاطر تواضع کرتا تھا۔ اور یہی سبب ہے، کہ دہلی کے ہر قسم کے اشخاص قدردانی کے سبب ایک دفعہ اس سے ضرور ملتے۔ یہ اخلاق دوستوں ہی تک محدود نہ تھا، بلکہ بعض وہ لوگ جو کسی سبب سے اس سے ناراض تھے، اور انگریزوں سے راجہ موصوف کے خلاف زہر اگل کر اس کے صلہ میں کسی عہدہ پر پہنچ گئے تھے، اور پھر کسی بددیانتی کے جرم میں ماخوذ ہو گئے۔ تو شتاب رائے نے بڑی جانفشانی سے ان کی مخلصی کرائی۔ اور خود ان کی ضمانتیں کیں۔

دیانت

دیانت کا یہ حال تھا، کہ کمپنی کے تمام امور مفوضہ میں کبھی کسی قسم کی بددیانتی نہیں کی، نہ کسی قسم کی رشوت لی۔ بلکہ تمام حساب و کتاب آئینہ کے طرح صاف رکھتا تھا۔ اور یہی سبب ہے، کہ کبھی کسی نے اس کا دامن داغدار نہ دیکھا۔ اور آخری عمر میں جو گرفتاری اور مطالبہ "حساب فہمی" کا معاملہ پیش آیا تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ در اصل گنہ گار مظفر جنگ تھا۔ اس کے طرفداروں نے جس میں ایک انگریز بھی شامل تھا محض حسد سے راجہ شتاب رائے کو بھی اس میں شامل کر لیا۔ اور چونکہ اس کا معاملہ صاف تھا، اسی لئے حساب فہمی کے بعد عزت کے ساتھ بری ہو گیا۔ خلعت اور انعام سے سرفراز کیا گیا۔

ترقی آبادی و زراعت

راجہ صاحب کو عظیم آباد کی ترقی کا خیال خاص طور پر رہتا تھا، انہوں نے اچھے اچھے مکانات و باغات تیار کرائے، چنانچہ خود اپنے لئے ایک اعلیٰ درجہ کی حویلی بڑے تکلف سے تیار کرائی تھی۔ ماہرین فن کو ہر طرح سے ترغیب دیتے کہ وہ عظیم آباد آکر آباد ہو جائیں۔ اور اس کے لئے ہر طرح کی سہولت بہم پہنچاتے۔ چنانچہ ایک خاص قوم کو جو پھول اور پھل کے متعلق کامل واقفیت رکھتی تھی، دہلی اور لاہور سے طلب کر کے یہاں آباد کرایا۔ اور ان کو آمادہ کیا کہ یہاں ہر قسم کے میووں کی کاشت کر کے بازار میں عام طور سے فروخت کریں۔ سردے، خربزے اور دوسرے میووں کی بیج لکھنؤ، آگرہ اور کابل سے منگوا کر دیئے۔ اسی زمانہ سے انگور، گنے، اور شاہ جہاں آبادی کیونلے وغیرہ کا رواج عظیم آباد میں ہوا۔ نہایت عمدہ، خوش ذائقہ اور بکثرت بازار میں فروخت ہونے لگے۔ چنانچہ اعلیٰ درجہ کے انگور روپیہ کے دو سیر تین سیر عام طور پر بازار میں ملتے تھے[1]

خیرات

راجہ موصوف کو اس معاملہ میں بھی خاص خیال رہتا تھا کہ کوئی شخص اس در سے خالی واپس نہ جائے۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ مسلمان فقراء سے اس کو عقیدت زیادہ تھی۔ غیر قوموں کو بھی کسی وقت محروم نہیں کیا، البتہ ایسے نمائشی فقیروں سے ہمیشہ بچتا رہا جو سادھو اور بھیک منگا کے شکل میں جبراً آدھمکتے تھے۔

---

[1] برٹش گورنمنٹ کے اس امن و امان اور عہد معدلت میں بھی کاش عظیم آباد میں میوے ایسا ہی ارزاں ملتے۔

عقائد

قومیت کے لحاظ سے اگرچہ وہ ہندو تھا، لیکن طرزِ معاشرت اور عقائد کے لحاظ سے وہ ایک مسلمان نظر آتا تھا۔ چنانچہ اس کا لباس، مکان کی سجاوٹ ... بار کا دستور، اور دسترخوان پر کھانوں کا طریقہ بالکل مسلمانوں جیسا تھا۔ (جس طرح کہ آج بھی کایستھ لوگ ہیں)

عقائد کے لحاظ سے بظاہر مسلمانوں کے خیال سے متفق تھا۔ ہر پہلو بدلتے وقت یا علی کا لفظ زبان پر لاتا۔ شرک (بت پرستی) سے ہمیشہ احتراز کرتا۔ چنانچہ ایک دفعہ بنگال جاتے وقت راستہ میں کوئی پوجا کی جگہ آگئی۔ اس کے بعض مصاحبوں نے بڑا زور دیا کہ راجہ وہاں جائے مگر اس نے صاف انکار کر دیا، اور دو چار سو روپے ان کو دیکر کہا کہ تم کو بہت شوق ہے تو میری طرف سے تم ہی ہو آؤ۔

شیعہ مسلمانوں کی طرح ہمیشہ عزاداری کا بندوبست کرتا، تعزیہ بنواتا۔ اور اس کا بڑا ادب کرتا۔ ۲۱ رمضان کو حضرت مولیٰ علیؑ کی شہادت کے دن بڑے اہتمام سے اعلیٰ درجہ کا کھانا پکواتا، اور فاتحہ کے بعد تقسیم کراتا۔

بعض لوگوں نے کہا کہ مہاراجہ آپ اس قدر تکلیف کیوں کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر تاخیر کر کے خوان تقسیم کرائیں تاکہ خوان سے حضرت وصی کی کرامت کا ظہور ہو جائے۔ (غالباً اس عہد میں ایسے تبرک کی نسبت لوگوں کا خیال تھا کہ نمک یا دیگر شے بطور کرامت اور ظاہر ہو جاتی ہے) جواب دیا کہ اس قسم کا معجزہ تو کافر (منکر) طلب کرتے ہیں، میں تو ان کا عقیدت مند ہوں، مجھکو اس کی حاجت نہیں۔

فہم دین

طرزِ معاشرت اور عقائد کی اس قسم کی ظاہری نمائش انگریزوں نے بھی اپنے شروع عہد حکومت میں بہت کی، اس لئے ناظرین یہ خیال کر سکتے ہیں کہ طرزِ معاشرت کی تقلید تو سلطنت کا اثر تھا۔ اور عقائد کی نمائش محض ایک سیاسی چال بھی، لیکن بعض مخصوص واقعات ایسے بھی گزرے ہیں جو اس کی تردید کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ خلوت میں ایک مقرب برہمن نے اس سے کہا کہ میں نے تمہارے لئے ایک اسم کا وظیفہ تمہارے ستاروں کو دیکھ کر تجویز کیا ہے۔ مہاراجہ نے کہا کہ مجھکو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں پہلے ہی سے ایک وظیفہ پڑھ رہا ہوں، برہمن کے سوال پر مہاراجہ نے ٹالنا چاہا۔ مگر جب اس نے بے حد اصرار کیا تو مہاراجہ نے کہا کہ وہ نام پاک "اللہ" کا ہے۔

برہمن نے تائید کے لئے مہاراجہ سے کہا کہ حضور رام اور رحیم ایک ہی ہے۔ مہاراجہ نے کہا کہ نہیں دونوں میں فرق ہے۔ برہمن نے پھر اصرار سے دریافت کیا، جواب دیا کہ رام کہنے سے خدا کے علاوہ ایک اور شخص کا بھی خیال گزرتا ہے، جو دسرت راجہ کا لڑکا تھا، بخلاف اللہ کے کہ اس میں باپ بیٹے کا وہم تک نہیں ہوتا۔

میرے خیال میں یہ راجہ عقائد کے لحاظ سے موحد اور صوفی منش ہندو تھا، جیسا کہ اس عہد میں اس خیال کے بکثرت ہندو پیدا ہو گئے تھے، کیونکہ اس زمانہ کے صوفیوں اور بزرگوں کی صحبت سے اکثر غیر مسلم متاثر تھے۔ اور اگر انگریزوں نے نفاق انگیزی کی پالیسی نہ اختیار کی ہوتی، تو یہ نظارہ آج بھی دکھائی دیتا۔

ادبی ذوق

مہاراجہ شتاب رائے کا ادبی ذوق بھی بہت بلند تھا، شاعروں کا قدردان اور خود بھی شاعر تھا، ان کا لڑکا جو راجہ تخلص کرتا تھا، میر غلام حسین ضاحک کا شاگرد تھا، وہ لکھنؤ کے بعد پٹنہ چلے آئے تھے، اسی طرح اشرف علی فغاں بھی مہاراجہ کے دربار میں

پہنچ گئے تھے۔ اور وہ ان کی بہت قدر کرتا تھا۔

میر باقر حزیں شاگرد مرزا جان جاناں نواب سعادت جنگ رئیس عظیم آباد کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ اور وہیں انتقال کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عظیم آباد میں شعرائے دہلی کی بڑی قدر تھی، اور شعر و سخن کا خوب چرچا تھا[1] اور یہ تمام ذوق ادب راجہ رام نرائن، اور مہاراجہ شتاب رائے کا پیدا کردہ تھا، اس وقت ان لوگوں کی قدردانی سے عظیم آباد پٹنہ دھلی اور لکھنو کا ہم پلہ ہو رہا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ راجہ رام نرائن اور مہاراجہ شتاب رائے کی صوبہ داری میں ہمارے ادبیات کی وہ عزت افزائی ہوئی کہ تاریخ اس کو کسی طرح فراموش نہیں کر سکتی۔ راجہ رام نرائن شیخ علی حزیں کے شاگرد تھے۔ اور اس دور کے اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ وہ اردو کے عاشق اور "موزوں" ان کا تخلص تھا۔

راجہ شتاب رائے بھی علم و ادب کا شیفتہ تھا، دہلی اور دوسرے مقامات سے شعراء و ادبا آتے تھے۔ اور گوہر مراد لے کر مالا مال واپس جاتے۔ اور اس طرح اکناف ہند میں پٹنہ کا نام روز روشن کی طرح مشہور ہو گیا۔ اس دور میں بہت سے باکمال دہلی سے آئے، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، نواب اشرف علی فغاں جو احمد شاہ کے سوتیلے بھائی بھی تھے۔ ان کی بہت ممتاز شخصیت تھی۔ اور بڑے روایات کے حامل تھے۔ اور ان کا اسلوب بیان بڑا ستھرا تھا۔ انہوں نے اردو کے لئے جدید شاہ راہ پیش کی، ان کی ہدایات سے متاثر ہو کر اردو بہت صاف ستھری اور نقائص سے پاک ہو گئی۔ فغاں کا قلمی دیوان اصلاح لائبریری دسنہ (بہار) میں محفوظ ہے۔

راجہ شتاب رائے کے صاحبزادے راجہ بہادر راجہ تخلص کرتے تھے، علم و ادب کا ذوق اور داد و دہش کا جذبہ ورثہ میں ملا تھا۔ ان کے عہد حکومت میں پٹنہ کی بڑی شہرت ہوئی۔ اور شاعروں کی کثرت نے اردو کا مرکز عظیم آباد کو بنا دیا، چنانچہ میر شیر علی افسوس اور میر امن دہلوی اسی دور کے باکمال افراد تھے۔ جو ہجرت کر کے راجہ کے خوان کرم سے فیضیاب ہو رہے تھے[2]

غرض مہاراجہ شتاب رائے اور اس کے جانشیں ہی تھے۔ جن کے ادبی ذوق نے عظیم آباد کو علم و ادب کا مرکز بنا رکھا تھا۔

هرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

---

[1] تاریخ ادب اردو مطبوعہ لکھنؤ۔ [2] خطبہ صدارت صلاح الدین بخش ۱۹۳۰ء۔

"ہم"

از حضرت حافظ مشکی پوری

پہونچتے ہیں سرِ عرشِ بریں ہم
جھکا دیتے ہیں جب اپنی جبیں ہم

فرشتوں کا وہی بن جائے قبلہ
زمیں پر جس جگہ رکھ دیں جبیں ہم

لئے بیٹھے رہے تم اپنی تسبیح
خلافت پا گئے اے نکتہ چیں ہم

انگوٹھی دستِ قدرت کی ہے عالم
اور اس انگشتری کے ہیں نگیں ہم

لکھا کرتے ہیں اپنی آپ قسمت
نہیں پڑھتے خطِ لوحِ جبیں ہم

ہمارے حق میں ناکامی ہے مہمیز
رکاوٹ ہو تو بڑھ جائیں کہیں ہم

قصور اپنے عمل کا ڈھونڈتے ہیں
گلہ تقدیر کا کرتے نہیں ہم

بنا ڈالا اسی دنیا کو جنت
جو آئے خلد سے سوئے زمیں ہم

ہمارے دل کے اندر کیا نہیں ہے؟
حرم یا دیر کیوں جائیں کہیں ہم

بتائیں کیا؟ وطن اپنا کہاں ہے؟
مکانِ لامکاں کے ہیں مکیں ہم

یہاں دو دن کو بھی بہلانے آئے
ترے مہمان بن کر اے زمیں ہم

ترے رازوں سے کیا واقف ہو کوئی؟
ہیں کچھ محرم تو اے پردہ نشیں ہم

حقیقت آپ کی بے پردہ ہو جائے
جو آنکھوں سے ہٹا لیں آستیں ہم

پہونچتے ہیں کہاں تک؟ دیکھ لینا!
بظاہر تو چلے زیرِ زمیں ہم

حقیقت میں نظر جب ڈالتے ہیں
تو پاتے ہیں ہر اک شئے کو حسیں ہم

ذرا ٹھہرو! ڈراما ختم ہے اب
دکھا دیں اک نگاہِ واپسیں ہم

بہت مجبور ہونے پر بھی حافظ
ہوئے مختارِ رب العالمیں ہم

شاعراتِ بہار

از جناب سید بہار الدین احمد فیض نیانوی بی اے (آنرز) بی ایل سابق ایڈیٹر رسالہ "موج نسیم"

صوبۂ بہار میں اُردو شاعری نے جو ترقی کی، اظہر من الشمس ہے، صرف طبقۂ ذکور ہی میں نہیں بلکہ خواتین میں بھی جہاں علم کی روشنی رہی وہاں شعر وسخن کا چرچہ رہا۔ مگر تذکرہ نویس کے لئے مشکل یہ پیش آتی ہے کہ حیا پرور پردہ نشیں خواتین گذشتہ دور میں اپنے کلام کی اشاعت کو غالباً گوارہ نہ کیا۔ اس لئے اُن کے کلام کا پتہ چلانا بہت دقت طلب ہے۔ موجودہ دور میں لکھنے والی خواتین ہیں تو بہت مگر شعر وسخن کا ذوق رکھنے والیاں نسبتاً کم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت زیادہ شاعرات کا نام شامل تذکرہ نہ ہوسکا۔
مجھے اعتراف ہے کہ مضمون بہت تشنہ رہ گیا اور جتنی تحقیق وکاوش اس موضوع کے لئے چاہیئے تھی نہ ہوسکی، بہرحال میں نے کوشش کی اور جو کچھ ہوسکا ہدیۂ ناظرین ہے:-

(۱) **جمیلہ** بی بی راضیہ خاتون نام، شمس العلما مولوی کبیر الدین صاحب کی بیٹی اور خان بہادر مولوی خدابخش خانصاحب مرحوم کی زوجۂ محترمہ، اکثر غزلوں میں راضیہ اور خاتون بھی تخلص کیا ہے۔ شعر وسخن کا بہت اچھا مذاق تھا۔ علم وادب کے گہوارے میں پلیں۔ قدرت نے وابستہ بھی ایسے کے دامن سے کیا جس کے نام پر دُنیائے علم فخر کرتی ہے۔ آسمان علم وادب کی ہلال تھیں۔ بدر بن کے چمکیں۔ مشق سخن ابتدائے سن سے شروع ہوئی اور آخر عمر تک جاری رہی۔ کاملان سخن جمع ہوتے اور پس پردہ سے اپنا کلام سناتیں اُردو اور فارسی میں بااستعداد تھیں، ان کا قلمی دیوان آٹھ ضخیم جلدوں پر محیط ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

جنوں تو سچ بتا یہ دشت کیا صحرائے بطحا ہے — کشش ہے اس جگہ کے ہر خس وخاشاک سے پیدا

نہ جب زندگی میں ملی مجھ کو راحت — تو کیا بعد مرنے کے آرام ہوگا

نہیں تھا گر تصوّر یار کا اے دل تو پھر کیا تھا — ہوئی تصویر کیسے آہ آتش بار سے پیدا

تلووں میں لگا لہو کو میرے — اے یار یہ خوں بہا ہے میرا

جل گیا دل اپنی آہوں کے شرر سے اے جنوں — یک بیک شعلہ سا بھڑکا اور بھڑک کر رہ گیا

نہ رو اب تو خاتون یوں غل مچا کر — کہ بلبل کا بھی چین جاتا رہے گا

یوں تو اس نے اِدھر اُدھر دیکھا　　میری جانب نہ بھر نظر دیکھا
اس سے مت پوچھو پتہ دلدار کا　　مہرباں ہوجیسا کا نلوہ خار کا
مہرباں ہوکے جو پوچھا کہ کہو حال ہے کیا　　قصۂ دردِ الم مجھ سے سُنایا نہ گیا

---

(۲) حضرت بی بی روشن حضرت مخدوم شاہ احمد عبدالحی بن حضرت تاج العارفین کی بیٹی اور حضرت قاضی رشید عالم کی زوجہ بڑی عالمہ اور زاہدہ تھیں شادی کے قبل ہی ان کی علمی شہرت کا غلغلہ زنان خانوں سے باہر تک پہونچ چکا تھا۔ یہی وجہ ہوئی کہ قاضی شاہ رکن عالم نے اپنے صاحبزادے قاضی رشید عالم کی شادی بی بی روشن سے کی اور پھلواری شریف کی سولہ آنہ بستی کو خرید کر مہر میں دیا۔ چنانچہ اس وقت بھی اس موضع عالمگیر پور پھلواری کا چوتھائی سے زیادہ حصہ اُن کے وارث حسان الہند حضرت تمنا عمادی کے قبضہ میں ہے

عربی اور فارسی میں بہت استعداد تھی شعر وسخن کا بھی فطری ذوق تھا۔ شادی بیاہ کے لیے بہت سے گیت بنائے چنانچہ ان کے بنائے ہوئے گیت اب تک پرانی عورتوں کو یاد ہیں اور عام طور سے بھی گائے جاتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

مرا بہ رحمت حق تکیہ باشد ایں نہ روشن　　کہ از گناہ محشر جز دل وحشت نمی دارم
ہست بے روئے تو ہر روزم شب یلدا مرا　　یا رسول اللہ بنما جلوۂ زیبا مرا
ذکر نام تو وردِ جان من است　　یاد تو مغز استخوان من است

اُردو

کیا کہوں فرقت میں کس کس طرح گریہ ہے　　دوران اشکوں کا جاری ایک دریا ہوئے ہے
تیج جس سر کے ترے گیسو کا سودا ہوے ہے　　گھر بستی یا ہر محل صحرا بہ صحرا ہوئے ہے
اس تڑپنے کا مزہ مت پوچھو روشن ہائے ہائے　　کیا کہیں جس وقت دل اپنا تڑپتا ہوئے ہے
بن نبی کے ایسی اندھیاری ہے دُنیا آنکھ میں　　کچھ بھی آوے ہے نہیں روشن نظر میرے تئیں

ان کی وفات ۱۸ شوال روز پنجشنبہ ۱۲۴۷ھ کو ہوئی۔

(۳) حضرت بی بی طاہرہ حضرت تاج العارفین مخدوم شاہ محمد مجیب اللہ کی پوتی اور حضرت شاہ برکت اللہ کی زوجہ بڑی عالمہ تھیں۔ درسیات کی کتابیں تقریباً تمام تھیں بعض مختلف فیہ فقہی مسائل پر چھوٹے رسالے

بھی لکھے جو خانقاہ عمادیہ پٹنہ سیٹی کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ شعروسخن کابہت اچھا ذوق تھا۔ فارسی میں بہت بلند اور اردو میں بطور تفنن طبع کچھ کہہ لیا کرتی تھیں۔ اُن کے شوہر نے اس شغلے کو ناپسند کیا۔ اس لئے اونہوں نے اپنا کلام نذرِ آتش کردیا۔ اُن کے صاحبزادے حضرت شاہ وجیہ اللہ قدس سرہٗ نے ان کے دو تین شعر فارسی کے اپنی ایک بیاض میں لکھ رکھے تھے جس میں کا ایک مطلع یہ ہے:۔

بہ شمعِ عشق تو پروانہ دارم ببیں یارب کہ من چوں جاں سپارم

افسوس کہ اُردو کلام کا کوئی نمونہ نہ مل سکا۔ آپ کی وفات ۸ رمضان ۱۳۱۵ھ میں ہوئی۔

(۴) غریب — امیر النساء بیگم نام۔ میر برکت علی عظیم آبادی کی دختر نیک اختر تھیں۔ میر صاحب پٹنہ کے محلہ مغلپورہ کے بسنے والے اور گھر کے خوش حال تھے۔ امیر النساء بیگم کی تعلیم و تربیت معقول ہوئی۔ شعروشاعری میں مشہور مرثیہ گو ذبیح کو اپنا استاد بنایا اور انہیں سے مرثیہ اور سلام کہنا سیکھا۔ غزلیں بھی کہتی تھیں۔ نواب نصیر حسین خیال مرحوم نے ہماری عورتیں کے عنوان سے ندیم ماہ دسمبر ۱۹۳۴ء میں ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں ان کا ایک شعر نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

کھلتا نہ تا بہ مرگ مرا یہ معاملہ رسوائے شہر مجکو دل زار نے کیا

صاحب تذکرۂ شمیم سخن نے بھی اُن کا ایک شعر لکھا ہے۔

لو اور وہ تو جلنے لگا میرے نام سے دل سرو آب تو آہ شرر بار نے کیا

(۵) منیر — بی بی منیر النساء نام۔ حضرت شاہ عنایت حسینؒ کی صاحبزادی تھیں۔ سنہ ۱۲۳۰ھ میں پیدا ہوئیں۔ اپنے والدین کے ساتھ برابر لکھنؤ میں رہیں۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ حضرت شاہ لیاقت حسین کمل پوش چشتی کے ساتھ بیاہی گئیں۔ بانوے ۹۲ سال کی عمر پاکر ۱۳۲۲ھ میں راہی ملک بقا ہوئیں۔ لائق باپ نے دینیات کی کافی تعلیم کے ساتھ ساتھ اُردو اور فارسی ادب کا ذوق پیدا کرا دیا تھا۔ باضابطہ طور پر کبھی کسی کو اپنا کلام نہیں دکھایا۔ اپنے والد ہی سے اصلاح لے لیا کرتی تھیں۔ ان کے ابتدائی کلام کا ایک مجموعہ موضع مجوا نواں ضلع پٹنہ میں اُن کے پوتے رئیس الحق صاحب کے پاس موجود ہے۔ چند منتخب اشعار درج ذیل ہیں:۔

کرتی ہوں رات دن میں زیارت رسول کی پھرتی ہے اپنی آنکھوں میں صورت رسول کی

منیر اپنے دل کو سمجھتی ہے پتھر نگینہ تو اس کو بنادے الٰہی

نہ رکھو ہجر میں بیمار مجھ کو پلا دو شربت دیدار مجھ کو

رہوں کبتک جدائی میں تڑپتی بلالو جلد اے سرکار مجھ کو

منیر بوندی ہے اپنے نبی کی ڈیوڑھی کی کسی کے در سے ہے اس کو تو کوئی کام نہیں

(۶) **حضرت بی بی ولیہ** پھلواری شریف کی رہنے والی۔ نام ہی کی نہیں بلکہ حقیقت میں ولیہ تھیں، بڑی زاہدہ و مرتاض۔ علم تصوف میں اچھی دستگاہ بہم پہونچائی تھی۔ ان کے معلومات اور مکاشفات اُن کے وقت ہی میں بہت شہرت پا چکے تھے۔ جس کے متعدد مجموعے پھلواری کے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں۔ عربی کی تھوڑی اور فارسی کی بہت معقول لیاقت رکھتی تھیں۔ حضرت مولانا محمد وارث رسول نما بنارسی قدس سرہ کی شان میں اُن کا ایک مشہور قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے:-

نازم کہ در روز محشر چہ باشد — کہ جرم و گناہم گذشت است ازحد

اُردو میں دوہوں کے وزن پر ان کے بعض اشعار بہت مشہور ہیں:-

کون سی تدبیر بتادیں — اون اپنے کن ہم کو بلادیں

حضرت کی ڈیوڑھی جو پادیں — سیر جھکا کے آنکھ لگادیں

۱۹ جمادی الاولی ۱۱۳۹ھ کو آپکا وصال ہوا۔ آپکے صاحبزادے حضرت مخدوم شاہ آیت اللہ شورش مشہور بزرگ اور صاحب دیوان شاعر گذرے ہیں۔

صوبۂ بہار کی بعض طوائفیں بھی شاعرہ تھیں۔ شریف خواتین کے ساتھ ان کا تذکرہ خلاف ادب سمجھا اسلئے علحدہ لکھتا ہوں:-

(۷) **امیر** امیر بیگم نام۔ پورنیہ کی مشہور طوائف تھی۔ اُردو کی اچھی استعداد رکھتی تھی۔ آج سے تقریباً پچاس سال قبل اس کے عروج کا زمانہ تھا۔ تذکرہ شمیم سخن مرتبہ عبدالحی صفا بدایونی وکیل میں صرف دو شعر ملے۔ ہدیۂ ناظرین ہیں۔

کھل گیا رازِ نہاں پیتے ہی اِک ساغرِ عشق — اب شرف لے گئے غافل ترے ہشیاروں پر

عرصۂ محفل میں اس کا قرب بھی مل جائیگا — اپنی جا ہم ڈھونڈ لیں گے صاحبِ محفل کے پاس

(۸) **حسن** گنا جان نام۔ دربھنگہ کی رہنے والی ۱۸۹۰ء سے قبل دادِ سخن دیتی تھی۔ ہنر بھی تخلص کرتی تھی کلام پاکیزہ ہوتا تھا۔ ملاحظہ ہو:-

یا الٰہی کیا ہوئے وہ میرے داغ آرزو — کچھ اندھیرا سا نظر آتا ہے مجھ کو دل کے پاس

قاصد لیلیٰ بنا تھا نجد میں شور جرس — قیس آیا بے طلب کب پردۂ محمل کے پاس

ستم بگا نام۔ بنارس کی رہنے والی۔ پٹنہ میں آکر بس گئی تھی۔ اس کا زمانہ بھی ۱۸۹۰ء سے قبل ہے: تذکرے میں اس کی ایک غزل کا مطلع اور ایک شعر ملا۔ اُسی کو نقل کرتا ہوں:-

کشتی کون ہوئے دل نگہِ یار میں آج — تیغ سنتا ہوں کہ ہے دستِ ستمگار میں آج

صنعف کہتا ہے قدم یاں سے نہ آگے رکھنا شوق کہتا ہے کہ رہ کوچۂ دلدار میں آج

(۱۰) **گل** نواب جان نام۔ آرہ کی مشہور طوائف تھی۔ اس کا زمانہ بھی ۱۸۶۹ء سے قبل ہے۔ صاحب تذکرۂ شمیم سخن نے اس کا صرف ایک شعر لکھا ہے۔ اسی کو نقل کرتا ہوں ؎

کیوں شب ہجر کا کھٹکا نہ ہو میرے دل کو کھل کے زلف آئے ترے رخ پہ اگر وصل کی رات

(۱۱) **لطیف** اللہ جوائی نام۔ پٹنہ اس کا وطن تھا۔ مگر کچھ دنوں کے لئے علی گڑھ چلی گئی تھی۔ تذکرہ میں اس کا بھی ایک شعر مل گیا ؎

آنے کا اس پری کے مجھے اشتباہ ہے دروازے کی طرف مری ہر دم نگاہ ہے

(۱۲) **ناز** گلاب نام۔ آرہ میں رہتی اور وہاں کی مشہور طوائف تھی، شعر و سخن کا ذوق تھا۔ خواجہ فخرالدین حسین سخن کی شاگرد تھی۔ اس کے دو اشعار ملے۔ درج ذیل ہیں:-

امید زیست کیا، نفس واپسیں ہے اب پھر جذب دل دکھائیگا اپنا کمال کب

فرقت تیغ نگاہ یار میں نیم جاں کی طرح تڑپاتی ہے روح

(۱۳) **ناز** یہ دوسری ناز ہے۔ بندی جان نام۔ عظیم آباد کی رہنے والی طوائف تھی۔ انگریزی، و فارسی میں با استعداد اور اردو میں کافی دستگاہ رکھتی تھی۔ سوئی کا کام بھی خوب کرتی تھی۔ حکیم آغا حسین ازل کی شاگرد تھی۔ دو شعر اس کے بھی سن لیجئے ؎

اے آسمان میرے نالوں سے ڈر تو ارادہ یہ کھتے ہیں اب لامکاں کا

وہ خنجر بہ سر دونوں حاضر ہیں اس دم ارادہ ہو دل میں گر امتحاں کا

موجودہ دور میں بھی بعض خواتین کو شعر و سخن کا ذوق ہے دو تین کے حالات ملسکے ہد یہ ناظرین ہیں:-

(۱۴) **زبیدہ خاتون** ہمشیرہ سید احمد حسین صاحب ہڈ ماسٹر۔ بنیا میں رہتی ہیں۔ غالباً زاری تخلص کرتی ہیں۔ کلام پاکیزہ اور شوخ ہوتا ہے۔ طبیعت میں خداداد روانی معلوم ہوتی ہے۔ رسالہ فطرت راجگیر میں ان کی ایک نظم "درشن" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے اس کا ایک بند ہدیۂ ناظرین ہے۔

جب صبح کی نظریں پڑتی ہیں خورشید کے روئے تاباں پر جس وقت کرن لہراتی ہے لیلائے شب کے داماں پر

جب بارش رحمت ہوتی ہے یکساں ہر گبر و مسلماں پر جب نور کی چادر ڈھک جاتی ہے شب کی زلف پریشاں پر

میں تیرا درشن کرتی ہوں ہر صبح کو "پردۂ امکاں" پر یہ سا تیرا درشن کرتی ہوں

(۱۵) عظیم النسا رضا — سبزی باغ پٹنہ۔ اخبار اتحاد پٹنہ کی کسی اشاعت میں نئے سال کا پیغام کے عنوان سے ان کی ایک نظم شائع ہوئی تھی۔ اس کا پہلا بند ہے:-

بسے نوروز کہتے ہیں یہ دن ہر سال آتا ہے
ہمیں ہر سال اگر یہ نئے نغمے سُناتا ہے

یہ دن بے انتہا تازہ امیدیں ساتھ لاتا ہے
کہ دل گذری ہوئی ناکامیوں کو بھول جاتا ہے

جو سچ پوچھو تو یوں ہر روز ہی نوروز ہوتا ہے
مگر اک سال بعد آئے تو دل افروز ہوتا ہے

(۱۶) وفا — عائشہ بیگم نام۔ سہسرام کی رہنے والی ہیں۔ رسالہ نصرت راجگیر میں ان کی ایک غزل نظر سے گذری۔ کلام صاف ہوتا ہے ملاحظہ ہو۔

نکلنا یاد ہے گلشن سے لے خزاں مجھ کو
میں آشیانہ کو روتی تھی، آشیاں مجھ کو

کبھی حرم میں۔ کبھی دیر میں۔ کبھی دل میں
ملا ہے جلوہ نما تو کہاں کہاں مجھ کو

وفا اسیر قفس رہ کے چپ رہوں کیونکر
ستا رہی ہے بہت یاد آشیاں مجھ کو

ان کے علاوہ شارۃ الکبریٰ صاحبہ عظیم آبادی بہت با استعداد خاتون ہیں اور شعر و سخن کا بھی کافی ذوق ہے افسوس ہے کہ اس وقت ان کا کلام نہ مل سکا۔

غزل

(از جناب رضا مظہری کاظمی (بی اے علیگ)

مجھ سا خاکِ رہِ نیاز کہاں
اور وہ بارگاہِ ناز کہاں

جب حقیقت ہی بے نقاب ہوئی
تو وہ رنگینیٔ مجاز کہاں

شوق ہی جب فسردہ ہو جائے
گرمیٔ کاروبارِ ناز کہاں

اُف کسی کی وہ پُر خمار آنکھیں
جا چھپا میکدے کا راز کہاں

ہم تو جانے ہیں میکدے کو شیخ
آپ نے "معرفت نواز" کہاں

عشق کو امتیازِ حسن نہیں
حسن میں حسنِ امتیاز کہاں

میری جانب بھی دیکھتے ہو مگر
وہ نگاہِ نظر نواز کہاں

دل کی فطرت بدل گئی ہے رضا
اب وہ ترکیبِ سوز و ساز کہاں

جذبات کشتہ

از جناب اودھ کشور پرشاد صاحب کشتہ بی۔اے۔ بی۔ایل گیاوی

میرے دل کا حال پھر ہوتا نہ ویرانے کا حال
پوچھتے ہم سے اگر وہ اپنے دیوانے کا حال

ساری دنیا سے الگ دیکھا یہ دیوانے کا حال
آپ میں آتا ہے سن کے آپکے آنے کا حال

اور کیا اس سے سوا ابتر ہو دیوانے کا حال
گھر ہے ویرانے میں گھر میں بھی ہے ویرانے کا حال

سر دھنا، روئی، جلی، پگھلی، بجھی، ٹھنڈی ہوئی
شمع سے دیکھا گیا آخر نہ پروانے کا حال

آنکھ پر پردہ پڑا ہے عقل پر پتھر پڑے
کس طرح زاہد کو ہو معلوم بتخانے کا حال

اسکو گردش، اسکو چکر اور یہ بھی دور میں
ہے زمین و آسماں کا حال پیمانے کا حال

سننے والے دم بخود سب دیکھنے والے خموش
یہ ہے میرا حال یہ ہے میرے افسانے کا حال

جسکے دل میں جو شکایت تھی وہ دل میں رہ گئی
اہلِ محشر پر کھلا جب انکے گھبرانے کا حال

ہنس کے بولا "اب چلا شاید تلاشِ حور میں"
جب ستمگر نے سنا کشتہ کے مرجانے کا حال

میری لیڈری

وہ جو کسی کہنے والے نے کہا ہے "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" تو غلط نہیں کہا ہے۔ بچپن ہی میں بغیر کسی رمّال اور جوتشی کی پیشگوئی کے میری ذہانت طباعی بچپن ہی کی حرکتوں کو دیکھ دیکھ کر لوگ آپس میں یہ چہ میگوئیاں کرتے تھے کہ دیکھئے آئندہ چل کر یہ فتنہ کیا قیامت برپا کرتا ہے۔ گھر کے بزرگ ہوں یا محلے ٹولے کے چھوٹے بڑے حتی کہ مکتب کے مولوی صاحب کی بھی کور مجھ سے دبتی تھی۔ ہمسن لڑکوں اور مکتب کے ساتھیوں کا تو پوچھئے سرداری تھا گویا از بس میں ہے لیڈری کی ایک شان مجھ میں پائی جاتی تھی۔ میری شورش انگیز حرکتیں میری لیڈری کی صلاحیتوں کو صاف صاف نمایاں کر رہی تھیں۔ بزرگوں کی تنبیہیں اُستاد کی سختیاں میری فطری ہنگامہ پسندی کو نہ دبا سکیں۔ چنانچہ ایک روز کا ذکر ہے کہ کسی لیڈر کی آمد کے سلسلے میں دو بجے دن کو ایک پبلک جلسہ کے ہونے کا شہر میں اعلان ہوا اور اتفاق سے تھا وہ پنجشنبہ کا دن۔ مولوی صاحب کی جو شامت آئی تو کل لڑکوں کو اپنا نادری حکم سنا دیا کہ خبردار کوئی اس جلسہ میں شریک نہ ہو اور صرف اس حکم ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پنجشنبہ کے آدھے دن کی چھٹی منسوخ کر کے فرمان جاری کر دیا کہ کھانا کھا کر فوراً سب کے سب مکتب میں چلے آویں اور شام تک مکتب میں حاضر رہیں۔

دنیا جانتی ہے کہ جمعرات کی آدھی تعطیل لڑکوں کا نہ صرف شہری حق بلکہ دیہاتی حق بھی ہے پھر اس جائز حق میں مولوی صاحب کی جبریہ دست اندازی کو میری آزاد پسند طبیعت کب گوارا کر سکتی تھی۔ دوپہر کی چھٹی ملتے ہی مکتب سے باہر آ کر بحیثیت ڈکٹیٹر مولوی صاحب کے اس آرڈی نینس کے خلاف کل ساتھیوں کو قانون شکنی کا حکم دیدیا اور کھانا کھا کر مکتب میں واپس آنے کی بجائے اپنے جتھے کو لئے ہوئے سیدھا جلسہ گاہ پہونچ گیا۔ لیڈروں کی اسپیچ اور لکچر کے مفہوم اور مطالب سے ہمیں کیا مطلب۔ یہاں تو بقول ع ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔ بھی شام تک لیڈروں کی ایجیٹنگ، چہکے نعروں کی گونج' تالیوں کا شور' مجمع کے ہنگامے کا تماشا دیکھتے رہے' دوسرے روز جمعہ کی تعطیل تھی ہفتہ کے دن کتاب بغل میں دابے مکتب کے سائبان کے قریب جیوں ہی پہونچا دیکھتا ہوں کہ وہاں ایکدم مارشل لا جاری ہے۔ کسی لڑکے کو صرف ایک ٹانگ پر کھڑا کر دیا گیا ہے کوئی لڑکا کان پکڑ کر جلد جلد اٹھ بیٹھ کی مشق کر رہا ہے۔ کوئی اپنی دونوں ٹانگوں میں ہاتھ دیکر اپنے دونو کان تھامے عالم رکوع میں ہے۔ قدیم زمانہ کی ان غیر آئینی وحشیانہ سزاؤں کو دیکھ کر الٹے پاؤں جیسے ہی بھاگا کہ مولوی صاحب بھی سائبان سے کود کر میرے پیچھے دوڑے۔ پاؤں سے جوتا اور ہاتھ سے کتاب پھینک یا علی! کا نعرہ لگا کر چھلانگیں مارتا ہوا قریب تھا کہ گلی کی موڑ پر پہونچ کر نظر سے اوجھل ہو جاتا' لیکن عین نکڑ پر ادھر سے آتے ہوئے ایک عزیز نے مجھے دھر لیا۔ پیچھے سے ہانپتے کانپتے مولوی صاحب بھی پہونچ گئے' اور آتے ہی میرے بازو کو اپنے دونو ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں لیکر مجھے گھسیٹنا شروع کیا۔ انکے پنجہ سے نکل بھاگنے کیلئے

میں نے پوری قوت کے ساتھ لاکھ ہاتھ پاؤں مارے لیکن چھٹکارے کی کوئی صورت نہ دیکھ کر مجبوراً اپنے آپ کو زمین پر ڈال دیا۔ اس ستیاگرہ کے بعد بھی وہ سنگدل بے رحم مجھے گھسیٹتا ہوا مکتب میں لے گیا اور کھجور کی چھڑی لے کر استاد انہ ہاتھ اس طرح چلانا شروع کیا کہ میری پیٹھ کا جو حال ہوا وہ تو ہوا ہی' میاں جی کی چھڑی بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی۔ اس ظلم و استبداد کے خلاف پہلے تو چیخ چیخ کر صدائے احتجاج بلند کرتا رہا۔ لیکن جب دیکھا کہ اس پروٹسٹ کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تو مجبوراً ایک بے بس نہتے نون وائلنٹ لیڈر کی طرح نہایت ہی صبر و استقلال کے ساتھ اس چھڑی چارج کو برداشت کرتے ہوئے دل میں یہ شعر پڑھتا رہا ؎

جو چپ رہے گی زبانِ ہنر نشاں پکاریگا خود چھڑی کا
فریب ہے یار و روزِ محشر چھپے گا مکتب کی مار کیونکر

لیکن آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اس جابرانہ تشدد سے میرے حوصلے پست ہو گئے؟ توبہ کیجئے۔ لیڈری کی صلاحیتیں خدا نے جس کی رگ رگ میں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہوں وہ اس معمولی ہوٹر پ سے بھی کہیں دبائی جا سکتی ہیں۔ مولوی صاحب کا یہ چھڑی چارج تو میرے لئے۔ ع

سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا۔ چنانچہ دوپہر کے کھانے کے لئے جیسے ہی مکتب کی قید سے چند گھنٹے کی عارضی رہائی ملی ساتھیوں کو لئے ہوئے وصیٹی پارک میں پہونچکر انجمن "اخوان الشیاطین" کی ایک ارجنٹ میٹنگ کول کر کے مولوی صاحب کے بائیکاٹ کا ریزولیوشن پاس کر دیا اور ہر لڑکے سے حلفیہ عہد لے لیا کہ جب تک یہ ڈائرشاہی مولوی مکتب کی حکومت سے برطرف نہ کر دیا جائے اسوقت تک یہ عدم تعاون کا سلسلہ جاری رہے اور اپنے بزرگوں سے اس مطالبہ کو پورا کرانے کے لئے ہر لڑکے کا فرض ہوگا کہ گھر پر ہنگر اسٹرائک یا اور جونسی قربانی کی ضرورت ہو اس سے پہلو تہی نہ کرے۔ چنانچہ اس پر باضابطہ عمل درآمد شروع ہو گیا۔ پروٹسٹ کی اور کاروائیوں کو چھوڑئیے صرف برت ہی والا معاملہ ایسا تھا کہ بڑی بڑی سلطنتیں بوڑھوں تک کی ہٹ ماننے پر مجبور ہو جاتی ہیں تو یہاں بچوں نے اگر اس کے ذریعہ والدین سے اپنی ضد منوالی تو کون سی تعجب کی بات ہوئی۔ مولوی صاحب بھی ایک پرانے گرگِ باراں دیدہ تھے۔ عدم تعاون کی تحریک کو کامیاب ہوتے دیکھکر لڑکوں میں پھوٹ ڈالنے اور ان میں سے بعض کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے طرح طرح کی ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ ایک طرف بعض سیدھے سادے لڑکوں اور اُن کے اعزا سے سازباز کیا جانے لگا۔ دوسری طرف اصلی بانیِ فساد۔ لڑکوں کا لیڈر سمجھ کر مجھ سے بھی پیام و پیامی ہونے لگی۔ میں نے دیکھا کہ واسطہ آپڑا ہے ایک ایسے جغادری سے جو داؤ پیچ اور عیاری میں ہم سب کا بھی استاد ہے۔ ہم لاکھ تیز اور چالاک سہی مگر پھر بھی اس کے سامنے طفلِ مکتب ہی ہیں۔ اگر کچھ مٹھائیاں اور کھلونے ہاتھ میں دیکر ساتھیوں کو مجھ سے روگرداں کر کے اپنے ساتھ ملا لیا تو میری لیڈری کا سارا بھرم ہی غائب۔ قبل اس کے کہ میرے اور ساتھیوں سے کوئی بات طے ہو ایک درمیانی شخص کے ذریعہ خود ہی سب کا نمائندہ بنکر مولوی صاحب کے پاس جا پہونچا اور محض لیڈری کی شان دکھلانے کے لئے کل لڑکوں کی طرف سے خواہ مخواہ بہت سے مطالبات پیش کر دئے۔

(۱) ڈانٹ ڈپٹ اور معمولی تنبیہہ کے علاوہ۔ بید یا چھڑی چارج' کان پکڑ کر اُٹھا بیٹھا کرانا' ناک رگڑوانا' ... ...

ہونے میں کسی کو شبہ نہ رہے۔ بچپن ہی میں میری رفتار، گفتار، کردار حتیٰ کہ صورت شکل سے بھی آئندہ ایک بڑے آدمی ہونے کے آثار ٹپکے پڑتے تھے ؎

بالائے سرم زہوشمندی — می تافت ستارۂ بلندی

گرچہ بزرگوں نے اُسوقت حوصلہ افزائی کے بدلے میری لیڈری کی پوشیدہ قوتوں کو سختی سے دبانا چاہا مگر قسمت میں آئندہ چل کر ایک زبردست لیڈر ہونا تھا اس لئے غیب سے خدا نے ایک ایسا سامان پیدا کر دیا جس نے میری لیڈری کی صلاحیتوں میں اور بھی چار چاند لگا دئے یعنی گھر اور مکتب کے علاوہ میری بے چین افتادِ طبیعت نے جب دوسرے محلوں کو اپنی آماجگاہ بنانا شروع کیا تو میری ان پوشیدہ صلاحیتوں کی نشو ونما کی غرض سے گورنمنٹ نے از راہ شفقت بزرگانہ میرے کل اخراجات کی کفیل بنکر مجھے ریفارمیٹری اسکول میں داخل کر دیا۔ وہاں کوئی گجی اور سید ھا سادا لڑکا لیا ہی نہیں جاتا۔ اس کے داخلہ کے لئے جس کوالیفکیشن کی ضرورت تھی خدا کے فضل سے سب میں میرا نمبر اول ہی تھا۔ گرچہ ہم میں بھی ایک سے ایک چھٹے ہوئے لڑکے پہلے سے وہاں موجود تھے ع۔

مگروہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ میری جیسی وہ سوجھ، وہ اپج، وہ ہنگامہ پسندی ان میں کہاں۔ میں نے پہونچتے ہی ان سب میں ایک نئی روح پھونک کر ایک نئی زندگی پیدا کر دی ؎

آگیا قیس تو جان آگئی دیوانوں میں — اک اداسی سی تھی پھیلی ہوئی دیوانوں میں

وہاں بھی اپنے نمایاں کارناموں کی بدولت سب کا لیڈر بن گیا۔ مثل ہے کہ "صحبت صالح ترا صالح کند"۔ ہمخیال، ہمرنگ، ہم مشرب لڑکوں کی سوسائٹی نے میری فطری صلاحیتوں میں اور بھی جلا پیدا کر دی۔ اب جو ایک کافی مدت کے بعد وہاں سے نکلا تو لیڈری کے اوصاف پہلے سے مجھ میں موجود ہی تھے۔ ریفارمیٹری اسکول کے قیام نے اور بھی ایک زبردست ریفارمر بنا دیا۔ میری بے چین اور بے قرار طبیعت اطمینان اور سکون سے کب مجھے بیٹھنے دیتی۔ اپنی سیمابی فطرت سے مجبور ہو کر کچھ نہ کچھ ٹھرپونگ کرتے رہنا میرے لئے لازمی تھا۔ اب سوال صرف یہ تھا کہ کون سا نمایاں کام کرنا چاہئے۔ طبعی مناسبت کے اعتبار سے لیڈری اور ریفارمری سے بڑھ کر اور کون سا دلچسپ مشغلہ میرے لئے موزوں ہو سکتا تھا۔ فطری مناسبت کے علاوہ عزت، شہرت، نام و نمود کے ساتھ ساتھ مالی اعتبار سے بھی یہ معزز پیشہ کچھ کم نفع بخش نہیں۔ البتہ زیر غور بات یہ تھی کہ لیڈری کے وسیع فیلڈ کو مذہبی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی حلقوں میں بانٹ کر رہنمایانِ ملک نے جو اپنی اپنی جداگانہ منڈی قائم کر رکھی ہے جس کے بارہ میں کسی نے کہا ہے :- ؎

من جز ایں عیب ندانم کہ کہن دزدے چند — بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

تو اب ان میں سے کس حلقہ کو اپنی لیڈری کی آماجگاہ بنایا جائے۔ پہلے تو یہ خیال ہوا کہ مذہبی رہنما بنکر لوگوں پر اپنی تقدس مآبی کا رنگ جماؤں لیکن دیکھا کہ پرانے خیال کے خوش عقیدہ لوگوں کی ایک قلیل جماعت کے سوا نئی روشنی والوں کی کثیر تعداد جب سرے سے مذہبی احکام ہی ماننے کے لئے تیار نہیں تو مذہبی پیشوا کی بات کون سنتا ہے اس لئے لیڈری کی اس غیر مفید اور محدود حلقے میں اپنی صلاحیتوں کو

ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ سوچا کہ اس سے کہیں زیادہ کام آمد تو قومی لیڈری کا بزنس ہے کیونکہ وہاں فرقہ وارانہ حقوق کا جال ایسا بچھا ہے جس میں پوری جماعت کی جماعت آسانی کے ساتھ پھنسائی جاسکتی ہے۔ عوام کی اطاعت، حکومت کی حمایت، پبلک چندہ کی کثرت، سرکار اور سرکاری لوگوں کی مالی اعانت۔ ایک لیڈر کی کامیابی کے لئے اس سے زیادہ اور کیا موافق فضا مل سکتی ہے۔ برادرم مونجے اور بھائی پرمانند کی کامیاب لیڈری کی زندہ مثال آنکھوں کے سامنے تھی صرف فرق اتنا ہے کہ ان دونوں برادران یوسف کو خوش قسمتی سے ایک ایسی جماعت کی لیڈری ہاتھ آگئی ہے جو اپنی نیکی اور سادہ لوحی کے باعث حیوانوں کی بھی عزت و توقیر کرنے کو تیار۔ اور یہ تو بہرحال انسان ہی ہیں۔ اور یہاں کرنی پڑتی تھی آجکل کے مسلمانوں جیسی خودسر جماعت کی لیڈری جو خدا اور رسول کی اطاعت تو ضروری سمجھتی ہی نہیں۔ بھلا لیڈر کی اطاعت کس شمار میں ہے۔ اور وہ بھی میرے جیسے خودساختہ لیڈر کی۔

جہاں ان کی طبیعت کے خلاف کوئی بات ہوئی اور اعتراضوں کی بھرمار شروع ہوگئی۔ مثلاً کسی لیڈر نے اپنے لکچر، اسپیچ، اور قومی کاموں کی دوڑ دھوپ کے محنتانہ میں چندہ کی کوئی رقم گھر بھیجدی یا اپنے کسی عزیز کو کچھ دیدی تو پھر پبلک فنڈ کا حساب سمجھانے کے لئے ایک ہنگامہ ہے۔ اب غریب لیڈر کی اور قومی ترقی کا راز سمجھائے یا چندہ کا حساب۔ اور سچ پوچھئے تو لیڈروں کا حساب ذرا ہوتا بھی ہے عام سمجھ سے باہر۔ تلک فنڈ، کھدر پرچار، اچھوت اُدھار کے چندوں کے حالات دیکھتے ہوئے بھی "حساب لیڈراں دردل" کے زرین اصول کو لوگ نہیں سمجھتے ہیں اور خواہ مخواہ شروع کر دیتے ہیں اعتراض۔ بنیوں کی طرح کوڑی کوڑی حساب کرنیوالی جماعت لاکھوں چندہ دیکر لیڈروں کے گلگل کھانے کا حساب تو دیکھتی نہیں اور یہاں چند ہی ہزار کے واسطے بے ایمان، چور، خائن اور جانے کیا کیا لقب دینے کو تیار۔ آپ کہیں گے کہ جس جماعت میں غربت اور افلاس ہو اور جس کے چندے کا ایک ایک پیسہ پسینہ کی کمائی کا ہو اُس سے ایسی امید رکھنی ہی فضول ہے۔ تو خیر مجھے اس سے بحث نہیں ان باتوں سے اتنا تو معلوم ہوگیا کہ مسلمانوں کی لیڈری میں نفع کم اور بدنامی زیادہ ہے۔ اس لئے لیڈری کی یہ لائن بھی کچھ زیادہ مفید مطلب نظر نہیں آئی۔ فوراً ذہن میں بات آئی کہ کیوں نہیں ملکی سیاسیات کا مردِ میدان بنکر پبلک اور سرکار دونوں پر اپنی شخصیت کا سکہ جماؤں مگر اس میں بھی ہر وقت دھر پکڑ کا قصہ کچھ ایسا لگا رہتا ہے کہ بیچارے غریب صورت مہاتما جی تک کو آخر عاجز آکر جب گوشہ نشین ہو جانا پڑا تو میری کیا حقیقت ہے اور آپ جانتے ہیں کہ میں خود بھی اس قسم کے بکھیڑوں سے ذرا زیادہ احتیاط برتتا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ میری ہنگامہ پسند طبیعت کے لئے سیاسی لیڈری سے بڑھکر اور کوئی دوسری قسم کی پبلک زندگی موزوں نہ تھی۔ جہاں جائیے شاندار استقبال، جہاں پہونچے ہنگامہ خیز خیر مقدم، جس مجمع میں کھڑے ہو جائیے نعرہ تحسین اور تالیوں کا شور، جس جلسہ میں تقریر کیجئے بس فلک شگاف نعرے، گلے میں زرتار گجرے، ہاتھوں میں نذرانے کی تھیلیاں، غرض پانچوں انگلیاں گھی میں لیکن وہی جیل کا بکھیڑا ایسا تھا کہ کوشش کے باوجود بھی طبیعت ادھر بڑھی نہیں۔ ادھر سے خیال ہٹانے کے بعد لیڈری کے ایک بے ضرر فیلڈ یعنی کھدر پرچار کی طرف دھیان گیا مگر معلوم ہوا کہ ایک زبردست لیڈر نے پہلے ہی

سے اس پر قبضہ کر کے لوگوں کو چرخہ کے چکر میں ایسا پھنسا رکھا ہے کہ جو ادھر گیا بس گھن چکر ہو کر رہ گیا۔ اس طرف سے مایوس ہو کر آخر میں غور و فکر کے بعد لیڈری کی ایک ایسی منڈی کی طرف خیال گیا جہاں بغیر روک ٹوک جو جی میں آئے کیجئے جو چاہئے بولئے بقدر چاہئے خرچ کیجئے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔ نہ پبلک فنڈ کے حساب سمجھانے کا دھڑکا۔ نہ کسی معترض کے اعتراض کا ڈر نہ سرکار کی بازپرس کا خوف۔ غرضکہ دل میں فیصلہ کر لیا کہ اچھوتوں کا ریفارمر بن کر ان کروڑوں انسان نما جانوروں سے دیوتا کی طرح اپنی پرستش کراؤں اور اس اچھوت اُدھار میں نقد رقمیں بھی وصول کروں مگر افسوس ع۔ بہر زمیں کہ رسیدم مہاتما موجود۔
کھدر کی سول ایجنسی اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد اس اچھوت نما لیڈر نے خالی میدان پا کر ہریجن مارکیٹ پر بھی کچھ اس طرح قبضہ کر لیا کہ کمپٹیشن کے بعد بھی کوئی دوسرا لیڈر اپنی گرم بازاری قائم رکھ نہیں سکتا۔ ایسی حالت میں "دو بادشاہ در اقلیمے" دو لیڈر در یکے نگنجند کے اصول پر لیڈری کی اور برانچوں کی طرح یہاں بھی "نو ویکنسی" والا معاملہ دیکھا تو مجبور ہو کر اس نتیجہ پر پہونچا کہ لیڈری کی کسی ایک خاص شعبہ میں قسمت آزمائی کی بجائے کیوں نہیں بیک وقت اکٹھے مذہبی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی رہنما ہونے کا اعلان کر کے ایکدم سے ریفارمر جنرل ہو جاؤں۔ چنانچہ یہ فائینل رائے قائم کرنے کے بعد ریفارمر جنرل کی حیثیت سے لیڈری کے کل ڈیپارٹمنٹ میں میں نے دلچسپی لینی شروع کر دی۔ کسی قسم کا مذہبی اجتماع ہو نماز کی جماعت چھوڑ کر سب میں میری شرکت لازمی، وعظ کا اگر جلسہ ہوا اور کچھ نہیں تو واعظ صاحب کا مجمع سے تعارف ہی کرانے کے بہانے کچھ بول کر اپنے کو نمایاں کرنا ضروری میلاد کی محفل ہوئی تو اس مذہبی کام میں بھی کافی حصہ لینا میرا فرض۔ سیاسی میٹنگ میں اگر تقریر کا وقت نہیں ملا تو کسی رزولیوشن کی تائید ہی کھڑے ہو کر کر دی۔ ابتدا میں لیڈری کے بہت سے عارضی کام مثلاً جلسہ کا انتظام، والنٹیروں کی تنظیم، پروسیشن کی ترتیب وغیرہ میں زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ رفتہ رفتہ اس خواہ مخواہ کے دخل در معقولات کی بدولت ٹمپریری لیڈر سے مستقل لیڈر ہو گیا۔ اور اب خدا کے فضل سے کسی قسم کی میٹنگ خفیہ یا علانیہ کہیں ہوئی لیڈر کی حیثیت سے میں ضرور مدعو کیا جاتا ہوں۔ اور آپ کی دعا سے ہر جگہ میری کافی آؤ بھگت بھی ہونے لگی ہے۔

ہونے کو تو لیڈر میں ہو گیا لیکن "تا درنہ آئی درنیابی" والی مثل کے مطابق جب تک لیڈری کے گورکھ دھندے میں نہ پھنسا تھا لیڈروں کی عزت و توقیر اور آؤ بھگت دیکھ کر ان کی بظاہر قابل رشک زندگی کو حسد کی نظر سے دیکھا کرتا تھا۔ لیکن جب سے اس فری میسن میں داخل ہوا ہوں خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ لیڈری کی زندگی کس قدر میرے لئے وبال جان ہے۔ بیسوں آرزوئیں، سیکڑوں تمنائیں، ہزاروں خواہشیں، محض لیڈری کی ظاہرداری پر قربان کرنی پڑتی ہیں، چونکہ فطرتاً میری طبیعت ذرا منچلی واقع ہوئی ہے اور آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ایک زندہ دل لیڈر کو چوری چھپے اپنی بعض پوشیدہ تمنائیں پوری کرنے میں کیا کیا دقتیں پیش آتی ہیں۔ کسی ایکٹرس سے کسی خاص ایکٹنگ کے متعلق کوئی گفتگو کیجئے تو نہایت ہی رازداری کے ساتھ "کسی جنس لطیف سے

کو آپریشن یا نون کو آپریشن کے بارہ میں تبادلۂ خیالات کیجئے تو ایکدم پوشیدہ۔ اپنے ہمخیال لیڈران رند مشرب کے ساتھ کسی تفریحی مشغلہ کا سامان کیجئے تو سب سے نظر بچا کر۔ کیونکہ ان باتوں کی ذرا بھنک کسی کے کان میں پہونچی اور طعن تشنیع کی بھرمار، اعتراضوں کی بوچھار شروع ہوگئی۔ بدچلن، بدوضع، اوباش، کیریکٹرلیس لیڈر کے جیسے الفاظ ہرطرف سے کانوں میں آنے لگے۔

ان ناسمجھوں سے کوئی پوچھے کہ تم لوگوں کو لیڈروں کے اندرونی حالات سے کیا سروکار۔ لیڈری کے فرائض از قسم لکچر، اسپیچ، تقریر وغیرہ میں کوئی ہرج واقع ہو تو ایک بات بھی ہے، چنانچہ کسی نے کہا ہے:—

ہر کرا جامہ کمدرش بینی! | رہنماداں و نیک مرد انگار
ورنہ در آشرم چہ دانی چیست | محتسب را درون خانہ چہ کار

ہمارے لیڈروں پر نکتہ چینیوں اور اعتراضوں کی مصیبت جو آجکل نازل ہوتی رہتی ہے اس کی وجہ صرف وہی ایک پرانا غلط تخیل ہے جو ایک قدیم زمانہ سے لوگوں کے ذہن نشیں چلا آتا ہے یعنی لیڈر اور رہنما کو نہایت ہی محتاط اور اعلیٰ کیریکٹر کا ہونا چاہئے اچھے چال چلن کے ساتھ انکا ظاہر و باطن بھی یکساں ہونا ضروری۔ لیڈر نہ ہوا مسجد کا کوئی ملا ہوا۔ اگلے زمانہ میں لیڈری کا معیار قائم کرنے میں اسی قسم کی تنگ نظری سے جو کام لیا گیا تھا اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ اسوقت سارے ملک میں تلاش کرنے پر بھی شاید ہی دو چار لیڈر نظر آتے ہوں گے۔ اور آج جبکہ وہ قیداٹھا دی گئی خدا کے فضل سے پورے ملک میں کیا ہر شہر، ہر قصبہ، ہر گاؤں، بلکہ ہر محلے میں بلا ارادہ دو چار لیڈر کے درشن ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اگرچہ عملاً لیڈری کے کوالیفیکیشن میں اعلیٰ کیریکٹر کا ہونا آجکل چنداں ضروری نہیں، تاہم بہت سے جاکر خیال والوں کے ذہن میں ابھی تک وہی پرانا معیار قائم ہے اس لئے ان لوگوں کے ہنگامہ سے بچنے کے لئے مجبوراً پرائیوٹ زندگی کی بہت سی باتیں صیغۂ راز ہی میں رکھنی پڑتی ہیں اور اس اخفا کی کوشش میں بعض وقت ایسی مصیبتوں کا سامنا آن پڑتا ہے۔ جس سے جان چھوڑانی مشکل ہو جاتی ہے۔ اس کا اندازہ آپکو صرف میرے اس ایک واقعہ سے مل جائیگا۔

ایک روز چند مقامی لیڈروں نے ایک مجوزہ ہڑتال کو ملتوی کرنے کے لئے خفیہ مٹنگ کی۔ اس کی خبر پاکر دوسری ہی صبح کو پانچ نئے نوشیلے نوجوانوں کی ایک جماعت میرے پاس پہونچی اور آتے ہی اور لیڈروں کے ساتھ مجھ پر بھی اس طرح اعتراضوں کی بھرمار اور بار بار خفیہ، پرائیوٹ کارروائیوں پر نکتہ چینی کچھ ایسے مجمل اور مہمل لفظوں میں شروع کر دی کہ مجھے شبہہ کیا بلکہ یقین ہوگیا کہ رات کی میری بعض دوسری ناقابل اظہار حرکتوں کی انھیں خبر ہوگئی۔ قریب تھا کہ گھبرا کر میں کہہ دوں کہ ہاں فلاں کام میں نے کیا ہے تو آپ حضرات کو میرے ذاتی معاملات میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ انھیں وگونگی گفتگو سے فوراً پتہ لگ گیا کہ انکا اعتراض اس خفیہ سیاسی مٹنگ کے متعلق تھا جس میں ہڑتال ملتوی کرنے کی تجویز پاس ہوئی۔ اور باتوں کی انھیں مطلق خبر نہیں۔ خدا نے بڑا فضل کیا ورنہ خود میرے ہی منہ سے سارا بھنڈا پھوٹ جاتا۔ اس واقعہ کی تفصیل یوں ہے کہ ایک شب کو چند قومی کارکنوں نے میرے یہاں

اس غرض سے ایک خفیہ مٹنگ کی کہ کل ہونیوالی ہڑتال روکدی جائے۔ یہ طے کرنے کے بعد اور لوگ تو اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ چند خاص احباب جو وہاں بیٹھے رہ گئے ان سب کی رائے ہوئی کہ اسوقت کچھ دلبستگی کا سامان ہونا چاہئے۔ پرد دسیش کے چندہ کی کافی رقم موجود ہی تھی ایک رازدار والنٹیر کو کلنز کے یہاں کھانے پینے کی چیزیں لانے کے لئے بھیجدیا گیا اور ایک دوسرا والنٹیر چوک روانہ کردیا گیا۔ پھر نو مت پوچھئے تمام رات وہ دھما چوکڑی رہی کہ توبہ ہی بھلی۔ ان پرائیوٹ دلچسپیوں سے فرصت کرکے سویرے صبح کو غسل کرا در پبلک لائف کا لباس یعنی کھدر کے کپڑے زیب تن کرکے جیسے ہی اپنے کمرہ میں آکر بیٹھا کہ چند نوجوان میرے پاس پہونچا اور آتے ہی انہوں نے سوالات شروع کردئے:۔

ایک:۔ جناب! یہ پرائیوٹ جلسے کے کیا معنی؟

میں:۔ (چونک کر) کس قسم کا پرائیوٹ جلسہ؟

دوسرا:۔ رات کے خفیہ جلسے کی کل کارروائیاں ہم سب کو معلوم ہیں۔ لیڈر ہوکر جب آپ لوگوں کی یہ حرکتیں ہیں تو دوسروں کو کیا کہا جائے

میں:۔ (گھبرائے ہوئے لہجہ میں) سراسر جھوٹ، بالکل غلط۔ کسی دشمن نے بدنام کرنے کے لئے ایسی خبر اڑادی ہے۔

تیسرا:۔ جناب! کل باتوں کی رپورٹ ہم لوگوں کے پاس پہونچی ہے۔

میں:۔ اچھا اگر کل باتیں معلوم ہیں تو یہ بتلائیے کہ کون کون والنٹیر کس کس کام کے لئے کہاں کہاں گیا تھا؟ بس آپ لوگ جانتے دانتے خاک نہیں صرف قیاس پر ایسا شرمناک الزام دینے کو تیار ہیں۔

پہلا:۔ پبلک مٹنگ میں جب سارا کچا چٹھا کھولا جائے گا تو ساری حقیقت کھل جائے گی۔

میں:۔ خواہ مخواہ کسی خادم ملک لیڈر کو بدنام کرنے سے آپ لوگوں کو کیا فائدہ۔ اگر جی بہلانے کے لئے کبھی کسی نے کچھ گانا سن لیا تو آپ لوگوں کا کیا بگڑا۔

دوسرا:۔ ایں؟ یہ بے موقع۔ گانے کا کیا تذکرہ آپ نے چھیڑ دیا۔

میں:۔ (فوراً سنبھل کر) نہیں یوں ہی ایک بات میں نے کہی۔ آخر آپ لوگوں کو کیا خبر ملی؟

چوتھا:۔ خیر وہ تو بعد کو کہی جائے گی لیکن یہ بے وقت کا راگ گانے کا مطلب ہم لوگ نہ سمجھے۔

میں:۔ مطلب یہ ہے کہ شائد آپ لوگوں کو یہ شبہہ ہو کہ میں نے چندہ کی رقم ناجائز کام میں خرچ کردی سو ایسی بات نہیں۔

پہلا:۔ (اپنے ساتھیوں کی طرف مسکراکر دیکھتے ہوئے) یہ تو اور اک دوسرا انکشاف ہوجانا چاہتا ہے۔

پانچواں:۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ:۔

لیڈراں کیں جلوہ بر اسٹیج و ممبر می کنند　　　چوں بخلوت میروند آں کار دیگر می کنند

اس شعر کو انھوں نے کچھ اس مسخرانہ انداز سے پڑھا اور ساتھ ہی دو ایک طعن آمیز ایسے جملے ادا کئے کہ غصہ میں بگڑ کر میں نے کہا کہ ہاں کارڈ بگڑ گیا تو کیا ہوا۔ آپ لوگوں کو لیڈر کے پرائیوٹ کاموں سے کیا واسطہ۔ پبلک لائف اور چیز ہے اور پرائیوٹ زندگی اور شئے۔ ان دونوں میں خلط مبحث کرنے کا آپ سب کو کیا حق ہے۔ اسی غصہ کی روانی میں خود ہی اور سب باتیں کہنا ہی چاہتا تھا کہ ان میں سے ایک شخص میرے سلسلۂ کلام کو منقطع کر کے بول اٹھا۔

پہلا:— اس قدر بگڑنے کی کیا ضرورت ہے کیا۔ غلط ہے کہ کل شب کو آپ لوگوں نے ایک خفیہ میٹنگ اس غرض سے نہیں کی کہ آج کی مجوزہ ہڑتال روک دی جائے؟ ہم لوگ تو جیل جانے، ڈنڈے کھانے، بلکہ ملک کے واسطے جان تک دینے کو تیار ہیں اور آپ لوگ لیڈر ہو کر ڈر کے مارے خفیہ میٹنگ کر کے نوجوانوں کے قومی جوش کو دبا کر ملکی تحریک کی جڑ ہی کاٹنا چاہتے ہیں۔ آپ جیسے لیڈروں کی یہ پوشیدہ کارروائیاں جب پبلک میٹنگ میں پیش کی جائیں گی تو دیکھئے گا کہ آپ لوگوں کی لیڈری کیسے قائم رہتی ہے۔

یہ سنکر جان میں جان آئی۔ اور خدا کا ہزار ہزار شکر کیا کہ جس راز کے افشا ہونے کا خوف بدحواس کئے تھا وہ ظاہر ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ورنہ ان بیوقوفوں کی دھمکی نے تو مجھے ایسا بوکھلا دیا تھا کہ قریب تھا کہ چور کی داڑھی کا تنکا شہتیر بنکر لوگوں کے سامنے آجائے۔ مگر خدا نے بڑا فضل کیا کہ بھانڈا پھوٹا نہیں بلکہ صرف درک کر رہ گیا۔ اس واقعہ سے آپ خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ لوگوں کی نکتہ چینی اور افشائے راز کے خوف سے لیڈر کی زندگی ہر وقت کس کشمکش اور مصیبت میں رہتی ہے۔ انہیں حرکتوں کو دوسرا کوئی علانیہ اور ڈنکے کی چوٹ کرے تو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اور کسی لیڈر سے کبھی کبھار چوری چھپے نظر بچا کر کوئی زندہ دلی کی حرکت سرزد ہوئی اور کسی کو اس کی بھنک پہونچی تو لوگ اس طرح پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ جان چھوڑانی مشکل۔ میں تو کہتا ہوں کہ آدمی فلم یا تھیٹر کے اسٹیج پر گا بجا کر کما کھائے۔ لیکن ملکی اور قومی اسٹیج پر لیڈری کی ایکٹنگ کبھی نہ کرے۔ گو تالیاں دونوں جگہ دیجاتی ہیں لیکن وہاں پردہ اٹھ جانے پر کم سے کم روح فرسا اعتراضوں سے تو انسان بچتا ہے۔ غرضکہ لیڈری میں نکتہ چینوں کا خوف تو رات دن عذاب جان بن کر ستاتا ہی رہتا ہے اس کے ساتھ دوسری مصیبت جو ہر وقت روح کو تحلیل کئے رہتی ہے وہ سرکاری دھر پکڑ کا احتمال ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اور واقعہ جو پیش آیا اُسے بھی لگے ہاتھ سن ہی لیجئے تاکہ آپ صحیح رائے قائم کر سکیں کہ لیڈری کی زندگی کس قدر پریشان کن اور مصیبت انگیز ہے۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ:—

ایک روز چند والنٹیر اور شہر کے کچھ ملاقاتی میرے یہاں بیٹھے ہوئے موجودہ سیاسیات پر گفتگو کر رہے تھے۔ اتفاق سے گورنمنٹ کے سب سے زیادہ مخالف مولانا سیفی بھی اسوقت پہنچ گئے اور حسب عادت آتے ہی سرکار کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا حاضرین کی دلچسپی کا اندازہ کر کے اپنے آپ کو ایک جوشیلا لیڈر ثابت کرنے کے لئے میں نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی بلکہ دو چار جملے گورنمنٹ کے خلاف ان سے بھی زیادہ سخت استعمال کئے۔ پبلک جلسوں میں تو سرکاری رپورٹروں کی موجودگی کے باعث

قابل گرفت الفاظ سے بچ بچا کر تقریریں کرتا تھا۔ لیکن چونکہ یہ ایک طرح کی نئی قسم کی صحبت تھی اس لئے آزادی کے ساتھ بے دھڑک باغیانہ باتوں سے حاضرین کو خوش کرتا رہا۔ دوسرے روز آٹھ بجے صبح کو کلکٹر صاحب کا چپراسی طلبی کا حکمنامہ لئے پہنچا۔ بے نشان گمان بلاوجہ طلبی پر کچھ تشویش تو ضرور ہوئی مگر "حکمِ حاکم مرگِ مفاجات" ویلے برنڈش صاحب کے بنگلے پر چپراسی کے ساتھ جا پہنچا۔ کوٹھی کے پچھم والے پھاٹک کے اندر جیوں ہی قدم رکھا، دیکھا کہ ایک سفید پوش۔ بزرگ صورت شخص دکھن والے گیٹ کی طرف جلد جلد قدم اٹھائے لپکا جا رہا ہے، اسی تیز روی میں کئی بار مڑ کر میری طرف جو اس نے دیکھا تو دور سے داڑھی کچھ مولانا سیفی کی سی معلوم ہوئی لیکن میں خود اس وقت ذرا گھبرایا ہوا سا تھا اس لئے اچھی طرح اس طرف دھیان نہ دے سکا۔ میرے پہونچنے کی خبر پاتے ہی صاحب نے فوراً آفس روم میں مجھے طلب کر لیا۔ شیک ہینڈ کے بعد کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا :۔

صاحب :۔ وِل مولوی صاحب ! آپ گورنمنٹ کے خلاف بات بولتا ہے ؟

میں :۔ میں اور سرکار کے خلاف ؟ دشمنوں نے جھوٹی خبر پہنچائی ہوگی۔

صاحب :۔ کانگریس کے لیڈروں میں آپ کا بھی نام ہے۔

میں :۔ یوں کہلانے کو تو ہزار ہا لیڈر ہیں لیکن "خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد" ہر لیڈر تھوڑا ہی سرکار کے خلاف ہے ۔ میری اسپیچ اور لکچر کی رپورٹ تو حضور کے پاس پہونچتی ہی ہوگی اس میں کوئی قابل گرفت بات آپ نہ پائیں گے۔

صاحب :۔ عام جلسوں میں نہیں مگر خاص خاص موقع پر لوگوں کو سرکار کے خلاف آپ ابھارتا ہے ۔

میں :۔ حضور کو حاضر و ناظر سمجھ کر حلفیہ قسم کھاتا ہوں کہ اگر بھولے سے بھی کوئی خلاف قانون بات میرے منہ سے نکلی ہو تو خدا سرکاری خطاب کی عزت سے مجھے محروم کر دے اور آرڈی نینس کی مار پڑے۔

صاحب :۔ اچھا اب آپ جا سکتا ہے۔ پہلا موقع تھا اس لئے ایکشن نہیں لیا گیا ۔ آئندہ اس قسم کی شکایت پہونچی تو کوئی رعایت نہیں کیا جائے گا ۔

میں صاحب کو دعا دیتا اور "جان بچی لاکھوں پائے" کہتا ہوا گھر پہونچا۔ خدا جانے صاحب کے یہاں کی طلبی کی خبر لوگوں کو کیسے مل گئی کہ احباب کی کافی تعداد میرے گھر پر انتظار میں پہلے ہی سے موجود تھی۔ پہونچتے ہی سوالوں کی بھرمار شروع ہوگئی۔ صاحب نے کیوں بلایا، کیا باتیں ہوئیں، خدانخواستہ کوئی مقدمہ وغیرہ چلانے کا ارادہ تو صاحب کا نہیں ہے۔ میں نے جواب دینا شروع ہی کیا تھا کہ مولانا سیقی بھی دریافت حال کے لئے پہونچ گئے۔ میں نے لیڈرانہ انداز سے کہا :۔

میں :۔ اجی جناب یہ بیچارے کلکٹر صاحب کیا ہیں لاٹ صاحب بھی بلائیں تو میں دب کر بات کرنے والا نہیں۔ جی ہاں چلے تھے دھمکی دیکر مجھے مرعوب کرنے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جیل کیا حضرت منصور کی طرح سولی پر بھی لٹکا دیں تو میرے خون کے ہر قطرہ

سے "انا لیڈر" کی آواز نکلتی رہے گی۔ مولانا سیفی نے میری ان دلیرانہ باتوں کو سنکر میری ہمت اور جرأت کی داد دیتے ہوئے کہا کہ "بیشک ملک کے جاں نثار لیڈر ایسے ہی ہوتے ہیں"۔ اس روز اور کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی۔ دوسری صبح کو پھر وہی آٹھ بجے کلکٹر صاحب کا چپراسی ملک الموت کی طرح طلبی کا پروانہ لئے دروازہ پر موجود۔ میں نے دل میں کہا خدا خیر کرے آج کی پھر طلبی بلا وجہ نہیں۔ کل جو صاحب کے یہاں سے واپسی کے بعد اپنی لیڈری کی دھاک جمانے کے لئے بڑھ بڑھ کے ڈینگیں مار گیا۔ کہیں کسی دشمن نے اس کی رپورٹ تو صاحب کے یہاں نہیں پہونچا دی۔ سونچا کہ اگر صاحب کے تیور میں کچھ گڑبڑی دیکھی تو توبہ استغفار کرنے کے بعد تحریری معافی نامہ لکھ کر کسی طرح چھٹکارا حاصل کرونگا۔ یہ خیال لئے ہوئے "نصر من اللہ و فتح قریب" اور "یا حفیظ" ماول میں ورد پڑھتا ہوا چپراسی کے ساتھ کوٹھی میں حاضر ہوا۔ اردلی کے منھ سے جیسے ہی "صاحب سلام بولتے ہیں" نکلا فوراً کرتا تھن کے دروازہ پر پہونچا اور جیوں ہی قدم اندر رکھا اوٹ کی دوسری جانب بڑی تیزی سے لپک کر جاتے ہوئے کسی کی جھلک معلوم ہوئی۔ کل کے خلاف آج صاحب نے نہ سلام کا جواب دیا اور نہ شیکہینڈ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے بھی غصہ میں اپنا بڑھا ہوا ہاتھ واپس کر لیا اور دوبارہ سلام تک نہ کیا اور کرسی پر بغیر اجازت بیٹھنے کو اپنی انسلٹ سمجھ کر اسی طرح کھڑا رہا۔ دو منٹ تک کاغذات پر دستخط کرنے کے بعد صاحب نے سر اٹھا کر بگڑے ہوئے تیور سے مجھے دیکھا اور غصہ کے لہجے میں مجھ سے کہا:۔

صاحب:۔ کل تنبیہہ کرنے کے بعد بھی تم اپنی حرکت سے باز نہیں آیا۔ ہمارے پاس رپورٹ پہونچی ہے کہ یہاں سے جانے کے بعد سرکار کے خلاف تم بہت اول فول بولا۔

میں:۔ حضور کیا میرے بارہ میں فرمارہے ہیں؟ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ میں آپ سے وعدہ کرنے کے بعد گورنمنٹ کے خلاف شان کچھ بولوں۔ یہ میرے دشمنوں نے مجھ سے اور سرکار سے لڑانا چاہا ہے۔

صاحب:۔ بات بنانے سے کام نہیں چلے گا۔ غلط خبر ہمیں نہیں ملی۔ جس کے سامنے تم باغیانہ بات بولا ہے تم بولو تو ابھی فوراً اس سے مقابلہ کرا دیا جائے۔

میں:۔ حضور حاکم ہیں کس کی ہمت ہے کہ جو بات آپ کہلوانا چاہیں اس سے وہ انکار کرے۔ اول تو کوئی ایسی بات میں نے کی نہیں اور اگر بھول چوک سے کوئی ایسی غلطی ہو ہی گئی ہو تو "الانسان مرکب من الخطاء والنسیان" کا لحاظ فرما کر معاف کیا جائے۔ اور آئندہ کے لئے احتیاطاً توبہ نامہ، اقرار نامہ، بیع نامہ، ہبہ نامہ، یا وثیقہ نامہ جس طرح کا جو نامہ آپ چاہیں رجسٹری کرالیں تاکہ عندالضرورت وقت پر کام آئے۔ اس کے بعد اگر اس میں منحرف یا وارثان و قائم مقامیان منحرف کبھی کوئی غدر کریں تو عندالعدالت ناقابل سماعت قرار دیا جائے۔ اس تحریری اقرار نامہ کے علاوہ زبانی اقرار صالح بھی کرتا ہوں کہ آئندہ سے اشارتاً کنایتاً یا کسی اور طرح پر میری شکایت پہونچے تو جو سزا اگلے دنوں کی تھی بلا تکلف جیل کے اے۔ کلاس میں جانے کو تیار ہوں۔ حضور کی مربیانہ شفقت سے مجھے امید ہے کہ از راہ لیڈر پروری

ایک بار معاف فرمائیں کیونکہ اوپر خدا اور نیچے حضور ہیں، ورنہ لیڈر تو بیچ میں معلق اِدھر اُدھر کہیں کا نہیں ہوتا۔

صاحب:۔ تم بہت فاضل بات بول گیا۔ اچھا ایک مرتبہ اور تمکو موقع دیا جاتا ہے مگر یاد رکھو کہ پھر کوئی عذر نہیں سنا جائے گا۔

حضور کو خدا تاحیات زندہ رکھے کہتا ہوا فوراً صاحب کے آفس سے باہر نکلا۔ برساتی کے قریب طلافاتی انعام دیتے وقت اردلی سے چپکے دریافت کیا کہ یہ پہلے سے صاحب کے پاس کون بیٹھا ہوا تھا جو میرے پہونچتے ہی تیزی کے ساتھ اوٹ کی اس طرف جا چھپا۔ انھوں نے آہستہ سے کہا کہ وہی چغلخور جس کو سب مولانا سیفی کہتے ہیں، یہ موذی کہلاتا ہے مولانا اور حرکت شیطانوں کی۔ روزانہ صاحب کے یہاں آکر لوگوں کی شکایتیں پہونچایا کرتا ہے۔ ذرا آپ بھی اس مفتری سے بچے رہئے گا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ سنکر غصہ کے مارے میرا کیا حال ہوا ہوگا۔ مگر کرتا کیا دل ہی دل میں اس پر لعن طعن کرتا ہوا گھر واپس پہنچا دیکھا کہ آج کل سے زیادہ مجمع دیافت حال کے لئے میرے انتظار میں پہلے سے موجود ہے۔ کل ہی کی طرح آج بھی اسی طرح کے سوالوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسی درمیان میں مولانا سیفی بھی اپنا دو دستی ہاتھ صاف کرنے کے لئے پہونچ گئے اس موذی پر نظر پڑتے ہی غصہ میں جی چاہا کہ اس کی جاسوسی کا کچا چٹھا کھولکر سب کے سامنے رکھدوں لیکن میری اور صاحب کی کل گفتگو پیچھے کھڑے ہو کر سُن لی تھی۔ ڈرا کہ کہیں یہ بھی میرا راز افشا کرکے اس کا انتقام نہ لے۔ مجبوراً خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس دشمن دربغل کی موجودگی میں حاضرین کے سوالوں کا جواب دینے میں جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا اُسے کچھ میرا ہی دل جانتا ہے۔

سوال:۔ ہاں جناب! آج صاحب سے کیا باتیں ہوئیں؟ آج بھی آپنے کل ہی کی طرح منہ توڑ اور دندان شکن جواب دیا ہوگا؟

میں:۔ ہاں مگر کوئی ایسی قابل ذکر بات نہیں ہوئی جس میں تو تو میں میں کی نوبت آتی

سوال:۔ آخر چپراسی بھیجکر بلانے کی وجہ؟ ہڑتال اور پروسیشن کے متعلق ضرور کچھ پوچھا ہوگا۔

میں:۔ بات اصل یہ ہے کہ صاحب فطرتاً ذرا امن پسند واقع ہوئے ہیں ہُلڑ بونگ سے گھبراتے ہیں اور ہنگامہ وغیرہ کو پسند نہیں کرتے۔

سوال:۔ ان کے نا پسند کرنے اور گھبرانے سے کیا ہوتا ہے۔ ہڑتال ہو گی۔ تمام دکانیں بند کی جائیں گی۔ پروسیشن نکلے گا اور آپ ہی کی سرکردگی میں نہایت دھوم سے نکلے گا۔ کیوں ہے نہ آپ کی بھی یہی رائے؟

میں:۔ تو میں کب آپ لوگوں سے علیحدہ ہوں۔ لیکن کہیں پولیس سے تصادم نہ ہو جائے۔ صرف فساد کا خیال ہے اور کوئی بات نہیں

سوال:۔ پولیس سے یہاں ڈرتا کون ہے۔ والنٹیر تو ملک کے واسطے جان تک دینے کو تیار ہیں۔ صرف آپ جیسے جوشیلے لیڈروں کے آگے رہنے کی ضرورت ہے۔

میں:۔ بات تو ٹھیک ہے لیکن مہاتما جی نے دنگا فساد سے علیحدہ رہنے کی سخت تاکید کی ہے۔ کیونکہ چورا چوری کی طرح

خدانخواستہ کوئی ہنگامہ ہوا تو بیچارے مہاتما جی کو خواہ مخواہ کئی روزے کفارہ کے رکھنے پڑیں گے۔

سوال: کل تک تو نہایت ہی زوردار لفظوں میں قومی جوش وخروش کا اظہار فرما رہے تھے اور ملک کے واسطے خود اپنی جان تک نثار کرنے کو تیار تھے اور آج پروسیشن اور ہڑتال کے متعلق طرح طرح کے احتمالات پیش کرکے دوسروں کی بھی ہمت پست کر رہے ہیں۔ آخر بات کیا ہے؟ یقینی آج صاحب نے ڈانٹ ڈپٹ کر جیل بھیجنے کی دھمکی دی ہے۔

ایک دوسری آواز:۔ اگر یہ بات ہے تو ہم لوگوں کو ایسے بزدل لیڈر کی ضرورت نہیں۔

میں نے دل میں کہا کہ تم لوگوں کو ضرورت نہیں ہے تو نہ ہو لیکن مجھے تو لیڈری کی ضرورت ہے۔ باقی رہا کر اس طرح دب دب کر اور رک رک کر کیوں جواب دے رہا ہوں تو اب کس طرح ان لوگوں کو سمجھاتا کہ بغل میں بیٹھا ہوا ایک سرکاری بھوت گلا دبائے ہوئے ہے ورنہ بڑھ بڑھ کر بولنے اور زبانی جمع خرچ کرنے میں کون سی بزدلی یا شیردلی رکھی ہوئی ہے۔ اس مفتری سیفی کی موجودگی نے اسوقت مجھے عجب کشمکش کی مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ ادھر اگر ان لوگوں کی ہاں میں ہاں ملا کر سرکار کے خلاف نہ بولوں تو بزدل ڈرپوک کہہ کر لیڈری سے برطرف ہونے کا خوف اور اگر لیڈری قائم رکھنے کے لئے سرکار کے خلاف کچھ بولتا ہوں تو یہ مار آستین کلکٹر صاحب کے یہاں جاکر زہر اگلنے کو تیار۔ میں نے سوچا کہ حتی الامکان بچ بچا کر ایسے گول مول الفاظ میں جواب دینا چاہئے جس سے ع۔ قوم بھی تابع رہے راضی رہے سرکار بھی — بزدلی کے الزام کے جواب میں میں نے کہا۔

میں:— یوں کہنے کو بزدل، ڈرپوک جو چاہیں کہیں آپ لوگوں کو اختیار ہے لیکن ہرگز ایسی بات نہیں۔ اور جیل سے ڈرنے کا جو الزام دیتے ہیں تو جیل ڈرنے کی چیز ہی نہیں اور خاص کر لیڈروں کے لئے کیونکہ سرکار نے ازراہ لیڈر پروری اے کلاس میں ہر طرح کی عافیت کا سامان بہم پہونچا رکھا ہے۔

سوال:— اگر جیل جانے سے بھاگتے نہیں تو بسم اللہ ابھی اٹھئے اور چلکر ہم سب کے ساتھ ہڑتال اور پروسیشن کا انتظام کیجئے۔ تمام دوکانیں بند کرانے کے لئے والنٹیروں کو علیحدہ علیحدہ ڈیوٹی بانٹ دیجئے۔ اٹھئے اب سوچ کیا رہے ہیں؟

میں:— (مولانا سیفی کی طرف دزدیدہ نظر سے دیکھتے ہوئے) جب آپ لوگ کہتے ہی ہیں تو میں ساتھ دینے کو تیار ہوں لیکن یہ ایک بات غور کرنے کی ہے کہ عدم تعاون کے سلسلہ میں سرکاری دفتروں اور محکموں حتی کہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا داخلہ قومی جرم سمجھا جاتا ہے۔ تو سرکاری جیل میں سرکاری مہمان بنکر مفت سرکاری کھانا کھانا یا پتھر توڑنے کی قسم کا سرکاری کام کرنا بھی گویا سرکار سے کو آپریشن کرنا ہے۔ اور میرے خیال میں یہ ایک طرح سے نون کوآپریشن کے اصول کی توہین ہے۔ یوں جیسی مرضی آپ لوگوں کی۔ میں تو خادم قوم ہوں۔ آپ لوگوں کی ہر طرح کی خدمت کرنے کو تیار ہوں۔

سوال:— یہ سب بھاگنے کی ترکیبیں ہیں۔ یقینی کلکٹر صاحب کی دھونس پڑی ہے۔ بس آج سے آپ کی لیڈری ختم۔

میں :- آپ لوگ ہر بات کے فیصلہ کرنے میں جلدی کر دیتے ہیں۔ میں نے تو یوں ہی ایک بات کہی میں آپ لوگوں سے علیحدہ کیا ہوں۔

سوال :- اگر آپ ہر طرح سے تیار ہیں تو اب زیادہ سوال و جواب کی ضرورت نہیں۔ لیکن آپ کی باتوں سے کچھ کمزوری کا پہلو نکلتا ہے۔ اس لئے جلوس کے ساتھ چل کر امتحاناً کچہری کی بلڈنگ پر سوراج کا جھنڈا آپ ہی کو نصب کرنا ہوگا۔

میں :- سوراج کا جھنڈا ؟

سوال :- جی ہاں سوراج کا جھنڈا !

میں :- کچہری کی عمارت پر ؟

سوال :- کچہری کی عمارت پر نہیں بلکہ کلکٹر صاحب کے اجلاس کی چھت پر۔

میں :- اور اس وقت صاحب اجلاس کر رہے ہوں تب ؟

سوال :- صاحب اجلاس کر رہے ہوں، سپاہی بندوق لئے پہرا دے رہا ہو، کانسٹبل ہتکڑی لئے کھڑا ہو، اور سپرنٹنڈنٹ صاحب ہنٹر لئے ٹہل رہے ہوں ان سب حالتوں میں آپ کو سوراج کا جھنڈا اپنے ہاتھ سے لے جاکر نصب کرنا ہوگا۔

میں :- تو کیا میں خود ہی چھت پر چڑھ کر اپنے ہاتھ سے نصب کروں؟

سوال :- لاحول ولاقوۃ پہلے ہی کہا جا چکا کہ یہ کام آپ ہی کے ہاتھ سے انجام پائے گا۔ کیوں آپ سوچ کیا رہے ہیں؟

میں :- جناب یہ کچہری کون سی بلند عمارت ہے آپ لوگ کہیں تو اس سے بھی ہزار گونہ بلند کسی پہاڑ پر سوراج کا جھنڈا جاکر گاڑ دوں ایسے چھوٹے چھوٹے کام کے لئے تو والنٹیر کافی ہیں۔

میں اس قسم کی باتیں بنا کر کسی طرح اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر رہا تھا کہ بیچ میں وہی مار آستین مولانا سیفی نے یہ زہر اگلنا شروع کر دیا۔

مولانا سیفی :- (لوگوں کو مخاطب کر کے) آپ لوگ خواہ مخواہ ان سے بدگمان ہیں یہ محض انکی لیڈرانہ انکساری ہے یہ خود اس کام کو انجام دیں گے کیونکہ لیڈر قوم کا سپہ سالار ہوتا ہے اور قومی جھنڈا عموماً سپہ سالار ہی حریف کے قلعہ پر جاکر لہراتا ہے۔

یہ کہہ کر اس فتنہ پرداز نے اور بھی میرا پوزیشن نازک کر دیا۔ دل میں کہا کہ دیکھئے اس موذی کی شرارت کو۔ اس وقت تو مجھے گڑھے کی طرف لے جانے کے لئے لوگوں کو ابھار رہا ہے اور پھر فوراً کلکٹر صاحب کی کوٹھی میں جاکر وہاں اس غار میں ڈھکیلنے کے لئے کلکٹر صاحب کو آمادہ کریگا۔ اس کی اس شرارت انگیز حرکت پر مارے غصہ کے قریب تھا کہ اس کی مخبری کے سارے کرتوت کو ظاہر کر کے سب کے سامنے اسے رسوا اور ذلیل کر دوں لیکن فوراً اپنے افشا راز کا خیال آیا تو مجبوراً جی ہی جی میں کڑھ کر رہ جانا پڑا۔ اب اسوقت کی میری بے بسی اور

بوکھلاہٹ کا اندازہ کچھ وہی لیڈر بھائی کر سکتے ہیں جنہیں کبھی اسی طرح بے موقعہ پھنس جانے کا اتفاق ہوا ہو۔ ادھر لیڈری ہاتھ سے نکل جانے کا خوف اُدھر سرکاری عتاب کا ڈر۔ کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چھٹ۔ ایک طرف لاٹھی چارج سہنے والے نوجوانوں کی جماعت رگید کر جھوٹے کو دروازہ تک پہونچائے بغیر جان چھوڑنا نہیں چاہتی۔ دوسری طرف یہ مارآستین تسمہ پا بکر جٹا ہوا کسی طرح جدا ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ ایسے نازک موقعہ پر ان لوگوں کے سوالوں کا ایسا جواب جس سے سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے میری سمجھ میں نہ آیا۔ جواب میں چند ہی منٹ دیر ہوئی ہوگی کہ ان میں سے ایک نے پھر ٹوکا۔

سوال :۔ کیوں جناب! سوراجی جھنڈا کے بارہ میں کیا ارشاد ہوتا ہے۔ گول مول نہیں صاف صاف فرمائیے کہ سرکار کے خلاف کارروائیوں میں آپ عملی حصہ لینے کو تیار ہیں یا نہیں؟

میں :۔ (مولانا سیفی کی طرف دیکھتے ہوئے) اگر ان کی بھی یہی رائے ہے تو مجھے کوئی عذر نہیں لیکن بھائی سیفی کہیں ایسا نہ ہو کہ...... بدحواسی کے عالم میں میری زبان سے یہ جملہ نکلنا ہی کو تھا کہ بھائی سیفی کہیں ایسا نہ ہو کہ حسب معمول اس گفتگو کو بھی آپ کلکٹر صاحب کے یہاں پہونچا دیں لیکن جملہ کے درمیان ہی میں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور صرف۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ۔ کہہ کر رک گیا۔ اب اس ادھورے جملے کو پورا کرنے کے لئے فوری طور پر کوئی اور دوسرے مربوط الفاظ بنے نہیں۔ اس لئے اسے ادھورا ہی چھوڑ کر جلدی سے چاہا کہ دوسری بات شروع کر دوں مگر ایک صاحب نے پھر چھیڑا۔

سوال :۔ ہاں جناب نے کیا فرمایا! کہیں ایسا نہ ہو کہ ....

میں :۔ مطلب یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ...... یعنی کوئی ایسا واقعہ رونما نہ ہو جائے کہ ...... اتفاق ہی ہے کوئی نئی بات ایسی نہ پیش آجائے کہ ...... اسی واسطے میں نے کہا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ...... اس بات کو ضرور خیال رکھنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ ...... لاحول ولا قوۃ دماغ سے بات نکل جانے کے بعد کمبخت حافظہ میں بھی نہیں آتی۔ خیر تو اسی کو کہہ رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ...... کیوں بھائی سیفی آپ تو سمجھ گئے ہوں گے؟

مولانا سیفی :۔ غالباً آپ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ پولیس روک ٹوک کرے۔
بامعنی پورا جملہ بن جانے کی خوشی میں بغیر غور کئے جلدی سے کہہ دیا۔

میں :۔ بس بس ٹھیک یہی کہہ رہا تھا آپ نے تو گویا میرے منھ سے بات چھین لی۔

ایک تیسری آواز :۔ کیا خوب سوراج کا جھنڈا آپ کورٹ کی بلڈنگ پر نصب کرنے جائیں گے اور پولیس روک ٹوک نہیں کرے گی۔ صرف غازی میاں کا جھنڈا سمجھ کر تماشا دیکھتی رہے گی۔ آپ کا مطلب تو یہی ہوا کہ اگر پولیس نے کوئی مزاحمت کی تو اس کام کو آپ انجام نہ دیں گے۔

اب جو میں نے غور کیا تو واقعی اس جملہ کا مفہوم کچھ بے جوڑ سا ہو گیا۔ میں نے دیکھا اب گاڑی آگے نہیں چلتی۔ اور چلے کیونکر
گاڑی میں مولوی سیفی کا روڑا ایسا اٹکا ہوا تھا کہ ایک انچ آگے بڑھ ہی نہیں سکتی تھی۔ عاجز آ کر تنہائی بے چارگی اور بوکھلاہٹ میں میں نے
کہ اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ یا تو ڈھیلے مار مار کر ان سب کو یہاں سے بھگا دوں یا
ان سب کو یہیں چھوڑ اس طرح فراٹے مار کر بھاگ جاؤں کہ رگید کر بھی یہ سب نہ دھر سکیں۔ زیادہ سے زیادہ لوگ یہی کہیں گے کہ دماغ
گیا ہے مگر کم سے کم اس کشمکش کی روحانی عذاب سے تو نجات مل جائے گی۔ قریب تھا کہ انہیں دو صورتوں میں سے کسی ایک پر
دوں کہ یکایک ایک الہامی بات ذہن میں آئی دل میں کہا کہ مولانا سیفی کی ایسی تیسی۔ کوئی پروا نہیں۔ دیکھا جائے گا۔ فوراً کھڑے ہو کر
نے اسپیچ دینی شروع کر دی:۔

"میرے جوشیلے نوجوانو! اس وقت تک محض تم لوگوں کو آزمانے کے لئے مشتبہ جملے بول رہا تھا میں سب سے
پہلے ملک اور قوم پر اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ تم لوگ اپنا شبہہ دل سے نکال دو اور مجھ پر اعتبار
کر کے اپنا لیڈر مانو۔ ہڑتال اور جلوس سے کچھ نہیں ہوگا اٹھو اور ملک پر جان دینے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

سنتے ہی نعرۂ تحسین اور میرے نام کی جے کی پکار سے پورا محلہ گونج اٹھا۔ اور میں اس کشمکش کی مصیبت سے نجات پا کر پھر لیڈری کی
پوزیشن پر آ گیا۔ ان سب کو رخصت کر کے چپکے وہاں سے اٹھا اور قبل اس کے کہ مولانا سیفی صاحب کے ہاں میرے خلاف الٹی
پر چل کریں۔ میں سیدھا "صاحب" کی کوٹھی میں پہونچا اور فوجی سلام کے بعد دست بستہ عرض کیا کہ اگر حضور اجازت دیں تو
جیوں سے ملکر نوجوانوں کو آپریشن کی تحریک کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دوں۔ اور گھن کی طرح ایسا ان کے ساتھ لگ جاؤں کہ بغیر انکی
بکلی کئے علیحدہ نہ ہوں لیکن حضور ذرا اس کا خیال رکھیں کہ ادھر ادھر کی باتیں سنکر آٹے کے ساتھ اس گھن کو بھی اپنے عتاب کی چکی میں
پیس دیں۔ میں نے اس اسکیم پر آج ہی سے عمل شروع کر دیا ہے اور ان لوگوں پر اپنا اثر ڈالنے کے لئے بظاہر سرکار کے خلاف آج کچھ
فول بک گیا ہوں اس کا حضور خیال نہ کریں۔ چند ہی روز میں ان نوجوانوں کو اپنے ٹیروں کو سرکار کے ساتھ کو آپریشن پر آمادہ نہ کر دوں۔
نسل کے عہدے تک نہ قبول کروا چھوڑوں تو میرے نام سے کتا پال کر ذلیل، خود غرض، بزدل، غدار جو ان سا خطاب آپ دیں اسے
ہی شکریہ کے ساتھ قبول کرنے کو تیار رہوں۔ یہ سنکر صاحب نے تھینکس کے ساتھ مبلغ ایک عدد سگرٹ معہ ایک نفر ماچس کے مجھے دیکر
کیا۔ اس روز سے نادم تحریر عریضہ ہذا خدا کے فضل، بزرگوں کی برکت، آپکی دعا سے نہایت ہی کامیابی کیساتھ اپنی دوہری ڈیوٹی ادا کر رہا ہوں
پبلک جلسوں میں عامیانہ تقریریں اور صاحب کے پرائیوٹ روم میں رازدارانہ گفتگو۔ ع۔ ہم قوم بدست آید و سرکار نہ رنجد۔ کی میری کامیاب
نہایت ہی خوش اسلوبی سے اپنا کام انجام دے رہی ہے۔ گو ساحل مقصود پر پہونچنے کے لئے جن دو کشتیوں پر میں آجکل سوار ہوں کبھی کبھی وہ ہاتے
ڈگمگانے بھی لگتی ہے لیکن خدا صاحب کو عمر خضری عطا کرے انکی دلجوئیاں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بنکر میری ہمت افزائی نہ کرتی رہیں تو
میری لیڈری کا بیڑا ہی غرق ہو جاوے۔ مانپوری

غزل

از حضرت ابوالجمال محمد احسن سخنؔ بہاری تلمیذ رشید خان بہادر حضرت مضطرؔ خیرآبادی

وہ کسی کا مے پلانا وہ ادا سے کام لینا
کبھی ہنس کے جام دینا کبھی کڑھ کے جام لینا

وہ کسی کا اُٹھ کے جانا مرا دل کو تھام لینا
وہ قضا کا آ کے کہنا کہ سخنؔ! اسلام لینا

دل و دیں تو دے چکے ہیں کہیں اب خدا بھی تم کو
بتو ایسی بندگی کو مرے سو سلام لینا

ہے بنا بنایا سودا مرا دل ہے مال اُن کا
نہ انھیں ہے دام دینا نہ مجھے ہے دام لینا

وہ تھا کوہکن کا قصہ جسے سن چکے ابھی تم
یہ فسانہ ہے ہمارا ذرا دل کو تھام لینا

وہ سنور کے آ رہے ہیں وہ نکھر کے آ رہے ہیں
کوئی عاشقوں سے کہہ دے کہ کلیجے تھام لینا

وہ نقاب اُلٹے الٰہی مرے پاؤں لڑکھڑائے
وہ کدھر ہے ذوقِ جلوہ ذرا مجکو تھام لینا

ابھی کیا سخنؔ بتوں پر دل و جاں سے تم فدا ہو
ذرا با خدا بھی بن لو تو بتوں کا نام لینا
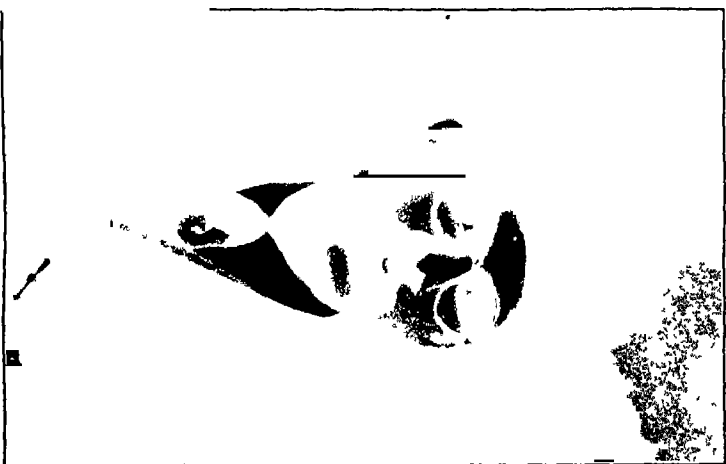
مشہور بہاری آرٹسٹ اے- ال- لال جی - گیا

سید رضا قاسم مظفر پوری (سیاح ممالک اسلامیہ)
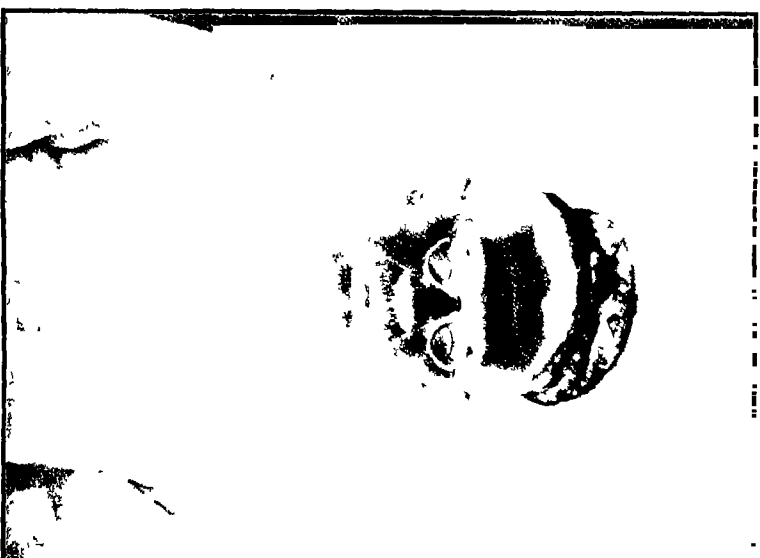
صوبۂ بہار کے معدنی وسائل

از جناب سید رضا قاسم صاحب مختار مظفر پور

[اس مضمون کی تدوین و ترتیب میں اپنے ذاتی مشاہدات و تجربات کے علاوہ ناچیز نے صوبۂ بہار کے مختلف اضلاع کے گزٹیر (GAZETEER) محکمۂ طبقات الارض کے سروے کی رپورٹ، جغرافیہ مصنفہ ڈڈلے اسٹیمپ، لغت اصطلاحات مرتبہ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد دکن اور بعض انگریزی کتب معاشیات مثلاً انڈین اکنامکس مصنفہ جاتھر اور بیری (INDIAN ECONOMICS By JATHER & BERI) وغیرہ سے بھی مدد لی ہے۔]

انسانی تمدن کے جملہ لوازمات میں معدنی وسائل کو بہت بڑی اہمیت ہے۔ عہد حاضر کے محض شعبۂ صنعت و حرفت ہی میں نہیں بلکہ ہماری خانگی ضروریات میں بھی اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔ فی زمانہ کوئلہ، لوہا، نفت وغیرہ کی قسم کے معدنیات کا استعمال روز افزوں ترقی پر ہے اور یہ ہمارے قومی استحفاظ اور اقتصادی ترقی کے اجزائے لاینفک ہیں اور موجودہ تجارتی اشیاء میں ان کی وہی حیثیت ہے جو زمانۂ سابق میں سونے اور چاندی کو حاصل تھی اور اسی بنا پر عہد حاضر کو آہنیات اور نفت کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ ایک وقت تھا کہ ہندوستان میں بھی معدنی و فطرتی پیداوار اس کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہوا کرتی تھی لیکن نسبتاً اب یہ اور ملکوں کی پیداوار کے مقابلے میں فزوں تر نہیں کہلا سکتی اس کی وجہ مزدوروں کی بے ہنری اور کل پرزوں کی کمزوری ہے۔ موجودہ زمانے کی سخت کشاکش اور مقابلے میں کسی صنعت و حرفت کا فروغ ناممکن ہے جب تک کہ کافی سرمایہ، خام اشیاء کی بہم رسانی اور ملکی و غیر ملکی بازار پر دسترس اس حد تک نہ ہو کہ اس کی پیداوار کی کھپت ہو جائے۔

ہمارا صوبۂ بہار بھی معدنی وسائل کے اعتبار سے ہندوستان کے دولت مند ترین صوبوں میں ہے اس کے معدنی اشیاء کی فہرست بہت طویل ہے، منجملہ ان کے کوئلہ، لوہا، ابرک اور شورہ کو سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ علاوہ ان کے اور بھی معدنیات بہار میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً آپاٹائٹ (Apatite) ڈالومائٹ (Dolomite) سنگ خارہ (Granite) لیٹ رائٹ (Laterite) چونا۔ کرانگٹ (کنکر) ریتیلا پتھر (Sand-stone) سلیٹ، کرومائٹ کا معدن خام (CROMITE-ORE) تانبے کا معدن خام، سونا، گرافائٹ (GRAPHITE) مینگنیز کا معدن خام (MANGNESE-ORE)

سوڈے کا سلفٹ (Sulphate of soda) سلیاٹائٹ (Sleatite) (جس سے درزی کپڑے پر نشان دیتے ہیں) ٹین ٹنگسٹن (Tungsten) (ایک قسم کی بیش قیمت دھات) اور المونیم وغیرہ

کوئلہ

منجملہ اور ضروری معدنیات کے (پتھر کا) کوئلہ بھی ایک ضروری شئے ہے، یہ مختلف کاموں میں آتا ہے مثلاً بھاپ والی کلوں کو چلانے، کوئلے کی گیس بنانے، کھانا پکانے، بھاتیوں کو روشن کرنے اور کالا پات یا الکترے (Coaltar) کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے۔

ہندوستان کے کوئلے کی پیداوار میں سینکڑے ستر ہمارے صوبۂ بہار کا حصہ ہے۔ اس صوبے میں بیس عدد مشہور کوئلے کے فیلڈ ہیں جو اضلاع کی ترتیب سے درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

(۱) پلاموں کے ضلع میں۔ ڈالٹین گنج، راجہارا، ہوٹار اور اورنگا ——— ۴ عدد

(۲) ہزاری باغ کے ضلع میں۔ شمالی کرن پورا۔ جنوبی کرن پورا۔ بوکارو۔ رام گڑھ۔ اٹکھورا۔ چوپ اور گری ڈی ——— ۷ عدد

(۳) مان بھوم کے ضلع میں۔ جھریا اور رانی گنج ——— ۲ عدد

(۴) سنتال پرگنہ کے ضلع میں۔ جینتی۔ برمنی ندی۔ دربرن پور۔ پچوارا۔ چپرابھٹا۔ گیل ہٹریا اور ہورا ——— ۷ عدد

کوئلے کی کل ہندوستانی کانوں میں تقریباً دو لاکھ مزدور کام کرتے ہیں جن میں مردوں کے علاوہ تخمیناً پچاس ہزار عورتیں اور ڈیڑھ ہزار لڑکوں کی تعداد ہے اور ان میں سے تقریباً ساٹھ فی صدی مزدور صوبۂ بہار کی متذکرہ بالا کانوں میں کام کرتے ہیں جو زیادہ تر قریبی اضلاع یا متصل صوبوں کے باشندے ہیں۔

نہ اتنا وقت ہے اور نہ ندیم کے صفحات میں اتنی گنجایش کہ ان کل کانوں کی منفرداً تفصیل کی جائے اسلئے ان میں سے صرف دو مشہور ترین کانوں کا بیان ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

صوبۂ بہار کی کانوں میں جھریا (ضلع مان بھوم۔ پورلیا) کی کان کو سب سے بڑی اہمیت حاصل ہے، یہ کان ۱۸۹۳ء میں دریافت ہوئی تھی۔ اس کا عرض دس میل اور طول تیئیس ۲۳ میل ہے اور اس کے رقبے کی وسعت ڈیڑھ سو مکعب میل ہے۔

او پر ذکر ہوا ہے کہ ہندوستان کی ستر فی صدی یا صدی پیداوار ہمارے صوبے سے حاصل ہوتی ہے، بہار کی اس اوسط پیداوار میں سے پچاس فی صدی صرف جھریا کی کانوں سے دستیاب ہوتی ہے اور اس کان کا کوئلہ نہایت اعلیٰ قسم میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے بعد دویم درجہ رانی گنج کی کانوں کا ہے اس کا کوئلہ جھریا کے کوئلے سے کچھ دبتا ہوا ہے۔

لوہا

کچے لوہے کی پیداوار اور اس کی کھادٹ دونوں ہی باتوں کے لئے صوبۂ بہار ہندوستان کے کل صوبوں میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، لوہے اور اسپات کی صنعت کے اجرا اور کامیابی کے لئے ہندوستان میں اکثر کوشش

کی گئیں لیکن کل اگلی کاوشیں بے سود ثابت ہوئیں یہاں تک کہ ایک غیر معمولی قسم کے کچے لوہے کا کثیر المقدار ذخیرہ سنگھ بھوم کو نیجر اور بونائی میں پایا گیا۔ اس ذخیرے کی دریافت ہندوستان کی آہنی صنعت کی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

بھاگلپور کے ضلع میں بھی ریت کی شکل میں کچا لوہا پایا جاتا ہے مگر قلیل مقدار میں جو علاقہ کٹوریا کے مقامی بھٹیوں میں گلاوٹ کے کام میں آتا ہے۔

سنتھال پرگنہ اور پلاموں کے اضلاع میں بھی بلند ٹیلوں میں سرخی اور زردی مائل ہیماٹائٹ (Hematite) قسم کا لوہا پایا جاتا ہے جس سے پینتالیس فی صدی خالص لوہا دستیاب ہوتا ہے چنانچہ ۱۸۵۲ء تک ستر دیسی بھٹیاں ان کے نکالنے کے لئے چلا کرتی تھیں۔ جن سے تقریباً تینتیس سو ٹن سالانہ غیر صاف شدہ لوہے کی مقدار حاصل کی جاتی تھی۔

راج محل کے علاقے میں بھی سامونائٹ (Semonite) قسم کا لوہا پایا جاتا ہے لیکن اس کی مقدار اتنی کافی نہیں ہے کہ عہد حاضر کی صنعت کے نقطۂ نظر سے اس میں کوئی دلچسپی لی جا سکے۔

حجر الحدید قنتلون (Iron Stone Shales) میں کچا لوہا اپنے انتہائی تکمیل کو صرف رانی گنج ہی کی کانوں میں نہیں پہونچا بلکہ یہی حال جھریا، بوکارو وغیرہ میں بھی پایا جاتا ہے۔ رانی گنج میں حجر الحدید قنتلوں کی اوسط دبازت تقریباً چودہ سو فیٹ ہے اور پوری کان تینتیس میل کی وسعت میں پورب پچھم پھیلی ہوئی ہے یہاں کی کانوں میں کچے لوہے کی یافتنی مقدار کا اندازہ بیس کروڑ ٹن فی مکعب میل کے حساب سے کیا جاتا ہے۔

براکر ندی کی تہ میں بھی پچاس ساٹھ فی صدی ہیماٹائٹ (Hematite) قسم کا لوہا دستیاب ہوتا ہے۔ چنانچہ جمشید پور ضلع سنگھ بھوم میں ٹاٹا کے کارخانے کی بنیاد کا باعث مایور بھنج، بونائی اور اس صوبے کے دیگر مقامات میں کچے لوہے کے کثیر المقدار ذخایر ہیں۔ صوبہ بہار میں اس عظیم الشان کارخانے کے قیام کے بعد مزید انتفاعی کارروائیوں کی بدولت گرومانشی اور کامپڈ اور بدم پہاڑ میں نہایت بکار آمد ذخائر دریافت ہوئے ہیں۔ یہ خام ذخیرے ہیماٹائٹ (Hematite) قسم کے خیمہ نما اجسام معلوم ہوتے ہیں جن میں مقنطائٹ (Magnatite) کے کچھ حصے بھی شامل ہیں۔

ضلع مان بھوم میں تبر المقناطیس (Magnetic-ore) کے ذخیرے بھی پائے جاتے ہیں۔

گرومانشی کے پہاڑی کی بلندی سمندر سے تین ہزار فیٹ اوپر ہے اور اس میں تین متوازی خام لوہے کی تہیں ہیں جن کی لمبائی ترتیباً سات ہزار، ساڑھے پانچ ہزار اور تین ہزار فیٹ اور چوڑائی تین سو سے سات سو فیٹ تک ہے۔

۱۹۴۳ء میں ہمارے صوبے میں کچے لوہے کی مجموعی پیداوار سات لاکھ چھبیس ہزار چار سو اکتالیس (۷۲۶۴۴۱) ٹن تھی۔

ابرک ہمارے صوبے کی تیسری بہت مشہور معدنی پیداوار ابرک ہے، صوبۂ بہار کے ابرک کا منطقہ (Belt) ساری دنیا کے ابرک کی منطقوں میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۴ء سے سنہ ۱۹۱۸ء تک کی پنج سالہ مدت میں صوبۂ بہار کے ابرک کے کانوں کی پیداوار کی اوسط سارے ہندوستان اور دنیا کی مجموعی پیداوار کے مقابل ترتیباً بیاسی اور پچپن فی صدی تھی۔ بہار کے ابرک کی منطقے پورب اتر کے مشرقی سمت میں و بیان پلاموں۔ گیا۔ ہزاری باغ اور مونگیر کے اضلاع میں یعنی پچھم جانب ایسٹ انڈین ریلوے (E.I.Ry) کے گرحوا روڈ اسٹیشن سے پورب طرف جھاجھا اسٹیشن تک پھیلے ہوئے ہیں جن کی مجموعی وسعت طولاً دو سو ساٹھ میل سے کچھ زیادہ اور چوڑائی تقریباً بارہ چودہ میل ہے۔

صوبۂ بہار کا غیر صاف شدہ ابرک شفاف و براق قدرے سرخی مائل ہوتا ہے جس کی دبازت جبکہ وہ کانوں سے نکالے جاتے ہیں اُس وقت ایک انچ سے پانچ گز تک ہوتی ہے جن کو کیمیاوی طریقے پر صاف کرکے ان کے اوراق علیحدہ کئے جاتے ہیں اور تب یہ صاف شدہ ابرک بہتیرے کاموں میں استعمال ہوتا ہے چونکہ ابرک بارود بنانے کے کاموں میں بھی آتا ہے لہذا یورپ کی جنگ عظیم کے دوران میں اس کی مانگ اسقدر زیادہ ہوئی کہ ہمارے صوبے کی اس معدنی پیداوار میں صرف اضافہ ہی نہ ہوا بلکہ بہار کے دیگر مقامات میں بھی اس کی چھان بین ہونے لگی جس کا نتیجہ نئے ذخائر کے دریافت کی شکل میں ظاہر ہوا۔

صوبۂ بہار کا غیر صاف شدہ ابرک رنگ سازی، کپڑے کی چھپائی اور ہولی کے تہوار میں کام آتا ہے، علاوہ ازیں بوجہ اس کے مساعد برقی (Dialectric Coefficient) ہونے کے اس کا استعمال کثیف برق کا برق گذار (Dialetric Of Electric Condenser) بنانے میں بھی کیا جاتا ہے۔ اس کا ورق گراموفون کے آلۂ صوت (SoundBox) کی بناوٹ میں بھی استعمال ہوتا ہے، اس کی شفافی و تابانی کے سبب لیمپوں کی چمنیاں بھی اس سے بنتی ہیں اور اس کے کترن کا سفوف رنگ و روغن (Paints & Lubricants) میں بھی ملایا جاتا ہے۔

شورہ اہمیت کے لحاظ سے بہار کی چوتھی معدنی پیداوار شورہ ہے، جو ایک منجمد بلوریں شئے ہے، یہ بہتیرے کاموں میں آتا ہے۔ آتش بازی کے مسالوں، بارود سازی اور گندھک کا تیزاب بنانے میں اس کو استعمال کرتے ہیں۔ ماسوا ان کے کھاد میں بھی یہ مستعمل ہے۔ نیز برف کی ایجاد کے قبل پینے کا پانی اسی سے جھال کر ٹھنڈا کیا جاتا تھا۔ ہمارے صوبے میں اس کی پیداوار کثیر مقدار میں ہوتی ہے۔ اگر ناظرین کو وہ کیفیتیں معلوم ہو جائیں جن کے

باعث زمین میں شورہ بنتا ہے تو بہار میں اس کی زیادتی پیداوار کی وجہ نہایت آسانی سے سمجھ میں آجائے گی۔ زمین میں شورے کے بننے کے لئے مندرجہ ذیل حالات کا پایا جانا اشد ضروری ہے۔

(۱) نائٹروجنی عضوی مادّے (Nitrogenous Organic Matter) کی موجودگی۔

(۲) نائٹروجنی بیکٹریا (Nitrizying Bacteria) کے نمو کے موافق آب و ہوا کا ہونا۔

(۳) مٹی میں پوٹاس (Potash) کی آمیزش۔

(۴) آب و ہوا کی وہ حالت جو سطح زمین پر پوٹاسیم نائٹریٹ کے تزہیر کی معاون ہو۔

مندرجہ بالا کل کیفیتیں بہ درجۂ اتم صوبۂ بہار میں پائی جاتی ہیں کیونکہ:-

(۱) یہاں کی آبادی گنجان ہے۔

(۲) یہاں کا موسم معتدل حرارت ۷۰ فارن ہائٹ ڈگری رکھتا ہے جس کا سالانہ تغیر تقریبًا ۱۸ فارن ہائٹ ڈگری ہے اور سال کے بیشتر حصوں کے روزانہ تغیر میں ۸۰ فی صدی نمی پائی جاتی ہے۔

(۳) گاؤں کی آبادیوں میں عمومًا لکڑی اور اُپلے یا کنڈے بطور ایندھن استعمال ہوتے ہیں جس کی وجہ سے زمین پوٹاس سے بھر جاتی ہے۔

(۴) بارش کی کمی کے باعث ایک مدت تک خشک رہ جانے سے سطح زمین پر نمکوں کی تزہیر (Efflorescence) ہوتی ہے۔

ہمارے ملک میں کھاری یا نونی مٹی سے شورہ بنانے کا ایک ہی پرانا طریقہ صدیوں سے رائج ہے جس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوا ہے، اس کے بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ آبادی کے قریب کی زمینوں میں سے کھاری مٹی کو اکٹھا کر کے پانی میں خوب اچھی طرح گھلا کر بذریعہ کسر قلماؤ (Fracional Crystalisation) نمک اور شورے کو موٹے جھوٹے طریقے پر علیحدہ کر لیتے ہیں۔ کچھ زمانہ قبل اس طریقے سے جو غیر صاف شدہ نمک حاصل ہوتا تھا اس کو مقامی ضرورتوں میں استعمال کیا کرتے تھے لیکن اب اس کو صاف کر کے فروخت کرتے ہیں اور ناصاف شدہ شورے کو قبل اس کے کہ وہ غیر ملکوں میں بھیجا جائے مخصوص (Refineries) میں مزید صفائی کے لئے بھیج دیتے ہیں۔

شورے کی تیاری شمالی ہند کے محکمۂ نمکسار کے زیر نگرانی ہے اور اسی محکمے سے خالص یا صاف شدہ اور بازاری یا

ا Meteorological Condition Suitable To The Efflorescence Of The Potassium Nitrate At The Surface Earth

ب شورہ، کھار اور نمکینیت

ج صوبۂ بہار میں اپلے کو گوئیٹھا کہتے ہیں

د صاف کرنے کے گودام

غیر صاف شدہ دونوں ہی قسم کے شورے بنانے کی اجازت (License) حاصل کرنی پڑتی ہے۔

ہمارے صوبۂ بہار میں شورے کی پیداوار کی فراوانی مظفر پور۔ سارن۔ چمپارن اور دربھنگہ کے اضلاع میں ترتیبًا ہوتی ہے۔ علاوہ ان اضلاع کے اس کی قلیل مقدار شاہ آباد۔ گیا۔ مونگیر اور پٹنہ (عظیم آباد) کے ضلعوں میں بھی دستیاب ہوتی ہے۔

۱۸۴۳ء تک ہمارا ملک شورے کی تجارت کا واحد اجارہ دار تھا، جس سے یورپ کی ضرورتیں پوری ہوا کرتی تھیں اور بارود میں استعمال ہونے کی وجہ سے اس کی بڑی سیاسی اہمیت رکھتی تھی۔ لیکن ۱۸۴۶ء میں چلی (جنوبی امریکہ) کے شورے کی دریافت اور بسبب اس کے دوطرفہ انفسا خ (Double Decomposition) کے بارود سازی میں زیادہ بکار آمد ہونے کے امکان نے ہندوستانی شورے کی سیاسی اہمیت کو بالکل ہی کم کردیا، مگر اس کمی نے اس کی تجارت کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جس کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ ۱۸۴۵ء میں یہاں کے شورے کی برآمد پچیس ہزار ٹن سے کچھ کم تھی مگر اس کے بعد پچاس برس کی مدت میں یعنی ۱۸۵۲ء لغایت ۱۹۰۲ء تک اس کی سالانہ برآمد کا اوسط ٹھیک پچیس ہزار ٹن تھا۔

تانبا

صوبۂ بہار میں تانبے کا معدن خام بھی ہے، اس کے مشہور ذخایر ضلع سنگھ بھوم میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء لغایت ۱۹۰۸ء ان میں سے چند معدن کا معاینہ ہندوستان کے محکمۂ تفحص طبقات الارضی (Geological Survey) نے ہیرے کے برموں کی مدد سے کیا تھا جس میں ۸ء ۳ فی صدی تانبا پایا گیا تھا۔ اس کے معدن کی کھدائی کیپ کوپر کمپنی کے متعلق تھی، اس کا منطقہ (Belt) طولاً اسی میل ہے جو دوپارم سے راج دوہا اور بایور منج تک پھیلا ہوا ہے۔

اس کا خاص اور اصلی معدن خام چالکوپائرائٹ (Chalcopyrite) قسم کا ہے جس کی دبازت تین انچ سے دو فیٹ تک ہوتی ہے اور جس کے اوپر کا حصہ اکسائدی معدن یعنی مالاکائٹ، آزورائٹ (نیلے رنگ کے پتھر) وغیرہ کی شکل میں تبدیل ہوگیا ہے۔

ہمارے صوبے کے دیگر مقامات جہاں تانبے کا معدن خام پایا جاتا ہے سنتال پرگنہ میں بیراکی اور بارگوندا ہیں۔ ان میں سے مؤخر الذکر مقام کے تانبے میں جستے کی بھی آمیزش پائی جاتی ہے۔

---

۱ ہامی ندی کے کنارے۔ ۲ Malachite ۳ Azurite

سونا ہمارا صوبۂ بہار سونے کے جوہر سے بھی خالی نہیں ہے' اس کے لئے سنگھ بھوم کا ضلع سب سے زیادہ مشہور ہے' یہاں گارہا دھیپا' سونہ ناد اور سوبرنہ ریکھہ کے چشمے معروف ترین ہیں جہاں سونے کی دھولائی اب تک ہوتی ہے۔

۱۸۸۸ء میں سونے کی گراں بہا چاشنیوں (Specimens) کی دریافت کی وجہ سے تقریباً تیس ۳۲ لیمیٹیڈ کمپنیاں دس لاکھ پاؤنڈ کے سرمایہ سے قائم ہوگئی تھیں' لیکن دو ہی تین سال کے اندر بجز دو کمپنیوں کے سب کی سب ٹوٹ گئیں مذکرہ بالا مقاموں کے علاوہ سونے کی قلیل مقدار مایور بھنج' دالبھوم اور بونائی اسٹیٹ میں بھی پائی جاتی ہے۔

مینگنیز صوبۂ بہار کے بہتیرے مقاموں میں مینگنیز (Manganese) دریافت ہوا ہے' لیکن ان میں سے صرف دو ہی مقامات یعنی گنگ پور اور سنگھ بھوم میں اس کے عملی نتائج ظاہر ہوئے ہیں۔ گنگ پور میں ۱۹۰۸ء میں جب کام شروع ہوا تھا تو اُس وقت اُس کی یافت میں ہزار ٹن سالانہ تھی جو بہ تدریج بڑھ کر ۱۹۱۴ء میں چھپن ہزار ساٹھ ٹن تک پہنچ چکی تھی۔

علاوہ ان مقامات کے چائباسہ کے دکھن پچھم حصے میں بھی اس کے کچھ ذخیرے دریافت ہوئے ہیں جو آٹھ گانوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

مینگنیز کا استعمال زیادہ تر آہنی سنگ (Ferro Manganese) کے بنانے میں کیا جاتا ہے۔

گرافائٹ بہار کے صوبے میں گرافائٹ (Graphite) بھی بلور (Quartzs) کلمنائٹ (Cilimnite) ٹامڑا (Garnate) وغیرہ کی آمیزش کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ یہ کالاہانڈی' پٹنا' اٹھ مالک اور سون پور کی دیسی ریاستوں میں دستیاب ہوتا ہے۔ کالاہانڈی کی ریاست میں اس کا ذخیرہ بارہ سے بیس انچ تک دبیز ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں ضلع پلاموں' مونگیر اور ہوٹار کے نزدیک کوئل ندی کی تہ میں بھی گرافائٹ ملتا ہے۔ اس سے کٹھالی (Crucibles) اور پنسل کا مسالا بناتے ہیں' ماسوا اس کے اس کو بطور خشک مَلس (Dry Lubricant) اور برقی طبع کاری (ElectroTyping) میں استعمال کرتے ہیں۔

ٹنگسٹن ٹنگسٹن[۱] کا معدن خام (Tungsten Ore) صوبۂ بہار میں صرف ایک ہی مقام یعنی کالاماٹی میں جو بنگال ناگپور ریلوے کی لائن پر واقع ہے پایا جاتا ہے ۱۹۱۶ء سے ۱۹۱۸ء تک کھدائی

---

[۱] ایک قسم کی بیش قیمت دھات۔

کا کام ہوا تھا اور اس کی مجموعی مقدار جو دستیاب ہوئی ۵۵،۰۰۰ ٹن تھی۔ اس کا معدن خام ترچھا تیر کی طرح ۳۰ فیٹ سے بھی زیادہ کی عمق تک چلا گیا ہے۔

صنعتی و جنگی فوائد کے لحاظ سے اس دھات میں چند مخصوص خاصیتیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں خود بخود سخت ہو جانے کی خاصیت ہے جو اسپات کی آمیزش سے پیدا ہو جاتی ہے۔ تیز دھار رکھنے والے تقریباً کل اوزار اسی اسپات کے بنتے ہیں جن میں ٹنگسٹن بھی ملا رہتا ہے۔

ٹنگسٹن کو خوب گرم کرنے پر اس میں نرمی اور لچک پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برقی لیمپوں میں استعمال کے لئے اسی کے تار بنائے جاتے ہیں جو باوجود باریک ترین ہونے کے بہت مضبوط ہوتے ہیں۔

المونیم المونیم کا معدن خام بھی یہاں بوکسائٹ (Bauxite) کی شکل میں دستیاب ہوتا ہے۔ صوبہ بہار میں بوکسائٹ (Bauxite) کے ذخایر زیادہ تر پالاموں اور رانچی کے اضلاع میں پائے جاتے ہیں اور علاوہ اس کے کالاہانڈی کی ریاست میں بھی ملتے ہیں۔

یہ اپنی کمی کثافت، نرمی، ملائمیت اور پیٹنے سے بڑھنے کی صلاحیت کی وجہ سے نہایت بکار آمد سمجھا جاتا ہے۔ اسکا استعمال برتنوں کے علاوہ بجلی کے کاموں، دھاتوں کی صفائی اور طیاروں کی ساخت میں بھی کیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا سطور میں نہایت ہی مختصر طور پر صوبہ بہار کے صرف چند اہم اور ضروری معدنی اشیاء کے حالات درج کئے گئے ہیں جس کی مثال چند دانوں سے ہے جو انبار سے اٹھائے گئے ہوں ورنہ موضوع کی اہمیت تو اس کی مقتضی ہے کہ کافی وقت اور محنت سے کام لیا جائے اور بسیط و واضح طریقے پر اس کو ترتیب دے کر مستقل کتابی صورت میں پیش کیا جائے۔ بہر حال اس مختصر اور نامکمل تحریر کو اگر ناظرین نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا تو میں سمجھونگا کہ میری محنت ٹھکانے لگی اور انشاء اللہ آئندہ اس کے متعلق ایک خاص رسالہ لکھنے کی کوشش کرونگا۔

دنیائے حسن

از جناب مولوی سعید الزماں خاں صاحب بی اے۔ اختر شہسرامی

روزِ ازل سے دل مرا شیدائے حُسن ہے
ہر دم مری نگاہ میں دُنیائے حُسن ہے

یہ سر ہے اور جوششِ سودائے حسن ہے
آنکھیں ہیں اور شوق تماشائے حُسن ہے

کیا ٹکٹکی لگی ہے مجھے دیکھ کر انہیں
گویا نگاہ وقفِ تماشائے حُسن ہے

رنگینیٔ چمن پہ یہ خود ہو گئی نثار
فطرت بھی آج محوِ تماشائے حُسن ہے

تصویر ہوں میں رنج و غم و اضطراب کی
تو پیکرِ جمال سراپائے حُسن ہے

غصہ سے یہ شکن نہیں تیری جبین پر
پیشِ نظر تموج دریائے حُسن ہے

اُن کو ہے ناگوار مرا اضطرابِ عشق
میری زباں پہ ذکرِ ستمہائے حُسن ہے

ہر لمحہ شوقِ دید میں اِک اضطراب ہے
مدِ نظر جو دل کو تماشائے حُسن ہے

تجھ کو حسین کہا تو تری مدح کیا ہوئی
تو جانِ حُسن نازشِ سلمائے حُسن ہے

ہیں یوں تو خوش جمال جہاں میں بہت مگر
مانے گا وہ تجھی کو جو بینائے حُسن ہے

تنویرِ رُوئے یار سے چھٹکی ہے چاندنی
اختر کے گھر میں آج تجلائے حُسن ہے

فخرِ بہار
ہنیمن ہومیو ہوم

مہتمم خصوصی:- ڈاکٹر آزاد- ال ام اف آر ام پی، ہومیو پیتھ۔

نگرانِ خصوصی:- اختر حسن ایم اے ایم ڈی۔ (ہومیو) ایڈوکیٹ۔

مشیرانِ خصوصی (۱) خان بہادر ڈاکٹر اظہر الحق بی اے ہومیو پیتھ (۲) ڈاکٹر اسٹورٹ جیمس ہومیو پیتھ۔

معاونِ خصوصی ڈاکٹر لارنس ام ڈی (ہومیو پیتھ)

نرخنامہ ہومیو ڈائیلوشن

نمبر ڈائیلوشن	ایک ڈرام	دو ڈرام
مدر ٹنکچر	۴/	۶/
۳-۶-۱۲-۳۰	[illegible]	[illegible]
۱۰۰ — ۲۰۰	۱۰/	[illegible]
۵۰۰	۶/	۱۰/
۱۰۰۰		۱۲/

ہیڈ آفس:- بانکی پور۔ پٹنہ
برانچ آفس: چوک۔ پٹنہ سیٹی

شجر گناہ کا دُنیا میں جب ثمر لایا — قدم جہان میں بیماریوں کا جب آیا
جہانِ فانی میں بیماریاں مصیبت تھیں — بلائیں تھیں، قہر تھیں آفت تھیں اور قیامت تھیں
زبانِ تابِ تکلم میں اُن سے چھالے تھے — کہ اُن سے پڑ گئے لوگوں کے جان کے لالے تھے

جمالِ روئے بقا کے لئے وہ چیچک تھیں — بہارِ نخلِ بقا کے لئے وہ دیمک تھیں
گلے کا ہار تھیں بیماریاں خزاں کی طرح — جگر کے پار تھیں بیماریاں سناں کی طرح
جہاں میں آتے تھے آزار آندھیاں بنکر — جلاتے خرمنِ ہستی تھے بجلیاں بن کر
غرض مرض میں زہی عذاب تھے انساں — برشتہ سوختہ مثلِ کباب تھے انساں
جو حد سے بڑھ گیا اہلِ جہاں کا جوش و خروش — تو آیا قلزمِ لطفِ خدائے پاک میں جوش
حریمِ قدس سے جرمن میں ایک حور آئی — شرابِ نابِ شفا کا نشۂ سرور آئی
یہ حور ہومیو پیتھی ہے رَبّ کی رحمت ہے — یہ روحِ عطرِ طبابت ہے عین فطرت ہے
یہ نوش نیشِ دُمِ عقرب و بائی ہے — عظامِ خستہ کی خاطر یہ مومیائی ہے
جو زخمِ دل کے لئے مرہمِ سلیمانی — تو سرمہ نرگسِ بیمار کو صفاہانی

نسیمِ صبح ہے بادِ صبا ہے شبنم ہے — دمِ مسیح کی دمساز اور ہمدم ہے
غرض کہ جملہ عوارض میں بیخطا درمان — علاجِ موت نہیں کل من علیہا فان

یہ ہومیو ہنیمن ہوم ہے بہارِ بہار — یہ سرپرست ہے اس کا مزو مدارِ بہار
یہ گوشِ شوق میں باجوں کی بجنے تان آیا — یہ جسمِ زار میں بسمل کے بن کے جان آیا
"چمن چمن یہ نسیمِ سحر پکار آئی — خزاں کے دن گئے اے بلبلو بہار آئی"

کہاں ہو؟ آؤ مرے روبرو مسیحاؤ — گئے وہ دن بلائیں لوں ہومیا پیتھو
گنواتے روگ ہو دکھ درد کو مٹاتے ہو — لگے جو آگ تو امرت ہے تم بجھاتے ہو
بچا لو تند ہواؤں سے گلستانوں کو — گلوں کو لالوں کو غنچوں کو نونہالوں کو
تمہاری کشورِ صحت پہ ہے قلمرانی — نثار تم پہ کروں کانِ لعلِ رُمانی
غرض یہ پیشہ تجارت نہیں عبادت ہے — کہ فیضِ عام جہاں آفریں کی خدمت ہے